ڈاکٹر محمد حمید اللہ

خطباتِ بہاولپور


ڈاکٹر محمد حمید اللہ

# فہرست عنوانات

# کچھ مصنف کے بارے میں

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب 1908ء کو علوم اسلامیہ کے گہوارے حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ آپ نے جامعہ عثمانیہ سے ایم۔اے، ایل ایل۔بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے لیے یورپ پہنچے۔ بون یونیورسٹی (جرمنی) سے اسلام کے بین الاقوامی قانون پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈی فل کی ڈگری حاصل کی اور سوربون یونیورسٹی (پیرس) سے عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں اسلامی سفارت کاری پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹر آف لیٹرز کی سند پائی۔ڈاکٹر صاحب کچھ عرصے تک جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں پروفیسر رہے۔ یورپ جانے کے بعد جرمنی اور فرانس کی یونیورسٹیوں میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں۔ فرانس کے نیشنل سنٹر آف سائنٹفک ریسرچ سے تقریباً بیس سال تک وابستہ رہے۔ علاوہ ازیں یورپ اور ایشیا کی کئی یونیورسٹیوں میں آپ کے توسیعی خطبات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

ڈاکٹر صاحب السنہ شرقیہ اردو فارسی عربی اور ترکی کے علاوہ انگریزی فرانسیسی جرمن اطالوی وغیرہ زبانوں پر بھی عبور رکھتے تھے۔ چنانچہ مختلف اقوام و ادیان کے تاریخی اور تقابلی مطالعے کی بدولت آپ کے مقالات اور تصانیف کا علمی و تحقیقی مرتبہ نہایت بلند ہے۔ فرانسیسی زبان میں آپ کے ترجمہ قرآن مجید اور اسی زبان میں دو جلدوں پر مشتمل سیرت پاک کو قبول عام حاصل ہوا۔ عالمی شہرت یافتہ کتاب Muhammad Rasul Allah کے مصنف ہیں۔اس کے علاوہ

The Battlefields of Prophet Muhammad

The Muslim Conduct Stare

The First Written Constitution

الوثائق السیاسیہ العھد النبوی والخلافۃ الراشدہ

خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

علاوہ ازیں علم حدیث کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا اہم ترین کارنامہ "صحیفہ ہمام بن منبہ" کی تحقیق واشاعت ہے۔ یہ قدیم ترین مجموعہ احادیث ہے جو عہدِ صحابہ میں مرتب ہوا تھا۔ آپ نے اس نادر ونایاب ذخیرہ حدیث کا ایک مخطوطہ برلن میں دریافت کیا اور اسے جدید اسلوب تدوین کے مطابق مرتب کر کے شائع کرایا۔ خدمت قرآن کے سلسلے میں آپ نے پچپن برس قبل تراجم قرآن حکیم کی ببلیو گرافی "القرآن فی کل لسان" مرتب کی جس میں دنیا بھر کی ایک سو بیس زبانوں میں قرآن کے تراجم کا تذکرہ اور بطور نمونہ سورہ فاتحہ کے تراجم درج ہیں۔

تو یہ ہے اس شخص کا مختصر تعارف جس نے مغرب کی نئی نسل کو اسلام سے قریب تر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جو تقریباً نصف صدی سے زائد علم کے موتی لٹاتا رہا، جو زندگی کی آخری سانس تک فاطمہ کے بابا کے عشق میں سلگتا رہا۔۔۔ جلتا رہا۔۔۔ جلاتا رہا

خدا اس پر رحمتیں نچھاور کرے

☆☆☆☆☆☆☆

# خطبہ ۱: تاریخِ قرآن مجید

محترم صدر، محترم وائس چانسلر، برادران وخواہران محترم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

قرآن مجید ایک ایسا موضوع ہے جس کے بہت سے پہلو ہیں اور ایک گھنٹے کے مختصر وقت میں یہ ممکن نہیں کہ ان سارے پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاسکے۔ اس لیے صرف اس کے ایک پہلو یعنی تدوین قرآن مجید کی تاریخ کو چند الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

مسند احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ میں ایک حدیث ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "اللہ نے حضرت آدم سے لے کر مجھ تک ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے۔ جن میں سے تین سو پندرہ صاحب کتاب تھے"۔ تین سو پندرہ صاحب کتاب نبیوں کے نام نہ تو قرآن مجید میں ہیں اور نہ احادیث میں ان کا ذکر ہے، لہٰذا ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ ان کی تفصیل معلوم کرسکیں۔ صرف چند اشارے ملتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام پر دس صحیفے نازل ہوئے تھے۔ لیکن یہ ہماری بدنصیبی ہے ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کس زبان میں تھے۔ چہ جائیکہ ان کے مندرجات کا علم ہو۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے حضرت شیث علیہ السلام بھی پیغمبر تھے ان کے متعلق بعض روایات میں ذکر ملتا ہے کہ ان پر بھی چند کتابیں نازل ہوئی تھیں۔ لیکن ان کا بھی دنیا میں اب کوئی وجود نہیں۔ قدیم ترین نبی، جن کی طرف منسوب کتاب کا کچھ حصہ ابھی حال ہی میں ہم تک پہنچا ہے حضرت ادریس علیہ السلام ہیں۔ غالباً آپ نے سنا ہو گا کہ فلسطین میں بحر مردار کے پاس بعض غاروں سے کچھ مخطوطے ملے ہیں۔ ان مخطوطوں میں سے ایک کتاب حضرت اخنوخ یا انوخ یعنی

حضرت ادریس علیہ السلام کی طرف منسوب ہے۔ حال ہی میں اس کتاب کے کچھ ترجمے انگریزی زبان میں شائع ہوئے ہیں۔ اگرچہ اس بات کا کوئی حتمی و قطعی ثبوت موجود نہیں، لیکن اب تک کی تحقیق کے مطابق ہم اسے قدیم ترین نبی کی کتاب کہہ سکتے ہیں۔ اس کتاب میں آخری نبی کی بشارت بھی ہے، جس کو بعد میں عہد جدید (انجیل) کے باب "مکتوب یہودا" نے بھی نقل کیا ہے۔ حضرت ادریس علیہ السلام کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق بھی ہمیں کچھ اشارے ملتے ہیں۔ عراق میں "صابیہ" کے نام سے ایک چھوٹا سا گروہ پایا جاتا ہے جس کا ایک مستقل دین ہے ان کا یہ دعویٰ ہے کہ "ہم حضرت نوح علیہ السلام کی کتاب اور ان کے دین پر عمل پیرا ہیں" ان کا کہنا ہے کہ "ایک زمانے میں حضرت نوح علیہ السلام کی پوری کتاب ہمارے پاس موجود تھی لیکن امتداد زمانہ کے سبب سے اب وہ ناپید ہے۔ اس کے مندرجات صرف چار پانچ سطروں میں ہمارے پاس موجود ہیں۔ جن میں اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے"۔ اس کے بعد ایک اور نبی آئے ہیں جن کی کتاب کا ذکر خود قرآن مجید میں موجود ہے۔ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ (صحف ابراہیم و موسیٰ) دو مرتبہ قرآن مجید میں اس کا ذکر آیا ہے۔ ان کی کتاب کے مندرجات یہودی اور عیسائی ادبیات میں تو نہیں قرآن میں چند سطروں کی حد تک محفوظ ملتے ہیں۔ اسی طرح بعض ایسے انسان بھی ہیں جن کو صراحت کے ساتھ نبی تو تسلیم نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کی نبوت کے امکان کو رد بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے ایک شخصیت "زردشت" کی ہے۔ پارسی انہیں اپنا نبی مانتے ہیں۔ ان کی نبوت کا امکان اس بنا پر بھی ہے کہ قرآن مجید میں مجوس قوم کا ذکر آیا ہے۔ مجوسیوں کا مذہب زردشت کی لائی ہوئی کتاب ''آوستا'' پر مبنی ہے۔ آوستا کے متعلق ہم تک کچھ معلومات پہنچی ہیں۔ جب ہم اس کا قرآن مجید سے موازنہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کس کو کیا برتری حاصل ہے؟ زردشت کی کتاب اس وقت کی ''زند'' زبان میں تھی۔ کچھ عرصے بعد ایران پر دوسری قوموں کا غلبہ ہوا اور نئے فاتحین کی زبان وہاں رائج ہوئی۔ پرانی زبان متروک ہوتی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک بھر میں مٹھی بھر عالم اور مختصصین کے سوا زند زبان جاننے والا کوئی نہ رہا اس لیے زردشتی مذہب کے عماء نے نئی زبان پازند میں اس کتاب کا خلاصہ اور شرح لکھی۔ آج کل ہمارے پاس اس نسخے کا صرف دسواں حصہ موجود ہے۔ باقی غائب ہو چکا ہے۔ اس دسویں حصے میں کچھ چیزیں عبادات کے متعلق ہیں اور کچھ دیگر احکام ہیں۔ بہر حال دنیا کی ایک قدیم دینی کتاب کو ہم آوستا کے نام سے جانتے ہیں لیکن وہ مکمل حالت میں ہم تک نہیں پہنچ سکی ہے۔ یہاں ایک چیز کا میں اشارۃً ذکر کروں گا۔ آوستا میں دوسری باتوں کے علاوہ زردشت کا یہ بیان ملتا ہے: ''میں نے دین کو مکمل نہیں کیا۔ میرے بعد ایک اور نبی آئے گا جو اس کی تکمیل کرے گا۔ اور اس کا نام رحمۃ للعالمین ہو گا۔'' یعنی ساری کائنات کے لیے باعث رحمت۔

ہندوستان میں بھی کچھ دینی کتابیں پائی جاتی ہیں۔ اور ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے الہام شدہ کتابیں ہیں۔ ان مقدس کتابوں میں وید، پران، اپنشد اور دوسری کتابیں شامل ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ سب کتابیں ایک ہی نبی پر نازل ہوئی ہیں۔ ممکن ہے متعدد نبیوں پر نازل ہوئی ہوں، بشرطیکہ وہ نبی ہوں، ان میں بھی خصوصاً "پران" نامی کتابوں میں کچھ دلچسپ اشارے ملتے ہیں "پران" وہی لفظ ہے جو اردو میں "پرانا" یعنی قدیم ہے۔ اس کی طرف ہمیں قرآن مجید میں ایک عجیب وغریب اشارہ ملتا ہے: (وانہ لفی زبر الاولین 26:196) اس چیز کا پرانے لوگوں کی کتابوں میں ذکر ہے)۔ میں نہیں جانتا کہ اس کا پران سے کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ بہرحال دس پران ہیں، ان میں سے ایک میں یہ ذکر آیا ہے کہ "آخری زمانے میں ایک شخص ریگستان کے علاقے میں پیدا ہو گا۔ اس کی ماں کا نام قابل اعتماد، اور باپ کا نام، اللہ کا غلام ہو گا۔ وہ اپنے وطن سے شمال کی طرف جاکر بسنے پر مجبور ہو گا۔ اور پھر وہ اپنے وطن کو متعدد بار دس ہزار آدمیوں کی مدد سے فتح کرے گا۔ جنگ میں اس کی رتھ کو اونٹ کھینچیں گے اور وہ اونٹ اس قدر تیز رفتار ہوں گے کہ آسمان تک پہنچ جائیں گے"۔ اس کتاب میں جو مذکورہ الفاظ ہمیں ملتے ہیں ان سے ممکن ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ مستنبط کیا جاسکے۔

ان پرانی کتابوں کے علاوہ وہ کتابیں ہیں جو مسلمانوں میں بالخصوص معروف ہیں، یعنی توریت، زبور اور انجیل۔ قبل اسکے کہ قرآن مجید کا آپ سے ذکر کروں بطور تمہید ان کا بھی چند الفاظ میں ذکر کروں گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو کتاب نازل ہوئی وہ "توریت" کہی جاتی ہے۔ لیکن دراصل توریت اس کتاب کا ایک جزو ہے، توریت کے معنی ہیں "قانون"۔ یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف پانچ کتابیں منسوب کرتے ہیں، پہلی کتاب "کتاب پیدائش" کہلاتی ہے۔ دوسری کتاب "کتاب خروج" جو مصر سے نکلنے کے حالات پر مشتمل ہے۔ تیسری کتاب "قانون" ہے۔ چوتھی کتاب کا نام "اعداد وشمار ہے" کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم دیا تھا کہ یہودیوں کی قبیلے وار مردم شماری کی جائے۔ پانچویں کتاب "تثنیہ" کے نام سے موسوم ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ پرانی چیزوں کو دوبارہ دہرایا جائے، ان کو up to date کیا جائے یا ان کی تشریح کی جائے۔ شروع شروع میں یہودیوں کے ہاں یہ پانچویں کتاب (تثنیہ) نہیں پائی جاتی تھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوئی چھ سو سال بعد ایک جنگ کے زمانے میں ایک شخص ملک کے اس وقت کے یہودی بادشاہ کے پاس ایک کتاب لایا اور کہا کہ مجھے یہ کتاب ایک غار سے ملی ہے۔ معلوم نہیں کس کی ہے، مگر اس میں دینی احکام نظر آتے ہیں۔ بادشاہان نے اپنے زمانے کی ایک نبیہ عورت کے پاس اس نسخے کو بھیجا (یہودیوں کے ہاں عورتیں بھی نبی رہی ہیں یا کم از کم وہ اس کا دعویٰ کرتے ہیں) اس نبیہ نے جس کا نام ہلدا HULDA بیان کیا جاتا ہے یہ کہلا بھیجا کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کی

کتاب ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چھ سو سال بعد اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کیا جانے لگا۔ اس کتاب کو "تثنیہ" کا نام اس لیے دیا گیا کہ اس میں پہلی چار کتابوں کے احکام میں سے کچھ احکام خلاصے کے طور پر اور کچھ اضافے کے ساتھ دہرائے گئے ہیں۔ بہر حال ان پانچ کتابوں کی سر گزشت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد آنے والے انبیاء کے زمانے میں یہودیوں نے فلسطین کا کچھ حصہ فتح کیا اور وہاں حکومت شروع کی تو کچھ عرصے بعد عراق کے حکمران بخت نصر (نبوکدنوصور) نے فلسطین پر حملہ کیا۔ چونکہ اس کا دین یہودیوں کے دین سے مختلف تھا اس لیے اس نے صرف ملک فتح کرنے پر ہی اکتفانہ کیا بلکہ ان دشمنوں کے دین کو بھی دنیا سے نیست و نابود کرنے کے لیے توریت کے تمام قلمی نسخوں کو جمع کر کے آگ لگا دی۔ حتیٰ کی توریت کا ایک نسختہ بھی باقی نہ رہا۔ یہودی مورخوں کے مطابق اس کے ایک سو سال بعد ان کے ایک نبی "حضرت عزرا Esdra" نے جو (شاید حضرت عزیر علیہ السلام ہوں) یہ کہا کہ مجھے توریت زبانی یاد ہے۔ انہوں نے توریت املا کروائی۔ توریت کے اس اعادے کے کچھ عرصے بعد روما کے ایک حکمران نے فلسطین پر حملہ کیا۔ سپہ سالار کا نام انٹیوکس تھا اس نے بھی وہی کام کیا جو بخت نصر نے کیا تھا۔ یعنی یہودیوں کی کتابیں جمع کر کے جلا دیں۔ اس طرح دوسری مرتبہ وہ نابود کر دی گئیں۔ اس کے کچھ عرصے بعد ایک اور رومی حکمران نے طیطس نامی کمانڈر کی ماتحتی میں ایک فوج بھیجی اور اس نے تیسری مرتبہ، فلسطین میں دستیاب شدہ یہودیوں کی تمام کتابوں کو جلا دیا۔ اب ہمیں توریت کے نام سے جو کتاب ملتی ہے وہ بائبل کے حصہ عہد نامہ عتیق (Old Testament) میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب پانچ کتابیں ہیں۔ یہ کتابیں تین چار مرتبہ کی آتش زدگی کے بعد اعادہ شدہ شکلیں ہیں۔ ان کا اعادہ کس طرح ہوا اور کس نے ان کا اعادہ کیا اس کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں۔ البتہ جو شخص ان کتابوں کو پڑھتا ہے تو اسے دو چیزوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ بعض اوقات اسے ایسی چیزیں نظر آتی ہیں جو کھٹکتی ہیں اور اسے احساس ہوتا ہے کہ یہ اصل میں نہ ہوں گی بلکہ بعد کا اضافہ ہیں۔ بعض مقامات پر کمی محسوس ہوتی ہے اور تشنگی باقی رہتی ہے چنانچہ بعض چیزیں جو زیادہ ہو گئی ہیں وہ اس طرح ہیں کہ جو کتاب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب ہے اس میں وہ باتیں ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد پیش آئیں۔ اگر آپ کتاب "تثنیہ" پڑھیں تو اس کے آخری باب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بیماری، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تدفین اور اس کے بعد کے واقعات کا ذکر ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حصہ بعد کا اضافہ ہے۔ مگر یہ تو ایسی باتیں ہیں جنہیں ہر پڑھنے والا فوراً محسوس کر لیتا ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس میں دیگر کتنی چیزوں کا اضافہ ہوا ہے جو غیر محسوس ہوں۔ اسی طرح جن چیزوں کی کمی نظر آتی ہے یا جن کا وہاں ہونا ضروری تھا مگر نہیں ہیں وہ ایسی ہیں کہ کم از کم بیس مرتبہ اس طرح کے الفاظ ملتے ہیں کہ اس حکم کی تفصیلیں فلاں باب میں ملیں گی۔ جن ابواب کے حوالے دئے گئے ہیں ان میں سے ایک بات کا نام "خدا کی جنگیں" اور ایک اور

باب کا نام " مخلص اور نیک لوگوں کی کتاب " ہے۔ اور وہ باب سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ یہ کچھ باتیں توریت کے متعلق تھیں جو میں نے آپ سے بیان کیں۔ توریت ضخیم صورت میں ہمارے پاس موجود ہے اور دنیا کی بیشتر زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔

توریت کے بعد مسلمانوں میں عام طور پر زبور کا نام لیا جاتا ہے اور ہمارا تصور یہ رہا ہے کہ یہ بھی توریت اور انجیل ہی کی طرح ایک مستقل کتاب ہے۔ لیکن عہد نامہ عتیق (Old Testament) میں جو چیز حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف منسوب ہے اور جس کو وہ سام Psalm یعنی زبور کے نام سے موسوم کرتے ہیں اس میں صرف خدا کی حمد و ثناء کی نظمیں ہیں۔ کوئی نیا حکم نہیں ہے۔ ہمارا یہ تصور ہے کہ ہر نبی ایک نئی شریعت لاتا ہے لیکن اس کتاب میں ایسی کوئی نئی شریعت نہیں ملتی۔ تاہم جس طرح پرانی کتابوں میں (کتاب ادریس سے لے کر ایران کے آوستا تک) ایک آخری نبی علیہ السلام کی بشارت ملتی ہے اس طرح زبور میں بھی ایسی چیزیں ملتی ہیں۔ نیز جو سرگزشت توریت کی رہی وہی زبور کی بھی رہی ہے اس لیے میں اس کو چھوڑ کر اب انجیل کا ذکر کرتا ہوں۔

انجیل کے متعلق مسلمانوں کا تصور عام طور پر یہ ہے کہ وہ ایک مستقل کتاب تھی جو خدا کی طرف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ لیکن ہمارے پاس عیسائیوں کے توسط سے جو انجیل پہنچی ہیں وہ ایک نہیں بلکہ چار انجیلیں ہیں، جو یہ ہیں متی Matthew، مرقس Mark، لوقا Luke، یوحنا John ۔ ہر انجیل ایک الگ آدمی کی طرف منسوب ہے۔ یہ چار کتابیں بھی ساری انجیلیں نہیں ہیں بلکہ خود عیسائی مورخوں کے مطابق ستر سے زیادہ انجیلیں پائی جاتی ہیں جن میں سے ان چار کو قابل اعتماد اور باقی کو مشتبہ قرار دیا گیا ہے ان کو پڑھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے الہام یا وحی پر مشتمل نہیں بلکہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمریاں ہیں۔ چار شخصوں نے یکے بعد دیگرے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمری لکھی اور ہر ایک نے اس کو انجیل کا نام دیا۔ لفظ انجیل کے معنی ہیں "خوشخبری" اور اس کی وجہ تسمیہ غالباً یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جو حالات زندگی انجیل میں ملتے ہیں ان کے مطابق عام طور پر وہ کسی گاؤں میں جایا کرتے تھے اور وہاں کے لوگوں سے کہتے تھے کہ میں بشارت دیتا ہوں کہ خدا کی حکمرانی اب جلد آنے والی ہے۔ شاید اس اساس پر کتاب کا نام بھی یہی ہو گیا لیکن اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر کوئی کتاب نازل ہوئی تھی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسے لکھوایا نہیں اس لیے آج دنیا میں اس کا کوئی وجود نہیں۔ اب جو انجیلیں موجود ہیں، ان کی حقیقت یہ ہے کہ بہت سے لوگوں نے مختلف زمانوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمریاں لکھیں اور ان سوانح عمریوں کو ہر مؤلف نے انجیل کا نام دیا۔ ان میں سے چار کو کلیسا نے قابل اعتماد قرار دیا ہے اور باقی کو رد کیا ہے۔ ان چار انجیلوں کے انتخاب کے متعلق کسی کو کوئی علم نہیں کہ ان کو کس نے انتخاب کیا، کب انتخاب کیا اور کن معیارات کو سامنے رکھ کر انتخاب کیا؟ بہر حال اس بات

پر سب متفق ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی لکھوائی ہوئی کتاب دنیا میں موجود نہیں ہے۔ جو چیز اس وقت ہمارے پاس انجیل کے نام سے ملتی ہے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمریاں ہیں۔ انہیں ہم "سیرت حضرت عیسیٰ علیہ السلام" کہہ سکتے ہیں۔ بعینہٖ جس طرح مسلمانوں کے ہاں سیرت نبوی کی کتابیں پائی جاتی ہیں۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے آپ پر نازل شدہ احکام کو لکھوایا کیوں نہیں تھا؟ میرے ذہن میں جو جواب آتا ہے (ممکن ہے غلط ہو) وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ ان سے پہلے کے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو توریت نازل ہوئی تھی اس کی کیا درگت بنی۔ دشمن حملہ کرتے ہیں اس کی توہین کرتے ہیں اسے جلا دیتے ہیں اور نیست و نابود کر دیتے ہیں۔ غالباً انہوں نے یہ سوچا کہ کہیں میری کتاب کا بھی وہی حشر نہ ہو۔ لہٰذا بہتر ہے کہ اسے لکھوایا ہی نہ جائے۔ اس طرح یہ کتاب لوگوں کے ذہنوں میں رہے گی۔ عبادت گزار نیک لوگ اسے ادب سے یاد رکھیں گے اور اپنے بعد کی نسلوں تک پہنچائیں گے۔ شاید یہی تصور ہو جس کی بنا پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی انجیل کو نہ لکھوایا۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ خدا چونکہ ازلی اور ابدی علم کا مالک ہے اس لیے یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ حضرت آدم کو ایک حکم دے اور بعد کے نبی کو کوئی دوسرا اس کے بالکل برعکس حکم دے۔ البتہ یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ ایک نبی کو کچھ احکام اور بعد کے نبی کو کچھ اور احکام اضافے کے ساتھ دیے جائیں۔ فرض کیجیے کہ حضرت آدم علیہ السلام پر نازل شدہ کتابیں آج دنیا میں صحیح حالت میں موجود ہوتیں تو (میرا تصور یہ ہے کہ) خدا کو کوئی نئی کتاب بھیجنے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی۔ وہی کتاب آج بھی کارآمد ہوتی۔ لیکن جس طرح ابھی ہم نے اس مختصر مطالعے میں دیکھا کہ پرانے انبیاء کی کوئی کتاب بھی بلا استثناء ہم تک من و عن کامل صورت میں نہیں پہنچی ہے اس لیے خدا نے چاہا کہ ایک مرتبہ انسان کو ایسی مکمل کتاب دی جائے جس میں تمام احکام ہوں اور اس کی مشیت یہ بھی ہوئی کہ یہ کتاب محفوظ رہے۔ وہ کتاب قرآن مجید ہے۔

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ قرآن کس طرح محفوظ حالت میں ہم تک پہنچا ہے۔ اولاً میں اس کی زبان کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔ یہ عربی زبان میں ہے۔ اس آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب کے لیے عربی زبان کا انتخاب کیوں ہوا؟ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ زبانیں رفتہ رفتہ بدل جاتی ہیں۔ خود اردو زبان کو لیجیے۔ اب سے پانچ سو سال پہلے کی کتاب مشکل سے ہمیں سمجھ میں آتی ہے۔ دنیا کی ساری زبانوں کا یہی حال ہے انگریزی میں پانچ سو سال پہلے کی مؤلف "چاسیر (Chaucer)" کی کتاب کو آج کل لندن کا

کوئی شخص، یونیورسٹی کے فاضل پروفیسروں کے سوا، سمجھ نہیں سکتا۔ یہی حال دوسری قدیم و جدید زبانوں کا ہے۔ یعنی وہ بدل جاتی ہیں اور رفتہ رفتہ ناقابل فہم ہو جاتی ہیں۔ اگر خدا کا آخری پیغام بھی کسی ایسی ہی تبدیل ہونے والی زبان میں آتا تو خدا کی رحمت کا اقتضاء یہ ہوتا کہ ہم بیسویں صدی کے لوگوں کو پھر ایک نئی کتاب دے تاکہ ہم اسے سمجھ سکیں کیونکہ گزشتہ صدیوں کی کتاب اب تک ناقابل فہم ہو چکی ہوتی۔ دنیا کی زبانوں میں سے اگر کسی زبان کو یہ استثناء ہے کہ وہ نہیں بدلتی تو وہ عربی زبان ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم عصر عربی یعنی قرآن مجید اور حدیث شریف میں جو زبان استعمال ہوئی ہے اور جو عربی آج ریڈیو پر آپ سنتے ہیں یا جو آج عربی اخباروں میں پڑھتے ہیں، ان دونوں میں بہ لحاظ مفہوم الفاظ، گرامر (صرف و نحو)، ہجے اور تلفظ، کوئی فرق نہیں ہے۔ آج رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہوں اور میں ایک عرب کی حیثیت سے اپنی موجودہ عربی میں آپ سے گفتگو کروں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا ہر لفظ سمجھیں گے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے جواب مرحمت فرمائیں تو آپ کا ہر لفظ میں سمجھ سکوں گا۔ کیونکہ ان دونوں زبانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ میں اس سے یہ استنباط کرتا ہوں کہ آخری نبی پر بھیجی ہوئی آخری کتاب ایسی زبان میں ہونی چاہیے جو غیر تبدیل پذیر ہو لہٰذا عربی کا انتخاب کیا گیا، عرض کرنا یہ ہے کہ اس عربی زبان میں دیگر خصوصیات مثلاً فصاحت، بلاغت، ترنم وغیرہ کے علاوہ ایک خصوصیت ایسی ہے جس کا ہم سب مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ وہ یہ کہ عربی زبان غیر تبدیل پذیر ہے اور اس کے لیے ہمیں عربوں کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے مختلف علاقوں کی بولیوں کو اپنی زبان نہیں بنایا۔ بلکہ اپنی علمی اور تحریری زبان وہی رکھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے چلی آرہی تھی۔

جہاں تک قرآن کا تعلق ہے آپ سب واقف ہیں کہ وہ بیک وقت نازل نہیں ہوا۔ جیسا کہ توریت کے متعلق یہودیوں کا بیان کہ اسے خدا نے تختیوں پر لکھ کر ایک ہی مرتبہ دے دیا تھا۔ اس کے برخلاف قرآن مجید تیئس سال تک جستہ جستہ، (نجمًا نجمًا) نازل ہوتا رہا اور یہ ان مختلف زمانوں میں نازل شدہ اجزاء کا مجموعہ ہے جو قرآن مجید کی صورت میں ہمارے پاس ہے۔ اس کا آغاز دسمبر سنہ 609ء میں ہوا جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں معتکف تھے۔ وہاں حضرت جبرئیل علیہ السلام آتے ہیں اور آپ تک خدا کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ وہ پیغام بہت ہی اثر انگیز ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک امی ہیں۔ انہیں لکھنا پڑھنا نہیں آتا۔ اس امی شخص کو جو پہلا حکم دیا گیا وہ ہے "اقراء" یعنی پڑھ اور پھر قلم کی تعریف کی گئی ہے۔ پڑھنے کا حکم دے کر پھر قلم کی تعریف کیوں کی جاتی ہے؟ اس لیے کہ قلم ہی کے ذریعے سے خدا انسان کو وہ چیز بتاتا ہے جو وہ نہیں جانتا دوسرے الفاظ میں قلم ہی وہ چیز ہے جو انسانی تمدن اور انسانی تہذیب کی حفاظت گاہ (Depository) ہے۔ اس کا وجود اس لیے ہے کہ پرانی چیزوں کو محفوظ رکھا جا سکے۔ آنے والے اس میں نئی

چیزوں کا اضافہ کرتے ہیں۔ انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء کا راز یہی ہے اور اسی وجہ سے انسان کو دیگر حیوانات پر تفوق حاصل ہے ورنہ آپ غور کریں گے کہ کوا آج سے بیس لاکھ سال پہلے جس طرح گھونسلا بناتا تھا آج بھی اسی طرح بناتا ہے۔ اس نے کوئی ترقی نہیں کی۔ لیکن انسان وہ جانور ہے جو چاند تک پہنچ چکا ہے۔ اس نے اتنی ترقی کی کہ آج وہ ساری کائنات پر حکومت کر رہا ہے۔ یہ ساری ترقیاں انسان نے اس لیے کی ہیں کہ اس کو اپنے سے پہلے کے لوگوں کے تجربات کا جو علم حاصل ہوا اس کو محفوظ رکھا اور اس میں اس نے اپنے ذاتی تجربوں سے روز افزوں اضافہ کیا اور اس سے استفادہ کرتا رہا۔ اور یہ سب قلم کی بدولت ممکن ہوا۔ آیت (علم بالقلم، علم الانسان مالم یعلم) میں اسی حقیقت کی طرف قرآن مجید نے بہت ہی بلیغ انداز میں اشارہ کیا ہے۔ جب "سورۃ اقراء" (یعنی سورۃ العلق) کی پہلی پانچ آیاتانازل ہوئیں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم غار کو چھوڑ کر گھر واپس آئے اور اپنی بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بتایا کہ مجھے آج یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ وہ شاید کسی دن مجھے نقصان نہ پہنچائے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے تسلی دی اور کہا کہ خدا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ضائع نہیں کرے گا۔ ورقہ بن نوفل میرا چچازاد بھائی ہے جو ان معاملات (یعنی فرشتے، وحی وغیرہ) سے واقف ہے۔ کل صبح جا کر ہم اس سے گفتگو کریں گے، وہ آپ کو بتائے گا۔ میں ان چیزوں سے واقف نہیں ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ شیطان کبھی آپ کو دھوکا نہیں دے سکے گا۔ ایک روایت کے مطابق صبح کو وہ آپ کو اپنے ساتھ ورقہ بن نوفل کے پاس لے جاتی ہیں۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے ان کے عزیز دوست ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان کو یہ قصہ سنایا اور کہا کہ انہیں اپنے ساتھ لے جا کر ورقہ سے ملاؤ۔ ورقہ بن نوفل بہت بوڑھے تھے۔ ان کی بصارت زائل ہو چکی تھی، مذہباً نصرانی تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس پہنچے اور یہ قصہ سنایا تو ورقہ نے بے ساختہ یہ الفاظ کہے: "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو چیزیں تم نے ابھی بیان کی ہیں، اگر وہ صحیح ہیں تو یہ ناموس موسیٰ علیہ السلام سے مشابہ ہیں"۔ "ناموس" کا لفظ اردو میں عام طور پر عزت کے لیے مستعمل ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں یہ مفہوم نہیں ہو سکتا۔ بعض مفسرین ناموس کے معنی "قابل اعتماد" لکھتے ہیں، وہ بھی یہاں موزوں نہیں ہے۔ بعض لکھتے ہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ناموس کا نام دیا جاتا ہے۔ اسلامی ادبیات میں وہ "روح الامین" ہیں مگر یہ معنی بھی یہاں کام نہیں دیتے۔ میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ "ناموس" اصل میں ایک اجنبی لفظ ہے، جو معرب ہو کر عربی زبان میں استعمال ہوا۔ یہ یونانی زبان کا لفظ "ناموس (Nomos) " ہے۔ یونانی زبان میں لفظ توریت کو نوموس یعنی قانون کہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ورقہ بن نوفل کا بیان ہے کہ یہ چیز حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توریت سے مشابہ ہے۔ اور یہی معنی زیادہ قرین قیاس نظر آتے ہیں۔

قرآن مجید کی تبلیغ و اشاعت کے متعلق قدیم ترین ذکر ابن اسحٰق کی کتاب المغازی میں ملتا ہے۔ یہ کتاب ضائع ہو گئی تھی لیکن اس کے بعض ٹکڑے حال ہی میں ملے ہیں اور حکومت مراکش نے ان کو شائع بھی کیا ہے۔ اس میں ڈیڑھ سطر کی ایک بہت دلچسپ روایت ہے، جسے ابن ہشام نے اپنی سیرۃ النبی میں معلوم نہیں کس بناء پر یا سہواً چھوڑ دیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: "جب کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید کی کوئی عبارت نازل ہوتی تو آپ سب سے پہلے اس مردوں کی جماعت میں تلاوت فرماتے پھر اس کے بعد اسی عبارت کو عورتوں کی خصوصی محفل میں بھی سناتے"۔ اسلامی تاریخ میں یہ ایک اہم واقعہ ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عورتوں کی تعلیم سے بھی اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی مردوں کی تعلیم سے۔ یہ قدیم ترین اشارہ ہے جو قرآن مجید کی تبلیغ کے متعلق ملتا ہے۔ اس کے بعد کیا پیش آیا یہ کہنا مشکل ہے لیکن بالکل ابتدائی زمانے ہی سے ہمیں ایک نئی چیز کا پتہ چلتا ہے وہ یہ کہ قرآن مجید کو لکھوایا جائے اور غالباً حفظ کرانا بھی اسی ابتدائی زمانے سے تعلق رکھتا ہے، جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پہلی وحی کے موقع پر قرآن مجید کی سورۂ اقراء کی پہلی پانچ آیتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچائیں تو ایک حدیث کے مطابق حضرت جبرئیل علیہ السلام نے دو کام اور کیے۔ ایک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو استنجاء اور وضو کرنا سکھایا کہ نماز کے لیے کس طرح اپنے آپ کو جسمانی طور پر پاک کریں۔ دوسرے یہ کہ نماز پڑھنے کا طریقہ بھی بتایا۔ خود جبرئیل علیہ السلام امام بنے اور پیغمبر مقتدی کی حیثیت سے پیچھے کھڑے دیکھتے رہے کہ پہلے کھڑے ہوں، پھر رکوع میں جائیں، پھر سجدہ کریں وغیرہ اور ساتھ ساتھ خود بھی وہی کرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ نماز میں قرآن مجید کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں، لہٰذا ابتدائی زمانے ہی سے جب لوگ مسلمان ہونے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا ہو گا کہ قرآن مجید کو حفظ بھی کرو اور روزانہ جتنی نمازیں پڑھنی ہوں ان نمازوں میں ان کا اعادہ بھی کرتے رہو۔ گویا اس وقت ہمیں دو باتیں نظر آتی ہیں۔ قرآن مجید حفظ کرنا اور اسی کو لکھنا۔ آدمی کو کسی نئی چیز کو ازبر کرنے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ اس کے سامنے کوئی تحریری عبارت ہو تو اس کو بار بار پڑھتا ہے بالآخر وہ حفظ ہو جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں قرآن کو حفظ کرنا اور لکھنا دونوں ایک ہی زمانے کی چیزیں ہیں۔ ہمارے مورخ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی آیت نازل ہوتی تو وہ اپنے صحابہ میں سے کسی ایسے شخص کو جسے لکھنا پڑھنا آتا ہوتا، یاد فرماتے اور اس کو املا کراتے تھے۔ اہم بات یہ بیان ہوئی ہے کہ لکھنے کے بعد اس سے کہتے کہ "جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ کر سناؤ" تاکہ اگر کاتب نے کوئی غلطی کی ہو تو اس کی اصلاح کر سکیں۔ یہ قرآن مجید کی تدوین کا آغاز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا کہ لکھوانے کے بعد اپنے صحابہ کو حکم دیتے کہ اسے ازبر کر لو اور روزانہ دو وقت کی نمازوں میں پڑھو۔ اس وقت دو نمازیں تھی معراج کے بعد پانچ نمازیں ہوئیں تو دو کے بجائے پانچ مرتبہ اس کو لوگ نماز میں دہرانے لگے۔ اس کا ایک عملی فائدہ یہ ہے کہ اگر آدمی کا حافظہ اچھا نہ ہو اور سال بھر میں مثلاً صرف عید الاضحیٰ اور عید الفطر کے دن قرآن مجید کو حافظے کی

مدد سے پڑھے تو ممکن ہے کہ اس کو بھول جائے لیکن اگر کوئی آدمی روزانہ پانچ مرتبہ دہراتا ہے تو ظاہر ہے قرآن مجید اس کے حافظے میں رہے گا اور وہ اسے نہیں بھولے گا۔

الغرض قرآن مجید کو لکھنے اور اسے حفظ کرنے کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔ اس سے پہلے کے انبیاء علیہم السلام کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال ہمیں نظر نہیں آتی ہے۔ اس سے بڑھ کر ایک اور کام بھی ہوا وہ یہ کہ فرض کیجئے میرے پاس ایک تحریری نسخہ موجود جس میں کسی نہ کسی وجہ سے کتابت کی کچھ غلطیاں موجود ہیں اس غلط نسخے کو میں حفظ کرلیتا ہوں۔ اس طرح میرا حفظ بھی غلط ہوگا۔ اس کی اصلاح کس طرح کی جائے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرف بھی توجہ فرمائی اور حکم فرمایا کہ ہر مسلمان کو کسی مستند استاد ہی سے قرآن مجید پڑھنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے بڑھ کر قرآن مجید سے کون واقف ہوسکتا ہے؟ اس لیے ہر مسلمان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سیکھنا اور پڑھنا چاہیے۔ اگر اس کے پاس تحریری نسخہ موجود ہے تو اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تلاوت کرنا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر فرمائیں کہ ہاں یہ نسخہ ٹھیک ہے تب اسے حفظ کیا جائے۔ جب مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی تو ظاہر ہے کہ ایک آدمی سارے لوگوں کو تعلیم و تربیت نہیں دے سکتا تھا۔ اس لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند ایسے صحابہ کو جن کی قرآن دانی کے متعلق آپ کو پورا اعتماد تھا یہ حکم دیا کہ اب تم بھی پڑھایا کرو۔ یہ وہ مستند استاد تھے جن کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سند دیتے تھے کہ تم پڑھانے کے قابل ہو اور اس کا سلسلہ آج بھی دنیا میں قائم ہے۔ اگر کوئی شخص کسی استاد سے قرآن مجید پڑھتا ہے تو قرات کی تکمیل کے بعد استاد کی طرف سے اسے جو سند ملتی ہے اس میں وہ استاد لکھتا ہے کہ "میں نے اپنے شاگرد فلاں کو قرآن مجید کے الفاظ، قرآن مجید کی قرات کے اصولوں کو ملحوظ رکھ کر یہ تعلیم دی ہے۔ یہ بالکل وہی ہے جو میرے استاد نے مجھ تک پہنچائی تھی اور اس نے مجھے اطمینان دلایا تھا کہ اس کو اس کے اپنے استاد نے اسی طرح پڑھایا تھا۔ اس کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے اور یہ سلسلہ آج بھی محفوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔

اسلامی روایات (Tradition) کے سوا دنیا کی کسی قوم نے اپنی مذہبی کتاب کو محفوظ کرنے کے لیے یہ اصول کبھی اختیار نہیں کیے تھے۔ یہ چیزیں قرآن مجید کی تدوین کے سلسلے میں عہد نبوی میں ہی پیش آئیں مگر اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ ایک اور چیز کی بھی شروع ہی سے ضرورت تھی۔ قبل اس کے کہ میں اس کا ذکر کرو، قرآن مجید کے تحریری نسخوں کے متعلق بھی کچھ آپ کو بتاتا چلوں کہ ان کا کب سے پتہ چلتا ہے۔ غالباً نبوت کے پانچویں سال کا واقعہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسلام قبول کیا۔ ان کے واقعہ سے آپ واقف ہوں گے۔ وہ اس زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت جانی دشمن تھے۔ ایک دن یہ طے کر کے گھر سے

نکلے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (نعوذ باللہ) قتل کر ڈالوں۔ راستے میں ان کا ایک رشتہ دار ملا جس نے اسلام تو قبول کر لیا تھا لیکن اسے چھپا کر رکھا تھا۔ اس نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ ہتھیار سے لیس ہو کر کہاں جا رہے ہو؟ چونکہ وہ رشتہ دار تھا اس لیے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے بتا دیا کہ میں محمد کو (نعوذ باللہ) قتل کرنے جا رہا ہوں کہ اس نے ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ اس رشتے دار نے کہا اے عمر، اپنے قبیلے کو بنو ہاشم کے قبیلے سے جنگ میں الجھانے سے پہلے اپنے گھر کی خبر لو۔ تمہاری بہن فاطمہ بھی مسلمان ہو چکی ہے اس کا شوہر بھی مسلمان ہو چکا ہے۔ پہلے اپنے گھر کی خبر لو بعد میں دنیا کی اصلاح کرنا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حیران ہوئے اور سیدھے بہن کے گھر پہنچے۔ دروازے کے پاس انہوں نے اندر سے کچھ آواز سنی جیسے کوئی شخص گا رہا ہے یا خوش الحانی سے کچھ پڑھ رہا ہے۔ انہوں نے بہت زور سے دروازہ کھٹکھٹایا، گھر سے ایک شخص نکلا اور یہ اندر پہنچے۔ وہاں بہن اور بہنوئی سے جو سخت کلامی ہوئی اس سے آپ لوگ واقف ہیں۔ میں مختصراً ذکر کر رہا ہوں کہ بالآخر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی بہن کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ جو چیزیں پڑھ رہی تھیں وہ ان کو دکھائیں۔ انہوں نے غسل کرانے کے بعد آپ کو وہ چیز پیش کی۔ یہ قرآن مجید کی چند سورتیں تھیں۔ ان کو پڑھ کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ متاثر ہوئے اور مسلمان ہو گئے۔ اس واقعے سے میں اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن مجید کی کم از کم چند سورتوں کے تحریری صورت میں پائے جانے کا ذکر سنہ ۵ نبوی ہی سے یعنی قبل ہجرت سے ملتا ہے۔ اس کے بعد جس تحریری نسخے کا پتہ چلتا ہے اس کا ذکر بھی دلچسپ ہے۔ یہ غالباً بیعت عقبہ ثانیہ کا واقعہ ہے۔ مدینے سے کچھ لوگ آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے ان میں سے بنی زریق کے ایک شخص کے بارے میں مؤرخین نے صراحت سے لکھا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی اس وقت تک نازل شدہ سورتوں کا مکمل مجموعہ ان کے سپرد کیا۔ یہ صحابی مدینہ منورہ پہنچ کر اپنے قبیلے میں اپنے محلے کی مسجد میں اسے روزانہ با آواز بلند پڑھا کرتے تھے۔ گویا قرآن مجید مدون ہونے یا تحریری صورت میں پائے جانے کا یہ دوسرا واقعہ ہے جس کا مورخوں نے صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

میں یہ بیان کر رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے قرآن کو کسی مستند استاد سے پڑھنا پہلی خصوصیت تھی۔ دوسری خصوصیت تحریری صورت میں محفوظ رکھنا، تا کہ اگر کہیں بھول جائے تو تحریر دیکھ کر اپنے حافظے کو تازہ کر لیا جائے اور تیسری خصوصیت اسے حفظ کرنا تھا۔ ان تین باتوں کا حکم دیا گیا تھا۔ لیکن اس میں ایک پیچیدگی اس طرح پیدا ہو گئی تھی کہ قرآن مجید کامل حالت میں بہ یک وقت نازل نہیں ہوا تھا۔ بلکہ جستہ جستہ 23 سال کے عرصے میں نازل ہوا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو میکانیکی طور پر مدون نہیں کیا کہ پہلی آیت شروع میں ہو اور بعد میں نازل شدہ دوسرے نمبر پر رہے بلکہ اس کی تدوین الہام اور حکمت

نبوی کے تحت ایک اور طرح سے کی گئی۔ قرآن مجید کی اولین نازل شدہ آیتیں جیسا کہ میں نے ابھی آپ سے عرض کیا سورۃ اقراء کی ابتدائی پانچ آیتیں ہیں۔ یہ آیتیں سورہ نمبر 96 میں ہیں۔ جب کہ قرآن مجید کی کل سورتیں 114 ہیں۔ ان میں 96 نمبر پر ابتدائی سورۃ ہے۔ قرآن مجید میں اب جو بالکل ابتدائی سورتیں ملتی ہیں، مثلاً سورہ بقرہ وغیرہ وہ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں۔ دوسرے الفاظ میں قرآن مجید ترتیب کے لحاظ سے مدون نہیں ہوا بلکہ ایک دوسری صورت میں مرتب ہوا۔ اس کی وجہ سے لوگوں کو دشواریاں پیش آسکتی تھیں۔ یعنی آج ایک سورۃ نازل ہوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہدایت دیتے ہیں کہ اس کو فلاں مقام پر لکھو۔ پھر کل ایک آیت نازل ہوئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ اس کو فلاں آیت سے قبل لکھو یا فلاں آیت کے بعد لکھو یا فلاں سورۃ میں لکھو۔ اس لیے ضرورت تھی کہ وقتاً فوقتاً نظر ثانی ہوتی رہے۔ لوگوں کے ذاتی نسخوں کی اصلاح اور نظر ثانی کا ذکر بھی ہجرت کے بعد سے ملتا ہے۔ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان شریف کے مہینے میں دن کے وقت قرآن مجید کو جتنا اس سال تک نازل ہوا تھا باآواز بلند دہرایا کرتے تھے اور ایسے صحابہ جن کو لکھنا پڑھنا آتا تھا وہ اپنا ذاتی نسخہ ساتھ لاتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت پر اس کا مقابلہ کرتے جاتے تاکہ اگر ان سے کسی لفظ کے لکھنے میں یا سورتوں کو صحیح مقام پر درج کرنے میں کوئی غلطی ہوئی ہے تو وہ اس کی اصلاح کرلیں۔ یہ چیز "عرضہ" یا پیشکش کہلاتی تھی۔ مؤرخین مثلاً امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے صراحت کی ہے کہ آخری سال وفات سے چند ماہ پہلے جب رمضان کا مہینہ آیا تو آپ نے پورے کا پورا قرآن مجید لوگوں کو دو مرتبہ سنایا اور یہ بھی کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ میری وفات قریب آگئی ہے کیونکہ قرآن حکیم کے متعلق جبرئیل علیہ السلام نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں دو مرتبہ پڑھ کر سناؤں تاکہ اگر کسی سے غلطیاں ہوئی ہوں تو باقی نہ رہیں۔ یہ تھی تدبیر جو آخری نبی نے آخری پیغام ربانی کی حفاظت کے لیے اختیار فرمائی۔ اس طرح قرآن مجید کے ہم تک قابل اعتماد حالت میں پہنچنے کا اہتمام ہوا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو شروع میں قرآن مجید کی طرف کسی کی توجہ مبذول نہ ہوئی۔ لوگوں کے پاس جو کچھ موجود تھا اس کو نماز میں پڑھا کرتے تھے اور اس کا احترام کرتے تھے لیکن پھر ایسا واقعہ پیش آیا جس نے نہ صرف اسلامی حکومت بلکہ تمام مسلمانوں کو مجبور کردیا کہ وہ قرآن مجید کی طرف فوری توجہ دیں۔ اس زمانے میں قرآن مجید کا کوئی سرکاری نسخہ موجود نہیں تھا اور غالباً کسی ایک شخص کے پاس بھی کامل قرآن مجید لکھا ہوا موجود نہیں تھا۔ یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پیش آیا۔ ہوا یوں کہ ملک میں چند لوگ مرتد ہوگئے اور مسلیمہ کذاب نے نہ صرف ارتداد کیا بلکہ نئے نبی ہونے کا اعلان بھی کردیا۔ وہ چونکہ ایک طاقتور قبیلے کا سردار تھا اس لیے بہت سے لوگ اس کے حامی بھی ہوگئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان

سے جنگ کی۔ یہ جنگ بہت شدید تھی اور اس میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی جب کہ دشمن کی تعداد بہت زیادہ تھی اور جنگ بھی دشمن کے علاقے میں یمامہ کے مقام پر ہوئی۔ میں جب وہاں گیا تھا تو وہاں کے لوگوں نے بتایا کہ یہ جنگ موجود شہر ریاض کے مضافات میں ہوئی تھی۔ اس جنگ میں بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔ ان شہید ہونے والوں میں چند لوگ ایسے بھی تھے جو قرآن مجید کے بہترین حافظ تھے۔ مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ مدینے کے مسلمانوں کو فتح پر خوشی ہوئی لیکن یہ اطلاع پا کر کہ بہت سے برگزیدہ اور بہترین حافظ قرآن مسلمان اس جنگ میں شہید ہوئے ہیں رنج بھی ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اگر قرآن مجید کے تحفظ پر حکومت نے توجہ نہ کی اور حافظ قرآن رفتہ رفتہ آئندہ جنگوں میں شہید ہوتے رہے یا طبعی موت سے اس دنیا سے رخصت ہوتے رہے تو پھر قرآن مجید کے لیے بھی وہی دشواری پیش آئے گی جو پرانے انبیاء علیہ السلام کی کتابوں کے سلسلے میں پیش آئی تھی۔ اس لیے وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آئے اور کہا کہ اے امیر المومنین قرآن کے تحفظ پر توجہ فرمائیے۔ یمامہ کی جنگ میں چھ ہزار مسلمان شہید ہو چکے ہیں جن میں بہت سے حافظ قرآن بھی تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس تجویز پر حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جواب، ان کی سیرت کے ایک خاص پہلو کا مظہر ہے۔ وہ فدائے رسول تھے اور فدائے رسول کا جواب ایسا ہی ہونا چاہیے۔ انہوں نے جواب دیا کہ اے عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ میں کیسے کروں؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بحث کرتے ہیں۔ بالآخر دونوں اس بات پر رضامند ہوئے کہ کسی تیسرے شخص کو حاکم بنائیں اور وہ جو فیصلہ کر دے اس پر عمل کریں۔ چنانچہ انہوں نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا حاکم بنایا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک کاتب وحی تھے۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فوری جواب بھی وہی تھا جو حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تھا کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ ہم کیسے کریں؟ دوبارہ بحث ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا اے زید! اگر لکھیں تو اس میں حرج کیا ہے؟ روایت میں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے الفاظ یہ ہیں کہ واقعی حرج تو مجھے بھی نظر نہیں آتا۔ یہ ایک جذباتی رویہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا تو ہم کیسے کریں؟ لیکن اگر کریں تو اس سے کوئی امر مانع نظر نہیں آتا۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ جب حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا کہ یہ کام میں سر انجام دوں تو مجھے یہ اتنا مشکل معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی تدوین کے مقابلے میں اگر مجھے جبلِ احد کے سر پر اٹھانے کا حکم دیا جاتا تو وہ میرے لیے آسان ہوتا۔

قرآن مجید کی تدوین کے سلسلے میں حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے احکام قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے شہر مدینہ میں ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ جس شخص کے پاس قرآن مجید کا کوئی حصہ تحریری صورت میں موجود ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس "عرضہ" کے موقع پر جو تلاوت ہوتی تھی اس سے کر کے تصحیح شدہ ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھا ہوا نسخہ موجود ہے تو وہ لا کر اس کمیشن کے سامنے پیش کرے۔ کمیشن کے صدر حضرت زید بن ثابت تھے لیکن کئی اور مددگار بھی تھے جن میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی شامل تھے۔ اس کمیشن کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ قرآن مجید کے جو نسخے پیش کیے جائیں قابل اعتماد ہوں، عرضہ میں پیش کیے ہوئے نسخے ہوں۔ اگر کوئی آیت کم سے کم دو تحریری نسخوں میں موجود ہو تو اسے لکھا جائے ورنہ رد کر دی جائے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں اس طرح قرآن مجید کی تدوین ہوئی اور اس کو ایک کاتب وحی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نگرانی میں انجام دیا گیا۔ یہ بات بھی نہ بھلایئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت کم از کم پچیس حافظ موجود تھے جن میں سے کچھ انصار تھے اور کچھ مہاجرین، جنہیں سارا قرآن مجید زبانی یاد تھا۔ ان میں ایک خاتون حافظہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی تھیں۔ خود اس کمیشن کے صدر، زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی حافظ تھے۔ اس لیے انہوں نے جو کچھ لکھا اس میں یقین کے ساتھ لکھا کہ ان کے ذہن میں بھی اسی طرح موجود ہے یہاں ایک اور چھوٹی سی بات کا ذکر کرتا ہوں کہ جب لوگ نسخہ لا کر پیش کرتے تھے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ انہیں حکم دیتے تھے کہ قسم کھا کر بتاؤ کہ یہ نسخہ جو تم پیش کر رہے ہو وہی ہے جس کی تصحیح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوئی ہے۔ وہ قسم کھا کر یقین دلاتے تو پھر اس سے استفادہ کیا جاتا۔ جب پورا قرآن مجید لکھا جا چکا تو حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے اسے شروع سے آخر تک پڑھا۔ اس میں مجھے ایک آیت کم نظر آئی یہ آیت میرے حافظے میں تو موجود تھی مگر کسی تحریری نسخے میں موجود نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے شہر کے چکر لگائے۔ ہر گھر میں داخل ہوا اولاً مہاجرین کے گھروں میں، کسی کے پاس یہ آیت تحریری صورت میں موجود نہیں تھی۔ پھر انصار کے گھروں کو گیا۔ بالآخر ایک شخص کے پاس ایک تحریری نسخہ ملا۔ وہ نسخہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھا ہوا تھا لیکن حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہدایت تھی کہ جب تک دو تحریری نسخے نہ ملیں اس وقت تک اس کو قرآن کے طور پر قبول نہ کیا جائے۔ جبکہ یہ آیت صرف ایک تحریری نسخے میں ملی تھی۔ لیکن یہاں مشیت خداوندی اپنا اثر دکھاتی ہے۔ اتفاق سے یہ وہ شخص تھا جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ اس کے کسی کام سے خوش ہو کر کہا تھا کہ آج سے تمہاری شہادت دو شہادتوں کے مساوی سمجھی جائے گی، ان کا نام خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھا۔ غرض یہ قدرت کی طرف سے پیشگی انتظام تھا۔ اس طرح اس آیت کو

انہوں نے صرف ایک شخص سے لے کر نقل کیا۔ ان کا بیان ہے کہ اس کے بعد میں نے قرآن کو دوبارہ پڑھا تو ایک اور آیت کی بھی کمی نظر آئی۔ ممکن ہے کہ وہ ایک ہی واقعہ ہو اور آیت کے متعلق راویوں میں اختلاف ہو۔ بہر حال وہاں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ اس نام والے ایک شخص نے وہ چیز بیان کی۔ یہ آیتیں جن کا ہمارے پاس صراحت سے ذکر موجود ہے، کہ کون سی آیتیں تھی، فرض کیجئے کہ اگر آج ہم ان کو قرآن مجید سے خارج بھی کر دیں تو کوئی اہم چیز خارج نہیں ہوتی۔ قرآن مجید کی جن آیتوں کی طرف یہ اشارہ ہے ان کا مفہوم دوسری آیتوں میں بھی موجود ہے۔ لیکن بہر حال جس احتیاط سے قرآن مجید کی تدوین عمل میں آئی اس کا مقابلہ تاریخ عالم کی دینی کتابوں میں سے کوئی کتاب بھی نہیں کر سکتی۔

ایک اور نکتہ یہاں بیان کرنا خالی از فائدہ نہ ہو گا اور اسی پر یہ تقریر ختم کرتا ہوں۔ کچھ عرصہ پہلے کا ذکر ہے، جرمنی کے عیسائی پادریوں نے یہ سوچا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں آرامی زبان میں جو انجیل تھی وہ تو اب دنیا میں موجود نہیں۔ اس وقت قدیم ترین انجیل یونانی زبان میں ہے اور یونانی سے ہی ساری زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے ہیں۔ لہٰذا یونانی مخطوطوں کو جمع کیا جائے اور ان کا آپس میں مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ یونی زبان میں انجیل کے نسخے جتنے دنیا میں پائے جاتے تھے کامل ہوں کہ جزوی، ان سب کو جمع کیا گیا اور ان کے ایک ایک لفظ کا باہم مقابلہ (Collation) کیا گیا۔ اس کی جو رپورٹ شائع ہوئی اس کے لفظ یہ ہیں: "کوئی دو لاکھ اختلافی روایات ملتی ہیں" یہ ہے انجیل کا قصہ۔ غالباً اس رپورٹ کی اشاعت سے کچھ لوگوں کو قرآن کے متعلق حسد پیدا ہوا۔ جرمنی ہی میں میونک یونیورسٹی میں ایک ادارہ قائم کیا گیا" قرآن مجید کی تحقیقات کا ادارہ "اس کا مقصد یہ تھا کہ ساری دنیا سے قرآن مجید کے قدیم ترین دستیاب نسخے خرید کر، فوٹو لے کر، جس طرح بھی ممکن ہو جمع کیے جائیں۔ جمع کرنے کا یہ سلسلہ تین نسلوں تک جاری رہا۔ جب میں 1933ء میں پیرس یونیورسٹی میں تھا تو اس کا تیسرا ڈائریکٹر پریتسل Pretzl ، پیرس آیا تھا تاکہ پیرس کی پبلک لائبریری میں قرآن مجید کے جو قدیم نسخے پائے جاتے ہیں ان کے فوٹو حاصل کرے۔ اس پروفیسر نے مجھ سے شخصاً بیان کیا کہ اس وقت (یہ 1933ء کی بات ہے) ہمارے انسٹی ٹیوٹ میں قرآن مجید کے بیالیس ہزار نسخوں کے فوٹو موجود ہیں اور مقابلے (Collation) کا کام جاری ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں اس ادارے کی عمارت پر ایک امریکی بم گرا اور عمارت اس کا کتب خانہ اور عملہ سب کچھ برباد ہو گیا لیکن جنگ کے شروع ہونے سے کچھ ہی پہلے ایک عارضی رپورٹ شائع ہوئی تھی۔ اس رپورٹ کے الفاظ یہ ہیں کہ قرآن مجید کے نسخوں میں مقابلے کا جو کام ہم نے شروع کیا تھا وہ ابھی مکمل تو نہیں ہوا لیکن اب تک جو نتیجہ نکلا ہے وہ یہ ہے کہ ان نسخوں میں کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں تو ملتی ہیں لیکن اختلافاتِ روایت ایک بھی نہیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ کتابت کی جو غلطی ایک نسخے میں ہو گی وہ کسی

دوسرے نسخوں میں نہیں ہو گی۔ مثلاً فرض کیجئے "بسم اللہ الرحیم" میں "الرحمٰن" کا لفظ نہیں لیکن یہ صرف ایک نسخے میں ہے۔ باقی کسی نسخے میں ایسا نہیں ہے۔ سب میں "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" ہے۔ اس کو ہم کاتب کی غلطی قرار دیں گے۔ یا کہیں کوئی لفظ بڑھ گیا ہے مثلاً ایک نسخے میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے باقی نسخوں میں نہیں تو اسے کاتب کی غلطی قرار دیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسی چیزیں کہیں کہیں سہو قلم یعنی کاتب کی غلطی سے ملتی ہیں لیکن اختلاف روایت یعنی ایک ہی فرق کئی نسخوں میں ملے ایسا کہیں نہیں ہے۔ یہ قرآن مجید کی تاریخ کا خلاصہ، جس سے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں خدا کا جو فرمان ہے (انا نحن نزلنا الذکر و نا له لحافظون) "ہم ہی اسے نازل کرتے ہیں اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے" یہ تمام واقعات جو میں نے آپ سے بیان کیے اس آیت کی حرف بحرف تصدیق کرتے ہیں۔

## سوالات وجوابات

برادران کرام:خواہران محترم السلام علیکم

سوالات کی ایک خاصی تعداد جمع ہوئی ہے۔اس سے محسوس ہوتا ہے کہ میری تقریر کو توجہ کے ساتھ سنا گیا ہے۔اسی وجہ سے کئی سوالات ذہنوں میں پیدا ہوئے ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ اپنی بساط کے مطابق ذہن میں جو جواب آئے وہ آپ سے عرض کروں۔ ظاہر ہے کہ ایک گھنٹے کی مختصر تقریر میں ساری باتوں کو بیان کرنا ممکن نہیں تھا۔ جیسا کہ آپ نے دیکھا کہ کسی تحریری چیز کو میں نے نہیں پڑھا بلکہ آپ سے معلومات برجستہ بیان کرتا چلا گیا۔ چنانچہ اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر کچھ باتیں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے کی تدوین قرآن کے بارے میں، آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ دو سوال اس بارے میں بھی آئے ہیں۔

[ فاضل مقرر نے یہ دونوں سوال نہیں سنائے۔ لیکن جواب کی نوعیت سے ظاہر ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ سوال کیا گیا تھا کہ تدوین قرآن کے سلسلے میں ان کی خدمات کیا ہیں اور انہیں جامع القرآن کیوں کہا جاتا ہے ] ۔

**جواب:** حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں جب قرآن مجید کی تحریراً تدوین ہوئی تو مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہ نسخہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں پیش کیا گیا اور ان کی وفات تک ان کے پاس رہا۔ جب ان کی وفات ہوئی تو وہ نسخہ ان کے جانشین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس چلا گیا۔ اور پھر مؤرخین لکھتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کی شہادت واقع ہوئی تو وہ نسخہ ان کی بیٹی ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس چلا گیا۔ امہات المومنین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں سب پڑھی لکھی نہیں تھی۔ بعض کو صرف پڑھنا آتا اور بعض کو پڑھنا لکھنا دونوں آتے تھے۔ جب کہ بعض امی تھیں۔ اس میں کوئی اعتراض کا پہلو نہیں صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا (حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی بیٹی ان معدودے چند عورتوں میں تھیں جن کو پڑھنا لکھنا دونوں آتے تھے۔ بہر حال حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے تیار شدہ

نسخہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کے بعد حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس چلا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جانشین حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غالباً ان کی شخصیت اور وجاہت کی بناء پر، یہ مناسب نہیں سمجھا کہ وہ نسخہ ان سے لے لیں۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود حافظ قرآن تھے۔ ان کے پاس ان کا اپنا نسخہ موجود تھا۔ انہیں ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی کہ وہ اس نسخے کو حاصل کریں۔ لیکن ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس کی بنا پر ضرورت پیش آئی کہ وہ نسخہ دوبارہ خلیفہ وقت کے پاس لایا جائے اور اس سے استفادہ کیا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں غیر معمولی تیز رفتاری سے چہار دانگ عالم میں فتوحات ہوئیں تو بہت سے ایسے لوگ جو دنیا طلب تھے انہیں موقع پرستی کے تحت خیال آیا کہ وہ بھی اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کریں۔ لیکن حقیقت میں وہ مسلمان نہیں تھے بلکہ منافق تھے اور ان کی کوشش تھی کہ اسلام کو اندر سے ٹھیس پہنچائی جائے۔ اس سلسلے میں وہ قرآن مجید پر بھی حملے کرتے رہے۔ ممکن ہے اس کی کوئی اہمیت نہ رہی ہو لیکن ایک واقعے سے سنگین صورتحال پیدا ہوگئی۔ وہ یہ کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں آرمینیا سے جنگ کرنے کے لیے ایک فوج بھیجی گئی۔ آرمینیا کا تصور غالباً آپ کے ذہنوں میں نہیں ہوگا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ شمالی ترکی جہاں آج کل ارض روم شہر ہے اور ایرانی سرحد کا علاقہ ہے۔ اس علاقے میں ارمنی رہتے تھے۔ یہ علاقہ آرمینیا کہلاتا تھا۔ قسطلانی جو بخاری کے شارح ہیں وہ لکھتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک فوج جب ارزن روم کے قریب موجود تھی (یہ ارزن روم اب ارض روم بن گیا ہے) تو اس وقت فوج میں ایک حادثہ پیش آیا۔ وہ یہ تھا کہ امام اور مقتدیوں میں بعض آیتوں کی قرات کے بارے میں جھگڑا ہو گیا۔ امام نے ایک طرح سے عبارت پڑھی اور حاضرین نے کہا یوں نہیں یوں ہے۔ ایک نے کہا ہمیں فلاں استاد فلاں صحابی نے پڑھایا ہے۔ دونوں اپنی اپنی باتوں پر اڑے رہے۔ قریب تھا کہ تلواریں چلیں اور خوں ریزی ہو کہ فوج کے کمانڈر انچیف نے حسن تدبیر سے اس فتنے کی آگ کو ٹھنڈا کیا۔ جب وہ فوج مدینہ منورہ واپس آئی تو کمانڈر انچیف حذیمہ بن یمان اپنے گھر میں بچوں کی خیریت پوچھنے سے پہلے سیدھے خلیفہ کے پاس پہنچتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یا امیر المومنین امت محمد کی خبر لیجئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا کہ کیا واقعہ پیش آیا؟ تو انہوں نے یہ قصہ سنایا۔ اس پر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فوراً فیصلہ کیا۔ ان میں ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ کوئی کام ان کے ذہن میں آتا اور فیصلہ کر لیتے تو فوراً اس کی تعمیل بھی کراتے۔ جیسے ہی یہ صورتحال سامنے لائی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ اس کی اصلاح ہونی چاہیے۔ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس ایک آدمی بھیجا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے تیار شدہ جو نسخہ آپ کے پاس ہے وہ مجھے مستعار دیجئے۔ استفادہ کرنے کے بعد میں

آپ کو واپس کر دوں گا۔ وہ نسخہ ان کے پاس آیا تو انہوں نے اسے دوبارہ پرانے کاتب وحی زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے سپرد کیا کہ اس کی نقلیں تیار کرو، اور ان نقلوں کا مقابلہ کر کے اگر ان میں کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہوں تو ان کی اصلاح کرو۔ قرآن مجید چونکہ عربی زبان کی پہلی کتاب ہے اس لیے ابتدائی زمانے میں عربی خط میں کچھ خامیاں ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ بھی ہدایت کہ اگر تلفظ کی ضرورت کے لحاظ سے املا میں کچھ ترمیم کی ضرورت محسوس ہو تو ضرور کرو۔ یہ نکتہ بھی سمجھایا کہ عربی زبان مختلف علاقوں میں کچھ فرق بھی رکھتی ہے۔ قبیلہ نجد کے لوگ ایک لفظ کو ایک طریقے ادا کرتے ہیں مدینے کے لوگ دوسرے طریقے سے، فلاں جگہ کے لوگ تیسرے طریقے سے۔ اس لیے اگر کسی لفظ کے تلفظ میں اختلاف پایا جاتا ہے تو قرآن مجید کو مکہ معظمہ کے تلفظ کے مطابق لکھو۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے چند مددگاروں کے تعاون سے دوبارہ اس پرانے نسخے کو سامنے رکھ کر نقل کرنا شروع کرتے ہیں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر کسی مسئلے میں اختلاف ہو تو مسئلہ میرے پاس بھیجو، میں خود اس کا فیصلہ کروں گا۔ بد قسمتی سے یہ واقعہ جو ارض روم میں پیش آیا تھا کہ فلاں آیت کے متعلق یا فلاں لفظ کے متعلق فوج میں جھگڑا ہوا، اس کی کوئی تفصیل نہیں ملتی، شاید اس جھگڑے کی بنیاد قبائلی بولیوں اور لہجوں کا اختلاف ہو۔ اس قسم کی ایک مثال مجھے یاد آتی ہے۔ قرآن مجید میں "تابوت" کا لفظ آیا ہے، جس کے معنی صندوق کے ہوتے ہیں۔ اس کا تلفظ مدینہ منورہ کی بولی (Dialect) میں "تابوہ" ہوتا تھا۔ آخر میں "ۃ" کے ساتھ جب کہ مکے کے لوگ "تابوت" کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اس پر کمیشن کے ارکان متفق نہیں ہو سکے۔ یہ اختلافی مسئلہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے پیش ہوا تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ تابوت بڑی ت کے ساتھ لکھو، یہ کوئی بڑی اہمیت کی بات نہیں، لیکن میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جو کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں قرآن مجید کی تدوین ہوئی اس کی حقیقت کیا ہے؟ حقیقت صرف اس قدر ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں قرآن مجید کی نقلیں تیار کی گئیں۔ املا میں کہیں کہیں ترمیم کی گئی۔ لفظ کی آواز کو نہیں بدلا گیا۔ لیکن اس آواز کی املا میں کچھ فرق کیا گیا۔ اس کے بعد اس کے چار نسخے یا ایک روایت کے مطابق سات نسخے تیار کیے گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں علمی دیانت داری کا جو معیار تھا اس کے تحت انہوں نے حکم دیا کہ ان ساتوں نسخوں کو ایک ایک کر کے، مسجد نبوی میں ایک شخص با آواز بلند شروع سے لے کر آخرت تک پڑھے تا کہ کسی شخص کو بھی یہ شبہ نہ رہے کہ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرآن میں کہیں کوئی تبدیلی کی ہے۔ جب یہ سارے نسخے اس طرح پڑھے گئے اور سب کو اطمینان ہو گیا کہ یہ نسخے صحیح ہیں تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی وسیع سلطنت کے مختلف صوبوں کے صدر مقاموں پر وہ نسخے بھیجے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے کی اسلامی سلطنت کی وسعت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ 27 ہجری یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے صرف پندرہ سال بعد،

اسلامی فوج ایک طرف اسپین میں اور دوسری طرف دریائے جیحوں کو عبور کر کے ماوراء النہر (چین) میں داخل ہو گئی تھی۔ یورپ، ایشیا اور افریقہ، اسلامی سلطنت ان سب براعظموں میں پھیل گئی تھی اس کے بڑے بڑے صوبوں میں قرآن مجید کے یہ نسخے بھیجے گئے اور یہ حکم دیا گیا کہ آئندہ صرف انہیں سرکاری مستند نسخوں سے مزید نقلیں لی جایا کریں۔ اس بات کی تاکید بھی کی گئی کہ اگر کسی کے پاس کوئی نسخہ اس کے خلاف پایا جائے تو اسے تلف کر دیا جائے۔ اس حکم کی تعمیل کس حد تک ہوئی، اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ عملاً یہ ناممکن بھی تھا کہ تین براعظموں کے ہر ہر مسلمان کے گھر میں پولیس جائے اور قرآن مجید کا شروع سے لے کر آخر تک سرکاری نسخے سے مقابلہ کرے۔ اور پھر اس میں کوئی اختلاف نظر آئے تو اسے تلف کر دے۔ تاریخی طور پر ایسے کسی واقعے کا ذکر بھی نہیں ملتا لیکن بہر حال حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے سے آج تک قرآن مجید کے جو نسخے ہمارے پاس نسلاً بعد نسلاً چلے آ رہے ہیں، وہ پہلی صدی ہجری سے لے کر آج تک وہی ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو چار یا سات قلمی نسخے مختلف مقامات پر بھیجے ان میں سے کچھ اب تک محفوظ سمجھے جاتے ہیں۔ ثبوت کوئی نہیں، لیکن یہ روایت ہے کہ یہ انہی نسخوں میں سے ہیں۔ ایک نسخہ آج کل روس کے شہر تاشقند میں ہے وہاں کیسے پہنچا اس کا قصہ یہ ہے کہ یہ نسخہ پہلے دمشق میں پایا جاتا تھا جو بنی امیہ کا صدر مقام تھا۔ جب دمشق کو تیمور لنگ نے فتح کیا تو وہاں کے مال غنیمت میں سب سے زیادہ قیمتی چیز کے طور پر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قرآن مجید پایا۔ اسے لیا اور اپنے ساتھ پایہ تخت سمرقند لایا اور وہاں اسے محفوظ رکھا۔ یہ نسخہ سمرقند میں رہا تا آنکہ گزشتہ صدی میں روسیوں نے سمرقند کو فتح کر لیا۔ فتح کرنے کے بعد اس نسخے کو جس کی بڑی شہرت تھی روسی کمانڈر انچیف نے وہاں سے لے کر سینٹ پیٹرس برگ منتقل کر دیا جو آج کل لینن گراڈ کہلاتا ہے۔ روسی مؤرخ بیان کرتے ہیں کہ اس نسخے کو سمرقند کے حاکم نے روسی کمانڈر انچیف کے ہاتھ 25 یا 50 روپے میں فروخت کر دیا تھا، ہم نے اسے چرایا نہیں بلکہ خرید کر لائے ہیں۔ بہر حال پہلی جنگ عظیم کے اختتام تک وہ نسخہ لینن گراڈ میں رہا اس کے بعد جیسا کہ آپ کو معلوم ہے زار کی حکومت ختم ہو گئی اور کمیونسٹوں نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت بہت سے روسی باشندے جو کمیونسٹ حکومت کے ماتحت رہنا نہیں چاہتے تھے روس چھوڑ کر دنیا میں تتر بتر ہو گئے۔ ان میں سے ایک صاحب پیرس بھی آئے جو جنرل علی اکبر توپچی باشی کے نام سے مشہور تھے۔ میں خود ان سے مل چکا ہوں، انہوں نے اس کا قصہ مجھے سنایا۔ کہنے لگے کہ جب زار کو قتل کیا گیا اس وقت میں فوج میں ایک بڑے افسر کی حیثیت سے سینٹ پیٹرس برگ ہی میں موجود تھا۔ میں نے ایک کمانڈر (فوجی دستہ) بھیجا کہ جا کر شاہی محل پر قبضہ کرو اور شاہی کتب خانے میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جو قرآن مجید کا نسخہ ہے اسے تلاش کر کے لے آؤ۔ کمانڈر گیا اور وہ قرآن مجید لے آیا۔ انہوں نے ایک فوجی جنرل کی حیثیت سے ریلوے اسٹیشن جا کر وہاں کے اسٹیشن ماسٹر سے کہا کہ مجھے ایک ریل کا انجن درکار ہے۔ اس انجن میں اس قرآن کو رکھا اور اپنے آدمیوں کی نگرانی میں انجن ڈرائیور کو

حکم دیا کہ جس قدر تیزی سے جاسکتے ہو اس انجن کو ترکستان لے جاؤ۔ اس کی اطلاع کمیونسٹ فوجی کمانڈروں کو چند گھنٹے بعد ملی۔ چنانچہ اس کے تعاقب میں دوسرا انجن اور کچھ افسر روانہ کیے گئے لیکن وہ انجن ان کے ہاتھ سے باہر نکل چکا تھا اور اس طرح یہ نسخہ تاشقند پہنچ گیا۔ جب کمیونسٹ دور میں تاشقند پر روسیوں نے دوبارہ قبضہ کر لیا تو اس نسخے کو وہاں سے لینن گراڈ منتقل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ چنانچہ وہ نسخہ اب تک تاشقند میں محفوظ ہے۔ زار کے زمانے میں اس قرآن مجید کا فوٹو لے کر ایک گز لمبی تقطیع پر کل پچاس نسخے چھاپے گئے تھے۔ ان میں سے چند نسخے میرے علم میں ہیں اور وہ دنیا میں محفوظ ہیں۔ ایک امریکہ میں ہے۔ ایک انگلستان میں ہے۔ ایک نسخہ میں نے کابل میں دیکھا تھا۔ ایک مصر کے کتب خانے میں پایا جاتا ہے۔ میرے پاس اس کا مائیکرو فلم بھی ہے۔ یہ ایک نسخہ ہے۔ دوسرا نسخہ استنبول میں توپ قاپی سرائے میوزیم میں موجود ہے جس کو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ اس میں سورۂ بقرہ کی آیت (فسیکفیکھم اللہ) پر سرخ دھبے پائے جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خون ہے۔ کیونکہ وہ جس وقت تلاوت کر رہے تھے اس وقت انہیں شہید کر دیا گیا تھا۔ تیسرا نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں ہے۔ اس کا فوٹو میرے پاس ہے۔ اس پر سرکاری مہریں ہیں اور لکھا ہے کہ یہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نسخہ قرآن ہے۔ ان نسخوں کے خط اور تقطیع میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخے ایک دوسرے کے ہم عصر ہیں۔ یہ نسخے جھلی پر لکھے گئے ہیں، کاغذ پر نہیں ہیں۔ ممکن ہے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نسخے ہوں یا اس زمانے میں یا اس کے کچھ ہی عرصہ بعد کے لکھوائے ہوئے نسخے ہوں۔ بہر حال یہ بات ہمارے لیے قابل فخر اور باعث اطمینان ہے کہ ان نسخوں میں اور موجودہ مستعملہ نسخوں میں، باہم کہیں بھی، کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جامع القرآن کہا جاتا ہے اس کے معنی یہ نہیں کہ انہوں نے قرآن کو جمع کیا۔ اس کی تاویل ہمارے مورخوں نے یہ کی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو ایک ہی قرآن پر جمع کیا۔ جو اختلاف بولیوں میں پایا جاتا تھا اس سے ان کو بچانے کے لیے مکہ معظمہ کے تلفظ والے قرآن کو انہوں نے نافذ کیا اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر یہ اجازت دی تھی کہ مختلف قبائل کے لوگ مختلف الفاظ کو مختلف انداز میں پڑھ سکتے ہیں تو اب اس کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ مکہ معظمہ کی عربی اب ساری دنیائے اسلام میں نافذ اور رائج ہو چکی ہے۔ اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسلمانوں کو ایک قرآن مجید پر جمع کیا۔ خدا ان کی روح پر اپنی برکات نازل فرمائے۔

## سوال ۲ مع جواب:

میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بعد میں دوسرے سوالوں پر توجہ کر سکتا ہو۔ ایک سوال حروف مقطعات کے متعلق ہے۔ یعنی قرآن مجید میں بعض جگہ الفاظ نہیں ہیں بلکہ حروف ہیں مثلاً الم، حم، عسق، وغیرہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان الفاظ کی کبھی تشریح نہیں فرمائی۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تشریح فرمادی ہوتی تو بعد میں کسی کو جرات نہ ہوتی کہ اس کے خلاف کوئی رائے دے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ کم از کم ساٹھ ستر آراء پائی جاتی ہیں۔ الف صاحب یہ بیان کرتے ہیں۔ ب صاحب وہ بیان کرتے ہیں اور یہ چودہ سو سال سے چلا آرہا ہے۔ اس کا قصہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ آج بھی لوگ نئی نئی رائے دے رہے ہیں۔ لطیفے کے طور پر میں عرض کرتا ہوں۔ 1933ء کی بات ہے۔ میں پیرس یونیورسٹی میں تھا، تو ایک عیسائی ہم جماعت نے ایک دن مجھ سے کہا کہ مسلمان ابھی تک حروف مقطعات کو نہیں سمجھ سکے۔ میں بتاتا ہوں کہ یہ کیا چیز ہے؟ وہ موسیقی کا ماہر تھا، کہنے لگا کہ یہ گانے کی جو لے اور دھن وغیرہ ہوتی ہے ان کی طرف اشارہ ہے۔ کہنے کا منشا یہ ہے کہ لوگ حروف مقطعات کو جاننے کی کوشش کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ اپنی حد تک میں کہہ سکتا ہوں مجھے اس کے متعلق کوئی علم نہیں ہے۔ سوائے ایک چیز کے اور وہ یہ ہے کہ ایک حدیث میں کچھ اشارہ ملتا ہے کہ ایک دن کچھ یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور پوچھا کہ تمہارا دین کب تک رہے گا؟ کم و بیش اسی مفہوم کے الفاظ انہوں نے ادا کیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا؟ "الم" تو انہوں نے کہا اچھا تمہارا دین الف (۱) ل (۳۰) اور م (۴۰) یعنی اکہتر سال رہے گا الحمد للہ اکہتر سال بعد تمہارا دین ختم ہو جائے گا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھ پر "الر" اور "المر" بھی نازل ہوا ہے۔ انہوں نے کہا الر ۲۳۱ سال المر ۲۷۱ سال۔ پھر آپ نے فرمایا کہ مجھ پر فلاں فلاں لفظ بھی نازل ہوا ہے مثلاً لحم عسق وغیرہ۔ یہاں تک کہ یہودیوں نے کہا کہ ہمیں کچھ سمجھ نہیں آتا اور چلے گئے ہو سکتا ہے کہ انہیں پریشان کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا جواب دیا ہو۔ لیکن اس میں اس بات کی طرف اشارہ بھی ملتا ہے کہ حروف کی گویا عددی قیمت ہے۔ جس طرح لوگ واقف ہیں کہ الف کے ایک، ب کے دو، ج کے تین اور د کے چار عدد مقرر ہیں اسی طرح عربی زبان میں اٹھائیس حروف ہیں۔ ان سے بہت ہی مکمل طریقے سے ایک ہزار تک لکھ سکتے ہیں تاکہ ہندسہ لکھنے میں اگر کوئی غلط فہمی پیدا ہو تو حروف کے ذریعے اسے دور کیا جا سکے۔ میں نے سنا ہے کہ سنسکرت میں بھی یہ طریقہ موجود ہے لیکن سنسکرت میں حروف تہجی ۲۸ سے کہیں زیادہ ہیں اور اس میں ایک سو مہا سنکھ تک لکھ سکتے ہیں۔ بہر حال ایک ہزار ہماری ضرورتوں کے لیے کافی ہے۔ یہ تھا حروف مقطعات کے متعلق میری معلومات کا خلاصہ۔ میں معذرت چاہتا ہوں کہ اس سے زیادہ میں آپ کو کوئی معلومات فراہم نہیں کر سکتا۔

**سوال ۳:** ایک اور سوال ہے۔ اچھا ہوتا اگر وہ نہ کیا جاتا۔ سوال یہ ہے کہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کو یہ بات مان لینی چاہیے کہ قرآن مجید حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف ہے اس میں مسلمانوں کے لیے زیادہ فخر کی بات ہے وہ یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک پڑھے لکھے انسان تھے۔

**جواب:** جیسا کہ میں نے عرض کیا اگر یہ سوال نہ کیا جاتا تو بہتر تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر پڑھے لکھے ہوتے تو کیا آپ کی عزت بڑھ جاتی؟ یا امی تھے تو کیا آپ کی عزت گھٹ گئی؟ باقی خود قرآن کریم کہتا ہے کہ میں کسی انسان کی تصنیف نہیں ہوں، میں خدا کا کلام ہوں۔ فرشتے اس کے شاہد ہیں۔ خدا شہادت دیتا ہے کہ خدا کا کلام ہے (لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ علا من خلفہ ۴۱:۴۲) خود رسول بھی اس میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتا اور نہ ہی ترمیم کر سکتا ہے۔ قرآن نے ایک چیلنج بھی دیا ہے جو میری دانست میں اس کے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت ہے۔ وہ چیلنج یہ ہے کہ قرآن جیسی ایک سورت یعنی کم از کم تین آیتیں لکھنے کی کوشش کرو۔ دنیا کے سارے انسانوں، سارے جنات کی مدد سے بھی تم نہیں لکھ سکو گے۔ یہ قرآن کا چیلنج تھا۔ اس قرآن کے چیلنج کو آج چودہ سو سال کے بعد بھی کسی نے کوئی ایسا جواب نہیں دیا، جسے لوگ قبول کر سکیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان حالات میں یہ کہنا کہ اگر قرآن مجید کسی انسان کی تصنیف ہو تو اس کی عزت بڑھ جائے گی، میرے نزدیک کوئی یقینی بات نہیں۔ شخصی طور پر مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔

**سوال ۴:** ایک اور سوال ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر کوئی آیت قرآن مجید سے نکال لی جائے تو کوئی حرج واقع نہیں ہو گا کہ اس قسم کی دوسری آیات موجود ہیں۔ جس سے اس کا مفہوم ادا ہو سکتا ہے۔ اس کمی بیشی کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی؟

**جواب:** اپنے مفہوم کو میں نے شاید ٹھیک طرح سے ادا نہیں کیا یا شاید آپ نے اس کو پوری طرح سمجھا نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ قرآن مجید کی کچھ آیتیں نکال لی جائیں۔ میں نے صرف یہ کہا تھا کہ قرآن مجید کی جن دو آیتوں کے متعلق یہ روایت آتی ہے کہ وہ دونوں تحریری صورتوں میں نہیں ملیں، ان میں حقیقتاً کوئی ایسی اہم بات نہیں ہے کہ اگر وہ اتفاقاً نکل بھی جائیں تو اس سے قرآن مجید کی تعلیم متاثر ہو۔ مثلاً صرف ایک آیت میں یہ ذکر ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ فرض کیجئے یہ آیت نہ رہے تو اس کا امکان تھا کہ اسلام صحیح صورت میں باقی نہ رہ سکے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جن آیتوں کی طرف مذکورہ روایت میں اشارہ ہوا ہے ان میں ایسی کوئی چیز نہیں مثلاً یہ عبارت کہ (لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمومنین رؤف رحیم۔ فان تولوا فقل حسبی اللہ لا الہ الا ھو علیہ توکلت وھو رب العرش العظیم ۱۲۸:۱۹ تا ۱۲۹) اس میں یہ ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم ایک ایسے نبی ہیں جن کو اپنی امت کے ساتھ بڑی شفقت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کی چیز تو ہے لیکن اس میں کوئی ایسی بات نہیں کہ یہ عبارت نہ ہوتی تو اسلام باقی نہ رہ سکے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہر گز نہیں تھا کہ قرآن مجید کی آیتوں کے حذف کرنے کا امکان پایا جاتا ہے۔ ویسے میں آپ سے عرض کروں گا کہ قرآن کی بعض آیتیں مکرر ہیں۔ ایک ہی آیت بار بار آتی ہے۔ فرض کیجئے کہ ان میں سے ایک حذف کر دی جائے تو ظاہر ہے کہ قرآن کی تعلیمات میں کوئی کمی واقع نہیں ہو گی۔ مثلاً سورۂ رحمان میں فبای الاء ربکما تکذبان کوئی پندرہ بیس مرتبہ آیا ہے۔ ان میں سے اگر ایک جگہ حذف کر کے دو آیتوں کو ایک آیت بنا دیا جائے تو قرآن مجید میں جو چیزیں انسان کی تعلیم کے لیے آئی ہیں ان میں عملاً کوئی کمی نہیں آئے گی۔ یہ نہیں کہ اس کا امکان ہے یا یہ مناسب ہے۔ میں یہ بالکل نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ قرآن مجید کی جس آیت کے متعلق حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تلاش کی ضرورت پیش آئی تھی اس میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اسلام کی تعلیم پر موثر ہو۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں اور آیتیں بھی موجود ہیں۔ یہ تو دراصل نمونہ ہے اس بات کا کہ قرآن کی تدوین میں کتنی عرق ریزی کی گئی ہے۔ یہ تھا میرا منشا۔

**سوال۵: خواتین کے مبعوث ہونے کے متعلق اپنی تحقیق سے مطلع فرمائیں تو ممنون ہوں گا۔**

**جواب:** قرآن مجید میں ایک آیت ہے کہ خدا نے مردوں کو نبی بنا کر بھیجا ہے۔ اور عورت کو نبی بنا کر بھیجنے کا اس میں کوئی ذکر نہیں ہے لیکن جیسا کہ میں نے اپنی تقریر میں ابھی ذکر کیا تھا کہ یہودیوں کے ہاں عورت کے نبی ہونے کا بھی پتہ چلتا ہے۔ خدا کا بیان تو یہ ہے کہ ہم نے کسی عورت کو نبی بنا کر نہیں بھیجا لیکن یہودی کہتے ہیں کہ نہیں، ہمارے ہاں نبیہ عورت ہوئی تھی تو اس کا فیصلہ خدا ہی کرے گا۔ میرے لیے یہ مشکل ہے کہ میں اس کا فیصلہ کروں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ میری بہنیں جو یہاں موجود ہیں، الحمد اللہ سب دیندار اور مسلمان ہیں اور کوئی بھی نبوت کے منصب کی امیدوار نہیں ہے۔

**سوال۶: انجیل برناباس کی صحت کے متعلق آپ کی کیا تحقیق ہے؟**

**جواب:** میں سمجھتا ہوں کہ قرآن مجید کی تاریخ میں انجیل برناباس کی کم ضرورت ہے۔ قصہ یہ ہے کہ برناباس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں دین قبول کرنے والوں میں سے ایک تھے۔ اور ایک زمانے میں ان کی بڑی اہمیت تھی۔ سینٹ پال کا نام آپ نے سنا ہو گا۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ان کا دشمن رہا، عیسائیوں کو تکلیف دیتا رہا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس دنیا سے سفر کر جانے

کے بعد ایک دن اس نے کہا کہ مجھے کشف ہوا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دین سچا تھا۔ اس دن سے وہ عیسائی بنا۔ مگر لوگوں کو اس پر اعتبار نہیں تھا۔ اکثر لوگ کہتے تھے کہ یہ منافق ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں جب یہ ہم کو تکلیفیں دیتا رہا تو اب ہم کیسے یقین کر لیں کہ وہ حقیقتاً کایا پلٹ ہو کر دین دار ہو گیا ہے۔

برناباس، جن کو میں رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہہ سکتا ہوں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں سے تھے۔ انہوں نے کہا نہیں مجھے اطمینان ہے کہ یہ پال پکا اور سچا دین دار ہے۔ اس کے کچھ عرصے بعد شہر بیت المقدس میں ایک اجتماع ہوا۔ جہاں اس بات پر بحث ہو رہی تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جو قول ہے کہ میں "توریت کے ایک شوشے کو بھی تبدیل کرنے نہیں آیا ہوں آیا اس کی من و عن تعمیل کی جانی چاہیے؟، اس قانون کو ہم برقرار رکھیں گے یا لوگوں کو اپنے دین کی طرف مائل کرنے کے لیے اس میں کچھ نرمی کریں"۔ یہ یروشلم کونسل کہلاتی ہے۔ وہاں سینٹ پال کا اصرار تھا کہ اس کو باقی نہ رکھا جائے بلکہ توریت کے سخت احکامات کر نرم کر دیا جائے۔ برناباس نے اس کی مخالفت کی تھی اور اس وقت شدت سے کہا تھا کہ یہ شخص منافق معلوم ہوتا ہے لیکن عیسائیوں نے برناباس کی تازہ ترین شہادت کو قبول نہیں کیا۔ برناباس کو کونسل سے نکال دیا اور سینٹ پال کی بات کو قبول کر لیا۔ عہد نامہ جدید کے ایک باب میں صراحت سے لکھا ہے کہ ہم لوگوں کو روح القدس کی طرف سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اب تم پر پرانے احکام باقی نہیں رہے، سوائے چار چیزوں کے۔ ایک تو یہ کہ خدا کو ایک مانیں، دوسرے یہ کہ اگر کسی بت پر جانور کو ذبح کیا گیا ہو تو اسے نہ کھائیں، تیسرے یہ کہ فحش کاری نہ کریں۔ اسی طرح ایک اور چیز کا بہ صراحت ذکر ہے۔ اس کے علاوہ باقی جتنی پابندیاں اور ممانعتیں تھیں اب وہ تم پر باقی نہیں رہیں۔ چنانچہ اب لوگ، عیسائی دنیا میں سینٹ پال کی اس رائے پر عمل کرتے ہیں اور خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے الفاظ کہ "میں توریت کا ایک شوشہ بھی تبدیل کرنے نہیں آیا ہوں اس کی من و عن تعمیل ہونی چاہیے" اس پر عمل نہیں کرتے۔

انجیل برناباس، جس کے متعلق سوال کیا گیا ہے، زمانہ حال کی دستیاب شدہ ایک چیز ہے۔ اس کا کوئی پرانا نسخہ نہیں ملا۔ اور وہ برناباس کی مادری زبان آرامی زبان میں بھی نہیں ہے۔ بلکہ اطالوی زبان میں ہے اور اس کے قلمی نسخے کے حاشیے پر جابجا عربی الفاظ بھی لکھے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں عیسائی محققین کا خیال ہے بلکہ اصرار ہے کہ یہ مسلمانوں کی تالیف کردہ جعلی انجیل ہے اور یہ حضرت برناباس کی انجیل نہیں ہے۔ مجھے اس کے متعلق کوئی علم نہیں ہے البتہ اس حد تک جانتا ہوں کہ انجیل برناباس کے دو نسخے ایک زمانے میں ملتے تھے۔ ایک وہ جو آسٹریا میں تھا اور جو غالباً اب بھی محفوظ ہے۔ غالباً میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے ٹھیک علم نہیں ہے۔ دوسرا وہ نسخہ جو اسپین میں تھا۔ جب آسٹریا کا نسخہ انگریزی ترجمے کے ساتھ شائع کیا گیا تو اسپین کا نسخہ یکایک غائب ہو گیا۔ غالباً اسے ضائع کر دیا

گیا بہر حال یہ مختصر سے حالات ہیں، مجھے شخصی طور پر انجیل برناباس کے متعلق معلومات نہیں ہیں۔ سوائے اس کے کہ اس میں جا بجا ایسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو اسلامی عقائد سے زیادہ مطابقت رکھتے ہیں اور عیسائیوں کے جو عام عقائد ہیں اس سے بہت کچھ اختلاف رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں اور کچھ نہیں جانتا۔ اس کو میں شخصی طور پر کوئی زیادہ اہمیت بھی نہیں دیتا کیونکہ میرے مطالعے کا جو موضوع ہے وہ اس سے ذرا ہٹا ہوا ہے۔ مجھے اس سے زیادہ کوئی واقفیت نہیں ہے۔ ادب سے معافی چاہتا ہوں۔

**سوال۷:** حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے کون سے سال میں قرآن کا پہلا نسخہ مدون ہوا۔ یہ کون سا ہجری سال تھا؟

**جواب:** یہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلیفہ بننے کے چند مہینے بعد ہی کا واقعہ ہے۔ یہ ۱۱ھ کے اواخر کا زمانہ ہو گا۔ یعنی مسلیمہ کذاب سے جو جنگ ہوئی تھی اس جنگ کے فوراً بعد کا ذکر ہے۔

**سوال۸:** احادیث مبارکہ میں مختلف آیات کی شان نزول کے متعلق جو بعض اوقات متعارض روایات ملتی ہیں، ان کو کس طرح حل کیا جائے؟

**جواب:** غالباً صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ شان نزول کے متعلق ہی نہیں اور چیزوں کے متعلق بھی اگر احادیث میں اختلاف پایا جاتا ہے تو جس طرح ہم ان کو حل کرتے ہیں اسی طرح اس کو بھی حل کیا جا سکے گا۔ اولاً ہم دیکھیں گے کہ یہ روایت صحیح ہے یا وہ روایت صحیح ہے۔ اس کے راوی زیادہ قابل اعتماد ہیں یا اس کے راوی زیادہ قابل اعتماد ہیں۔ احادیث کے تمام اختلافات رفع کرنے کا یہ طریقہ اس کے متعلق بھی استعمال کیا جائے گا اور میں سمجھتا ہوں کہ شان نزول کے متعلق جو اختلاف ہیں انہیں کوئی بڑی اہمیت بھی حاصل نہیں ہے۔ ان معنوں میں فرض کیجئے ایک راوی یہ کہتا ہے کہ (اقرا باسم ربک الذی خلق) کے بعد سب سے پہلے سورہ "الم" نازل ہوئی۔ دوسرے راوی یہ کہتے ہیں کہ نہیں فلاں سورت نازل ہوئی تو اس اختلاف کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس سے صحابہ کی واقفیت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ انہیں جیسا یاد رہا انہوں نے ویسا ہی بیان کر دیا۔ اس کے متعلق میں نے حقیقتاً غور نہیں کیا، کبھی مطالعہ نہیں کیا۔ اس لیے اس وقت اس پر اکتفا کرتا ہوں۔

**سوال۹:** ام ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کون تھیں؟ کیا صرف وہی حافظہ تھیں یا جناب ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی حافظہ قرآن تھیں؟

**جواب:** حضرت ام ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ایک انصاری عورت تھیں جو بہت پہلے ایمان لائی تھیں چنانچہ ان کے متعلق لکھا ہے کہ جنگ بدر (۲ ھ) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے سے روانہ ہوئے تو انہوں نے اپنی خدمات پیش کیں کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیں۔ میں اسلام کے دشمنوں سے جنگ کرنا چاہتی ہوں۔ ان کے متعلق ایک اور روایت ہے جو اس سے بھی زیادہ عملی یا علمی دشواریاں پیدا کرے گی وہ یہ کہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو رسول اللہ نے ان کے محلے "اہل دارہا" نہ کہ "اہل بیتھا" کی مسجد کا امام مامور فرمایا تھا جیسا کہ سنن ابي داوٗد اور مسند احمد بن حنبل میں ہے اور یہ بھی کہ ان کے پیچھے مرد بھی نماز پڑھتے تھے اور یہ کہ ان کا مؤذن ایک مرد تھا۔ ظاہر ہے کہ مؤذن بھی بطور مقتدی ان کے پیچھے نماز پڑھتا ہو گا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عورت کو امام بنایا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس حدیث کے متعلق یہ گمان ہو سکتا ہے کہ یہ شاید ابتدائے اسلام کی بات ہو اور بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منسوخ کر دیا ہو لیکن اس کے برعکس یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے تک زندہ رہیں اور اپنے فرائض سرانجام دیتی رہیں۔ اس لیے ہمیں سوچنا پڑے گا۔ ایک چیز جو میرے ذہن میں آئی ہے وہ عرض کرتا ہوں کہ بعض اوقات عام قاعدے میں استثناء کی ضرورت پیش آتی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے استثنائی ضرورتوں کے لیے یہ استثنائی تقرر فرمایا ہو گا۔ چنانچہ میں اپنے ذاتی تجربے کی ایک چیز بیان کرتا ہوں۔ پیرس میں چند سال پہلے کا واقعہ ہے کہ ایک افغان لڑکی طالب علم کے طور پر آئی تھی۔ ہالینڈ کا ایک طالب علم جو اس کا ہم جماعت تھا، اس پر عاشق ہو گیا۔ عشق اتنا شدید تھا کہ اس نے اپنا دین بدل کر اسلام قبول کر لیا۔ ان دونوں کا نکاح ہوا۔ اگلے دن وہ لڑکی میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ بھائی صاحب میرا شوہر مسلمان ہو گیا ہے اور وہ اسلام پر عمل بھی کرنا چاہتا ہے لیکن اسے نماز نہیں آتی اور اسے اصرار ہے کہ میں خود امام بن کر نماز پڑھاؤں۔ کیا وہ میری اقتدا میں نماز پڑھ سکتا ہے؟ میں نے اسے جواب دیا کہ اگر آپ کسی عام مولوی صاحب سے پوچھیں گی تو وہ کہے گا کہ یہ جائز نہیں لیکن میرے ذہن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کا ایک واقعہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ہے۔ اس لیے استثنائی طور پر تم امام بن کر نماز پڑھاؤ۔ تمہارے شوہر کو چاہیے کہ مقتدی بن کر تمہارے پیچھے نماز پڑھے اور جلد از جلد قرآن کی ان سورتوں کو یاد کرے جو نماز میں کام آتی ہیں۔ کم از کم تین سورتیں یاد کرے اور تشہد وغیرہ یاد کرے۔ پھر اس کے بعد وہ تمہارا امام بنے اور تم اس کے پیچھے نماز پڑھا کرو۔ دوسرے الفاظ میں ایسی استثنائی صورتیں جو کبھی کبھار امت کو پیش آ سکتی تھیں۔ ان کی پیش بندی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انتخاب فرمایا تھا۔ ہمارے دوست سوال کرتے ہیں کہ کیا اور عورتیں بھی حافظہ تھیں؟ مجھے اس کا علم نہیں، ان معنوں میں کہ حافظ ہونے کا صراحت کے ساتھ اگر کسی کے بارے میں ذکر ملتا ہے تو صرف انہیں کے متعلق۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا یا ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا وغیرہ کے متعلق میں نے کبھی کوئی

روایت نہیں پڑھی کہ وہ حافظہ تھیں۔ انہیں کچھ سورتیں یقیناً یاد ہوں گی اور ممکن ہے کہ بہت سی سورتیں یاد ہوں لیکن ان کے حافظہ قرآن ہونے کی صراحت مجھے کہیں نہیں ملی، اس کے سوا اور میں کچھ عرض نہیں کروں گا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

# خطبہ ۲: تاریخِ حدیث

محترم وائس چانسلر صاحب محترم اساتذہ کرام! برادران و ہمشیر گان!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

جیسا کہ ابھی اعلان کیا گیا آج کی تقریر کا موضوع تاریخ حدیث ہے۔ قرآن مجید کے بعد حدیث کا ذکر ناگزیر ہے، اس لیے کہ یہی دو چیزیں ہیں جو اسلام کا محور ہیں۔ شاید یہ نامناسب نہ ہو گا اگر میں شروع ہی میں تاریخ کے اس پہلو پر نظر ڈالوں کہ حدیث کی اہمیت کیا ہے اور یہ کہ حدیث اور قرآن کا ایک دوسرے کے ساتھ کس قسم کا تعلق ہے؟ ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں اور کچھ نہیں تو دس پندرہ جگہ صراحت کے ساتھ مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات مانو مثلاً "ما آتاكم الرسول فخذوه ومانهكم عنه فانتهوا" (جو تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دے دیں اسے لے لو اور جس سے وہ تمہیں منع کریں اس سے رک جاؤ۔ 7:59) اس سے بھی زیادہ زوردار صراحت کے ساتھ ایک اور آیت ہے: "من يطع الرسول فقد اطاع الله" (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتا ہے وہ گویا خدا کی اطاعت کرتا ہے۔ 80:4) تو یہ آیت نیز اس طرح کی دوسری آیتیں ہمیں بتاتی ہیں کہ قرآنی تصور میں حدیث کوئی کم درجے کی چیز نہیں بلکہ ایک لحاظ سے اس کا درجہ قرآن کے برابر ہی ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک سفیر کسی بادشاہ کی طرف سے دوسرے بادشاہ کے پاس ایک خط لے کر جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خط میں زیادہ تفصیلیں نہیں ہوں گی لیکن جس مسئلے کے لیے سفیر بھیجا جاتا ہے اس مسئلے پر جب گفتگو ہو گی تو سفیر کا بیان کیا ہوا ہر ہر لفظ بھیجنے والے بادشاہ ہی کا پیغام سمجھا جائے گا۔ اس مثال کے بیان کرنے سے میرا منشاء یہ ہے کہ حقیقت میں حدیث اور قرآن ایک ہی چیز ہیں دونوں کا درجہ بالکل مساوی ہے۔ ایک مثال سے میرا مفہوم آپ پر زیادہ واضح ہو گا۔ فرض کیجئے کہ آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہوں اور ہم میں سے کوئی رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کرنے کا اعلان کرے اور اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر یہ جاہل شخص اگر کہے کہ یہ تو قرآن ہے خدا کا کلام، میں اسے مانتا ہوں مگر یہ آپ کا کلام ہے اور حدیث ہے یہ میرے لیے واجب التعمیل نہیں ہے، تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ فوراً ہی اس شخص کو امت سے خارج قرار دے دیا جائے گا اور غالباً اگر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہاں پر موجود ہوں تو اپنی تلوار کھینچ کر کہیں گے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجازت دیجئے کہ میں اس کافر و مرتد کا سر قلم کر دوں۔ غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں یہ کہنا کہ یہ آپ کی نجی بات ہے اور مجھ پر واجب العمل نہیں ہے گویا ایک ایسا جملہ ہے جو اسلام سے منحرف ہونے کا مترادف سمجھا جائے گا۔ اس لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو بھی ہمیں حکم دیں اس کی حیثیت بالکل وہی ہے جو اللہ کے حکم کی ہے۔ فرق دونوں میں جو کچھ ہے وہ اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ قرآن مجید کی تدوین اور قرآن مجید کا تحفظ ایک طرح سے عمل میں آیا ہے اور حدیث کی تدوین اور حدیث کا تحفظ دوسری طرح سے۔ اس لیے تحقیق اور ثبوت کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں تو ثبوت کا کوئی سوال نہیں تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو بھی ارشاد ہوا وہ یقینی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا۔ لیکن بعد کے زمانے میں یہ بات نہیں رہتی۔ میں ایک حدیث سن کر آپ سے بیان کرتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو بالکل سچے ہیں لیکن میں جھوٹا ہو سکتا ہوں۔ مجھ میں انسانی کمزوری کی وجہ سے خامیاں ہوں گی۔ ممکن ہے میرا حافظہ مجھے دھوکہ دے رہا ہو۔ ممکن ہے مجھے غلط فہمی ہوئی ہو۔ ممکن ہے میں نے غلط سنا ہو۔ کسی وجہ سے مثلاً دھیان کم ہو جانے کی وجہ سے یا کوئی چیز حرکت میں تھی اس کے شور کی وجہ سے میں نے کوئی لفظ نہیں سنا تو غلط مبحث پیدا ہو گیا۔ غرض مختلف وجوہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حدیث یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کا دوسروں تک ابلاغ اتنا یقینی نہیں رہتا جتنا قرآن کا یقینی ہے۔ قرآن مجید کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگرانی میں مدون کرایا اور اس کے تحفظ کے لیے وہ تدبیریں اختیار کیں جو اس سے پہلے کسی پیغمبر نے نہیں کی تھیں یا کم از کم تاریخ میں ہمیں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مگر حدیث کے متعلق یہ صورت پیش نہیں آئی اور اس کی وجہ ممکن ہے رسول للہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائل مبارکہ کا یہ پہلو بھی ہو کہ آپ میں تواضع بہت تھی۔ اپنے آپ کو محض انسان سمجھتے تھے۔ (انما انا بشر مثلکم) یہ خیال آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر زیادہ غالب رہتا تھا، بہ نسبت اس خیال کے کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ شاید یہ تصور رہا یا کوئی اور، بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کی تدوین پر وہ توجہ نہ فرمائی جو قرآن مجید کے متعلق رہی۔ اس کی وجہ ایک اور بھی ہے جو بہت اہم ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم میں (وما ینطق عن الھوی۔ ان ھو الا وحی یوحی 53:4,3) کے ذریعے سے یہ واضح کیا گیا کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

تم سے بیان کرتے ہیں وہ اپنی خواہش سے نہیں کرتے بلکہ وہ اللہ کی وحی کردہ چیز ہوتی ہے۔ اس طرح ہمیں یقین دلایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو بھی بیان کرتے ہیں وہ خدا کی وحی پر مبنی ہوتا ہے۔ جب وحی آتی آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں غلطی نہیں کرتے اسے من و عن پہنچاتے ہیں لیکن اگر وحی نہ آئے تو انتظار کرتے ہیں۔ کیونکہ وحی پیغمبر کے اختیار میں نہیں۔ جب خدا چاہتا ہے وحی کرتا ہے اور جب نہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سوائے انتظار کے کوئی چارہ نہیں ہوتا اور وہ اپنی طرف سے کچھ کہہ کر من گھڑت طور سے اپنی بات کو وحی قرار نہیں دے سکتے۔ ہمیں حدیث میں ایسی کافی مثالیں ملتی ہیں جن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بعض دنیوی معاملات میں آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشورہ بھی فرماتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ احکام دیے۔ صحابہ نے کہا کہ کیا یہ وحی پر مشتمل ہیں۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ اگو وحی پر مشتمل ہوتے تو میں تم سے مشورہ نہ کرتا۔ ایک دوسری حدیث بہت دلچسپ ہے جو کھجور کے درختوں کے متعلق ہے۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے اور وہاں دیکھا کہ نر درختوں کے پھول مادہ پھول کے اندر ڈالے جاتے ہیں گویا اس عمل کی وجہ سے کھجور پیدا ہوتی ہے۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت میں جو حیا تھی اس کی بناء پر آپ کو یہ عمل پسند نہیں آیا اور کہا کہ نر اور مادہ کا تعلق پیدا کرنا درختوں میں مناسب نہیں ہے، بہتر ہے کہ تم یہ نہ کرو۔ لوگوں نے جب اس حکم پر عمل کیا تو کھجور کی پیداوار اس سال بہت خراب گئی۔ سب لوگ آئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے اس سال بیج ڈالنے (Pollination) کا عمل نہیں کیا جس کی وجہ سے کھجور کی پیداوار نہیں ہوئی اس پر (ترمذی شریف وغیرہ کی حدیثوں کے مطابق) آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب یہ تھا "**انتم اعلم بامور ادنیا کم**" (تم اپنے دنیاوی معاملات کو میرے مقابلے میں بہتر جانتے ہو) اس مثال سے یہ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی چیز وحی کے تحت بیان کریں تو اس کی حیثیت قرآن کے مطابق ہو گی۔ لیکن کوئی بات اپنی طرف سے بیان کریں تو وہ ایک ذہین، ایک فہیم انسان کا بیان ہو گا لیکن خدائی وحی نہیں ہو گی، انسانی چیز ہو گی اور انسانی چیز میں خامیاں ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ حدیثوں میں اس کا ذکر آتا ہے کہ کبھی کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے چار رکعت کے تین ہی رکعت کے بعد سلام پھیر لیا، یا یہ کہ بجائے دو کے تین رکعتیں پڑھ لیں، سہو ہو گیا تو یہ انسانی بھول چوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ممکن ہے اور ایسا مصلحت الٰہی کے تحت واقع ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نے اسوہ حسنہ قرار دیا ہے۔ کوئی رسول اسوہ حسنہ اور کامل نمونہ اس وقت ہو سکتا ہے جب وہ انسانی دائرے میں رہے۔ یعنی وہ ایسا ہی کام کرے جسے اور انسان بھی کر سکتے ہیں۔ اس کے بر خلاف اگر رسول "فوق البشر" بن جائے تو ہمارے لیے اسوہ حسنہ نہیں رہے گا۔ اس لیے ایسی مثالیں پیش آتی ہیں کہ فجر کی نماز کا وقت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سو رہے ہیں، بیدار نہیں ہوتے جب سورج طلوع ہوتا ہے تو سورج کی کرنوں کی

گرمی اور جلن سے بیدار ہوتے ہیں یا جیسا کہ میں نے بیان کیا، کبھی نماز پڑھنے میں رکعتوں کی تعداد میں سہو فرماتے ہیں، یا اسی طرح کی چیزیں پیش آتی ہیں جن کا حکمت الٰہی کے تحت منشاء اور غرض وغایت یہ ہوتی ہے کہ ہمیں یقین دلایا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم بھی انسان ہی ہیں۔ وہ جو کام کرتے رہے اس کے متعلق کبھی یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ ہم نہیں کر سکتے بلکہ ہم بھی چاہیں تو کر سکتے ہیں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں یاد رہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ طرز عمل یہ رہا کہ ایسے کام نہ کریں جو امت کی طاقت سے بالاتر اور ان کی استطاعت سے باہر ہوں۔ مثال کے طور پر "وصال" نامی روزے کا میں آپ سے ذکر کروں گا۔ "وصال" کے معنی یہ ہیں کہ چوبیس گھنٹے کی جگہ اڑتالیس گھنٹے کا روزہ رکھا جائے۔ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدت سے منع فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ چوبیس گھنٹے کا بھی روزہ نہ رکھو بلکہ سحری کرو، اور اس پر بہت زور دیتے تھے۔ ایک مرتبہ صحابہ نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ تو ہمیں حکم دیتے ہیں یوں کرو مگر خود آپ کا طرز عمل اس کے برخلاف ہے۔ ہم بھی ویسا ہی کرنا چاہتے ہیں، تو حدیث میں ایک دلچسپ ذکر آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا اچھا کوشش کر کے دیکھو۔ آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے چوبیس گھنٹے روزہ رکھا، افطار نہیں کیا اسے اور بڑھایا اور اڑتالیس گھنٹے گزرے، اب لوگوں کو شدید پریشانی ہوئی۔ حسن اتفاق سے شوال کا چاند 29 تاریخ کو نظر نہ آتا تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم شاید 72 گھنٹے کا روزہ رکھتے پھر ان لوگوں کو پتہ چلتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید کرنے کی جو تم خواہش رکھتے ہو وہ تمہارے لیے مناسب نہیں ہے۔ امت کے لیے مصلحت یہی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر عمل کریں، یہ نہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید میں وہ کام کرنا چاہیں جو ان کے بس کی چیز نہیں۔ ممکن ہے کوئی ایک شخص ایسا کر سکے لیکن عوام الناس ضعیف اور کمزور لوگ ہوتے ہیں وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ غرض حدیث کی اہمیت قرآن کی اہمیت سے کسی طرح کم نہیں۔ اگر ان دونوں میں فرق ہے تو اس قدر کہ حدیث کا ثبوت ہمیں اس طرح کا نہیں ملتا جس طرح قرآن کے متعلق ملتا ہے کہ متواتر چودہ سو سال سے اس کے ایک ایک لفظ، ایک ایک نقطے اور ایک ایک شوشے کے متعلق ہمیں کامل یقین ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کا جو قرآن تھا وہی اب بھی باقی ہے۔ حدیث کے متعلق ایسا نہیں ہوا۔

اس تمہید کے بعد میں آپ سے یہ عرض کروں گا کہ قرآن کی مماثل چیزیں اور قوموں میں بھی ملتی ہیں، مثلاً یہودیوں کے ہاں توریت اللہ کی نازل کردہ کتاب ہے یا مثلاً اور قوموں کی طرف خدا کی بھیجی ہوئی کتابیں ہیں، تو قرآن کے مماثل الہامی کتابوں کی مثالیں ہمیں ملتی ہیں، لیکن حدیث کی مماثل چیزیں دیگر قوموں میں مجھے نظر نہیں آتیں۔ بدھ مت میں ایسی چیز موجود ہے مگر اس کی اہمیت وہ نہیں ہے جو ہمارے ہاں حدیث کی ہے۔ بدھ مت کی اساسی اور بنیادی کتاب اسی قسم کی ہے جیسے ہمارے ہاں ملفوظات کے نام سے مشہور

مجموعے ہیں جن میں کسی ولی، کسی بزرگ یا کسی مرشد کے اقوال کو ان کے مریدوں میں سے کسی نے قلم بند کیا ہے۔ گوتم بدھ کے ملفوظات بھی صرف ایک شخص کے جمع کردہ ہیں لیکن حدیث کے مماثل کوئی ایسی چیز نہیں ملتی کہ بہت سے اہل ایمان اپنے مشاہدات اور اپنے محسوسات کو جمع کر کے بعد والوں تک پہنچانے کی کوشش کریں، جیسا کہ حدیث کے مجموعوں میں کوشش کی گئی ہے۔ یہ بات دوسروں کے ہاں مفقود ہے۔ گویا حدیث ایک ایسا علم ہے اور حدیث کے مندرجات ایسی چیزیں ہیں جن کے مماثل کوئی اور چیز دوسرے مذاہب میں ہمیں نظر نہیں آتی ان حالات میں تقابلی مطالعے کا امکان باقی نہیں رہتا لہٰذا براہ راست رسول اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کی حدیث کی تاریخ ہی پر اکتفا کرنا پڑے گا۔

حدیث کے سلسلے میں اولاً چند اصطلاحوں کا بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایک لفظ حدیث ہے اور ایک لفظ سنت، اب یہ دونوں تقریباً مترادف الفاظ سمجھے جاتے ہیں۔ حدیث سے مراد وہی ہے جو سنت کا مفہوم ہے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کی بیان کردہ چیزیں، رسول صلی اللہ علیہ و سلم کے عمل کردہ امور جن کا تذکرہ کسی مشاہدہ کرنے والے کی طرف سے ہو کہ میں نے دیکھا کہ رسول صلی اللہ علیہ و سلم نے یہ کہا یا یوں کیا اور تیسرے وہ امور جنہیں ہمارے مؤلفین "تقریر" کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی وہ امور جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے برقرار رکھا اور اس سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے اپنے کسی صحابی کو کوئی کام کرتے ہوئے دیکھا اور اسے منع نہ کیا یا خاموش رہے، تو گویا اپنی خاموشی سے آپ نے اس عمل کو برقرار رکھا۔ یعنی آپ کے سکوت سے بھی اسلامی قانون بن جاتا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کا یہ فریضہ ہے کہ وہ کسی برائی کو دیکھیں تو "نہی عن المنکر" کریں یعنی اپنے صحابی کے کسی ایسے فعل کو جو اسلام کے مطابق نہیں ہے آپ معاف تو کر دیں گے کہ اس صحابی نے غفلت سے یا ناواقفیت سے کیا ہے لیکن اسے روکیں گے ضرور کہ آئندہ ایسا نہ کرے۔ مختصر یہ کہ حدیث سے متعلق تین چیزیں پائی جاتی ہیں، ایک رسول اللہ کا قول، دوسرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کا عمل، تیسرا رسول اللہ کا کسی دوسرے کے قول و فعل کو برقرار رکھنا یعنی اصطلاحی طور پر رسول اللہ کی "تقریر" پہلی دو اصطلاحو یعنی حدیث اور سنت میں اب تو کوئی فرق نہیں لیکن ابتدا میں فرق تھا۔ حدیث کے معنی بولنا یعنی قول اور سنت کے معنی ہیں طرز عمل۔ اب گویا قول اور فعل دونوں ایک ہی طرح کی چیزیں ہو گئی ہیں کیونکہ بارہا صحابہ کی نقل کردہ روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کا قول بھی ہوتا ہے اور رسول اللہ کا عمل بھی مگر اس کے لیے حدیث کو حدیث اور سنت میں تقسیم کر کے ان کو الگ الگ کر کے جمع کرنا ناممکن بات تھی۔ اس لیے کثرت استعمال سے حدیث سے مراد قول بھی ہے اور عمل بھی۔ اسی طرح سنت سے مراد قول بھی ہے اور عمل بھی۔ اب عملاً ان میں کوئی فرق باقی نہیں ہے، جہاں تک میرے علم میں ہے۔

حدیث اور قرآن کے مابین ایک تیسری چیز بھی آتی ہے اس سے بھی واقفیت ہو جانی چاہیے۔ اگرچہ اس میں اور حدیث میں کوئی بڑا فرق نہیں ہے، لیکن ایک حد تک فرق ضرور ہے وہ چیز ہے حدیث قدسی۔ حدیث قدسی کے معنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ وہ حدیث جس کے شروع میں یہ الفاظ آتے ہیں "اللہ کہتا ہے کہ ۔۔۔ فلاں فلاں" یوں ہم کہہ سکتے ہیں۔ حدیث ساری ہی اللہ کے الہام پر مبنی ہے کیونکہ یہ (وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی 4,3:53) کی آیت کے مطابق ہے۔ لیکن اگر حدیث میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صراحت فرمائیں کہ "اللہ کہتا ہے کہ فلاں چیز تو اس کو ہمارے مؤلف ایک مستقل درجے میں رکھتے ہیں اور اسے "حدیث قدسی" کا نام دیتے ہیں البتہ اس کی روایت اس کا ایک دور سے دوسرے دور تک منتقل ہونا بالکل اسی طرح ہوا جس طرح عام حدیثوں کا ہے۔ ہم ان میں کوئی فرق نہیں پاتے ہیں۔ ایسی حدیث کی ابتدا عموماً اس طرح ہوتی ہے کہ "اللہ" ضمیر متکلم کے ذریعے سے ایک امر ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ایسا کروں گا تو خدا خود کلام کرتا ہے اور اس کو رسول اللہ ﷺ ہم تک پہنچاتے ہیں۔ اس موضوع پر قدیم زمانے ہی سے متعدد مؤلفوں نے کتابیں لکھی ہیں جو ہم تک پہنچی ہیں۔ بعض چھپ بھی گئی ہیں اور بعض ممکن ہے ابھی تک قلمی حالت میں موجود ہوں۔ اس موقع پر آپ کی دلچسپی کے لیے ایک واقعہ سناتا ہوں۔ پیرس میں ایک نو مسلم لڑکی آج کل اس موضوع پر اپنے ڈاکٹریٹ کا مقالہ تیار کر رہی ہے اس لڑکی کا نام عائشہ ہے یہ بہت ذہین لڑکی ہے۔ دو سال ہوئے اس نے عربی شروع کی اور اب اس درجہ کی اسے عربی آگئی ہے کہ ریاض الصالحین نامی سات آٹھ سو صفحوں کی ضخیم کتاب کا ترجمہ عربی سے اس نے فرنچ میں کر ڈالا ہے اور اب ایک مقالہ لکھ رہی ہے اس موضوع پر کہ "حدیث قدسی کیا ہے" اور ایسی حدیثوں کے اندر کیا کیا چیزیں ملتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس میں ہر چیز حدیث قدسی کے موضوع کی تشریح کے ساتھ ساتھ آئے گی۔ حدیث قدسی کے دو چار رسالے جو دستیاب ہیں ان میں سے بھی بعض کا وہ ترجمہ کر رہی ہے تاکہ مقالہ میں شامل کر سکے۔

حدیث کی دو بڑی قسمیں بیان کی جا سکتی ہیں ایک سرکاری مراسلے اور دوسرے صحابہ کا اپنے طور پر مراسلے یا سرکاری تحریریں۔ ہجرت سے پہلے ہی ہمیں چند چیزوں کا پتہ چلتا ہے مثلاً آپ واقف ہیں کہ تقریباً سنہ 5 نبوت میں ہجرت سے سات آٹھ سال پہلے مکے میں جب مشرکین مکہ نے مسلمانوں پر ظلم و ستم کیا تو کچھ لوگ رسول اللہ کے حکم اور اجازت سے حبشہ کو ہجرت کر گئے، اس سلسلے میں ایک دستاویز ہمیں ملتی ہے۔ ممکن ہے آپ میں سے بعض اس سے واقف بھی ہوں کہ اس کا ذکر سیرت کی کتابوں میں آتا ہے یہ ایک خط ہے جو رسول اللہ نے اپنے چچازاد بھائی جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیا کہ یہ خط نجاشی کو جو حبشہ کا حکمران تھا پہنچا دیں۔ اس کے آخر میں الفاظ یہ ہیں:

"میں اپنے چچازاد بھائی جعفر کو تیرے پاس بھیج رہاہوں اس کے ساتھ کچھ اور بھی مسلمان ہیں جب یہ تیرے پاس پہنچیں تو ان کی مہمانداری کرنا۔"

ظاہر ہے کہ خط پر تاریخ نہ ہونے کے باوجود یہ خط ہجرت حبشہ کے زمانے ہی کا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ہمیں اس زمانے کی ایک اور چیز ملتی ہے جو کافی دلچسپ کہی جاسکتی ہے۔ بعض لوگوں کو اس پر حیرت بھی ہوتی ہے۔ یہ تمیم داری کا واقعہ ہے۔ تمیم داری شام کے رہنے والے ایک عیسائی تھے۔ وہ مکہ آتے ہیں، اسلام قبول کرتے ہیں اور پھر اپنے قصے بھی بیان کرتے ہیں۔ وہ ایک جہاز ران تھے بہت سے بحری سفر کر چکے تھے۔ جن کا تفصیل کے ساتھ " صحیح مسلم " میں ذکر آیا ہے۔ تمیم داری نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا کہ مجھے یقین ہے کہ آپ کی فوج بہت جلد میرے وطن یعنی شام کو فتح کرے گی جب یہ ہو تو مجھے فلاں فلاں گاؤں بطور جاگیر مرحمت فرمائیں۔ تاریخی کتابوں کے مطابق رسول اللہ نے ایک پروانہ لکھوایا اور اس کو دیا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ اگر مرطوم، خبرون (اور چند گاؤں کے نام ہیں) وغیرہ فتح ہو جائیں تو تمیم داری کو دیے جائیں۔ غرض یہ بھی ہجرت مدینہ سے پہلے کی تحریری چیزوں میں ایک چیز کہی جاتی ہے۔ اسی طرح کچھ اور چیزیں ہمیں ملتی ہیں۔ دوسرا مختصر دور ہجرت کا وقت ہے۔ یعنی مکہ سے مدینہ کے سفر کے دس بارہ دن کا زمانہ۔ اس زمانے میں بھی ہمیں بعض تحریری چیزوں کا پتہ چلتا ہے۔ مثال کے طور پر سراقہ بن مالک کا واقعہ ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعاقب کیا۔ چاہا کہ آپ کو گرفتار کرلے اور قریش کے ہاتھ حضور کو بیچ دے۔ کیونکہ قریش نے اعلان کیا تھا کہ جو محمد کو گرفتار کرے گا اسے اتنا انعام دیا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ اس اثناء میں کئی معجزات بھی پیش آئے۔ کہتے ہیں کہ آخر میں سراقہ نے معافی چاہی۔ رسول اللہ نے اسے معاف کیا تو اس پر اس نے درخواست کی کہ مجھے پروانہ امن دیا جائے۔ ہمارے راوی بیان کرتے ہیں کہ اس ہجرت کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دوات قلم اور کاغذ بھی موجود تھا اور حضورؐ کے ہمراہیوں میں لکھنا پڑھنا جاننے والا ایک غلام بھی موجود تھا جس کا نام عامر بن فہیرہ تھا۔ چنانچہ اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے املا کروایا، جس میں سراقہ بن مالک کو رسول اللہ ﷺ کی طرف سے امن اور پناہ دینے کا ذکر تھا۔ بعد میں سراقہ مسلمان ہو گیا اور جس وقت وہ مسلمان ہونے کے لیے آیا اس نے بتایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا کردہ پروانہ میرے پاس ہے، چنانچہ اس تحریر کی اساس پر صحابہ نے اسے قریب ہونے کا موقعہ دیا، باوجود ہجوم کے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ گیا اور گفتگو کی۔ اسے ہجرت کے زمانے کی تحریروں میں شامل کیا جائے گا۔ ایسی چیزیں زیادہ تو نہیں ہیں۔ غالباً ہجرت کے دوران کی یہ واحد مثال ہے۔ مگر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ پہنچے تو اب سرکاری تحریروں کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ ان میں کچھ سرکاری کاغذات ہیں اور کچھ تحریریں خالص پرائیویٹ

قسم کی ہیں۔ بعض تحریریں ایسی ہیں جن کی کوئی توقع بھی نہیں ہو سکتی کہ ایسی چیزیں بھی اس زمانے میں پائی جاتی ہوں گی۔ مثلاً "صحیح بخاری" میں ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ جتنے لوگ مسلمان ہوئے ہیں ان کے نام لکھو۔ چنانچہ مردم شماری کی گئی۔ صحیح بخاری کے مطابق اس فہرست میں پندرہ سو نام لکھے گئے۔ مردوں، عورتوں، بچوں، بوڑھوں سب کی تعداد پندرہ سو کی تعداد ایسی ہے کہ میرے خیال میں ہجرت سے عین بعد کی معلوم ہوتی ہے۔ فرض کیجئے کہ مکہ سے آئے ہوئے مہاجرین دو سو خاندان ہوں گے تو پانچ سو کے لگ بھگ افراد ہونے چاہئیں۔ اسی طرح اس میں مدینہ منورہ کے مسلمان بھی ہوں گے تو اس طرح پندرہ سو مسلمانوں کا ہونا ہجرت کے ابتدائی سالوں کا واقعہ معلوم ہوتا ہے، بہت بعد کا نہیں۔ کیونکہ بعد میں مسلمانوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی کہ شمار نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً حجۃ الوداع میں ایک لاکھ چالیس ہزار حضرات فریضہ حج ادا کرنے کو آئے تھے تو پندرہ سو اور ایک لاکھ چالیس ہزار میں ظاہر ہے کوئی نسبت نہیں پائی جاتی۔ مردم شماری کے علاوہ ایک اور چیز بھی ملتی ہے جس کا تعلق غالباً سنہ ۱ھ سے ہے اس کی بھی ہمیں کوئی توقع نہیں تھی۔ یہ بھی ایک عجیب و غریب چیز ہے۔ پہلے میں بتا دوں کہ یہ ایک دستور مملکت ہے۔ اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ جیسا کہ معلوم ہے کہ ہجرت کے موقع پر قریش کی اذیت کے باعث مکے کے مسلمان اور آخر میں خود رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے تھے۔ اب اگر قریش چپ رہتے تو شاید مسلمان جلدی ہی اپنی مصیبت، اپنی جائیداد کی تباہی، اپنے وطن سے بے وطنی وغیرہ کو بھی بھول جاتے اور نئے ملک اور نئے وطن میں نئی زندگی کا آغاز کر لیتے لیکن قریش مکہ نے ان کو چین لینے نہ دیا۔ قریشیوں کو یہ دیکھ کر کہ ان کے دشمن، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاتھ سے بچ کر چلے گئے ہیں، اتنی جلن ہوئی اور اتنا غصہ آیا کہ مدینہ والوں کو ایک خط لکھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارا دشمن تمہارے ملک میں آیا ہے یا تو اس کو مار ڈالو یا اس کو اپنے ملک سے نکال دو، ورنہ ہم مناسب تدبیریں اختیار کریں گے۔ ظاہر ہے کہ مدینے کے مسلمان ان میں سے کسی بات کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔ آخری دھمکی یا الٹی میٹم کہ ہم مناسب تدبیریں اختیار کریں گے، اگر کوئی حکمران جاہل یا غافل ہوتا تو اس کو غیر اہم چیز سمجھ کر نظر انداز کر دیتا لیکن جس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اسوہ حسنہ بننا تھا ان کے لیے ضروری تھا کہ اپنے بعد آنے والے حکمرانوں کو بتائیں کہ ان حالتوں میں کیا کرنا چاہیے، یعنی دشمن خاص کر قومی دشمن سے اپنے اور اپنی قوم کے مفادات کو محفوظ رکھنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کرنا چاہئیں۔ چنانچہ آپ نے دو تین احتیاطی تدابیر اختیار فرمائیں پہلی تدبیر یہ تھی کہ جو لوگ ہجرت کر کے بے وطن ہو کر ایک نئے ملک میں آئے تھے اور جن کے پاس، ان کے بدن کے کپڑوں کے سوا، کوئی چیز نہ تھی، ان کی گزر بسر کا انتظام کیا۔ آپ لوگوں کو پاکستان میں مہاجرین کے مسائل کے پیش نظر اچھی طرح واقفیت ہے کہ یہ کتنا دشوار کام ہے۔ برسوں گزر جانے کے بعد بھی مہاجرین کی ساری گتھیاں، ساری دشواریاں حل نہیں ہو پائیں، اور پھر باوجود ان وافر وسائل کے جو موجودہ زمانے میں ہمارے پاس ہیں اور باوجود اس حقیقت کے کہ ہماری حکومت کی

آمدنی کروڑوں روپے کی ہے، ہم مہاجرین کے مسائل آسانی سے حل نہیں کر سکے۔ پاکستان ہی میں نہیں، جرمنی وغیرہ جیسے بہت سے ممالک میں یہ واقعات پیش آئے ہیں اور ہر جگہ یہ ایک نہایت ہی دشوار اور پیچیدہ مسئلہ رہا ہے۔ جو لوگ مدینہ آئے تھے ان کی تعداد اگرچہ زیادہ نہیں تھی۔ شاید چند سو آدمی ہوں گے لیکن اس زمانے میں وسائل بہت کم تھے۔ ان چند سو آدمیوں کو ایک چھوٹی سی بستی میں مستقل گزر بسر کے وسائل فراہم کر دینا آسان کام نہیں تھا۔ تقریباً اتنا ہی مشکل کام تھا جتنا کسی بڑے ملک میں آج کل مثلاً ایک ہزار کی جگہ ایک لاکھ یا دس لاکھ افراد کا آنا۔ تو ایسی ہی دشواری اس وقت پیدا ہوئی ہو گی۔ مگر اس مشکل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سیاسی فراست سے ایک لمحے میں حل کر لیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر مدینہ کے ان لوگوں کو بلایا جو نسبتاً خوشحال تھے اور ساتھ ہی مکی مہاجرین کے ان نمائندوں کو بھی بلایا جو اپنے اپنے خاندان کے سربراہ تھے۔ جب دونوں جمع ہو گئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کی سفارش کرتے ہوئے انصار سے خطاب فرمایا کہ یہ تمہارے بھائی ہیں، تمہارے ہی دین والے ہیں اور اس دین ہی کی خاطر اپنے وطن، اپنے ملک اور اپنی ہر چیز کو چھوڑ کر یہاں آئے ہیں۔ اس لیے تمہارا فریضہ ہے کہ ان کی مدد کرو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجویز کی کہ انصار میں سے ہر خاندان مکہ والوں کے ایک خاندان کو اپنے خاندان میں شامل کر لے۔ مواخاۃ یا بھائی چارہ کا مفہوم یہ نہیں کہ یہ کوئی طفیلی Parasite کے طور پر مفت خوری کرنے والے مہمانوں کی طرح رہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب بجائے چھوٹے خاندانوں کے بڑا خاندان ہو گا۔ بجائے دو آدمیوں کے چار آدمیوں کا خاندان ہو گا اور دونوں خاندان کام کریں گے۔ جب کام زیادہ کیا جائے گا تو آمدنی زیادہ ہو گی۔ آمدنی زیادہ ہو گی تو دونوں کی گزر بسر کا انتظام باآسانی ہو سکے گا۔ کوئی شخص کسی خاندان پر بار نہیں بنے گا۔ اس لیے سب ہی نے یہ تجویز بخوشی قبول کر لی۔ مواخات کے اس اصول کا یہ نتیجہ نکلا کہ کئی سو خاندان ایک لمحے میں گزر بسر کے انتظامات حاصل کرنے کے قابل ہو گئے اور پھر اس کے بعد کبھی یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوا کہ کون خوش حال ہے کون بے روزگار ہے، کون پناہ دہندہ ہے اور کون باہر سے آیا ہوا مہاجر ہے۔ اس اہم کام سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور امر کی طرف توجہ فرمائی وہ یہ کہ اس زمانے سے پہلے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے مدینہ میں کوئی ریاست یا مملکت نہیں پائی جاتی تھی۔ وہاں آبادی کا ایک گروہ تھا جو قبیلوں میں بٹا ہوا تھا۔ تقریباً پچیس تیس قبیلے تھے اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلے سے اتنا ہی آزاد اور خود مختار تھا جتنا آج کل کی دنیا کی سلطنتیں ہوتی ہیں اور اس خود مختاری کا نتیجہ بھی وہی تھا جو آزاد مملکتوں میں ہوتا ہے یعنی آپس میں جنگ بھی ہوتی ہے۔ ہمارے مؤرخوں نے لکھا ہے کہ مدینے کے انصار درحقیقت دو بڑے قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے (بلکہ دو بڑے گروہوں میں، اور ہر گروہ میں کئی قبیلے تھے) یعنی اوس اور خزرج۔ ان دونوں میں ایک سو بیس سال سے خانہ جنگیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ظاہر ہے کہ جب دو قبیلوں میں جنگ ہو رہی ہو تو دونوں کی مشترکہ حکومت کا کوئی سوال ہی پیدا

نہیں ہوتا۔ مدینہ میں ان عربوں کے علاوہ اور بھی لوگ آباد تھے۔ مثلاً یہودیوں کے قبائل وہاں تھے۔ ان کی کئی ہزار کی آبادی تھی تخمیناً نصف آبادی یہودیوں پر مشتمل تھی اور نصف آبادی عربوں پر۔ یہودیوں کے علاوہ کچھ عیسائی بھی تھے جن کی صحیح تعداد معلوم نہیں۔ ایک روایت میں پندرہ، ایک روایت میں پچاس کا ذکر ملتا ہے اور یہ قبیلہ اوس کے اندر رہتے تھے۔

بہر حال اس آبادی میں جس میں یکجہتی نہیں پائی جاتی تھی، ایسا انتظام کرنا کہ سب کی مشترکہ حکومت قائم ہو یہ بظاہر خیال و خواب کی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کی ضرورت تھی، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کی مواخات کے ذریعے سے گزر بسر کا انتظام کرنے کے بعد جو کام کیا وہ یہ تھا کہ ان سارے گروہوں کے نمائندوں کو اپنے پاس بلایا، مسلمان بھی یہودی بھی، صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ میرے والد کے مکان پر یہ اجتماع ہوا۔ اس میں یہودیوں کے نمائندے بھی تھے، عربوں کے بھی۔ عربوں میں اوس کے نمائندے بھی تھے، خزرج کے بھی۔ اسلام قبول کرنے والے اوس اور خزرج کے نمائندہ بھی اور وہ بھی جو تاحال مسلمان نہیں ہوئے تھے، اور مہاجرین کے نمائندے بھی تھے۔ ان سب کو جمع کیا اور ان سے مخاطب ہو کر غالباً یہ فرمایا (کیونکہ صراحت نہیں ملتی کہ اجتماع میں کیا چیز شروع میں پیش آئی) کہ آپ اس وقت مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے ہیں اور بالکل ایک دوسرے سے آزاد ہیں اور نتیجہ یہ ہے کہ اگر ایک قبیلہ پر اس کا دشمن باہر سے حملہ آور ہوتا ہے تو باقی سب لوگ غیر جانبدار رہتے ہیں اور اس قبیلہ کو دشمن کی مجموعی قوت سے تنہا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اسے شکست ہو۔ پھر کچھ دنوں کے بعد دوسرے قبیلے پر کوئی بیرونی دشمن حملہ آور ہو اور اسی طرح تیسرے اور چوتھے پر تو نتیجہ یہی ہوگا کہ رفتہ رفتہ دشمنوں کے ہاتھوں سب ختم ہو جاؤ گے۔ اس لیے، کیا یہ مناسب نہیں کہ تم سب قبیلے اپنی ایک مشترکہ حکومت قائم کرو تاکہ تمہاری مشترکہ حکومت کے باعث دشمن کو بھی یہ خوف ہو کہ ہمارا ایک دشمن نہیں، بلکہ بہت سے قبیلے وہاں موجود ہیں وہ سب ہمارا مقابلہ کریں گے اور ہم اپنی تنہا قوت پر اس سارے شہر مدینہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ ایک مشترکہ معاہدہ ہے جو دشمنوں سے تمہارے تحفظ، تمہارے معاشی اور مالی فوائد کا ضامن ہوگا۔ تجویز معقول تھی اس لیے سبھوں نے یا کم از کم اکثر قبیلوں نے قبول کر لیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اکثر کا لفظ صحیح ہے کیونکہ اس واقعہ کا ذکر ملتا ہے کہ اوس کے چار قبیلے شروع میں اس میں شریک نہیں تھے۔

بہر حال اہل مدینہ کے اجتماع کا مقصد صرف یہی نہ تھا جو میں نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہوگا کہ تمہاری مشترکہ قوت تم سب کی حفاظت کا باعث ہوگی۔ بلکہ ایک اور چیز بھی تھی جس کو ہم اس دستور کے اندر دیکھتے ہیں اور جس پر سب نے اتفاق کیا، وہ یہ کہ ہر قبیلے کو بہت سے امور میں حسب سابق کامل آزادی رہے گی صرف چند چیزوں کے متعلق یہ وضاحت کی گئی

کہ وہ بجائے انفرادی کے مشترکہ ہوں گی اور مرکزی حکومت سے متعلق رہیں گی۔ ان مرکزی امور میں سے ایک عسکری مسئلہ بھی تھا یعنی جنگ۔ اجنبیوں سے جنگ کرنا اور صلح کرنا ناقابل تقسیم قرار دیا گیا یعنی یہ نہ ہو گا کہ جنگ صرف ایک قبیلہ سے ہو اور صلح صرف ایک قبیلہ سے ہو اور باقی لوگ اس میں شریک نہ ہوں بلکہ آئندہ سے صلح اور جنگ ناقابل تقسیم، ایک مشترکہ مسئلہ سمجھی جائے گی۔ اسی طرح انشورنس (یعنی بیمہ زندگی) کا ایک انتظام کیا گیا جس کی تفصیل میں آگے بیان کروں گا۔ یہ سب گویا مشترکہ امور قرار پائے۔

عدالت کے متعلق ایک حد تک قبائلی نظام برقرار رکھا گیا لیکن اگر فریقین مقدمہ دو مختلف قبیلوں کے ہوں تو مرکز سے رجوع کرنا ہو گا، اپیل کورٹ کو (اگر ہم ایسا کہہ سکیں) مشترکہ قرار دیا گیا، یعنی جھگڑوں کے آخری فیصلے کے لیے شہر کے حکمران سے رجوع کیا جائے گا۔ اسی طرح اس میں اس بات کا بھی ذکر ہے کہ مذہبی آزادی ہو گی۔ یہود کے لیے یہود کا دین رہے گا، مسلمانوں کے لیے مسلمانوں کا دین، دین میں مذہب، قانون اور عدل گستری سب داخل سمجھے گئے، وغیرہ وغیرہ۔ ایک دستاویز مرتب کی گئی جو ہم تک لفظ بہ لفظ پہنچی ہے اور اس کی 52 دفعات ہیں ان میں تفصیل بتائی گئی ہے کہ کیا کام انجام دینے چاہئیں۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ اس وقت کی اسلامی مملکت کا تحریری دستور تھا۔

ابھی میں نے اشارتاً کہا کہ اس میں کچھ انشورنس کا بھی ذکر ہے۔ یہ ایک عجیب وغریب شے ہے۔ قدیم زمانے میں وہ ضرورتیں جو آج پائی جاتی ہیں نہیں پائی جاتی تھی، اس زمانے کی جو ضرورتیں تھیں وہ آج کل ہمارے لیے بے سود نظر آتی ہیں۔ قدیم زمانے میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں، مدینہ منورہ میں دو مسئلے بہت اہم تھے۔ ایک یہ کہ اگر کوئی شخص غلطی سے (یعنی عمداً نہیں) کسی شخص کے قتل کا مرتکب ہوتا تو اسے خون بہا دینا پڑتا تھا۔ خون بہا کی رقم رواج و قانون کے مطابق اتنی زیادہ تھی کہ عملاً ساری آبادی میں سے ایک آدھ شخص ہی اس کو ادا کر سکتا تھا۔ دوسرے لوگوں کے لیے وہ ناممکن سی بات تھی، یعنی ایک سو اونٹ کی قیمت کا اندازہ یوں کیجئے کہ ایک اونٹ سو آدمیوں کے لیے دن بھر کی پوری غذا کا کام دیتا ہے۔ اس حساب سے سو اونٹ کے معنی ہوئے دس ہزار دن تک ایک شخص کو غذا مہیا کرنا۔ یہ ہوتا تھا خون بہا۔ اتنی بڑی رقم دینا اتنا بڑا خون بہا ادا کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی۔ سوائے مال دار سردار قبیلے کے کسی اور شخص کے لیے یہ ناممکن تھا۔ لیکن یہ واقعات روز مرہ پیش آتے تھے اس کے لیے اجتماعی انشورنس کا انتظام کیا گیا یعنی ایک قاتل ہی اس کا ذمہ دار نہ ہو گا بلکہ پوری انشورنس کمپنی اس کی ذمہ داری قبول کرے گی اور اس کی طرف سے خون بہا ادا کرے گی۔ دوسری چیز جس کی اس زمانے میں ضرورت تھی اور آج ہمارے عہد میں اس کی ضرورت عملاً نظر نہیں آتی وہ یہ ہے کہ کسی شخص کو دشمن گرفتار کر کے قید کر لے تو وہ فدیہ دے کر اپنی آزادی حاصل کرتا تھا۔ یہ فدیہ بھی بہت گراں

تھا یعنی سو اونٹ فدیہ دینا ہوتا تھا۔ کوئی غریب شخص گرفتار کر لیا جاتا تو اس کی رہائی کی کوئی صورت نہ ہوتی تھی۔ وہ عملاً اپنے دشمن کا غلام بن جاتا۔ ایسے وقت میں انشورنس کمپنی کام دیتی۔ اس کی طرف سے ذمہ داری قبول کرتی اور فدیہ ادا کرتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انتظام کیا کہ مدینہ منورہ میں ہر ہر قبیلے میں ایک انشورنس یونٹ قائم ہوا اور یہ کہا کہ تمہارے قبیلے کے کسی آدمی کو قتل یا گرفتاری کے سلسلے میں رقم ادا کرنی ہو اور وہ شخص ادا نہ کر سکے تو یہ انشورنس یونٹ ادا کرے گی اور اگر کسی یونٹ کے پاس اتنی گنجائش نہ ہو تو حکم تھا کہ اس کی قریبی محلے کی انشورنس یونٹ جو ہے اس کے ساتھ تعاون کر کے رقم ادا کرے اور اگر اس کے پاس بھی نہ ہو تو دوسری یونٹ سے انتظام کیا جائے۔ جب ساری آبادی کی انشورنس یونٹیں بھی بار نہ اٹھا سکیں تو ایسی صورت میں مرکزی حکومت بھی مدد کرے گی۔ یہ ایک خاص نظام تھا جو مدینہ منورہ میں قائم کیا اور اس دستور کے اندر ضبط تحریر میں لے لیا گیا۔ غرض سرکاری طور پر حدیث کے لکھوانے کی ایک مثال یہ دستور مملکت مدینہ کی دستاویز بھی ہے۔ ان ابتدائی کاموں میں ایک اور چیز یہ ہے کہ جب مہاجرین کی بسر و بود کا انتظام مواخات کے ذریعے کر دیا گیا اور اس کے بعد شہری مملکت وجود میں آ گئی یعنی ایسی مملکت جس کا رقبہ صرف ایک شہر تھا اور اس کے اندر عدالت اور قانون غرض ساری چیزوں کا انتظام کر دیا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی پر اکتفا نہیں فرماتے ہیں، آپ مکہ کے الٹی میٹم کے جواب میں ایک اقدام فرماتے ہیں وہ اقدام یہ تھا، کہ مدینہ منورہ کے اطراف کا آپ دورہ شروع کر دیتے ہیں۔ مثلاً شمال کی طرف جاتے ہیں وہاں کے قبیلوں سے کہتے ہیں تم اس وقت ایک آزاد قبیلہ ہو اور خود مختار ہو، لیکن دشمن سے مقابلہ ہو تو تنہا ہو گے۔ کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ ہم دونوں میں ایک حلیفی معاہدہ ہو جائے۔ تم پر کوئی دشمن حملہ کرے تو ہم تمہاری مدد کو دوڑیں گے، اگر ہم پر کوئی دشمن حملہ کرے اور ہم تمہیں بلائیں تو تم بھی ہماری مدد کو آنا۔ یہ بات ان کے دل کو لگی اور ان کے ساتھ معاہدہ ہو گیا۔ یہ معاہدہ تحریری طور پر عمل میں آیا اور وہ ہم تک پہنچا ہے۔ پھر آپ مشرق کی طرف جاتے ہیں، پھر جنوب کی طرف، غرض مختلف علاقوں میں، مدینہ کے اطراف میں وقتاً فوقتاً دورہ کر کے ہجرت کے پہلے اور ہجرت کے دوسرے سال مختلف غیر مسلم قبائل سے حلیفی کے معاہدے کیے گئے اور یہ معاہدے تحریری صورت میں لائے گئے اس کے بعد اس کا سلسلہ اور چلتا رہا۔ غرض یہ ابتدائی نظام تھا کہ ایک طرف مدینے کے اندر امن و امان کا اور یکجہتی کا انتظام کیا جائے اور مدینے کے اطراف میں دوست قبائل کا جال پھیلا دیا جائے تاکہ دشمن اگر حملہ کرے تو اولاً اسے ہمارے آس پاس کے قبیلوں سے جنگ کرنا پڑے اور ہم محفوظ رہیں، یہ سیاسی تدبیر تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اور جس کے سلسلے میں تحریر کا بار بار ذکر آیا ہے۔

اس کے بعد اور بے شمار چیزیں ایسی ملتی ہیں جو تحریراً عمل میں آئیں ان میں سے بعض چیزیں پرائیویٹ ہیں۔ مثلاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک غلام خریدتے ہیں اس کا پروانہ موجود ہے کہ میں نے یہ غلام فلاں شخص سے خریدا، اتنی رقم دی گئی یا ایک غلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آزاد فرماتے ہیں، اسے آزادی کا تحریری پروانہ دیا جاتا ہے کہ فلاں شخص کو آزاد کیا جاتا ہے، اسے سب تسلیم کرلیں کہ یہ شخص آزاد ہے، اب آئندہ اسے غلام نہ قرار دیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ ایک اور چیز ذرا بعد کی ہے غالباً ۸ ہجری میں رسول اللہ ﷺ ایک شخص کو خط لکھتے ہیں کہ "جیسے ہی یہ پیغام رساں پہنچے زمزم کا پانی صبح ہو کہ شام فوراً اس کے ہاتھ مجھے بھیجو"۔ اسی طرح مثلاً جب اسلامی مملکت توسیع پاتی ہے تو مختلف اضلاع اور صوبوں کے گورنروں کے نام پروانے بھیجے جاتے ہیں کہ فلاں کام انجام دو۔ یا گورنر خود دریافت کرتا ہے کہ اس خاص صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ تو اس کا جواب مدینہ سے بھیجا جاتا ہے۔ غرض سرکاری تحریروں کی کثیر تعداد ہے اور اس وقت ان کی تعداد جو ہم تک پہنچی ہے، کم سے کم چار سو مکتوبات نبی پائے جاچکے ہیں جن میں کچھ تبلیغی بھی ہیں۔ مثلاً قیصر و کسریٰ کو دین اسلام کی دعوت دی گئی ہے۔ کچھ حلیفی کے معاہدے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اب تحریری حدیث کا دوسرا پہلو لیجئے یعنی وہ حدیثیں جو سرکاری تحریریں نہیں ہیں بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اسے نجی طور پر مرتب کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ عام طور پر صحابہ کرامؓ امی تھے۔ لکھنا پڑھنا انہیں نہیں آتا تھا لیکن اچھے مخلص مسلمان ضرور تھے۔ جب مدینہ میں ہوتے تو اکثر مسجد نبوی میں حاضر ہوتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو سنتے، اس پر عمل کرتے۔ لیکن ایک واقعہ ایسا پیش آیا جو غالباً آغاز ہے حدیث کے مدون کرنے کا۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک دن ایک صحابیؓ آئے، ان کا نام بیان نہیں ہوا ہے۔ ترمذی میں یہ حدیث موجود ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا "یا رسول اللہ ﷺ! آپ روزانہ جو چیزیں ہمیں بیان کرتے ہیں وہ بے حد دلچسپ، بے حد اہم اور ضروری ہوتی ہیں لیکن میرا حافظہ کمزور ہے، میں انہیں بھول جاتا ہوں، کیا کروں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں الفاظ فرمائے "استعن بیمینك" (اپنے سیدھے ہاتھ سے مدد لو) یعنی لکھ لیا کرو۔ غالباً انہوں نے اس اجازت سے فائدہ اٹھایا ہوگا اور لکھا ہوگا۔ ہمیں، بعد میں کیا ہوا، اس کے متعلق تفصیل نہیں ملتی۔ بعد میں ایک دوسرا واقعہ جو غالباً اسی حکم اور "استعن بیمینک" کے الفاظ کا نتیجہ سمجھنا چاہیے وہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ہے۔ یہ نوجوان تھے غالباً سولہ سترہ سال کی عمر ہوگی۔ بے حد ذہین، بے حد دیندار اور علمی ذوق رکھنے والے تھے۔ ان کے علمی ذوق کا اندازہ اس سے کیجئے کہ بعد میں انہوں نے سریانی زبان بھی سیکھی اور وہ عیسائیوں کی دینی کتاب انجیل کو سریانی زبان میں پڑھ بھی سکتے تھے۔ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت بھی دی تھی کہ اپنے علمی مشاغل جاری رکھیں۔ یعنی قرآن کے ساتھ ساتھ بائیبل بھی پڑھ سکتے

ہیں۔ غرض عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب یہ سنتے ہیں کہ فلاں شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "استعن بیمینک" تو انہوں نے خود لکھنا شروع کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ بھی سنتے اسے فوراً نوٹ کر لیتے تھے۔ دو چار دن غالباً اسی طرح کا واقعہ گزرا ہو گا، پھر ان کے دوستوں نے ان سے کہا "اے عبداللہ یہ تم کیا کر رہے ہو؟ رسول اللہ ﷺ بشر ہیں، کبھی خوش ہوتے ہیں، کبھی خفا ہوتے ہیں، تم ان کی ہر چیز نوٹ کرتے جا رہے ہو، یہ مناسب نہیں۔ کوئی اور شخص ہوتا تو وہ ان کے کہنے پر عمل کرتا اور اسے چھوڑ دیتا، مگر وہ ذہین تھے۔ انہوں نے سوچا کہ بجائے ان سے مشورہ لینے یا ان کی بات ماننے کے کیوں نہ براہ راست اصل سے رجوع کیا جائے۔ ان کے استفسار پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ضرور لکھو۔ اطمینان کے لیے وہ پوچھتے ہیں کہ کیا اس وقت بھی جب آپ خفا ہوں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب یہ ہے "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، یہاں سے جو چیز نکلتی ہے (اپنے منہ کی طرف اشارہ فرمایا) وہ حق ہی ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ پورے اطمینان کے ساتھ حدیثوں کو لکھتے رہے۔ بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے مجموعہ احادیث میں کوئی دس ہزار حدیثیں تھیں اور اس کے بعد ان کے بیٹے اور ان کے پوتے اس قلمی نسخے کی مدد سے دوسرے لوگوں کو حدیث کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ عمرو بن شعیب بن عبداللہ بن عمرو بن العاص مشہور محدث گزرے ہیں۔

ایسی اور بھی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً ابو رافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک آزاد شدہ غلام تھے وہ بھی ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کے پاس آکر کہتے ہیں کہ کیا میں آپ کی حدیثوں کو لکھ سکتا ہوں؟ حضور نے انہیں بھی اجازت دے دی۔ انہوں نے بھی مجموعہ تیار کیا ہو گا۔ ان میں سب سے اہم حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ ان کا قصہ یہ ہے کہ ہجرت کے وقت ان کی عمر دس سال کی تھی۔ بہت کم سن بچے تھے لیکن ایک ایسے بچے جس کے والدین نہایت مخلص مسلمان تھے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود فرماتے ہیں کہ جب مدینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو میری والدہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر جا کر حضور کے سامنے پیش کیا اور بہت ہی فخر کے ساتھ کہنے لگیں "یارسول اللہ ﷺ! میرا بچہ لکھنا پڑھنا بھی جانتا ہے" ٹھیک اسی طرح جیسے آج ہم آپ کہیں کہ میرا بیٹا ڈاکٹریٹ یعنی پی ایچ ڈی کی ڈگری لے چکا ہے غرض بڑے فخر سے بیان کرتی ہیں اور پھر کہتی ہیں "یارسول اللہ ﷺ! میری عزت افزائی کا باعث ہو گا کہ اگر اسے آپ خادم کے طور پر قبول کر لیں۔" حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میری والدہ کی درخواست کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول کیا چنانچہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان میں آپ کی وفات تک رہا۔ اس دس سال کے عرصہ میں ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری و باطنی زندگی کو دیکھتا۔ مسجد میں آپ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے ہیں وہ بھی دیکھتا، مکان کے اندر اپنی ازواج مطہراتؓ سے کس طرح برتاؤ کرتے ہیں، کیا کھاتے ہیں، کس طرح سوتے ہیں، غرض ہر چیز کا میں مشاہدہ کر سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ سہولت، جو ان کو حاصل تھی بڑے سے بڑے صحابہ مثلاً حضرا بو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی میسر نہیں آسکتی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو اس قدر قریب سے دیکھیں۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کے زمانے میں مسلمانوں کی جماعت کی تعداد بڑھی اور انہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوا تو میرے پاس بہت سے شاگرد آیا کرتے تھے۔ اس بارے میں ان کی روایت کے دو الفاظ ہیں "اذا کثروا" (جب ان کی تعداد زیادہ ہوتی) اور "اذا اصروا" (اور جب وہ زیادہ اصرار کرتے) بہر حال جو بھی صحیح ہو، حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ایسے موقع پر میں ایک صندوق میں سے ایک پرانا رجسٹر یا پرانی کتاب نکالتا اور اپنے شاگردوں کو بتاتا اور کہتا کہ یہ وہ چیز ہے جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نوٹ کی ہے اور اسے رسول اللہ کے حضور میں وقتاً فوقتاً پیش بھی کیا ہے۔ میری تحریر میں اگر کوئی کمی یا غلطی ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اصلاح فرما دیتے۔ یہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مجموعہ ہے جو یقیناً کئی ہزار حدیثوں پر مشتمل ہو گا۔ یہ ایک ایسی حدیث کی کتاب کہی جا سکتی ہے جو صحیح ترین حدیث کی کتاب ہے، کیونکہ لکھنے کے بعد خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر نظر ثانی فرماتے، یعنی سن کر اس کی اصلاح فرماتے ایسی اور مثالیں بھی ملتی ہیں۔ غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں، ان کی اجازت سے، ان کے حضور میں حدیث کی تدوین ہو رہی تھی۔ بخاری شریف میں دو ہزار سے زیادہ حدیثیں نہیں ہیں جبکہ بعض روایات کے مطابق حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مجموعہ احادیث میں دس ہزار حدیثیں تھی۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کتنی کثیر حدیثیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تحریری طور پر مدون ہو چکی تھیں۔ بد قسمتی میں وہ سب کی سب کتابی صورت میں ہمارے پاس نہیں پہنچیں بعد کے مؤلفوں نے ان کو تتر بتر کر دیا ہے۔ یعنی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیثوں میں سے ایک حدیث کو ایک باب میں دوسری حدیث کو دوسرے باب میں تحریر کیا ہے۔ اس طرح ان کا جو اصل مجموعہ تھا وہ ہم تک نہیں پہنچ سکا۔ بہر حال یہ بالکل واضح ہے کہ عہد نبوی میں حدیثوں کی جمع و تدوین کا آغاز ہو چکا تھا اور اس میں اضافہ بھی ہوتا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہم کو ایسے صحابہ کی تعداد روز افزوں نظر آتی ہے جو اپنی یادداشتوں کو مدون کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں انہیں خیال نہیں آیا، اب انہیں احساس ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باقی نہ رہے میں بھی آج نہیں کل مرنے والا ہوں، اگر میں اپنی یادداشتوں کو محفوظ نہ کر سکا تو یہ سب ضائع

ہو جائیں گی۔ کم از کم میں خود اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات تحریر کر لوں۔ چنانچہ ایسی متعدد کتابوں کا ذکر حدیث کی کتابوں میں آتا ہے۔ حضرت سمرہ بن جندب، حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسرے بہت سے صحابہ تھے جنہوں نے کتابیں اور رسالے لکھ ڈالے۔ ان مجموعہ ہائے حدیث میں سے ایک کے متعلق ابن حجر نے لکھا ہے "فیہ علم کثیر" (اس میں بہت علم ہے)۔ ایک اور رسالے کے متعلق لکھا ہے کہ بہت ضخیم تھا۔ یہ جمع حدیث کی ایک صورت ہوئی۔ ایک دوسری صورت تدوین حدیث کی یہ ہے کہ لوگ صحابہ سے لکھ کر پوچھتے تھے۔ مثلاً ایک شخص کو کسی مسئلے کے متعلق کچھ دریافت کرنا ہے تو وہ کسی بزرگ صحابی کو اس خیال سے ممکن ہے وہ جانتے ہوں ایک خط لکھتا ہے۔ وہ صحابی جواب میں حدیث لکھ بھیجتے ہیں کہ ہاں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے یا رسول اللہ کو یہ کرتے دیکھا ہے۔ غرض خط و کتابت کے ذریعے سے حدیث کی تدوین اور حدیث کی تعلیم کا یہ سلسلہ ہمیں نظر آتا ہے اور اس میں ایسی بڑی شخصیتیں بھی ہیں جیسے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ان کے ہاں اکثر خطوط آیا کرتے تھے اور وہ جواب لکھوا کر بھیجتیں۔ حضرت عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ دوسرے صحابی ہیں اور ان کے متعلق صحیح بخاری میں یہ مذکور ہے کہ ان کے پاس ایک خط آیا جس کا انہوں نے جواب لکھ بھیجا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی یہی حال تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے خلیفہ وقت ان سے لکھ کر دریافت کرتے کہ اس بارے میں آپ کی کیا معلومات ہیں۔

اب میں ایک اور خاص پہلو کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے جب حدیثوں کو اس طرح لکھ کر مدون کرنا شروع کیا اور اس کی تعلیم اپنے زمانے کے نوجوان مسلمانوں کو دینے لگے تو ابتداءً صحابہ کے ناموں کے تحت حدیثیں مدون ہوئیں۔ مثلاً میں اپنے شہر میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی کے پاس جا کر سبق لیتا ہوں اور ان سے سنی ہوئی حدیثوں کو جمع کرتا ہوں۔ دوسرے شہر میں رہنے والے صحابہؓ سے مجھے استفادہ کا موقع نہیں ملتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابتداءً صحابہ وار حدیثیں جمع ہوتی رہیں۔ صحابہ کے بعد کے دور میں ایک شخص کئی استادوں سے سے درس لیتا ہے۔ مثلاً وہ ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شاگرد سے درس لینے اور ان کی روایت کردہ ساری حدیثوں کو قلم بند کرنے کے بعد ایک دوسرے صحابی کے شاگرد کے پاس جاتا ہے اور ان سے ان کی حدیثیں سنتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ دو تین نسلوں کے بعد ساری حدیثیں علماء کے علم میں آ گئیں۔ ایک اور چیز کا ذکر کرتا چلوں جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق ہے اور ان کا قصہ بہت دلچسپ ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایسے صحابی ہیں جو دیر سے مسلمان ہوئے یعنی سنہ ۷ ہجری میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تین چار سال پہلے اسلام لائے۔ اس

کے باوجود ان سے بے شمار حدیثیں مروی ہیں۔ اس کی وجہ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ "دیگر صحابہ مثلاً ابو بکر، عمر، عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور فلاں فلاں صحابی سارا دن اپنے کاروبار میں لگے رہتے، اپنی تجارت اور اپنی دکان میں مصروف رہتے۔ میں پیٹ بھر ابن کر مسجد نبوی کے اندر پڑا رہتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو سننے کا جتنا موقع مجھے ملتا، اتنا بڑے بڑے صحابہ کو بھی نہ ملتا، ان کا حافظہ بھی بڑا اچھا تھا، علمی ذوق بھی تھا، لکھنا بھی آتا تھا۔ انہوں نے بہت سی حدیثیں لکھیں۔ چنانچہ ان کے ایک شاگرد حسن بن عمرو بن امیہ ضمری نے ایک دن غالباً حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پیرانہ سالی کے زمانے میں، اپنے استاد سے کہا کہ "استاد، آپ نے فلاں چیز بیان کی تھی" انہیں یاد نہیں تھا مکر گئے۔ نہیں صاحب میں نے کبھی یہ نہیں کہا ایسی کوئی حدیث مجھے بالکل یاد نہیں۔ نہیں استاد، آپ نے ہی ہم سے یہ چیز بیان کی ہے۔ اس پر ان کا بیان ہے کہ استاد نے میرا ہاتھ پکڑا، اپنے گھر کی طرف چل دیے اور راستے میں یہ کہتے چلے کہ اگر واقعی میں نے وہ حدیث تم سے بیان کی ہے تو وہ میرے پاس تحریری صورت میں موجود ہونی چاہیے۔ چنانچہ گھر لائے، اپنی الماری سے ایک جلد نکالی ورق گردانی کی مگر نہیں ملی پھر دوسری جلد اور پھر تیسری جلد میں نظر دوڑائی۔ پھر اس کے بعد یک بہ یک خوشی کی حالت میں پکار اٹھے کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ اگر میں نے بیان کیا ہے تو وہ میرے ہاں تحریری صورت میں موجود ہونا چاہیے۔ دیکھو یہ موجود ہے۔ ٹھیک ہے۔ ابن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کے مزید بر آں الفاظ یہ ہیں: "ارانا کتبا کثیرۃ من الحدیث" (ہمیں ابو ہریرہ نے حدیث کی بہت سی کتابیں دکھائیں) یعنی میں نے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بہت سے کتابیں ان کے گھر کے کتب خانے میں دیکھیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا طرز عمل عالمانہ اور بہت دلچسپ تھا۔ ان کے پاس جو شاگرد آتے، سارے شاگردوں کو وہ ایک ہی چیز نہیں پڑھاتے تھے۔ ہر شاگرد کو الگ الگ حدیثیں پڑھاتے تھے۔ چنانچہ جب ہمام بن منبہ ان کے پاس آتے ہیں تو ان کو ایک خصوصی رسالہ سوڈیڑھ سو حدیثوں کا مرتب کر کے دیتے ہیں۔ جو "صحیفہ ہمام بن منبہ" کہلاتا ہے۔ ایک دوسرا شاگرد آتا ہے، اس کے لیے ایک نیا مجموعہ تیار کرتے ہیں جو اس شاگرد کے نام سے منسوب ہوا۔ غرض حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ ہزاروں حدیثیں انہیں حفظ تھیں اور اپنے متعدد شاگردوں کو انہوں نے جو رسالے لکھ دیے تھے وہ آج تک محفوظ چلے آرہے ہیں۔

بعض حدیثوں میں ذکر ملتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ حدیث کو مت لکھو اور بعض حدیثوں میں جن کا میں نے ابھی ذکر کیا، صراحت کے ساتھ حکم ہے کہ اپنے دائیں ہاتھ سے مدد لو یعنی انہیں ضرور لکھو کیونکہ اس منہ سے کوئی چیز جھوٹی نہیں نکل سکتی۔ ان باتوں کے تضاد کو کیسے دور کریں گے؟ اس بارے میں اب ہمارے لیے کوئی دشواری باقی نہیں رہی۔ مختصر قصہ یہ ہے کہ

ایسے متعدد صحابہ ملتے ہیں جن کا بیان ہے کہ حدیث کو نہیں لکھنا چاہیے۔ لیکن وہ اس امر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کرتے کہ رسول اللہ نے کہا کہ حدیث کو مت لکھو۔ جو صحابی اپنی رائے بیان کرتے ہیں اس پر ہمیں بحث کرنے کی ضرورت نہیں لیکن جو صحابہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ حکم دیا کہ نہ لکھیں، اس پر ہمیں غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ان میں تین صحابی ملتے ہیں، ایک حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، خود انہوں نے حدیث کی کثیر کتابیں لکھ رکھی تھیں، دوسرے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں اور تیسرے ابو سعید الخذری رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ جہاں تک زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کا تعلق ہے ہمارے ماہرین حدیث اس کو رد کر دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ درمیان کے راوی ثقہ نہیں ہیں۔ انہوں نے غلطی کی ہے۔ علم حدیث کے اصول کی رو سے یہ حدیثیں قابل قبول نہیں ہیں۔ صرف ابو سعید الخذری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث اصول کی رو سے بہت اہم ہے کیونکہ "صحیح مسلم" جیسی حدیث کی صحیح کتاب میں یہ موجود ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے کہا کہ مجھ سے کوئی حدیث نہ لکھو اور اگر لکھ چکے ہو تو اسے مٹا ڈالو۔ اس حدیث کی موجودگی میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کسی سیاق و سباق context میں خاص حکم سے متعلق تھا یا کوئی عام حکم تھا؟ ہمارے دوست، مصطفیٰ الا عظمی حدیث کے ایک ماہر استاد، جو آج کل ریاض یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، انہوں نے ایک دلچسپ تحقیق کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "صحیح مسلم" میں جو حدیث آئی ہے امام بخاریؒ اسے رد کر دیتے ہیں۔ امام بخاری کہتے ہیں کہ یہ غلط فہمی پر مبنی ہے۔ حقیقت میں یہ ابو سعید الخذری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذاتی رائے تھی جو کسی درمیانی راوی کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو گئی ہے۔ ان حالات میں ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم کہ حدیثیں نہ لکھو، اس کا اصول حدیث کی رو سے کوئی ثبوت نہیں۔ اگر فرض بھی کر لیں کہ کسی وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی تھی تو اس کا حل آسان ہے غالباً کسی خاص سیاق و سباق context میں یہ حکم صادر ہوا تھا کہ کیونکہ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مثال موجود ہے۔ وہ نہایت ہی دین دار اور حدیث پر عامل شخص تھے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعی ممانعت کی ہوتی تو وہ کبھی جسارت نہ کرتے کہ حدیث کی بہت سی کتابیں خود لکھ ڈالیں۔ ممکن ہے کس وجہ سے منع کیا گیا ہو اور اس واقعہ کے مطابق اسے نہ لکھا گیا ہو۔ مثلاً ایک معین دن کی حدیثوں کو نہ لکھا اور بعد میں عام اجازت کے تحت لکھ ڈالا۔ غرض کوئی خاص سیاق و سباق ہو گا۔ مثلاً کسی دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسا کہ حدیث میں اس کا ذکر آتا ہے، قیامت تک پیش آنے والے واقعات کو مسلمانوں سے بیان فرمایا کہ تم فلاں ملک فتح کرو گے، ایسے علاقوں میں جاؤ گے، ایسے ایسے امور پیش آئیں گے۔ غرض کبھی قیامت تک پیش آنے والی باتوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا۔ اس سلسلے میں یہ بیان بھی موجود ہے کہ بعض صحابہ نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! جب یہ مقدر ہیں تو پھر ہمیں کوشش کرنے کی

کیا ضرورت ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوشش کرنا بھی مقدر ہے، ایسا کرنا پڑے گا۔ ممکن ہے اس دن حضورؐ نے فرمایا ہو کہ ان باتوں کو مت لکھو کیونکہ بعض صحابہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر یہ کہہ دیتے تھے کہ جب مقدر ہو چکا ہے تو کوشش کرنے کی کیا ضرورت؟ یا کوئی اور وجہ ہوئی ہو گی۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف بھی بعض کتابیں منسوب ہوئیں۔

ایک آخری نکتہ ہے جس پر میں اس تقریر کو ختم کرتا ہوں، وہ یہ کہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے مقرب ترین صحابہ نے حدیث کے متعلق کیا کام کیا؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق یہ روایت ملتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد، انہوں نے اپنی بقیہ مختصر زندگی کے دو ڈھائی سال کے عرصے میں حدیث کا ایک مجموعہ تیار کیا۔ جس میں پانچ سو حدیثیں تھیں۔ لکھنے کے بعد ان کو وہ اپنی بیٹی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سپرد کرتے ہیں۔ میرا گمان یہ ہے کہ شاید بیٹی ہی نے فرمائش کی ہو کہ "ابا جان مجھے کچھ حدیثیں کتابی صورت میں لکھ دیجئے" کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو علم کا بے پناہ ذوق و شوق تھا۔ بیٹی کی تمنا پر حدیثیں مرتب کیں اور انہیں دے دیں۔ مگر اس رات کو وہ حضرت عائشہ ہی کے مکان میں لیٹے اور سو نہ سکے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں کہ میرے ابا جان ساری رات کروٹیں بدلتے رہے، مجھے ذرا خوف ہوا کہ وہ بیمار ہیں۔ صبح کو بھی میں نے جسارت نہیں کی کہ خود پوچھوں کہ کیا آپ بیمار ہیں۔ خود ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ "بیٹی! میں نے تمہیں جو کتاب دی ہے وہ لے آنا۔ میں لائی تو اسے فوراً پانی سے دھو کر مٹا دیا اور کہا "اس میں بعض حدیثیں وہ ہیں جو میں نے خود سنی ہیں"۔ ان کے متعلق مجھے یقین ہے۔ بعض کو میں نے کسی اور صحابی سے سنا تھا۔ مجھے جھجک اور خوف ہے کہ شاید وہ الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہ ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ رسول اللہ کی طرف کوئی ایسا لفظ منسوب کروں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نہ ہو اور کسی بالمعنی روایت کے تحت آیا ہو۔ مگر اس حدیث کا یہ پہلو بہت اہم ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث لکھنے کی ممانعت کی ہوتی تو یقیناً حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس سے واقف ہوتے اور وہ لکھنے کی جسارت نہ کرتے۔ لکھنے کے بعد آپ کا مٹانا اس بناء پر نہیں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت کی تھی بلکہ اس بناء پر تھا کہ انہیں خوف تھا کہ کہیں صحیح حدیث میں کمی بیشی نہ ہو جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق بھی ایسی ایک روایت ملتی ہے۔ ایک زمانے میں انہوں نے حدیث کو مدون کرنے کی کوشش فرمائی تھی۔ انہوں نے لوگوں کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ سب کا مشورہ یہی تھا کہ "لکھنا چاہیے" مگر کافی عرصہ بحث مباحثہ اور مشورہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ نہیں لکھنا چاہیے۔ اور کہا کہ ہم سے پہلے کی امتوں نے انبیاء کے اقوال پر عمل کیا،

ان کو محفوظ رکھا لیکن خدا کی نازل کردہ کتاب کو بھول گئے۔ اس کی تحریفیں ہونے لگی۔ میں نہیں چاہتا کہ قرآن کے متعلق بھی یہ سانحہ پیش آئے۔ اس طرح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حدیث کی تدوین کا جو ارادہ فرمایا تھا، اس سے یہ یقینی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی ممانعت نہیں ہوئی ورنہ وہ لکھنے کا ارادہ نہ کرتے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نہ لکھنے کی وجہ ایک دوسری ہی تھی کہ لوگ قرآن سے غافل نہ ہو جائیں۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانے میں ایک دن فرمایا: "جسے ایک درہم خرچ کرنے کی توفیق ہے وہ کاغذ خرید لائے، میں حدیثیں لکھواتا ہوں، لکھ لے، ان کے ساتھیوں میں سے ایک صاحب بازار جا کر ایک درہم میں کاغذ کی ایک گڈی خرید لائے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بہت سی چیزیں لکھوائیں اور وہ ان کے پاس محفوظ رہیں۔ اس قصے سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث لکھنے کی ممانعت نہیں کہ ورنہ حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم جیسے اصحاب کبار حدیث لکھنے یا لکھوانے کی جسارت نہیں کر سکتے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## سوالات وجوابات

**سوال ا:** مسلمانوں کی حدیث کی کتابوں میں اختلاف کیوں ہے۔ مثلاً اہل سنت کے نزدیک "صحاح ستہ" اور دوسری کتب ہیں، لیکن اہل تشیع ان سب کے منکر ہیں، اور ان کی اپنی حدیث کی کتب ہیں۔ اس اختلاف کی وجہ نیز "حق" کی وضاحت فرمائیں؟

**جواب:** آپ نے بڑا مشکل سوال کیا ہے۔ اگر ایک ہی فرقے کی چیزیں ہوں تو آدمی آسانی سے جواب دے سکتا ہے۔ جب فرقہ داری مسئلہ بن جائے تو میں ہمیشہ اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں ایک فرقے سے تعلق رکھوں اور دوسرے فرقے پر اعتراض کروں خاص کر اس کی غیر موجودگی میں کہ اسے جواب کا موقع نہ ہو تو یہ علمی نقطہ نظر سے ٹھیک نہیں ہوتا۔ بہر حال جس حد تک ممکن ہے مختصر الفاظ میں آپ کو اس کا جواب دیتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے تھوڑی دیر پہلے اشارۃً ذکر کیا، حدیثوں کو مدون کرنے اور اس کو محفوظ کر کے ایک نسل کے بعد دوسری نسل تک پہنچانے کا عمل سرکاری نگرانی میں نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہوا، نہ خلفائے راشدین کے زمانے میں بلکہ پرائیوٹ طور پر مختلف افراد اپنی ذاتی ذمہ داری پر یہ کام کرتے رہے۔ پھر ایک استاد کے درس میں آنے والے بالفرض دس پندرہ شاگرد تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کی صلاحیتیں یکساں نہیں ہو سکتیں۔ ایک ہی استاد کی بیان کردہ حدیث کو اس کے سامعین میں سے وہ شخص روایت کرتے ہیں اور اس انفرادی فرق کی وجہ سے اس میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ایک فطری امر ہے جس کو روکا نہیں جا سکتا۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ بعض وقت لفظ بہ لفظ حدیث کی روایت کرنے کی جگہ اس کا خلاصہ یا اس کا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔ ایسے نازک مقامات بھی آتے ہیں کہ لفظ کے بدلنے سے مفہوم میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک آدمی کا حافظہ اچھا ہوتا ہے، دوسرے کا حافظہ کمزور ہوتا ہے یا کسی ایک شخص کا ایک زمانے میں حافظہ ٹھیک ہے، اس کے بعد مثلاً بڑھاپے کی وجہ سے اس کا حافظہ کمزور ہو گیا ہے اور اس کے باوجود اپنے تدریسی کام کو جاری رکھتا ہے۔ انہی وجوہ سے حدیثوں میں باہم تضاد بھی نظر آ سکتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو وہی ہے کہ راوی سے غلطی ہوئی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداً ایک حکم دیا اور بعد میں اسے کسی نہ کسی وجہ سے منسوخ کر دیا اور نیا حکم دیا۔ ان حالات میں "الف" صحابی کے پاس پہلے دن کی

بات تو موجود ہے لیکن دوسرے دن کی بات یا دوسری مرتبہ بیان کی ہوئی بات موجود نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی بیان کردہ حدیث اور دوسرے شخص یعنی بعد والے صحابی کی بیان کردہ حدیث میں اختلاف ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بعض وقت امت کی صلاحیتوں کے پیش نظر یا کسی خاص سیاق وسباق میں ایک حکم دیا جاتا ہے اور بعد میں اسے بدلنا پڑتا ہے۔ اس کی ایک مثال میں عرض کر چکا ہوں یعنی کھجور کے نر اور مادہ پھولوں کو ملانے کا مسئلہ۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداً صراحت کے ساتھ اس کا حکم دیا، بعد میں صراحتاً اسے منسوخ بھی فرمایا۔

ایک اور مثال اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ قبر پرستی انسانی سوسائٹی میں ایک عام مرض رہا ہے۔ عرب میں بھی اسلام سے پہلے اس کا رواج تھا، آج بھی ہم میں پایا جاتا ہے۔ غالباً اس کو روکنے کی غرض سے (تا کہ آدمی قبر میں سونے والوں سے مانگنے کی بجائے خدا سے مانگے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت ہی کی ممانعت فرمادی۔ کچھ عرصہ بعد ان الفاظ کے ساتھ اس کی مکرر اجازت دے دی۔ "كنت نهيتكم عن زيارة القبور الا فزوروها" (میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا، سنو! اب تم زیارت کر سکتے ہو) اس دوسرے حکم کی وجہ یہ نہیں تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے بدل گئی بلکہ یہ کہ سیاق وسباق بدل گیا۔ قبر پرستی سے بے شک روکنا چاہتے تھے لیکن قبرستان میں جانے سے جو عبرت ہوتی ہے، یعنی ہم سوچتے ہیں کہ ہمیں بھی ایک روز مرنا ہے تو کیا ہمیں اس کے لیے تیار نہیں ہونا چاہیے؟ کیا ہمیں جھوٹ، دغابازی اور فریب وغیرہ پر ہی قائم رہنا چاہیے؟ تو عبرت حاصل کرنے کی خاطر آپ نے اجازت دے دی۔ غرض حدیث میں اختلاف ایک طرف فرقہ وارانہ ہے اور دوسری طرف ایک فرقے کے اندر بھی ہے۔ ان دشواریوں کو دور کرنے کے لیے ماہرین علم حدیث نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اس کو انہوں نے مختلف تدبیروں کے ذریعہ سے حل کیا، مثلاً ایک خصوصیت جو مسلمانوں ہی میں پائی جاتی ہے دوسری قوموں میں عملاً غیر موجود ہے وہ یہ کہ حوالہ نامکمل نہ ہو۔ مثلاً میں آج سے چودہ سو برس پہلے کی ایک حدیث بیان کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یوں کرو یہ نامکمل حوالہ ہو گا۔ اس کے برخلاف اگر میں بیان کروں کہ میرے استاد "الف" نے کہا کہ اسے اس کے استاد "ب" نے "ج" نے اس طرح تمام استادوں کا نسلاً بعد نسل ذکر کرتے ہوئے کہوں کہ آخری استاد فلاں صحابی نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے تو وہ حوالہ مکمل ہو گا۔ چنانچہ حدیث کی کتابوں میں ہر آدھی سطر یا ایک سطر کی جو حدیث ہوتی ہے، اس کے شروع میں ایک لمبی فہرست ہوتی ہے کہ عن فلاں، عن فلاں عن فلاں۔ مثلاً بخاری جو قدیم ترین مؤلفوں میں سے ایک ہیں، ان کی حدیثیں بعض دفعہ تین درمیانی راویوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی ہیں اور زیادہ سے زیادہ نو تک۔ گویا ڈھائی تین سو سال کے عرصے

میں نو پشتیں راویوں کی آچکی تھیں۔ اس بات کی تحقیق کے لیے کہ حوالہ مکمل ہے یا نہیں، یہ ضروری ہے کہ ہمارے سامنے ایسی کتب ہوں جن میں ہر راوی کی سوانح موجود ہو۔ مثلاً یہ بیان کیا جائے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شاگرد "الف" "ب" "ج" تھے اور پھر میرے سامنے ایک روایت آتی ہے جس میں عن فلاں، عن فلاں، عن فلاں، کرتے ہوئے مثلاً "ب" یا "ج" نامی شخص بیان کرتا ہے کہ "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا" تو اس کتاب کی مدد سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ چونکہ یہ سب راوی ثقہ ہیں اور استاد شاگرد رہے ہیں، اس لیے یہ روایت قابل قبول ہے، یہ بھی کہ ہر ایک کا ذاتی کردار کیسا تھا۔ یا اس کا حافظہ اچھا تھا یا نہیں، یہ بھی کہ اس کے استاد کون کون تھے۔ اور شاگرد کون کون تھے، تاکہ اس قسم کی سوانح عمریوں کی مدد سے ہم استاد کو جانچ سکیں اور یہ معلوم کر سکیں کہ راویوں کی تاریخ کا جو حوالہ دیا گیا ہے وہ واقعی صحیح ہے یا فرضی ہے۔ اس کے بعد علم اصول حدیث وجود میں آیا، جس میں یہ بیان کیا جانے لگا کہ اگر حدیثوں میں ایسی باتیں نظر آئیں جو خلاف عقل ہوں یا حدیثوں میں فلاں فلاں عیب یا کمی ہو، تو ایسی صورتوں میں ہم کیا کریں؟ کس طرح ان گتھیوں کو سلجھائیں! چنانچہ روایت اور درایت کے دو اصول مسلمانوں نے اختیار کیے۔ روایت کے اصول کے مطابق یہ دیکھا جاتا ہے کہ جو لوگ حدیث کو بیان کرتے ہیں آیا وہ بیان کرنے والے فرضی ہیں یا حقیقی، قابل اعتماد ہیں یا جھوٹ بولنے والے ہیں۔ استاد شاگرد ہیں یا نہیں؟ یہ روایتاً حدیث کو کنٹرول کرنے یا جانچنے کا طریقہ ہے۔ درایت کے اصول کے مطابق یہ دیکھا جاتا ہے کہ حدیث میں جو بات بیان کی گئی ہے وہ عقلاً درست ہے یا نہیں۔ فرض کیجئے ایک حدیث میں ذکر آتا ہے کہ مثلاً شہر بہاولپور میں فلاں چیز ہو گی۔ لیکن درایتاً اس زمانے میں شہر بہاولپور موجود تھا ہی نہیں، یہ ذکر کیسے آیا۔ لہٰذا ہم یہ نتیجہ اخذ کریں گے کہ غالباً یہ سہو کتاب ہے، یا یہ کہ حدیث جعلی ہے اس شہر کا نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہاولپور بیان نہ کیا ہو گا، بلکہ اور لفظ ہو گا جو بگڑ کر بہاولپور بن گیا۔ یہ اور اس طرح کی چیزیں ہم درایت سے معلوم کر سکتے ہیں اور ان اصولوں کے مطابق ہم ان دشواریوں کو حل کر سکتے ہیں جو حدیث کے اندر نظر آتی ہیں۔ اسی طرح دو حدیثوں میں اختلاف کا مسئلہ ہوتا ہے۔ ایک میں کہا گیا ہے کہ یہ کام کرو، دوسری میں ہے کہ نہ کرو۔ تو ان دشواریوں کو جن طریقوں سے دور کیا جا سکتا ہے، وہ "علم اصول حدیث" کی کتابوں میں ملتا ہے۔ مثلاً یہ بات ممکن ہے کہ ایک حکم قدیم ہو، دوسرا حکم جدید ہو تو جدید ترین حکم قدیم حکم کو منسوخ کر دے گا۔ یا یہ کہ ایک حکم خاص ہے، دوسرا حکم عام ہے۔ ایک شخص کو یہ کہا گیا کہ یوں کرو یا یوں نہ کرو اور دوسرے لوگوں کو حکم دیا گیا کہ تم یہ کام کر سکتے ہو۔ ایک مثال ذہن میں آتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ چند لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور ایک شکایت کی کہ مدینہ کی آب و ہوا ہمیں موافق نہیں آرہی ہے، ہم فلاں فلاں بیماریوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھا، سرکاری جانوروں کے ریوڑ میں جا کر رہو اور سرکاری اونٹوں اور اونٹنیوں کے دودھ اور ان کے پیشاب پیو۔ بظاہر یہ بات ہمیں حیران کن معلوم

ہوتی ہے کہ پیشاب پینے کا حکم کیسے دیا جا سکتا ہے، جب کہ وہ نجس چیز ہے۔ اس مشکل کا حل ہمیں اصول روایت یا درایت کے ذریعے ملتا ہے اور یہ ٹیکنیکل چیز بھی ہے جو میری آپ کی رائے پر مبنی نہیں، بلکہ طبیبوں اور ڈاکٹروں کی رائے پر مبنی ہوگی۔ مثلاً زہر ہمارے لیے سم قاتل ہے لیکن ایک ڈاکٹر کسی خاص بیماری میں مریض کے لیے زہر ہی تجویز کرتا ہے۔ زہر کے بغیر اس کا کوئی علاج ممکن نہیں۔ اس طرح یہ ممکن ہے کہ کوئی خاص بیماری اونٹوں کے پیشاب کے بغیر دور نہ ہو سکتی ہو۔ جب کوئی اور چارہ کار نہ ہو تو ممنوع اور مکروہ چیزیں جائز ہو جاتی ہیں۔ اونٹنیوں کے پیشاب کے متعلق بعض ہمعصر سیاح بیان کرتے ہیں کہ وہ آج بھی بعض بدوی قبائل میں کچھ مخصوص بیماریوں کے علاج کے لیے مستعمل ہے۔ غرض مختلف طریقے ہیں جن کے ذریعے ہم حدیثوں کی اندرونی دشواریوں کو دور کر سکتے ہیں اور اس سے ہمارے علماء غافل نہیں رہے۔ گزشتہ چودہ سو سال سے وہ اس پر توجہ کرتے رہے ہیں اور ہم آج ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حدیثوں کی صحت کو جانچنے کا جو وسیلہ یا طریقہ ہمارے پاس ہے اس کا عشر عشیر بھی کسی اور قوم میں نہیں پایا جاتا۔ میں اپنے عیسائی بھائیوں کو ناراض کیے بغیر یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی انجیل پر اتنا اعتماد نہیں کیا جا سکتا، جتنا ہماری بخاری، مسلم اور ترمذی پر کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ انجیل کی تدوین، انجیل کا تحفظ، انجیل کا نسل بعد نسل منتقل ہونا، اس طریقے سے عمل میں نہیں آیا جس طریقے سے حدیث کی کتابوں میں عمل ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تین سو سال بعد تک انجیلوں کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں کہ کس نے اس کو لکھا، کس نے اس کا ترجمہ کیا اور کس نے اسے نقل کیا، اصل زبان سے یونانی زبان میں کس کے حکم سے منتقل کیا گیا۔ آیا کاتبوں نے صحت کا التزام رکھا یا نہیں۔ تین سو سال بعد چار انجیلوں کا ذکر ہمیں پہلی مرتبہ ملتا ہے۔ کیا ہم ایسی بلا سند کتاب پر اعتماد کریں یا بخاری پر جو ہر دوسطری بیان کو بھی تین سے لے کر حوالوں تک بیان کرتا ہے کہ رسول للہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان کیا ہے۔ لیکن اس کا ثبوت کیا ہے کہ بخاری نے سچ بیان کیا ہو، ممکن ہے کہ انہوں نے گھڑ لیا ہو اور راویوں سے منسوب کر دیا ہو کہ مجھے "الف" نے "ب" سے اور "ب" نے "د" سے، اسی طرح رسول اللہ تک پہنچا ہو۔ اعتراض عقلاً بالکل صحیح ہے لیکن حقیقتاً بے بنیاد اعتراض ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بخاری سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک جن محدثین نے حدیث کی روایت کی ہے ان کی کتابیں بھی ہمیں موجود ملتی ہیں۔ لہٰذا بخاری پر ہمیں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں نظر آتی۔ مثال کے طور پر بخاری کہتے ہیں مجھے یہ حدیث امام احمد بن حنبل رح نے بیان کی اور کہا کہ مجھے عبدالرزاق بن ہمام نے بیان کی جنھوں نے کہا کہ میرے استاد معمر نے بیان کیا تھا۔ معمر نے کہا کہ مجھے میرے استاد ہمام بن منبہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سن کر بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہا ہے۔ بخاری کی کتاب ہمارے پاس موجود ہے۔ درمیانی روایتوں کا ہمارے پاس کوئی وجود نہ ہو تو ہم علمی نقطہ نظر سے فرض کر سکتے ہیں کہ شاید امام بخاری نے جھوٹ کہا ہو۔ لیکن اگر ہمیں احمد حنبل کی کتاب مل جائے جو امام بخاری کے استاد ہیں اور اس میں من و عن وہی حدیث انہی الفاظ میں

ایک شوشے کے فرق کے بغیر ملے تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ امام بخاری جھوٹے نہیں، کیونکہ احمد بن حنبل کے پاس واقعی وہی حدیث انہیں الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔ امام احمد بن حنبل پر ہم شبہ کر سکتے ہیں۔ اس وقت جب کہ ان کا بیان ہے کہ مجھے عبد الرزاق بن ہمام رح نے بیان کیا تھا اور عبد الرزاق بن ہمام کی کتاب موجود نہ ہو۔ الحمد اللہ! احمد بن حنبل کی "مسند" کی طرح عبد الرزاق بن ہمام کی "مصنف" بھی دنیا میں موجود ہے۔ اب چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔ بعض حدیثوں کے متعلق تلاش کیا گیا کہ یہ کہاں ہیں، وہ بھی بالکل انہی الفاظ میں بیان کرتے ہیں جن الفاظ میں بخاری کے ہاں ہے۔ اسی طرح ان کے استاد معمر بن راشد کی کتاب "الجامع" ہمیں مل گئی ہے۔ اس کے اندر بھی وہی حدیث جو بخاری نے بیان کی تھی انہیں الفاظ میں موجود ہے۔ اسی طرح ان کے استاد ہمام بن منبہ کا "صحیفہ" بھی دستیاب ہو چکا ہے اور چھپ چکا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ امام بخاری نے جو چیزیں بیان کیں وہ بالکل صحیح ہیں، کیونکہ ان کی کتابیں جو بخاری کا ماخذ ہیں دستیاب ہو چکی ہیں اور ان کے اندر وہی الفاظ موجود ہیں۔ ان حالات میں عقل کہتی ہے کہ بے وجہ شبہ کرنا نامناسب بات ہے۔ عقل کا تقاضا ہے کہ ہم یہ تسلیم کر لیں کہ امام بخاری رح کی بیان کردہ حدیث بالکل صحیح ہے۔ پھر کچھ چیزیں ایسی ملتی ہیں جن سے ایک دوسرے کی تصدیق ہوئی۔ مثلاً ایک دوسرے سلسلہ اسناد سے امام ترمذی رح نے وہی حدیث بیان کی ہے تو یہ ناممکن ہے کہ پچاس آدمی جو مختلف ادوار سے متعلق ہیں، جھوٹ پر پیشگی متفق ہو گئے ہوں۔ غرض یہ ٹیکنیکی اصول ہیں جن کا استعمال حدیث کے متعلق کیا گیا ہے اور دنیا کی کوئی کتاب حتیٰ کہ مقدس ترین کتب توریت، انجیل وغیرہ میں بھی التزام صحت کا اتنا خیال نہیں رکھا گیا جتنا حدیث کے متعلق ہمیں ملتا ہے۔ اصولاً یہ بیان صحیح ہے کہ حدیث کی کتابوں میں جو سنیوں کی حدیثیں ہیں اور جو شیعوں کی حدیثیں ہیں، ان میں اختلاف ہو۔ لیکن عملاً ایسا نظر آتا ہے کہ مفروضہ ہی ہے۔ راویوں کا بے شک فرق ہے۔ مثلاً میں حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت پر ایک چیز بیان کرتا ہوں، وہی بات میرا شیعہ بھائی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت پر بیان کرتا ہے، تو یہ مفروضہ کہ شیعہ سنی کی ساری حدیثوں میں فرق ہے، غلط ہے۔ فرق صرف روایت کرنے والوں میں ہے، حدیث کے مندرجات میں فرق نہیں ہے۔ تضاد شاذ و نادر ہو گا۔ اب تک کوئی ایسی خاص چیز ملی بھی نہیں، جس سے یہ کہا جائے کہ شیعہ کتابوں میں الف، چیز کا حکم ہے اور سنی کتابوں میں اس کے بالکل برعکس الف، کی ممانعت کا حکم دیا گیا ہے۔ اختلافی باتیں جو ہمیں نظر آ سکتی ہیں ان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ سنی خاص کر حنفی، شافعی اور حنبلی نمازوں میں ہاتھوں کو سینے پر باندھتے ہیں اور ہمارے شیعہ بھائی ہاتھوں کو چھوڑ کر نماز پڑھتے ہیں۔ یہ اس لیے نہیں کہ حدیثوں میں اختلاف ہے بلکہ اس لیے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اوقات ہاتھ باندھ کر نماز پڑھی۔ بعض اوقات ہاتھ چھوڑ کر پڑھی۔ یہ بات آسانی سے سمجھ میں آتی ہے مثلاً فرض کیجئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنگ میں زخمی ہو گئے اور ہاتھ باندھ نہیں سکتے تھے، کیا کریں، ہاتھ چھوڑ کر ہی پڑھیں گے۔ ایک شخص نے دیکھا کہ رسول اللہ ہاتھ چھوڑ کر نماز

پڑھ رہے ہیں۔ پھر اسے موقع نہیں ملا کہ کچھ عرصہ بعد دیکھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ ہاتھ باندھ کر نماز پڑھ رہے ہیں تو وہ اسی سنت پر عمل کرے گا جس کو وہ دیکھ چکا ہے۔ یہ چیز ایک پہلو سے ہمارے لیے اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔ میرے استاد نے آج سے کوئی ساٹھ پینسٹھ سال پہلے پرائمری اسکول میں یہ نکتہ بیان کیا تھا، جسے میں کبھی بھول نہیں سکتا کہ اللہ کو اپنے حبیبؐ سے جو محبت تھی، اس کی خاطر اللہ نے چاہا کہ اپنے حبیبؐ کی ہر ہر حرکت کو قیامت تک محفوظ رکھے، لہٰذا چند لوگوں کے ذریعہ سے مثلاً شیعہ فرقے کے ذریعے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حرکت محفوظ کرلی گئی۔ کہ ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری حرکت ایک دوسرے گروہ کے ذریعے سے اللہ نے قیامت تک کے لیے محفوظ رکھی۔ اس طرح جو اختلاف عمل میں نظر آتا ہے وہ حدیث کی غلطی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو مختلف زمانوں کے عملوں اور حرکتوں پر مبنی ہے۔ اس لیے ہمیں باہم ایک دوسرے کا متحمل ہونا چاہیے۔ حدیث کے اختلاف پر جھگڑنے کی جگہ یہ فرض کرنا چاہیے کہ اس خاص صورتحال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا تھا۔ دوسری صورتحال (context) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرا حکم دیا۔ ایک دوسری مثال لیجیے، جس کا آج کل اخباروں میں بھی ذکر آتا ہے یعنی "چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹنا" سنیوں کے ہاں پہنچے سے ہاتھ کاٹنے کا ذکر ملتا ہے اور شیعوں کے ہاں ہاتھ کی صرف انگلیاں کاٹنے کا ذکر ملتا ہے۔ مگر یہ خیال نہ کیجئے کہ حدیثوں میں اختلاف ہے، بلکہ سنیوں کے ہاں کی حدیثوں میں بھی اس کا ذکر آیا ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف انگلیوں کو کٹوایا تھا۔ تو ان حالات میں بجائے اس کے کہ اسے فرقہ واری اختلاف قرار دیں ہم ایک دوسرے کا تحمل کریں اور حدیث پر اپنے فرقے کے بیان کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کریں، جو ہماری نجات کے لیے کافی ہے۔ یہ نہیں کہ ان اختلافات کو دور کرنے کی لاحاصل کوشش کریں جو کبھی دور نہیں ہوسکتے۔

**سوال۲:** یہ سوال مکرر ہے کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھی؟ حدیث سے ثابت کریں؟

**جواب:** امام مالکؒ کی کتابیں آپ پڑھیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ وہ اس کا ذکر کرتے ہیں اور وہ حدیث کی بناء پر کرتے ہیں۔ جب کہ امام مالکؒ خود سنیوں ہی کے ایک امام ہیں اور مالکی مذہب کے بانی ہیں۔ یہ لوگ بھی ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتے ہیں۔

**سوال۳:** جو حدیثوں کا رجسٹر حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تیار کیا تھا وہ کب تک موجود رہا اور کب ضائع ہوا؟

**جواب:** مجھے اس کا کوئی علم نہیں۔ صرف یہ حدیث بیان ہوئی ہے کہ انہوں نے ایک مجموعہ تیار کیا تھا اور اسے اپنے شاگردوں تک پہنچایا تھا اور وہ کب ضائع ہوا، اس کا مجھے علم نہیں۔

**سوال۴:** کیا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے جب کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ میں حدیثیں کافی بیان کرتا ہوں مگر عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجھ سے زیادہ جانتے تھے کیونکہ وہ لکھتے تھے اور میں لکھتا نہیں تھا۔

**جواب:** اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہ صرف عربی لکھنا جانتے تھے بلکہ وہ حبشی زبان بھی جانتے تھے، فارسی زبان بھی جانتے تھے، کئی زبانیں جانتے تھے۔ گویا بہت عالم شخص تھے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پہلے لکھنا شروع کیا، ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بعد میں اس کا خیال آیا۔ ظاہر ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس حدیثوں کا زیادہ ذخیرہ تحریری صورت میں جمع ہو گیا اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ان حدیثوں کو جانتے تھے لیکن تحریری صورت میں نہیں تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکی مسلمان ہوئے ہیں۔ لازمی بات ہے کہ وہ شخص جو شروع سے لکھتا رہا ہو اس کے پاس حدیثیں زیادہ ہوں گی اور وہ شخص جسے لکھنے سے تو خوب واقفیت ہے لیکن دیر سے حدیثیں لکھنے کا موقع ملا، اس کے پاس حدیثیں کم ہوں گی۔ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں۔

**سوال۵:** آپ نے ابھی اپنے خطبہ میں فرمایا کہ ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کے سوال کے جواب میں فرمایا، خدا کی قسم! جو کچھ میری زبان سے نکلتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں بولتے جب کہ بعض علماء کے نزدیک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ یعنی ان کی ہر بات درست نہیں، وضاحت فرمائیں؟

**جواب:** میں واضح کر چکا ہوں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی والہام سے کوئی چیز معلوم ہو چکی ہو اور وہ بیان کریں گے تو وحی پر مبنی ہو گی۔ لیکن وحی ابھی آئی نہیں ہے، وحی کے انتظار میں ہیں، فوری معاملہ درپیش ہے تو اجتہاد کریں گے۔ یعنی اپنی رائے سے کوئی حکم دیں گے اور اس کے متعلق وہ حدیث ملتی ہے کہ اگر مجھے وحی آچکی ہوتی تو میں تم لوگوں سے مشورہ نہ کرتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض وقت وحی کا انتظار رہتا تھا اور فوری ضرورتوں سے وہ خود اجتہاد کر کے اپنے فہم و فراست سے احکام دیا کرتے تھے اور ان احکام میں بعض وقت وحی کے ذریعہ سے تنسیخ بھی ہو جاتی ہے۔ اس ضمن میں یہ مثال ملاحظہ ہو کہ جنگ کے قیدیوں سے کیا برتاؤ کیا جائے؟

جنگ بدر کے موقع پر یہ معاملہ پیش آیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی وحی کی غیر موجودگی میں اور انتظار میں صحابہ سے مشورہ کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مشورہ دیا کہ ان سب کا سر قلم کر دیا جائے، یہ کبھی مسلمان نہیں ہوں گے۔ اسلام کے ازلی وہ ابدی دشمن ہیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا نہیں، آج وہ مسلمان نہ ہوں لیکن ممکن ہے ان کے بچوں میں سے کوئی مسلمان ہو جائے۔ میری رائے میں ان کو قتل نہیں کرنا چاہیے۔ ہماری دوسری ضرورتیں ہیں، انہیں فدیہ لیکر رہا کر دیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشورے کو قبول کیا اور وہی حکم دیا کہ انہیں قتل نہ کیا جائے بلکہ فدیہ لیا جائے۔ اللہ کو یہ بات پسند نہ آئی۔ فرمایا "لو لا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم" (اگر پہلے ہی سے اللہ اس کا فیصلہ نہ کر چکا ہوتا (کہ اس پرانے قانون کو بدلا جائے) تو تم جو فدیہ لے رہے ہو اس پر تم لوگوں کو سخت سزا دی جاتی) آپ دیکھ رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحی کی غیر موجودگی میں بعض اوقات انسانی ضرورتوں سے اور انسانی طریقہ سے مشورے کے ساتھ یا بغیر مشورے کے اپنی صوابدید کی بناء پر احکام دیا کرتے تھے اور بعض وقت وہ اللہ کو پسند نہیں آتا تھا۔ اس وقت فوراً تنسیخ کی وحی آجاتی تھی تاکہ امت غلط چیزوں پر عمل نہ کرے۔ اس واقعے کی تھوڑی سی توجیہ میں اور کروں گا۔ قرآن مجید میں ایسی آیتیں ہیں جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ پرانے انبیاءؑ کی شریعت پر عمل کرو۔ توریت میں حکم دیا گیا ہے کہ دشمن سے لیے ہوئے مال غنیمت کو جلا ڈالو۔ وہ خدا کا مال ہے، خدا تک پہنچانے کے لیے تم اس کو جلا ڈالو۔ تم اس سے استفادہ نہ کرو۔ جب کوئی نئی وحی نہیں آتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضہ تھا کہ اس پرانے خدائی قانون یعنی توریت پر عمل کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مصلحت سے اس پر عمل نہیں فرمایا، اس سے خدا نے وہ آیت نازل کی "لو لا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم" (اگر پہلے ہی سے اللہ اس کا فیصلہ نہ کر چکا ہوتا (کہ اس پرانے قانون کو بدلا جائے) تو تم جو فدیہ لے رہے ہو اس پر تم لوگوں کو سخت سزا دی جاتی) بہر حال ان دونوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس حدیث کو کہ میری زبان سے میرے منہ سے جو بات نکلتی ہے وہ برحق ہوتی ہے، اس معنی میں لیں کہ اولاً یا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے ذریعے معلوم کردہ چیزوں کو بیان کرتے ہیں۔ یا بشری حیثیت سے بھی بیان کرتے ہیں، عمداً کسی کو بھٹکانے یا گمراہ کرنے کے لیے نہیں بلکہ جو چیز مناسب ترین ہے اور جس کی خدا نے ممانعت نہیں کی ہے اس کا حکم دیتے ہیں۔ ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں رہتا۔ ضمنی طور پر ایک سوال ہے کہ ہم حدیث کے صحیح ہونے کا اندازہ کس طرح لگائیں؟ اس کا جواب میں دے چکا ہوں کہ علمائے حدیث نے مختلف علوم اختراع کیے ہیں جن سے حدیث کی روایۃً اور درایۃً دونوں طرح سے جانچ ہو سکتی ہے اور ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ کس حدیث پر اعتماد کیا جائے اور کس حدیث پر اعتماد نہ کیا جائے۔

**سوال۷:** آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس صحابی کو "استعن بیمینک" کے الفاظ فرمائے تھے ان صحابی کا اسم گرامی کیا ہے؟

**جواب:** میں بیان کر چکا ہوں کہ صحابی کا نام حدیث میں مذکور نہیں۔ ایک صحابی آئے، انہوں نے کہا میں بھول جایا کرتا ہوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا "استعن بیمینک" چونکہ ماخذ میں نام درج نہیں، اس لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں آپ کو نام بتا سکوں البتہ ابو رافع کے متعلق بھی ذکر آیا ہے اور میں عرض کر چکا ہوں کہ وہ ایک آزاد شدہ غلام تھے انہیں بھی یہ دقت پیش آتی تھی کہ وہ بھول جاتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، کیا میں آپ کی بیان کردہ چیزوں کو لکھ سکتا ہوں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے دائیں ہاتھ سے مدد لو۔ یعنی لکھ لیا کرو۔

**سوال۸:** جو حضرات غلط قسم کا پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ احادیث کو تین سو سال بعد مدون کیا گیا وہ کیا دلیل پیش کرتے ہیں؟

**جواب:** وہ دلیل یہ ہے کہ ان کے نزدیک اولاً صحیح بخاری جو تیسری صدی کی تالیف ہے وہ حدیث کی قدیم ترین کتاب ہے لیکن بخاری سے لیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک جو دور گزرے ہیں اور امام بخاری رح کے استاد اور استاد کے استاد، انہوں نے حدیث کو تحریری صورت کبھی نہ دی۔ لیکن اب ان سب کی کتابیں بڑی حد تک دستیاب ہو چکی ہیں۔ اس لیے وہ پرانا اعتراض جو گولڈ سہیر Goldzeir نے کیا تھا باقی نہیں رہتا۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹا سا لطیفہ میں آپ سے بیان کرتا ہوں۔ کوئی چار پانچ سال کا عرصہ ہوا، میں نے جرمن زبان میں ایک مضمون لکھا تھا جو جرمنی کے ایک رسالے میں شائع ہوا۔ اس میں یہی بات بیان کی گئی تھی کہ حدیث کے متعلق یہ تصور کہ وہ تین سو سال بعد مدون ہونا شروع ہوئی، فلاں فلاں اسباب سے صحیح نہیں۔ مضمون چھپنے کے کوئی چھ آٹھ مہینے کے بعد ایک جرمن پروفیسر نے اس موضوع پر ایک نیا مضمون لکھا، اور وہی پرانی دلیلیں اس میں دہرائیں کہ حدیث ناقابل اعتماد ہے، وہ تین سو سال بعد جمع ہونی شروع ہوئی۔ میرا اصول رہا ہے کہ کسی پر اعتراض نہ کروں، واقعات کو اس طرح پیش کروں کہ لوگ اپنے ممکنہ اعتراض کا جواب خود ہی پالیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب یہ دوسرا مضمون چھپنے کے لیے آیا، اسے بھی شائع کر دیا گیا ایڈیٹر نے فٹ نوٹ دیا کہ صاحب مضمون کو چاہیے کہ فلاں نمبر میں شائع شدہ، حمید اللہ کے مضمون کو پڑھ لے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کون سا اصول بہتر ہے۔

**سوال۹:** امام مہدیؑ کے بارے میں متعارض احادیث کا کیا حل ہے؟

**جواب:** مجھے کوئی علم نہیں کہ کیا متعارض حدیثیں ہیں۔ حدیث کی کتابوں میں ذکر آیا ہے کہ آخری زمانے میں میری امت سے ایک شخص پیدا ہو گا، جس کا نام میرے ہی نام کے مطابق ہو گا، یعنی "محمد" اس کے باپ کا نام میرے باپ ہی کے نام کے مطابق ہو گا یعنی "عبد اللہ" اس کی ماں کا نام میری ہی ماں کے نام کے مطابق ہو گا یعنی "آمنہ" اور وہ یہ یہ کام کرے گا۔ میرے علم میں ایسی کوئی حدیثیں نہیں ہیں کہ انہیں متعارض کہا جائے۔ البتہ حدیث میں کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ فلاں سال پیدا ہوں گے، کب ہوں گے ؟ ہمیں کوئی پتہ نہیں۔ جب بھی آئیں گے اس کے لیے ہمیں تیار رہنا چاہیے تا کہ امام مہدیؒ کے اچھے رفیق بننے کا شرف حاصل ہو سکے۔

**سوال ۱۰:** حدیث قدسی چونکہ خدائے پاک کے الفاظ ہیں تو حدیث قدسی کو قرآن پاک میں کیوں نہیں شامل کیا گیا؟ وضاحت کریں۔

**جواب:** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مناسب نہیں سمجھا، یہی اصل جواب ہے کیونکہ ضرورت نہیں تھی کہ قرآن مجید کو ایک لا محدود کتاب بنایا جائے۔ بہتر یہی ہے کہ قرآن مجید مختصر ہو۔ ساری ضرورت کی چیزیں اس کے اندر ہوں اور وقتاً فوقتاً اس پر زور دینے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیگر چیزیں بیان کریں جو حدیث میں بھی آئی ہیں اور حدیث قدسی میں بھی۔ اس سے ہم استفادہ کر سکتے ہیں لیکن اس کو قرآن میں شامل کرنے کی ضرورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس نہیں فرمائی۔ حدیث قدسی کی جو کتابیں ہیں ان میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو قرآن پر اضافہ سمجھی جا سکتی ہے، بلکہ قرآن ہی کی بعض باتوں کو دوسرے الفاظ میں زور دے کر بیان کیا گیا ہے۔

**سوال ۱۱:** آپ نے تقریر میں فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں انشورنس کا نظام رائج تھا۔ ذرا وضاحت فرمائیں کہ کیا موجودہ انشورنس کے نظام میں اور اس انشورنس میں کیا فرق ہے؟ کیونکہ موجودہ انشورنس کے نظام کو غیر شرعی کہا جاتا ہے۔

**جواب:** زمانہ حال میں دو طرح کے بیمے یا انشورنس ہے ایک سرمایہ دارانہ Capitalist انشورنس اور دوسرے کو تعاونی Mutualist انشورنس کہتے ہیں۔ Capitalist میں سرمایہ دار انشورنس کمپنیاں قائم کرتے ہیں اور Clients سے اتنی رقم لیتے ہیں جو انشورنس کے متوقع ہر جانوں سے کچھ زیادہ ہو۔ گویا پوری منفعت سرمایہ دار لے لیتے ہیں۔ Mutualist سسٹم میں Clients منفعت میں شریک ہوتے ہیں۔ مثلاً موٹر کار کی انشورنس کمپنی کو لیجئے۔ پانچ سو آدمی اس کے ممبر بنتے ہیں اور ہر شخص ہر سال ایک سو روپیہ ادا کرتا ہے۔ اگر کمپنی کو پہلے سال پچاس ہزار روپے کی آمدنی ہوئی جب کہ ایک ممبر کے حادثے کا معاوضہ دو ہزار روپے دینا پڑا۔ اس کے علاوہ دس ہزار روپے ملازمین کو تنخواہوں کے لیے دینے پڑے اور باقی رقم محفوظ رہی۔ دوسرے سال پرانے

ممبروں سے سو روپے کی جگہ کچھ کم رقم لی جاتی ہے۔ Capitalist انشورنس میں پوری منفعت سرمایہ دار لیتے ہیں۔ Mutualist سسٹم میں Clients کو استفادے کا موقع ملتا ہے۔ عہد نبوی میں جو انشورنس کا نظام تھا وہ Mutualist سے کچھ قریبی مشابہت رکھتا ہے۔ وہ حقیقت میں ایک دوسرے کے تعاون اور امداد باہمی کے اصول پر مبنی تھا۔ یعنی ایک قبیلہ کے جملہ افراد اپنے قبیلے کی انجمن کے خزانے کو سالانہ تھوڑی تھوڑی رقم دیتے ہیں۔ مثلاً ہر شخص ایک درہم، دو درہم دیتا ہے اور جب کبھی کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو کمیٹی کا یہ سرمایہ جو سارے افراد قبیلہ کی طرف سے آیا تھا، اس شخص کی ضرورت کے لیے کام آتا تھا جسے ہرجانہ ادا کرنا ہے پھر اس میں Mutualist سسٹم کو بڑھا کر یہ نظام قائم کیا گیا تھا کہ اگر ایک قبیلہ کے خزانے میں رقم کافی نہ ہو تو اس کے ہمسائے میں جو کمیٹی ہے وہ بھی اس کی مدد کرے اور بالآخر حکومت مدد کرے۔ یہ دو مختلف سسٹم رہے ہیں ظاہر ہے کہ اس ٹیکنیکل چیز کو میں چند الفاظ میں پوری طرح واضح نہیں کر سکتا۔

**سوال ۱۲:** کیا غلطی تسلیم کرنے کے بعد احادیث کی روشنی میں انتقام، سزا، جرمانہ، ضروری ہے یا معاف کر دینا اسلام کے اصولوں کے منافی ہے؟ جواب ضرور دیں التجا ہے۔

جواب: مجھے اعتراف ہے کہ میں آپ کا مفہوم پوری طرح نہیں سمجھ سکا۔ یہاں لفظ "غلطی" سے جرم مراد لیتا ہوں۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ بعض جرم ایسے ہیں جن کے لیے شریعت نے سزا مقرر کر دی ہے، اسے حد کہا جاتا ہے، مثلاً چوری، مئے نوشی اور قتل وغیرہ۔ یہ سات آٹھ جرائم ہیں جن کے لیے حد مقرر ہے۔ ان پر معافی مانگنے کے باوجود سزا معاف نہیں ہوتی۔ مثلاً کوئی چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، چاہے وہ معافی مانگ لیے۔ قتل کے سلسلے میں قاضی سزائے موت تو دے گا لیکن سزائے موت کا نفاذ مقتول کے قریبی رشتہ داروں کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ وہ خون کی جگہ خون بہا لیکر اس ملزم کو چھوڑ دیں۔ یہ ساری تفصیلیں حدیث اور فقہ کی کتابوں میں ملتی ہیں۔

**سوال ۱۳:** قرآن نظم اور معنی دونوں کا مجموعہ ہے، جب کہ حدیث صرف قول رسول، فعل رسول، تقریر رسول کا نام ہے، اگرچہ قول رسول کا ترجمہ کسی اور نے کیا ہو۔ تو حدیث کے قرآن سے برابر ہونے کے کیا معنی ہیں؟

**جواب:** پہلے میں کافی وضاحت سے بیان کرنے کی کوشش کر چکا ہوں۔ اس کو مختصراً پھر دہراتا ہوں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ایک شخص یہ کہے کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ قرآن ہے، اس پر عمل کرتا ہوں لیکن اپنے آپ کو حدیثوں کا پابند نہیں

کرتا۔ تو ایسے شخص کو مسلمان قرار نہیں دیا جا سکتا اسے امت سے خارج کر دیا جائے گا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد چونکہ حدیث کے ثابت کرنے کا وہ وسیلہ نہیں ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں روبرو ہو کر، شخصی طور پر سننے میں ہوتا تھا۔ حدیث کی تدوین، تحفظ اور نقل ایک نسل کے بعد دوسری نسل میں جانا، اس احتیاط سے نہیں ہو سکتا جو قرآن کے متعلق ہوئی ہے، تو اب ہم قرآن اور حدیث میں فرق کرنے پر مجبور ہیں، لیکن اصولاً دونوں یکساں ہیں کیونکہ قرآن خود کہتا ہے "من یطع الرسول فقد اطاع اللہ" ان حالات میں میری دانست میں دونوں یکساں ہیں لیکن ثبوت اور شہادت کی ضرورتوں کے تحت ہم ان میں فرق کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ کے حضور میں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا۔

**سوال ۱۴:** اولیاء اللہ کی قبروں پر جا کر السلام علیکم یا اھل القبور کہنا، فاتحہ پڑھنا اور ان کے طفیل سے خدا سے فضل و کرم کی التجا کرنا یہ امور قبر پرستی میں شامل ہیں یا نہیں؟

**جواب:** میں سمجھتا ہوں کہ اس سوال کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم مزارات کی زیارت فرماتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم السلام علیکم یا اھل القبور کہا کرتے تھے، ان کے لیے فاتحہ پڑھتے تھے تو میں اگر کروں تو سنت ہی کی پیروی ہوگی، بدعت اور جدید چیز نہ ہوگی۔ باقی کسی کے طفیل سے اللہ کے فضل و کرم کی التجا کرنا، یہ نیت پر منحصر ہے۔ اگر آپ یہ خیال ظاہر کریں کہ چونکہ میں اس صاحب قبر کو رشوت دے چکا ہوں، اس پر پھول چڑھا چکا ہوں، لہٰذا ان کا فریضہ ہے کہ جو چیز اللہ میاں نہیں چاہتے وہ کر ڈالیں، یہ چیز شرک ہوگی۔

**سوال ۱۵:** یتیم بچے کو اس کے دادا کی وراثت سے کیوں محروم کیا گیا۔ وراثت سے محرومی کے پس پشت جو مصلحت کار فرما ہے اس پر روشنی ڈالیے؟

**جواب:** قانون کا ایک اصول ہوتا ہے اور اس اصول سے بعض وقت اتفاقاً کسی فرد کو نقصان پہنچ سکتا ہے، تو ایک فرد کے نقصان کی خاطر عام اصول کو بدلا نہیں جا سکتا۔ عام اصول یہی ہے کہ ایک شخص کی وفات پر اس کے فلاں فلاں رشتہ داروں کو ایک حصہ وراثت میں دیا جاتا ہے جو قرآن نے مقرر کر دیا ہے۔ اگر اتفاقاً اس قانون کی وجہ سے کسی ایک فرد کو نقصان پہنچتا ہے تو اس کا حل بھی قرآن و حدیث میں بیان کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ وصیت کا ایک قانون اسلام میں پایا جاتا ہے کہ جس شخص کو وراثت میں سے حصہ نہیں ملتا تو اسے مرنے والا شخص وصیت کے ذریعے سے کوئی چیز دے دے۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ کسی شخص کے مرنے پر اس کے بیٹے کو حصہ ملے اور

پوتے اپنے دور میں حصہ پائیں گے۔ ان کو اس مرنے والے شخص سے یعنی دادا سے حصہ لینے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ایک خاص صورت میں جب اس پوتے کا باپ مر چکا ہے، دادا کے لیے ممکن ہے کہ اپنے مال کا ایک حصہ، وصیت کے ذریعے سے، اس پوتے کو دے دے تا کہ اسلامی قانون کے عام قاعدے کو بدلنے کی ضرورت پیش نہ آئے اور اس انفرادی دشواری، پیچیدگی اور مصیبت کو، جو پوتے کو پیش آنے والی ہے اسے بھی دور کیا جائے۔ یہ ہے فلسفہ اسلامی قانون کا کہ قانون، قانون ہی رہے اور جو استثنائی صورتیں پیش آئیں، ان کا بھی استثنائی حل پیش کیا جائے۔

# خطبہ ۳: تاریخِ فقہ

محترم وائس چانسلر صاحب! محترم اساتذہ! محترم بھائی بہنو!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ !

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین و آلہ واصحابہ اجمعین

ان تقریروں کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، اس سلسلے میں آج تیسری تقریر علم فقہ کے متعلق ہے۔ اور یہ ترتیب کہ اولاً قرآن کریم، پھر حدیث اور پھر فقہ، اس لیے اختیار کی گئی ہے کہ فقہ مبنی ہے ان دو سابقہ چیزوں پر۔ یعنی پہلے معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن کیا چیز ہے؟ اور وہ کس طرح ہم تک پہنچے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارا دین، ہماری فقہ اور ہمارا قانون، جن دو چیزوں پر مبنی ہیں وہ اس قدر قابل اعتماد بھی ہیں یا نہیں کہ ان کو ایک غیر جانبدار انسان قبول کر سکتا ہو۔

میں سمجھتا ہوں کہ گزشتہ دو تقریروں سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اپنے دین کے ماخذوں کے متعلق ہم مسلمانوں کو کسی سے شرمانے کی ضرورت نہیں۔ جس طرح قرآن اور حدیث ہم تک پہنچے ہیں اس سے زیادہ احتیاط کے ساتھ دنیا کی کسی اور قوم کی اساسی چیزیں ان تک نہیں پہنچیں۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ان دونوں قابل اعتماد ماخذوں سے مسلمانوں نے اپنا قانون کس طرح بنایا اور وہ کس طرح آج تک چلا آ رہا ہے۔ ایک چیز کا آپ سے شروع ہی میں ذکر کرتا ہوں کہ قرآن مجید اپنی معجزانہ حیثیت کے باوجود، کہ وہ خدا کا کلام ہے، اور حدیث اپنی الہامی حیثیت کے باوجود کہ پیغمبر خدا کی طرف سے الہام شدہ باتیں ہی بیان کرتا ہے اور خدا اعلام الغیوب ہے، صرف قرآن اور حدیث کے ناکافی ہونے کی صورت میں کیا کیا جائے؟ چنانچہ میں آپ کو دوبارہ یاد دلاؤں گا اور حضرت معاذ بن

جبلؓ کے واقعے کی طرف توجہ دلاؤں گا۔ وہ ایک مشہور صحابی گزرے ہیں، اور انہیں لمبی عمر ملتی تو صحابہ میں غالباً سب سے بڑے فقیہ ہوتے، بہر حال ابھی وہ نوجوان تھے لیکن ان کی ذہانت کے باعث رسول اللہ ﷺ نے ان کو گورنر بنا کر یمن بھیجا۔ آخری وقت باریابی میں حضور ﷺ نے ان سے پوچھا کہ اے معاذ! تم اپنے فیصلے کس طرح کیا کرو گے؟ انہوں نے جواب دیا "بکتاب الله" (اللہ تعالی کی کتاب کے مطابق) جواب صحیح تھا لیکن حضور ﷺ نے پوچھا اگر اس میں نہ پاؤ تو؟ میرا اشارہ اصل اس نکتے کی طرف ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ بھی فرماتے ہیں کہ قرآن کریم عام حالات میں تو نہیں لیکن کسی خاص حالت میں ناکافی معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے حضور انور ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر تم مطلوبہ چیز اس میں نہ پاؤ تو تم کیا کرو گے؟ حضرت معاذ بن جبلؓ نے جواب دیا "بسنة رسول الله" (رسول اللہ کی سنت کے مطابق عمل کیا کروں گا) یہ جواب بھی صحیح تھا مگر حدیث و سنت کی اِلہامی کیفیت کے باوجود رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں "فان لم تجد" (اگر تم اس میں بھی نہ پاؤ تو تم کیا کرو گے؟) تو اس پر وہ فرماتے ہیں "اجتهد برايي ولا الو" (یعنی میں اپنی رائے کے مطابق کوشش کروں گا اور استنباط مسائل کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کروں گا)۔ اس جواب پر حضور ﷺ اس قدر خوش ہوئے کہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا "اے اللہ تیرے رسول ﷺ کے رسول نے جو چیز بیان کی ہے اس پر میں خوش ہوں" یعنی دعائے برکت دی اور اس کو قبول کیا اور برقرار رکھا کہ یہی طریقہ ہونا چاہیے، انسانی نقطہ نظر سے۔ اگر قرآن مجید اور حدیث ناکافی ثابت ہو تو ممکن ہے مسلمانوں کی قوم بے بس ہو جاتی اور اپنی ضروریات پورا نہ کر سکتی، جو ایک قیامت تک چلنے والے دین کے لیے نامناسب ہوتا۔ اس لیے رسول ﷺ نے خود ہمیں بتا دیا کہ اگر قرآن و حدیث میں نہ ملے تو اجتہاد کرو۔ میں اس کی طرف بعد میں رجوع کروں گا کہ اجتہاد کے معنی کیا ہیں۔

فقہ ایک عربی لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہیں "جاننا" اور اس کے اصطلاحی معنی ہیں "قانون"۔ قرآن مجید میں قانون کے متعلق ایک بہت ہی لطیف انداز میں ذکر آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا تصور قانون کیا تھا۔ وہ آیت یہ ہے:

مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ (14:24)

(اچھی بات کی مثال ایک اچھے درخت کی طرح ہے اس کی جڑ تو زمین میں گڑی ہوئی رہتی ہے لیکن اس کی شاخیں آسمان تک پھیلی ہوتی ہیں۔)

دوسرے الفاظ میں قانون کی بنیاد بیج جیسی چھوٹی سی چیز کی طرح ہے لیکن اس سے جو درخت نکلے گا وہ آسمان تک پھیل جائے گا اور اس کی شاخیں ہر چیز کو ڈھانپ سکیں گی۔ چنانچہ واقعہ یہی ہے کہ اگر ہم قرآن اور حدیث کو جڑیں یا بیج تصور کریں تو اس جڑ یا بیج سے نکلا ہوا درخت اتنا تناور اور اتنا شاخ در شاخ پھیل گیا ہے کہ انسان کی ہر ضرورت کو، اور قیامت تک کے مسلمانوں کے آنے والی نسلوں کو جدید ضرورتوں کو پورا کرنے کے قابل ہے اور ظاہر ہے شاخ در شاخ روزانہ اس درخت میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ ان حالات میں شاید مناسب معلوم ہو گا کہ میں تمہید کے طور پر اسلامی قانون کا دیگر ممالک کے قانون سے موازنہ کروں۔

محققین اور مؤرخین کا بیان ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی قانون ساز قوم رومیوں کی گزری ہے اور ان کے برابر کسی قوم نے قانون کی خدمت نہیں کی۔ یورپ کی حد تک یہ صحیح ہو گا کیونکہ رومیوں سے پہلے یورپ میں جو قومیں گزری ہیں، ان میں شاید یونانی سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ یونانیوں سے پہلے جو قومیں گزریں، ان کے آثار مفقود ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ قدیم قوموں کے پاس کیا قانون تھے؟ سب سے بڑی ممتاز قوم رومیوں سے پہلے یونانیوں کی گزری ہے۔ یونانیوں نے بہت سے علوم کی خدمت کی لیکن قانونی نقطہ نظر سے ان کے ہاں کوئی زیادہ وقیع چیز نہیں ملتی۔ لہٰذا ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یورپ میں رومیوں نے قانون کی واقعی بڑی خدمت کی۔

رومی قانون کا مشہور مؤرخ، کولینے COLIENT لکھتا ہے کہ رومی قانون پہلے بالکل ابتدائی قسم کا (Primitive) تھا۔ وہ کھلے دل سے یہ اعتراف کرتا ہے کہ رومیوں کی سلطنت توسیع پا کر جب ایشیا میں پہنچی تو اس وقت وہاں کے قانون سے متاثر ہو کر رومیوں نے اپنے قانون میں اصلاحیں کیں۔ چنانچہ رومی قانون کا جو قدیم ترین مصنف گزرا ہے یعنی گائیس GAIUS وہ ایشیائے کوچک یعنی موجودہ ترکی کا باشندہ تھا، یورپین نہیں تھا۔ بعد میں اس قانون کی توسیع اس بنا پر عمل میں آئی کہ رومی سلطنت یورپ، افریقہ اور ایشیا کے براعظموں میں پھیل گئی تھی، اور مختلف قوموں پر وہ حکومت کرتے تھے۔ اس لیے انہیں اپنے قانون میں بہت سے اضافے، تبدیلیاں اور ترمیمیں کرنا پڑیں اور اس قانون نے بے شک ترقی کی۔ اس ترقی یافتہ قانون کو رسول ﷺ کی ولادت سے چار پانچ سال پہلے فوت ہونے والے حکمران جسٹینین (Justinian) نے مدوّن کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہم ایک اعتبار سے جسٹینین کے مجموعہ قوانین کا مقابلہ فتاوائے عالمگیری سے کر سکتے ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر، علم دوست بادشاہ ضرور تھے، لیکن عالم یا فقیہ نہیں تھے۔ یہی حال جسٹینین کا ہے۔ وہ بہت ذہین بادشاہ تھا لیکن خود ماہرِ قانون نہ تھا۔ اس نے عالموں کی سرپرستی کی اور انہیں ملک میں پائے جانے والے سارے قوانین پر، جن کے بعض اجزاء میں تضاد پایا جاتا تھا، نظر ثانی کی دعوت دی۔ اس طرح ایک کوڈ یا مجموعہ

قوانین مرتب ہوا۔ یورپ میں یہ ایک قابل فخر چیز ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ قانون دلچسپ ہے۔ اس میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو آج بھی قابل عمل ہیں اور ان میں ردّوبدل کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ لیکن اس قانون کی اساس یہ ہے کہ انسان خود قانون ساز ہے۔ یعنی ایک انسان دوسرے انسان کے بنائے ہوئے قانون قبول بھی کر سکتا ہے اور ان کو رد بھی کر سکتا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ اس قانون میں استحکام (Stability) نہیں رہا۔ چنانچہ ہمارے مؤرخ بیان کرتے ہیں کہ خود Justinian نے اپنی تیس بتیس سالہ حکومت میں، اپنے ہی تیار کردہ قانون میں اتنی تبدیلیاں کیں کہ وہ کچھ سے کچھ ہو گیا۔ اس کے برخلاف اگر قانون کی اساس اللہ کے احکام ہیں تو اس میں استحکام اور پائیداری ہو گی، جو انسانی قانون کے اندر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ایک انسان دوسرے انسان کو اپنے ہی برابر سمجھتا ہے، اس پر اعتراض کرنے کی جسارت کرتا ہے اور اس کے خلاف رائے دینے کی ہمت کرتا ہے۔ دیگر ممالک میں بھی ہمیں یہ چیز نظر آتی ہے۔ لیکن سارے قوانین سے موازنہ کرنے کا موقع نہیں کیونکہ وقت کم ہے۔

غرض جب رسول ﷺ مبعوث ہوئے تو اس وقت دنیا کے سامنے ایک قانونی چیلنج تھا کہ اگر تم میں ہمت ہے تو اس رومی قانون سے بہتر قانون بناؤ۔ اس چیلنج کا ہمارے پیغمبر ﷺ نے جواب دیا اور وہ قانون بنایا جو جسٹینین کے قانون سے بھی حقیقتاً بہتر تھا۔ اس میں وہ کمزوری بھی نہیں ہے جو Justinian کے قانون میں تھی بلکہ استحکام، استقامت اور پائیداری بھی ہے۔ اسلامی قانون میں جو وسعت اور ہمہ گیری ہے وہ رومی قانون میں نہیں ہے۔ مثلاً جسٹینین کے کوڈ میں دینی امور اور عبادات کا قطعاً کوئی ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح اور بہت سی چیزیں جو اسلامی قانون میں ملتی ہیں، وہاں نظر نہیں آتیں۔ اگر کوئی شخص غیر جانبداری سے رومی قانون اور اسلامی قانون کا موازنہ کرے تو وہ یقیناً یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے گا کہ اسلامی قانون ہی بہتر ہے۔ میں نے چند ابواب کی حد تک رومی اور اسلامی قواعد کا تفصیلی مقابلہ کیا ہے اور ذاتی علم کی بنا پر یہ دعویٰ کر رہا ہوں۔

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ اسلامی قانون کس طرح بنا؟ اسلامی قانون ربانی وحی کے ذریعے سے آئے ہوئے اوامر کی تبلیغ کے سلسلے میں رسول ﷺ کے دیے ہوئے احکام پر مشتمل ہے۔ ان احکام کا کچھ حصہ آپ نے املا کرایا اور کہا کہ یہ اللہ کا حکم یعنی قرآن ہے، تم اسے زبانی یاد کرو، اسے نمازوں میں پڑھو، کبھی نہ بھلاؤ۔ اسی طرح آپ ﷺ نے اور احکام بھی دیے جو (وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ سورۂ نجم 53 آیت 3 تا 4) کے مطابق اگرچہ ربانی وحی پر ہی مشتمل تھے لیکن قرآن میں داخل نہیں کیے گئے۔ ان کو سنّت بھی کہتے ہیں۔ اللہ کے احکام، اللہ کے پیغمبر کے احکام یعنی حدیث و سنت، یہ دونوں چیزیں ایک دن میں مدوّن نہیں ہوئیں۔ جیسا کہ میں نے آپ سے بیان کیا قرآن مجید نازل ہوتے ہوئے (23) سال لگے۔ یہی حال اور یہی مدّت حدیث کی بھی ہے۔

لیکن شروع میں کچھ بھی نہ تھا لوگ مسلمان ہونے لگے تھے اور ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر قانون کے معنی ہیں "طرزِ عمل" یا "اصولِ کار" تو ابتداء میں اسلامی قانون کیا تھا، کیونکہ اس وقت سوائے "سورۂ اقراء" کی پہلی پانچ آیتوں کے کوئی چیز موجود نہ تھی۔ اس کا جواب بہت سادہ ہے۔ اسلامی اصول یہ ہے کہ جس چیز کی ممانعت نہ کی جائے وہ مباح ہے۔ دوسرے الفاظ میں مکہ معظمہ ہی کے کافرانہ معاشرے میں بت پرستی کے سوا، جو بھی معاشرتی رسم ورواج تھے اور جو بھی عرف وعادت پائی جاتی تھی، اس پر عمل کرنے کی مسلمانوں کو اجازت تھی، آپ کو شاید برا لگے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابتداء میں مسلمان شراب بھی پی سکتے تھے اس لیے کہ شراب ابھی حرام نہیں ہوئی تھی۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی قانون شروع ہوتا ہے شہر مکہ کے رسم ورواج سے، اور اس رسم ورواج میں رفتہ رفتہ ترمیم اور تبدیلی ہوتی گئی۔ قرآن وحدیث کے احکام کے مطابق قدیم رسم ورواج میں جو تبدیلی ہوئی وہ 23 سال کے عرصے میں ترجیحی بنیادوں پر ہوئی کہ کن چیزوں کو سب سے پہلے منسوخ کیا جائے، ان کے بعد کن چیزوں کو، ان کے بعد کن چیزوں کو، اور کن نئی چیزوں کا اضافہ کیا جائے، ظاہر ہے کہ مکے کے رسم ورواج کے متعلق اسلام کے امتناعی اور اصلاحی احکام کا سب سے پہلا عنصر، سب سے پہلی چیز بت پرستی کی مخالفت تھی۔ یعنی اللہ ایک ہے۔ بتوں کی پرستش نہ کرو۔ اللہ کا کسی کو شریک نہ بناؤ۔ عقائد کے متعلق ایک چیز اور بھی تھی کہ ہماری زندگی کا تعلق صرف اسی دنیا سے نہیں بلکہ اس کے بعد آخرت کی زندگی بھی ہے۔ مرنے کے بعد حساب کتاب دینے کے لیے اللہ ہمیں دوبارہ زندہ کرے گا اور ہمارے نیک وبد اعمال کے مطابق ہمیں جزا یا سزا دے گا۔ یہ بالکل ابتدائی چیزیں تھیں۔ اللہ پر ایمان اور قیامت پر ایمان۔ ایک چیز اور تھی کہ جب اللہ کو ہم ایک مانتے ہیں اور اسے اپنا مالک اور خالق جانتے ہیں تو اس کے متعلق ہمیں اپنے فرائض کس طرح انجام دینے چاہئیں۔ ظاہر ہے کہ اللہ ہمارا محتاج نہیں بلکہ ہم اللہ کے محتاج ہیں۔ لہٰذا اللہ کی بندگی اور شکر گزاری بھی ہمارا فرض ہے۔ اس فرض کی ادائیگی کے لیے نماز کی تاکید کی گئی۔ چنانچہ نماز اور عقائد یہ دو عنصر تھے جو شروع میں آئے۔ پھر رفتہ رفتہ دیگر امور کا اضافہ ہوتا گیا میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلامی قانون کا ماخذ قرآن وحدیث تو ہے لیکن ان کے ساتھ ساتھ، بلکہ ان سے کچھ پہلے ہی شہر مکہ کا رسم ورواج بھی اسلامی قانون تھا۔ یہ رسم ورواج ایک عارضی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ قرآن وحدیث جو باضابطہ ماخذ قانون تھے ان میں یہ بھی قوت تھی کہ اس غیر اہم یا غیر دوامی عنصر یعنی رسم ورواج کو منسوخ کر سکے۔ اس سے انکار کیے بغیر کہنا یہ پڑتا ہے کہ پہلا ماخذ ملک کا رسم ورواج تھا۔ دوسرا باضابطہ ماخذ قرآن اور حدیث ہیں۔ لیکن حضرت معاذ بن جبلؓ سے متعلق مشہور حدیث سے یہ ظاہر ہے کہ عہد نبوی ہی میں قرآن وحدیث کے علاوہ اجتہاد کو بھی ایک تیسرے ماخذ قانون کی حیثیت حاصل تھی۔

ہمارے پاس اصول فقہ کی کتابوں میں اور ماخذ بھی بیان ہوتا ہے جسے اجماع کا نام دیتے ہیں، یعنی کسی بات پر علماء امت کا متفق ہو جانا، عہد نبوی میں اس کی ضرورت ہی نہیں تھی اس لیے کہ اگر کوئی سوال پیدا ہوتا تو لوگ فوراً رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سے رجوع کرتے تھے۔ رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم فیصلہ فرمادیتے جو قطعی اور آخری ہوتا۔ آپس میں مشورہ کر کے کسی پر متفق ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس پہلو پر مزید گفتگو بعد میں ہو گی۔

ان ماخذوں کے ساتھ ساتھ عہد نبوی میں ایک اور چیز بھی ملتی ہے جو آئندہ بھی ہمیں کام آسکتی ہے، اسے ہم "معاہدہ" کہہ سکتے ہیں۔ یعنی اگر کسی دوسرے ملک سے اور کسی دوسری حکومت سے ہم معاہدہ کر لیں اور بعض شرطیں قبول کر لیں، کہ ہم یہ کیا کریں گے اور تم یہ کرو گے۔ تو جب تک وہ معاہدہ برقرار رہے گا، وہ پابندیاں یا وہ شرطیں جو ہم نے قبول کی تھیں، ہمارے قانون کا جزو بن جائیں گی اور ہمارے لیے واجب التعمیل رہیں گی۔ دوسرے الفاظ میں یہ معاہداتی پابندیاں اور معاہدے کے ذریعے سے قبول کی ہوئی شرطیں اسلامی قانون ہیں، لیکن غیر تابدی اور عارضی۔ جب تک معاہدہ برقرار رہے گا، وہ شرطیں ہمارے قانون کا جزو رہیں گی۔

ایک اور ماخذ قانون جو عہد نبوی میں پایا جاسکتا تھا لیکن مجھے اب تک عہد نبویؐ میں اس کی کوئی مثال نہیں مل سکی۔ قدیم ترین مثال جو مجھے اس کی ملی ہے، وہ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت کے ایک واقعے سے متعلق یہ اصول مماثلت (Reciprocity) جس میں معاہدے کے بغیر غیروں کے احکام ہمارے قانون میں داخل ہو جائیں۔ پہلے میں اس واقعے کو بیان کرتا ہوں جس سے آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ 'مماثلت' جو اس کا نام دیا گیا ہے کیا چیز ہے؟ ایک دن خلیفہ وقت حضرت عمرؓ کے پاس سرحد کے علاقے کا ایک گورنر خط بھیجتا ہے کہ ہمارے سرحد کے باہر جو بیز نطینی (رومن) وغیرہ ہیں، ان کے یہاں کے تاجر ہمارے ملک میں آنا چاہتے ہیں، اور ہمارے ملک میں تجارت کرنا چاہتے ہیں۔ احکام دیجئے کہ ان سے ہم کس اساس پر چونگی وصول کریں؟ اس گورنر کو کوئی علم نہیں تھا کہ اسلامی قانون چونگیوں کے متعلق کیا ہے؟ اس نے قرآن دیکھا، قرآن میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملا اور اس بارے میں اسے کوئی بھی معلومات نہیں تھیں۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ جس علاقے کے لوگ آئیں، اگر اس علاقے میں مسلمان تاجر جاتے ہیں تو جس نرخ پر ان سے چونگی لی جاتی ہے، اسی نرخ پر تم لے لو یہ reciprocity یعنی مماثلت کا قانون ہے۔ اس سے پہلے بیزنطینی حکومت سے اس قسم کا کوئی معاہدہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود حضرت عمرؓ یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اس علاقے میں جس شرح سے چونگی لی جاتی ہے، اسی شرح سے وہاں والوں سے ہمارے یہاں چونگی لی جائے گی۔

ان ماخذوں کے علاوہ ایک ماخذ، جس کا کچھ پہلے ذکر کرنا چاہیے تھا، وہ قرآن مجید میں مذکور ہے۔ "سورہ انعام" میں ایک مقام پر تقریباً پچیس پیغمبروں کے ناموں کی ایک طویل فہرست ہے۔ اس فہرست کے دینے کے بعد یہ آیت ہے :

(أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۖ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ) (90:6)

(یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے، اس لیے (اے محمدؐ) آپ بھی ان کی پیروی کریں۔)

تاریخی نقطہ نظر سے اس اہم آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے لے کر پیغمبر اسلام کے زمانے تک اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے جو پیغام بھیجے ہیں، وہ بھی خدائی احکام ہیں، اور وہ بھی ویسے ہی قابل تعظیم ہیں، جیسے پیغمبر اسلام پر نازل شدہ قوانین (لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ) (285:2)(سب پیغمبر مساوی رتبہ رکھتے ہیں بحیثیت پیغمبر کے) تو حکم دیا جاتا ہے کہ سابقہ پیغمبروں کے قوانین بھی واجب التعمیل ہیں، اور پیغمبر اسلام کو اس پر عمل کرنا چاہیے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس حکم کے ساتھ کچھ شرطیں ہوں گی۔ قانون ساز اللہ کی ذات ہے۔ اس نے اگر حضرت آدم علیہ السلام یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کچھ احکام دیے، تو وہی قانون ساز اس میں کچھ ترمیم اور تبدیلی بھی کر سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اگر خدا نے ہمارے پیغمبر کو حکم دیا کہ تم اپنے سے پہلے پیغمبروں مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے احکام میں سے فلاں چیز پر عمل نہ کرو بلکہ یوں کرو، تو پرانا قانون واجب التعمیل نہیں رہے گا۔ بلکہ جدید حکم پر عمل کرنا ہوگا۔ دوسری شرط اس قانون سے متعلق یہ ہوگی کہ اس کا علم، ہمیں قابل اعتماد صورت میں پہنچے کہ یہ چیز حضرت آدم علیہ السلام کی شریعت میں تھی، یہ چیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں تھی، یہ چیز حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں تھی۔ اگر کسی حکم کا قابل اعتماد ثبوت ملے تو واجب التعمیل ہوگا ورنہ نہیں۔ چنانچہ حدیث میں ایسی باتوں کا ذکر ملتا ہے اور قرآن میں بھی ایسی آیتیں ہیں کہ فلاں چیز حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قانون میں تھی، فلاں چیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قانون میں تھی، تو اس پر ہم عمل کریں گے۔ مگر اس میں دشواری یہ پیدا ہوگئی ہے کہ خود قرآن مجید میں یہ الزام لگایا گیا ہے کہ یہود اور نصاریٰ اپنی کتاب میں تحریف کرتے ہیں۔ ان حالات میں کہ براہ راست حضرت موسیٰ علیہ السلام یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قانون ہم تک قابل اعتماد صورت میں پہنچا ہے لہٰذا ہم ان کی کتابوں کے احکام پر عمل کرنے کی جسارت نہیں کر سکتے جب تک کہ ان کے کسی حکم کے متعلق ہمیں کسی اور ذریعے سے اس بات کا ثبوت نہ مل جائے کہ وہی صحیح اور قابل اعتماد ہے۔

جیسا کہ میں بیان کر رہا تھا۔ اسلامی قانون کے جو متعدد ماخذ ہیں ان میں سابقہ پیغمبروں کی شریعتیں بھی داخل کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک مثال آپ کو دیتا ہوں جس سے میرا مفہوم شاید زیادہ واضح ہو جائے گا۔ قرآن مجید کی "سورۂ نور" میں زنا کی سزا سنائی گئی ہے کہ ایک سو دُرّے لگائے جائیں اور اسلامی قانون میں پیغمبر اسلام کے عمل کی بنا پر شادی شدہ لوگوں کے زنا کرنے کی صورت میں "رجم" یعنی پتھراؤ کرنے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ جو "رجم" کرنے کا حکم ہے یعنی کسی مجرم کو پتھر مار کر سزائے موت دینا اس کی اساس کیا ہے، چونکہ قرآن مجید میں اس کا ذکر نہیں ہے، اس لیے بہت سے لوگوں کو بد گمانی ہو سکتی ہے، شاید ہوئی بھی ہے کہ "رجم" کا قانون اسلام میں نہیں پایا جاتا۔ صرف سو دُرے لگائے جائیں، یہی کافی ہے، اگر آپ غور کریں تو نظر آئے گا کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ قرآن مجید میں بالواسطہ طور پر اس قانون کا حکم ہے کہ "رجم" کیا جائے۔ وہ واسطہ یہ ہے کہ قرآن نے کہا ہے تم سے پہلے کے جو پیغمبر گزرے ہیں، ان کے قانون پر عمل کرو اور "رجم" کے متعلق قانون توریت میں موجود ہے، انجیل میں بھی موجود ہے، جو کتابیں آج کل ہمیں عیسائیوں اور یہودیوں کی شائع کردہ ملتی ہیں، ان میں بھی یہ قانون آپ کو ملے گا۔ اس قانون کی صحت ہمارے پیغمبر نے قبول کر کے اس کی توثیق بھی کی ہے کہ یہ قانون تھا۔ اگر قرآن میں اس کا ذکر نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن نے اس قانون کو منسوخ نہیں کیا، اور جب منسوخ نہیں کیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ برقرار ہے، جب وہ برقرار ہے تو ہمارا قانون ہے۔ ہمارا بنایا ہوا نہیں، خدا کا بنایا ہوا قانون ہے اور ہمارے لیے واجب التعمیل ہے۔ چنانچہ توریت میں شادی شدہ لوگوں کے زنا سے متعلق صراحت سے ذکر ہے کہ ان کو رجم کیا جائے۔ لیکن غیر شادی شدہ لوگوں کے زنا سے متعلق توریت میں حکم ہے کہ ان کو صرف مالی جرمانہ کیا جائے، اور کچھ نہیں۔ اس قانون کو قرآن نے منسوخ کر دیا۔ صرف جرمانے پر اکتفا کرنا، بد اخلاقی میں اضافہ کرنا ہے۔ اس کو ایک زیادہ روکنے والی چیز کی ضرورت ہے۔ لہٰذا حکم ہوا کہ ایک سو دُرے لگائے جائیں۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں ایک پرانے قانون کے ایک جز کو سکوت کے ذریعے برقرار رکھا گیا اور دوسرے حصے کو صراحت کے ساتھ منسوخ کیا گیا، تو وہ اسلامی قانون ہوئے اور دونوں پر عمل واجب ہے۔ یہ تھا میرا منشاء کہ پرانے انبیاء کی شریعت، مسلمانوں پر واجب التعمیل ہے، دو شرطوں کے ساتھ، ایک تو ان میں ترمیم یا تبدیلی قرآن نے نہ کی ہو اور دوسرے یہ کہ ان کا ہم تک پہنچنا قابل اعتماد وسائل سے ہوا ہو۔

اب ہم اسلامی قانون کی ترقی کے متعلق ایک اور پہلو کو لیں گے۔ قانون کا کچھ حصہ صراحت کے ساتھ قانون ساز یعنی خدا اور رسول اللہ ﷺ ہم تک پہنچاتے ہیں۔ اس میں گویا انسان کے بنانے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے لیکن اگر کسی وقت قرآن و حدیث میں سکوت ہو، جیسا کہ میں نے ابھی معاذ بن جبلؓ کی حدیث کے ذریعے سے آپ کو بتایا تو ایسے حالات میں ہم کو اجتہاد کرنے کی ضرورت

ہے۔ یعنی سوچ کر، اپنی عقل سلیم کے لحاظ سے ہو کوئی قاعدہ استنباط کریں جو ہمیں مناسب معلوم ہو اور ہماری عقل اور ہمارا ضمیر اس کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو۔ یہ کام قانون کے ماہرین ہی کر سکتے ہیں۔ فرض کیجیے ایک طبیب ہے، اس کا قانون سازی سے کوئی علاقہ نہیں۔ ایک روٹی پکانے والا نانبائی ہے، اس کو قانون سازی سے کوئی تعلق نہیں وغیرہ وغیرہ۔ قانون سازی کا کام قانون کے متخصصین ہی کر سکتے ہیں، کوئی اور نہیں۔ لٰہذا ہم دیکھیں گے کہ اسلامی معاشرے میں قانون بنانے کا کام کون کرتے ہیں اور قانون کو سمجھنے اور سمجھانے کا کام کون کرتے ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں ایک تو حاکم عدالت اور دوسرے جسے ہم مفتی کا نام دیتے ہیں یعنی اس سے پوچھتے ہیں کہ اس بارے میں کیا قانون ہے اور وہ ہمیں بتاتا ہے کہ اسلامی قانون یہ ہے یا یہ ہونا چاہیے، لیکن مفتی اس کا نفاذ نہیں کر سکتا۔ اس فرق کے باوجود دونوں ذیلی قانون سازی کا کام کرتے ہیں۔ اساسی قانون کی حیثیت تو قرآن و حدیث رکھتے ہیں لیکن قرآن و حدیث ساکت ہوں تو اجتہاد کے ذریعے سے، استنباط کے ذریعے سے، یہ لوگ قانون معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ ہمیں بتاتے بھی ہیں اور ہم پر نافذ بھی کرتے ہیں۔

ایک مثال میں آپ کو دیتا ہوں۔ قرآن مجید میں چوری کی سزا مقرر کی گئی ہے، لیکن اگر کوئی شخص کفن چوری کرے یعنی ایک ایسے شخص سے اس کا مال لے جو اپنی مدافعت نہیں کر سکتا یعنی کسی مردہ شخص کی قبر کھولے، قبر کے اندر سے اس کا کفن چرا لے جائے تو کیا اسے چوری کہا جائے گا؟ ہمارے فقہاء کہتے ہیں کہ وہ چوری نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کفن چوری کی سزا کیا ہو گی؟ کیا وہی سزا ہو گی جو عام چوری کی ہے یا اس کے لیے کسی اور قانون کی ضرورت ہو گی؟ اس میں سوائے استنباط، اجتہاد اور غور و فکر کے، قانون معلوم کرنے کے اور کوئی صورت ممکن نہیں کیونکہ قرآن میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ ایسی صورت میں ہمارے فقہاء استنباط کرتے ہیں اور استنباط کے لیے قیاس سے کام لیتے ہیں۔ میں تفصیلوں میں نہیں جاتا، صرف آپ کو مثال دے کر سمجھانا چاہتا ہوں کہ کن صورتوں میں فقہاء کو یا مفتیوں کو اور قاضیوں کو قانون معلوم کرنے اور قانون میں ترقی دینے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ کیونکہ چوری کے متعلق قانون تھا لیکن کفن چوری کے متعلق قانون نہیں تھا، اسے ہمارے قاضی اور مفتی نے معلوم کیا۔ پھر وہ ہمارے قانون کا جزو بنا اور ہمارے قانون میں اس سے ترقی ہوئی۔ یہ کام ہمیں عہد نبویؐ ہی سے نظر آنے لگتا ہے۔ چنانچہ اس کی صراحت ایک حدیث میں ملتی ہے۔ ایک روایت ہے کہ رسول ﷺ نے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ تمہیں کوئی چیز معلوم کرنا ہو تو ابو بکرؓ سے معلوم پوچھ لو۔ حضرت ابو بکرؓ ایک ماہر قانون تھے اور صحابہ کرام رسول ﷺ کو ہر چھوٹی چیز کے متعلق زحمت دینے کے بجائے، حضرت ابو بکرؓ کے پاس جاتے اور ان سے پوچھ لیتے۔ انہیں ایک طرح سے اجازت تھی کہ وہ چھوٹے موٹے مسائل میں فتویٰ دیں۔ کوئی مشکل مسئلہ ہو تو ظاہر ہے

حضرت ابو بکرؓ بھی کہتے کہ ٹھیرو، رسول ﷺ سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ اگر انہیں معلوم ہوتا تو وہ کہتے کہ رسول ﷺ نے اس کے متعلق سابق میں یہ حکم دے رکھا ہے، تم اس پر عمل کرو۔ اس طرح قاضی کے فیصلے بھی عہد نبویؐ سے شروع ہوئے تھے مجھے معلوم نہیں کہ مفتیوں کی تعداد کتنی تھی۔ صرف ایک واقعہ میرے ذہن میں تھا۔ وہ میں نے آپ سے بیان کر دیا۔ حضرت ابو بکرؓ کے متعلق صراحت سے تاریخوں میں ذکر ہے کہ رسول ﷺ نے ان کو مفتی بنا کر نامزد کر رکھا تھا۔ ممکن ہے اور صحابی بھی ہوں۔ رہا قاضی تو اسلامی سلطنت کی توسیع کے ساتھ ان کی تعداد بھی بڑھتی جاتی ہے، خاص کر یمن میں جو ایک بڑا صوبہ تھا اور ذہنی لحاظ سے اس زمانے میں بہت ترقی یافتہ تھا۔ وہاں کے لوگ خانہ بدوش نہیں تھے۔ بستیوں میں زندگی گزارنے والے اور تجارت کاشتکاری کرنے والے لوگ تھے۔ اس لیے یمن کے متعلق ایک سے زیادہ سرکاری افسروں کا ذکر ملتا ہے۔ گورنر بھی اور اس طرح کے دیگر عہدیدار بھی ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک کا ذکر تھوڑی دیر ہوئی میں نے آپ سے کیا تھا یعنی معاذ بن جبلؓ۔ وہ قاضی بھی تھے لیکن ان کا ایک اور فریضہ بھی نظر آتا ہے کہ وہ انتظامی امور بھی سر انجام دیتے تھے، یعنی گورنر بھی تھے اور قاضی بھی تھے۔ ایک اور افسر عمرو بن حزم ہیں ان کے متعلق تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسپکٹر جنرل تعلیمات بھی تھے۔ چنانچہ طبری نے لکھا ہے کہ ان کا فریضہ تھا کہ گاؤں گاؤں کا دورہ کریں اور لوگوں کو تعلیم دیں۔ غالباً وہ ہر جگہ کوئی مدرسہ کھولتے ہوں گے۔ پھر مقامی لوگوں کو قرآن پاک پڑھانے کی تربیت دے کر آگے روانہ ہو جاتے ہوں گے۔ بہر حال "کان ینتقل من امارۃ عامل الی عامل" کے الفاظ تاریخ طبری میں آتے ہیں۔ وہ ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں جایا کرتے تھے اور ان کا کام لوگوں کو تعلیم دینا تھا۔ ان قاضیوں میں سے ایک جو یمن بھیجے گئے۔ یہ حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ ہیں۔ ان کا ذکر میں بالخصوص اس لیے کر رہا ہوں کہ ان کا تقرر نامہ بھی تاریخ میں محفوظ ہے۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں نظم و نسق کا اصول یہ نہ تھا کہ کوئی شخص انتہا کسی مقام پر پہنچ جائے۔ جیسے حمید اللہ بہاولپور آ کے یہ کہہ دے کہ میں لیکچر دینے آیا ہوں وائس چانسلر کو خبر بھی نہ ہو۔ اس کے بر خلاف مرکز یعنی پایہ تخت سے ایک تحریری پروانہ نامزد شدہ گورنر کو بھی دیا جاتا، اور ایک خط مقامی باشندوں کے نام بھی ہوتا۔ جس میں یہ کہا جاتا کہ میں تمہارے پاس فلاں شخص کو گورنر بنا کر یا قاضی بنا کر یا عامل بنا کر بھیج رہا ہوں۔ جب وہ آئیں تو ان کی اطاعت کرنا، ورنہ میری عدم اطاعت متصور ہو گی۔ اور قاضیوں کو پروانہ نامزدگی دیا جاتا جس میں ان کے فرائض کا بھی کچھ ذکر ہوتا تھا۔ یہ طریقہ بھی ہمیں عہد نبوی ﷺ ہی میں ملنے لگتا ہے۔ (اور حضرت عمرو بن حزمؓ کو دیا ہوا ہدایت نامہ محفوظ ہے) اس کا ذکر میں نے ایک اور وجہ سے بھی کیا ہے یعنی حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ کی عظیم الشان شخصیت کی بناء پر۔ ان کا ایک قصہ بھی آپ سے بیان کرتا چلوں اور بہت ادب کے ساتھ آپ سے عرض کرتا ہوں کہ ابن سعد کے مطابق وہ ان پڑھ تھے، لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا۔ رسول ﷺ کی وفات تک وہ اُمّی رہے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے ان کی عظیم صلاحیتوں اور وسیع

تجربے کی بناء پر، کہ عہد نبوی ﷺ میں مختلف عہدے انجام دے چکے تھے، ان کو عراق کی فتح کے بعد بصرہ کا گورنر نامزد کیا۔ چونکہ خود انہیں لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا اس لیے وہاں انہوں نے ایک لکھے پڑھے اچھے ماہر کو سیکرٹری بنا لیا، جو ایک عیسائی تھا۔ ایک دن حضرت عمرؓ نے ان کو بلا بھیجا۔ وہ اپنے سیکرٹری کے ساتھ کچھ انتظامی فرائض کے لیے مدینہ آئے تو مسجد کے اندر حضرت عمرؓ سے ملنے کے لیے چلے گئے، لیکن سیکرٹری صاحب باہر ہی رہے حضرت عمرؓ نے پوچھا تمہارا سیکرٹری ساتھ نہیں آیا، کہاں ہے؟ کہا کہ باہر ہے۔ آپ نے پوچھا کہ مسجد میں کیوں نہیں آیا؟ تو بتایا کہ عیسائی ہے۔ حضرت عمرؓ کو یہ نامناسب معلوم ہوا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ سیکرٹری کو بدل دو۔ بظاہر ہمیں موجودہ زمانے میں مسلم اور غیر مسلم کا فرق و امتیاز نامناسب معلوم ہو گا لیکن آپ اس پر غور کیجیے کہ ایک گورنر جسے بیسیوں قسم کے اختیار حاصل ہوں، اس کا فیصلہ بھی فی الفور نافذ ہو جاتا ہے اور بالخصوص اس علاقے میں جہاں ابھی پوری طرح امن قائم نہ ہو۔ اس کو فتح ہوئے مشکل سے چند مہینے گزرے ہوں، وہاں کے گورنر صاحب کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا، وہ سیکرٹری کو حکم دیتے ہیں، معلوم نہیں سیکرٹری صاحب کیا لکھتے ہیں۔ گورنر کی مہر کے ساتھ پروانہ چلا جاتا ہے، اس لیے احتیاط لازمی تھا۔ آج اگر بالفرض ہمارے محترم جنرل ضیاء الحق کو لکھنا پڑھنا نہ آئے تو وہ کسی ہندو کو اپنا سیکرٹری نہیں بنائیں گے، یا کسی روسی کو اپنا سیکرٹری نہیں بنائیں گے۔ یہی فیصلہ حضرت عمرؓ نے فرمایا سیکرٹری بدل ڈالو۔ مگر وہی حضرت عمرؓ دوسرے موقعوں پر عیسائیوں سے سرکاری کاموں میں مدد بھی لیتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ حضرت عمرؓ میں تعصب تھا۔ وہ غیر مسلم افسروں سے بوقت ضرورت استفادہ کرتے تھے۔ صرف اس وقت روکتے تھے جب عقلِ سلیم اس کی متقاضی ہوتی کہ ان پر اعتماد نہ کیا جائے۔ ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں مثلاً ہرمزان نامی ایک ایرانی تھا۔ اس سے حضرت عمرؓ بارہا مشورہ کیا کرتے تھے۔ سیاسی معاملات میں بھی اور جنگی معاملات میں بھی۔

عہد نبوی ﷺ میں اسلامی قانون کی ترقی کے لیے جو اولین ماخذ تھے، وہ میں نے بیان کیے ان کے علاوہ دو نئے عناصر کا اضافہ ہوا۔ ان میں سے ایک مفتی ہیں اور دوسرے قاضی۔ قاضیوں کو عام طور پر نئی قانون سازی کی ضرورت پیش آتی ہے، مقدمات ان کے سامنے آتے ہیں اور ہر مقدمے کے مواقع، حالات اور روددادیں مختلف ہوتی ہیں اور انہیں اسی کے مطابق فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ ایسی متعدد مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں کہ گورنر اور قاضی، جو دور دراز علاقوں میں تھے یا تو خود لکھ کر رسول ﷺ سے پوچھتے تھے کہ ان حالات میں کیا کرنا چاہیے اور ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ ان گورنروں اور قاضیوں نے اپنی صوابدید اور فہم کے مطابق فیصلہ کر ڈالا۔ اس کی اطلاع رسول ﷺ کو ہوئی۔ اگر آپ کو نامناسب معلوم ہوا تو فوراً تصحیح کے احکام صادر فرما دیے۔ اس دوسری قسم کی ایک مثال آپ کو دیتا ہوں۔ ایک شخص کو قتل کر دیا جاتا ہے، اس کا خون بہا کس کو دیا جائے؟ پرانے زمانے میں عرب میں رواج تھا کہ خون بہا مقتول

کے مرد رشتہ داروں کو دیا جاتا تھا، یعنی بیٹے کو، باپ کو، بھتیجے کو وغیرہ۔ مقتول کی بیوہ کو اس میں کوئی حصہ نہ ملتا تھا۔ اس کی اطلاع رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کو ہوئی۔ آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے بیوہ کو بھی اسی تناسب سے حصہ ملنا چاہیے جس تناسب سے وراثت میں اس کا حصہ ہے۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر نہیں تھا، حدیث میں بھی اس وقت اس کا ذکر نہیں تھا، جب تک یہ واقعہ پیش نہ آیا۔ اس کے بعد رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی حیاتِ طیبہ میں اسلامی قانون کے دو مستقل، غیر تبدل پذیر ماخذ یعنی قرآن و حدیث مکمل ہو جاتے ہیں۔ قانونی نقطہ نظر سے جب کوئی نئ گتھی پیدا ہوتی تو اسے سلجھانے کے لیے مسلمان سب سے پہلے قرآن اور پھر حدیث سے رجوع کرتے اور اگر ان دونوں میں کوئی حل نہ ملتا تو پیغمبر کے عطا کردہ عظیم الشان اصول یعنی اِجتہاد پر عمل کرتے۔ یہ اصول بعد میں مسلمانوں کے بہت کام آیا ورنہ اسلامی قانون منجمد ہو جاتا، اور مسلمان اسے ناکافی پاکر غیر اسلامی قوانین اختیار کر لینے پر مجبور ہوتے۔ اجتہاد کے ذریعے سے ہر نئی چیز کے بارے میں قانون بنانے کا موقع مل گیا۔

اسی طرح قاضیوں کے نام حضرت عمرؓ کا ہمیں ایک خط ملتا ہے جس میں یہ حکم تھا کہ فیصلہ کرنے سے پہلے مشورہ بھی کر لیا کرو۔ یہ نہیں کہ من مانا فیصلہ کرو اور اسے نافذ کر دو۔ اگر تمہیں قانون معلوم نہیں ہے تو خود بھی سوچو اور عالم لوگوں سے جو تمہارے آس پاس موجود ہوں، ان سے بھی مشورہ کرو۔ یہ ایک طرح سے اجتماعی (Collective) اجتہاد کی صورت ہو سکتی ہے۔ خود خلفاء کا بھی یہی معمول تھا۔ حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے متعلق ہمیں کثرت سے ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ کوئی پیچیدہ مقدمہ ان کے سامنے آتا، جس کے بارے میں قرآن و حدیث میں وضاحت کے ساتھ کوئی قانون نہ ملتا تو اجتماع عام کیا جاتا۔ اذان ہوتی، لوگ دوڑتے ہوئے مسجد کی طرف آتے، مسجد میں خلیفہ اُن سے مخاطب ہو کر پوچھتا کہ اس معاملے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ اس اجتماع میں ہر شخص رائے دینے کا مجاز تھا، بڑا ہو یا چھوٹا، مرد ہو یا عورت، ہر ایک مشاورت میں شریک ہو سکتا۔ عورتوں کا ذکر اس لیے کرتا ہوں کہ ایک ایسی مثال ہمیں حضرت عمرؓ کے زمانے میں ملتی ہے۔ اس زمانے میں یہ خرابی پیدا ہو گئی تھی کہ بیٹی کا نکاح کرنے سے پہلے لوگ بڑا مہر حاصل کرنے کی کوشش کرتے، اور ہونے والے داماد سے کہتے کہ اتنی رقم دو۔ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ اس طرح بہت سی لڑکیاں بوڑھی ہو جاتی ہیں اور شوہر کا خواب دیکھتی رہتی ہیں، نکاح کا موقع نہیں ملتا۔ انہوں نے حکم جاری کر دیا کہ فلاں مقدار رقم سے زیادہ مہر نہ باندھا جائے۔ حضرت عمرؓ خلیفہ وقت تھے، بہت بڑے صحابی تھے، دیگر صحابہ نے اعتراض بھی نہ کیا، اس اعلان پر مسجد میں ایک عورت اٹھ کھڑی ہوتی ہے، اور کہتی ہے اے عمر، تمہیں ایسا حکم کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا، یہ قانون نامناسب ہے۔ وہ حیران ہوئے، پوچھا "کیوں ناجائز ہے؟" اس بوڑھی عورت نے کہا" قرآن مجید (22:4) میں ایک جگہ ذکر آیا ہے کہ تم عورت

کو مہر میں ایک قنطار یعنی بہت بڑا خزانہ دے چکے ہو تو بھی طلاق کی صورت میں اسے واپس نہ لینا۔ جب خدا نے یہ اجازت دی ہے کہ مہر ایک قنطار باندھا جاسکتا ہے تو عمر کو کیا حق ہے کہ اس قانون کو منسوخ کرے۔" حضرت عمرؓ بہت خدا ترس آدمی تھے، فوراً کہہ اٹھے "عمر نہیں سمجھا، بوڑھی عورت سمجھ چکی ہے اس کا بیان ٹھیک ہے۔ میں اپنا حکم واپس لیتا ہوں"۔ حاصل کلام یہ کہ مشورے کی عام اجازت ہے، اس میں عالم و جاہل، بچہ اور بوڑھا، مرد اور عورت کا کوئی فرق نہیں۔ ہر شخص رائے دے گا۔ اس رائے پر اگر لوگوں کا اتفاق ہو تو اس پر عمل کیا جائے گا، ورنہ نہیں، بہر حال رسول ﷺ کی رحلت کے بعد خلفائے راشدین کے دور میں ہمیں حکومت کی طرف سے اجتماعی مشورہ، مفتیوں اور قاضیوں کی طرف سے انفرادی آراء کا ملنا نظر آتا ہے۔ اس کا سلسلہ برابر جاری ہے۔

چونکہ مسلمان ابتدائی زمانے ہی میں تین براعظموں، یعنی ایشیاء، یورپ اور افریقہ میں پہنچ گئے تھے، جہاں بیسیوں قوموں سے انہیں سابقہ پڑا، ان کی رعیت میں دس پندرہ مذہب والے لوگ پائے جاتے تھے جن کی عادت و رواج مختلف تھے، لہٰذا انہیں نئے نئے مقدمے اور مسائل پیش آتے رہے اور ان کے متعلق فیصلے بھی مختلف ہوتے رہے۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے کا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ قرآن مجید میں غیر مسلم رعایا سے جزیہ لینے کا حکم ہے اور وہاں اہل کتاب کا ذکر ہے۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں شمالی افریقہ کا وہ علاقہ فتح ہوا جہاں بربر نامی قوم رہتی ہے۔ سوال پیدا ہوا کہ بربر قوم سے جزیہ لیا جائے یا نہیں۔ اس واقعے سے کچھ پہلے حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایران کے مجوسیوں یعنی پارسیوں کے متعلق یہی سوال پیدا ہوا تھا۔ جواب آسانی سے مل گیا۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے اٹھ کر کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ سنوا بھم سنۃ اھل الکتاب فی غیر أکل ذبا ئحھم و نکاح نسا ئھم مجوسیوں سے، پارسیوں سے وہی برتاؤ کرو جو اہلِ کتاب سے ہے (یعنی عیسائیوں اور یہودیوں کا قانون ان سے بھی متعلق کرو) بجز دو باتوں کے، ان کا ذبیحہ نہ کھاؤ اور ان کی عورتوں سے نکاح نہ کرو لیکن حضرت عثمانؓ کے زمانے میں بربر کا مسئلہ پیدا ہوا تو رسول ﷺ کا کوئی حکم موجود نہ تھا۔ قرآن مجید میں صراحت نہ تھی۔ آخر مشورہ کے بعد خلیفہ نے حکم دیا کہ ان سے جزیہ لو۔ پھر یہ فیصلہ ہوا کہ صرف اہل کتاب ہی نہیں، ساری غیر مسلم اقوام سے جو ہماری رعیت ہوں، جزیہ لیا جائے۔ سندھ پہنچے تو یہاں جو قوم تھی، ان سے جزیہ لیا جانے لگا پھر دوسرے علاقوں میں پہنچے تو برہمنوں سے بھی جزیہ لیا جانے لگا۔ غرض امام ابو یوسف کے الفاظ میں سارے غیر مسلموں سے جزیہ لیا جانے لگا۔ چاہے وہ آگ کی پوجا کریں یا درخت یا پتھر کی پوجا کریں، سب کے ساتھ اسی حیثیت سے برتاؤ کیا جانے لگا، جو اہلِ کتاب کے متعلق قرآن نے کہا ہے اور استنباط کیا کہ قرآنی احکام توضیحی (Illustrative) ہیں، تحدیدی (limitative) نہیں یعنی یہ منشاء نہیں کہ صرف اہل کتاب سے جزیہ لو بلکہ اس طرح کی صورت میں اوروں سے بھی تم لے سکتے ہو۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک واقعہ پیش آیا جسے قانونی نقطہ نظر سے کافی اہمیت حاصل ہے۔ وہ یہ کہ انہوں نے ایک فاضل صحابی حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کو معلم کی حیثیت سے کوفہ بھیجا (یوں سمجھئے کہ کوفہ کی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے) بہر حال انہیں معلم کی حیثیت سے کوفہ بھیجا گیا۔ وہ مورخ نہیں تھے، صوفی نہیں تھے، وہ خالد بن ولیدؓ کی طرح نامور سپاہی بھی نہیں تھے لیکن قانون میں ان کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ چنانچہ وہ وہیں درس دیتے رہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے درس میں قانونی مباحث اور فقیہانہ عناصر ہمیشہ زیادہ ہوتے تھے۔ جب وہ وہاں بھیجے گئے تو انہیں ایک پروانہ یا تقرر نامہ دیا گیا جس کے الفاظ یہ تھے "اے کوفہ کے مسلمانو! میں رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے ایک نہایت محترم صحابی کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔ تمہیں شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں اپنے آپ پر ایثار کر کے ایسے شخص کو تمہیں دے رہا ہوں۔ اس سے تمہیں معلوم ہو گا ان کی کیا اہمیت ہے۔" حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اپنی وفات تک وہاں شعبہ قانون کے استاد کی حیثیت سے درس دیتے رہے۔ اس شہر کے باشندوں میں انہیں ایک لائق یمنی شاگرد علقمہ نخعی نامی ملا، جو ان کا بہترین طالب علم تھا۔ عبد اللہ بن مسعودؓ کی وفات کے بعد یہ شاگرد جامع مسجد کوفہ میں قانون کا معلم بنا اور اس نے درس جاری رکھا۔ ان کی وفات ہوئی تو ابراہیم نخعی ایک اور یمنی باشندہ جو کہ شاگرد تھا اور کوفہ میں ہی رہتا تھا، وہ ان کا جانشیں بنا۔ غرض یہ سلسلہ جاری رہا اور یہ شہرت پھیل گئی کہ کوفہ کی مسجد میں فقہ کی تعلیم بہت اچھی ہوتی ہے۔ ابراہیم نخعی کی وفات کے بعد ان کے ایک شاگرد، حماد بن ابی سلیمان، جو عرب نہیں بلکہ ایرانی تھے، وہ جانشین ہوئے۔ وہ بھی قانون کے ماہر تھے اور فقہ کی تعلیم دیتے تھے۔ جب ان کی وفات ہوئی تو ان کا جانشین ایک اور ایرانی شاگرد بنتا ہے۔ یہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمت اللہ علیہ ہیں۔ وہ بہت کمسن تھے، اس کے باوجود سب سے بہتر شاگرد سمجھے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ خود حماد بن ابی سلیمان کے شاگرد یعنی امام ابو حنیفہؒ کے جو ہم درس طلباء تھے وہ بھی اصرار کرنے لگے کہ: اے ابو حنیفہؒ! استاد کے بعد تم اس کام کو جاری رکھو۔ ابو حنیفہؒ بہت ذہین آدمی اور انسانی نفسیات سے آشنا تھے۔ انہوں نے خیال کیا کہ مجھ جیسے نوجوان کو استاد کی جگہ لوگ دیکھیں گے تو غالباً پسند نہیں کریں گے۔ جب تک انہیں کوئی تشویق نہ دی جائے اور یہ نہ بتایا جائے کہ واقعی ان کے لیکچر بہت اہم ہیں۔ چنانچہ امام ابو حنیفہؒ نے اپنے ساتھیوں سے، جو ان کے رفیق درس تھے، کہا کہ میں اس شرط کے ساتھ قبول کرتا ہوں کہ ایک سال تک تم میرے طالب علموں کی حیثیت سے لیکچروں میں حاضر رہو گے۔ اگر تم اس پر آمادہ ہو تو میں قبول کرتا ہوں۔ وہ بھی مخلص دین دار لوگ تھے انہوں نے کہا "بہت خوب"۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ ابو حنیفہؒ وہ استاد ہیں کہ ان کے ہم درس بھی ان کے شاگرد بننے کو تیار ہیں تو انہیں خوشی بھی ہوئی اور اطمینان بھی ہوا کہ واقعی یہ قابل شخص ہو گا، جب ہی تو اس کے ہم جماعت اس کے شاگرد بننے پر آمادہ ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کی اور دوسری خوبیوں کے علاوہ ایک خوبی یہ بھی تھی کہ جب کبھی ان کے پاس کوئی غریب طالب علم آتا وہ مالی مدد بھی کیا کرتے۔ اس طرح لوگوں میں ان کی شہرت و عزت اور ان کا اثر و

رسوخ بڑھتا گیا۔ بنی امیہ کا آخری دور تھا۔ یہ زمانہ سیاسی نقطہ نظر سے بہت خراب تھا۔ ملک میں دہشت گردی اور خون ریزی عام تھی۔ حکومت کے جبر و تشدد کے خلاف عوام میں بغاوت کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ غرض بہت ہی نازک زمانہ تھا۔ اس دور کے آخری زمانے یعنی 120ھ کے ایک واقعے کی طرف اشارہ کروں گا۔ امام حسینؓ کے پوتے زید بن علی زین العابدینؒ کو حکومت کے مظالم کی وجہ سے حکومت کے خلاف سخت نفرت پیدا ہوئی، اور وہ بغاوت پر کمربستہ تھے۔ امام ابو حنیفہؒ ان کو بہت چاہتے تھے اور وہ دل سے خواہاں تھے کہ بنو امیہ کے حکمرانوں کی جگہ زید بن علی خلیفہ بن جائیں۔ ایک دن زید بن علی نے ان سے کہا کہ بہت سے لوگ مجھے مدد دینے پر آمادہ ہو چکے ہیں، اور میں اب حکومت کے خلاف ایک مسلح بغاوت کرنا چاہتا ہوں۔ امام ابو حنیفہؒ نے انہیں رقم دی، لیکن ساتھ دینے سے انکار کر دیا، یہ کہا کہ اگر مجھے یقین ہوتا کہ تمہارے ساتھی آخر تک ساتھ دیں گے تو میں بھی اس فوج میں شریک ہوتا، یعنی حکومت کے خلاف بغاوت میں حصہ لیتا۔ مگر مجھے اطمینان نہیں ہے، میں تمہیں رقم کی حد تک مدد دیتا ہوں۔ چنانچہ وہی پیش آیا جس کا ابو حنیفہ کو اندیشہ تھا۔ یعنی ان کے ساتھی ان کا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے، حکومت نے انہیں گرفتار کر لیا اور انہیں قتل کر دیا۔ زید بن علی کی قانون دانی کی وجہ سے ابو حنیفہ کو ان سے محبت تھی۔ زید بن علی بہت بڑے فقیہ تھے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے فقہی معاملات میں ان سے استفادہ کیا تھا۔ کیونکہ وہ امام ابو حنیفہؒ سے زیادہ معمر اور پرانے ماہر تھے۔ زید بن علی نے جو کتاب لکھی اس کا نام ہے "المجموع فی الفقہ" یہ مشہور کتاب ہے اور اسلامی قانون کی قدیم ترین کتاب ہے، جو ہم تک پہنچی ہے۔ یہ کتاب چھپ گئی ہے۔ اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ فقہ کی کتابیں آج کل جس انداز و ترتیب کی ہوتی ہیں، وہی نہج اس میں موجود ہے۔ آغاز ہوتا ہے "کتاب الطہارۃ" سے، جس میں وضو کے احکام اور غسل کے احکام ہیں۔ پھر نماز کے احکام، روزہ وغیرہ، عبادات کا بیان، پھر معاملات، پھر دوسری چیزوں کا بیان۔ یہ طرح زید بن علی نے ڈالی اور لوگوں کو اتنی پسند آئی کہ بعد میں کسی نے اس میں ترمیم نہیں کی۔ یہ دور گزر گیا اور بنی عباس برسر اقتدار آئے۔ لوگوں کو توقع تھی کہ بنو عباس کے زمانے میں دنیا جنت بن جائے گی مگر انہیں بڑی مایوسی ہوئی۔ مختلف وجوہ سے لوگوں کی توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں، صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس دور میں امام ابو حنیفہؒ نے ایک کارنامہ انجام دیا، جو اسلامی قانون کی تاریخ میں سب سے زیادہ اہم اور یادگار کارنامہ ہے۔ اس زمانے میں امام مالکؒ، امام اوزاعیؒ وغیرہ بڑے بڑے فقیہ موجود تھے۔ انہوں نے کتابیں بھی لکھیں لیکن ان کی کوششیں انفرادی تھیں۔ امام ابو حنیفہؒ نے سوچا کہ انفرادی کوشش کی جگہ، اسلامی قانون کی تدوین اگر اجتماعی طور پر کی جائے تو بہتر ہو گا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بہت سے شاگردوں میں چالیس ماہرین قانون منتخب کر کے ایک اکیڈمی قائم کی۔ انتخاب میں اس بات کا خیال رکھا کہ جو لوگ قانون کے علاوہ دیگر علوم اور معاملات کے ماہر ہوں، انہیں بھی اکیڈمی کا رکن بنایا جائے۔ غرض مختلف صلاحیتوں کے ماہرین کو اس اکیڈمی میں جمع کیا گیا۔ اصول یہ تھا کہ ایک فرضی سوال پیش کیا جائے، اگر

یوں ہو تو کیا کرنا چاہیے؟ اس مسئلے پر بحث ہوتی۔ بعض اوقات ایک سوال پر ایک ایک ماہ تک بحث ہوتی اور بالآخر جب سب لوگ ایک نتیجے پر پہنچ جاتے تو اس اکیڈمی کے سیکرٹری امام ابو یوسفؒ اسے لکھ لیا کرتے تھے۔ ایسی کچھ تحریریں ہم تک پہنچی ہیں جن میں "قال" "قلنا" "قال" "قلنا" یعنی سوال و جواب کی صورت میں کسی مسئلے پر بحث کی گئی ہے۔

خلاصہ یہ کہ امام ابو حنیفہؒ کے زمانے میں اسلامی قانون کی تدوین کی دو کوششیں ہوئیں۔ ایک کوشش حکومت کی طرف سے ہوئی۔ دوسری کوشش پرائیوٹ طور پر امام ابو حنیفہؒ کی طرف سے۔ سرکاری کوشش خلیفہ منصور کی تھی۔ اس نے چاہا کہ اسلامی قانون کو مدوّن کیا جائے اور ساری اسلامی سلطنت میں اسے نافذ کیا جائے۔ اس زمانے میں امام مالکؒ کی بڑی شہرت تھی۔ چنانچہ خلیفہ نے امام مالکؒ کو بلا بھیجا اور کہا کہ تم اپنی کتاب فقہ کو مکمل کر لو۔ میں تمہاری فقہ کی حکومت کا قانون بنا کر نافذ کرنا چاہتا ہوں۔ امام مالکؒ بہت خدا ترس تھے۔ انہوں نے کہا نہیں، ایک آدمی کی رائے سب پر نافذ نہیں ہو سکتی۔ لوگوں کو اختلاف کی اجازت ہونی چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے انکار کر دیا۔ مگر اسلامی قانون کی تدوین کی ضرورت تھی۔ وہ کام امام ابو حنیفہؒ نے انجام دیا اور سالہا سال کی کوشش سے ایک ایسا قانون بنایا جس کے متعلق پورے اطمینان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ Justinian code سے زیادہ مکمل اور زیادہ مناسب ہے۔

اس زمانے میں اور بھی فقیہ پیدا ہوئے اور ان فقہاء کے شاگرد بھی بنتے رہے۔ ایک مختصر جملے پر اسے ختم کرتا ہوں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں جو فقہاء تھے، ان میں ایک عبد اللہ بن مسعودؓ تھے اور ان کے شاگرد امام مالکؒ تھے۔ مالکی مذہب گویا اس صحابی کی راہ سے پہنچتا ہے۔ ایک اور صحابی عبد اللہ ابن عباسؓ ہیں۔ ان کا قانون اسلامی فرقوں میں سے خوارج کا قانون ہے۔ ایک اور صحابی عبد اللہ ابن عباسؓ، ان کے قانونی احکامات ہمارے شیعہ بھائیوں کے پاس، زید بن علی، اثناء عشری یا فاطمی ائمہ وغیرہ، کے ذریعے سے پہنچتے ہیں۔ پھر اس کے بعد ان علماء کے شاگردوں کے شاگرد، مثلاً امام شافعیؒ ہیں کہ بیک وقت امام ابو حنیفہ کے شاگرد امام محمدؒ کے شاگرد اور امام مالکؒ کے بھی شاگرد ہیں۔ امام شافعیؒ کے شاگرد ہیں امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے شاگرد ہیں ظاہری مذہب کے پیشوا داؤد ظاہری۔ غرض شیعہ سنی کا کوئی فرق نہیں، سب ایک دوسرے کے شاگرد ہیں اور خود ایک دوسرے کے مماثل۔

والسلام و علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ

## سوالات وجوابات

برادران کرام! خواہران محترم! السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ!

مختلف سوالات کیے گئے ہیں، اپنی بساط کے مطابق جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

سوال 1: حضرت معاذؓ کو حضور اکرم ﷺ کے ارشاد "فان لم تجد" سے قرآن وحدیث کا ناکافی ہونے کا استدلال کیا گیا۔ حالانکہ "فان لم یکن" کے الفاظ نہیں فرمائے۔ قرآن میں اپنے ذہن کے مطابق کوئی چیز تلاش نہ کرسکنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن میں ہے ہی نہیں۔ آیت (الیوم اکملت لکم دینکم) کی روشنی میں کیا یہ کہنا بہتر نہ ہوگا کہ اصولی طور پر قرآن کامل اور کافی ہے لیکن اگر اس سے کوئی مسئلہ انسانی ذہن کسی وقت استنباط نہ کرسکے، تو اجتہاد کرلے۔ اس صورت انسانی ذہن کا قصور ہوگا، نہ کہ کتاب اللہ کا ناکافی ہونا ثابت ہوگا۔

جواب: الفاظ کا پھیر ہے، دونوں کا مقصد ایک ہی ہے۔ البتہ میں یہ عرض کروں گا کہ آیت: (الیوم اکملت لکم دینکم) (3:5) میں قرآن وحدیث اور اجماع، تینوں شامل ہوجائیں گے، تنہا قرآن ہی نہیں ہوگا۔ کیونکہ قرآن ہی نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرو۔ قرآن نے کہا ہے کہ (مَنْ یطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰہَ) (80:4) رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرنا اللہ کی اطاعت کرنا ہے۔ وہاں یہ نہیں کہا گیا کہ صرف قرآن پر عمل کرو اور خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر قرآن میں نہ ملے تو حدیث میں تلاش کرو، حدیث میں نہ ملے تو اجتہاد کرو۔ تو آپ کا اور میرا مقصد ایک ہی ہے۔ الفاظ کی ترتیب میں تھوڑا سا فرق ہے۔

سوال 2: اسلامی قانون میں دو عورتوں کی شہادت کو ایک مرد کے برابر قرار دیا گیا ہے، کیا اس صورت میں عورت کو آدھا مرد نہیں بنایا گیا؟

جواب: میں سمجھتا ہوں کہ اس سوال میں ایک بنیادی اصول نظر انداز کر دیا گیا ہے، وہ یہ کہ قدرت کبھی دو چیزوں کو بالکل مماثل نہیں بناتی۔ ایک کو دوسرے کی تکمیل کے لیے Complementary بناتی ہے۔ ورنہ اگر ایک ہی طرح کی دو چیزیں ہوں تو وہ Redundant یعنی مکرر ہو جائیں گی اور یہ قدرت کی طرف سے ایک ضیاع ہو گا۔ قدرت نے مرد کو یا عورت کو مکمل شخصیت نہیں بنایا کہ Self-production کریں، عورت کو مرد کی ضرورت نہ ہو، وہی تنہا اپنے بچے پیدا کرے یا مرد کو بیوی کی ضرورت نہ ہو، وہی تنہا ایک دوسرا انسان خود ہی تخلیق کرے۔ بلکہ اس کی جگہ ایک کو دوسرے کے تعاون سے مکمل کرنے کا بندوبست اپنی حکمت کے تحت کیا ہے۔ ان حالات میں اگر اسلامی قانون دو عورتوں کی شہادتوں کو ایک مرد کے برابر قرار دیتا ہے تو اس کے اس پہلو پر جانے کی جگہ کہ دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر قرار دیا گیا ہے، اگر اس پر سوچیں کہ ایسا کیوں کیا گیا، تو میرے خیال میں زیادہ صحیح اصول ہو گا، اور اس کا جواب میں اپنی طرف سے یہ دوں گا کہ دونوں کے فرائض منصبی مختلف رکھے گئے ہیں۔ ایک عورت کو، چاہے وہ مانے یا نہ مانے، بچے کی ماں بننا پڑے گا، اور اسے بچے کی پرورش کا فریضہ انجام دینا ہو گا۔ اسی طرح مرد کبھی بچہ جن نہیں سکے گا، چاہے وہ کتنا ہی خواہشمند کیوں نہ ہو۔ ان حالات میں جب عورت کا یہ فریضہ کہ وہ اپنے دودھ پیتے ننھے بچے کی پرورش کرے اور ساتھ ہی اس کے ذمے وہ فرائض بھی کر دیے جائیں جو مرد انجام دیتا ہے تو نہ عورت اپنا کام انجام دے سکے گی نہ مرد اپنا کام انجام دے سکے گا۔ مختلف وجوہ سے اسلامی شریعت نے عورت کو پردہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ عورتوں کو مردوں کے ساتھ مخلوط ہونے کی تشویق نہیں دلائی۔ ان حالات میں جس طرح مرد کو اور مردوں کی ملاقات کی آسانی ہوتی ہے، اس طرح ایک عورت کو دوسرے مردوں سے ملاقات کرنے کی سہولت ہماری اسلامی سوسائٹی میں نہیں ہوتی۔ لہٰذا یہ ناگزیر تھا کہ ایک کی جگہ دو عورتوں کی شہادت کو طلب کیا جائے تاکہ دونوں کی شہادت سے واقفیت اور معلومات ہو سکیں۔ اس میں عورتوں کی توہین نہیں ہے بلکہ عورت کے فرائض منصبی کی موجودگی میں اس کی سہولت اور امکانات کا لحاظ رکھ کر اس کو یہ موقع دیا گیا ہے، ورنہ ممکن ہے، یہ کہہ دیا جاتا کہ عورت کی شہادت قبول ہی نہ کی جائے۔ اس کے برخلاف یہ کہا گیا کہ نہیں عورت کی شہادت قبول کی جائے، وہ بھی انسان ہے۔ جیسے وراثت میں اسلام سے پہلے عورت کو کوئی حصہ نہیں ملتا تھا، قانون وراثت کے نقطہ نظر سے غالباً پنجاب کی روایات میں بھی یہ چیز رہی ہے کہ عورتوں کو حصہ نہیں ملتا۔ اسلام نے کہا نہیں عورتوں کو بھی حصہ ملے گا لیکن چونکہ عورت کے واجبات کمتر ہوں گے لہٰذا عورت کا حصہ کم ہو گا۔ آپ کو علم ہو گا کہ ایک عورت خواہ بیٹی ہو یا بیوی ہو یا ماں ہو، ہمیشہ کسی مرد کے زیر کفالت رہتی ہے۔ اسے نفقہ دلایا جاتا ہے اور اگر اس کا قریبی رشتہ دار، بیٹا یا باپ یا شوہر وغیرہ نفقہ نہ دیں تو قانون اس مرد کو مجبور کرتا ہے کہ وہ نفقہ دے۔ عورت کی پرورش کا انتظار مرد کے ذمے کر دیا گیا ہے لیکن اگر کبھی مرد کو ضرورت پیش آئے تو کسی عورت کو مجبور نہیں کیا جاتا کہ وہ اس مرد کا نفقہ ادا کرے۔ ان حالات میں ناگزیر تھا کہ قانون وراثت

میں عورت کو حصہ کم دیا جائے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ چونکہ عورت کے سارے مصارف قانوناً دوسرے کی طرف سے ادا ہو جاتے ہیں، اس لیے عورت کو حصہ بالکل ہی نہ دیا جائے۔ ہو سکتا تھا مگر اسلام نے عورت کے ساتھ ایک ایسا برتاؤ کرنا مناسب سمجھا جو اس کے وقار اور اس کی ضرورتوں کے مطابق ہو۔ ان حالات میں، میں سمجھتا ہوں کہ قانون شہادت میں یہ اصول پیش نظر رکھا گیا کہ چونکہ عورت کو مردوں کے ساتھ ملنے جلنے کے مواقع مقابلتاً کم ہوتے ہیں، لہٰذا ایک کی بجائے دو عورتوں کی شہادت ضروری ہے۔ یہ میری ذاتی رائے ہے لیکن یہ واضح رہے کہ میں قانونِ شہادت کا ماہر نہیں ہوں۔

سوال 3: غلامی کو یکسر ختم نہ کرکے انسانیت کے ناسور کو برقرار رکھا گیا ہے، اس کا کیا جواز ہو سکتا ہے؟

جواب: اس کا جواز یہ ہے کہ بعض انسان معقول چیز کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ان کو مجبور کرنا پڑتا ہے کہ یہ چیز مان لو۔ ہمارے زمانے میں بھی ایسی قومیں ہیں، مثلاً جنوبی افریقہ میں، جہاں اپنے باپ آدم ہی کی دوسری اولاد کو، جس کا رنگ اتفاق سے کالا ہو گیا ہے، مساوات کا حق دینے کے لیے تیار نہیں ہیں، چاہے ساری دنیا متفقہ طور پر مجلسِ اقوامِ متحدہ میں اس کا مطالبہ کیوں نہ کرے۔ کیا ان حالات میں یہ مناسب نہ ہو گا کہ ایسے لوگوں کو جو ہٹ دھرمی پر تلے ہوئے ہیں، ایک ایسے ذریعے سے مجبور کیا جائے جو غلامی کا نام تو رکھتی ہو، لیکن حقیقت میں ان انسانوں کے لیے ایک تربیت گاہ ہے جو دوسرے انسانوں کو اپنے برابر آمادہ کرنے پر تسلیم نہ ہوں، اس لیے اسلام نے غلامی کو لازمی قرار نہیں دیا ہے بلکہ جائز قرار دیا ہے تاکہ بوقت ضرور اس سے استفادہ کیا جائے۔ میں آپ کو پیچھے لے جانا چاہتا ہوں کہ غلامی شروع کیسے ہوئی؟ اس کے بعد آپ واقعی یہ سمجھیں گے کہ غلامی اتنی بری چیز نہیں ہے۔ غلامی کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ پرانے زمانے میں ہمارے ہی آباؤاجداد جب لڑتے تھے اور کسی دوسرے انسان کو مغلوب کر لیتے تھے تو اسے قتل کرکے کھا جاتے تھے۔ اس کے بعد زمانے میں نیک طینت انسانوں نے سوچا کہ ان کو مار کر کھانے کے بجائے ان سے خدمت لی جائے۔ اپنے دشمن کو قتل کرنے کی بجائے اس کو زندہ رکھا جائے اور پھر زندہ رہنے کے بعد، اسلام میں اس کے امکانات بھی رہیں کہ اس کو آزاد کیا جائے۔ غلام بنانا اسلام ہی میں نہیں ہے بلکہ دنیا کی کوئی ایک قوم بھی ایسی نہیں ملتی جس کے ہاں غلام نہ ہوں۔ اسلام نے غلامی کے متعلق جو احکام دیے ہیں، میں ان کا مختصراً ذکر کرتا ہوں۔ پہلی چیز وہی ہے جو میں بیان کر چکا ہوں کہ غلام بنانا واجب نہیں ہے، صرف جائز ہے اس سے حسب ضرورت استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ اسلام نے حکم دیا ہے کہ غلاموں کو آزاد کرنا ایک بہت بڑی نیکی ہے:(فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ • وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ • فَكُّ رَقَبَةٍ •) (90:11،12،13)

آپ کو یہ سن کر حیرت ہو گی کہ توریت اور انجیل میں غلام بنانے کا تو ذکر ہے لیکن غلام کی آزادی کا قطعاً کوئی ذکر نہیں۔ ایک بھی ایسی آیت توریت اور انجیل میں نہیں ہے جس کی رو سے غیر یہودی غلاموں کو آزاد کیا جا سکتا ہو۔ اس کے بر خلاف قرآن میں کہا گیا ہے کہ غلاموں کو آزاد کرنا ایک بہت بڑی نیکی ہے اور آگے چلئے، مختلف گناہوں کا کفارہ دینے کے لیے قرآن نے حکم دیا ہے کہ غلام کو آزاد کرو۔ مثال کے طور پر ایک شخص اپنی بیوی کو "ظہار" نامی طلاق دے کے پچھتائے یا کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کر دے تو علاوہ خون بہا کے، قرآن نے یہ حکم دیا ہے کہ غلام کو آزاد کر کے کفارہ دو۔ اگر غلام تمہارے پاس نہ ہو تو اس صورت میں دوسرے کام سر انجام دے سکتے ہو، مگر غلام آزاد کرنے کا حکم شروع میں آتا ہے۔ ایسی تین چار چیزیں تو قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ اور آگے چلئے قرآن مجید نے حکم دیا ہے کہ اگر غلام اس پر آمادہ ہے کہ اپنی مالیت کی رقم جمع کر کے اپنے آقا سے مطالبہ کرے کہ اس رقم کو لے کر اس کو آزاد کر دے تو آقا انکار نہیں کر سکتا، قانون اس آقا کو مجبور کرے گا کہ اس معاوضے کو قبول کرے اور غلام کو آزاد کرے۔ یہی نہیں بلکہ وہ کاروبار کر کے اور دوسرے وسائل سے اپنی مالیت جمع کرنے کی کوشش کر سکتا ہے اور مطلوبہ رقم جمع ہو جائے تو آقا کو دے کر فی الفور آزاد ہو جائے گا۔ اس سے بھی آگے چلئے، قرآن مجید میں ایک آیت ہے جسے ہم اسلامی حکومت کے بجٹ کا اساسی اصول کہہ سکتے ہیں۔ یعنی یہ کہ سرکاری آمدن کو کن مدات میں خرچ کیا جائے (إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ) (60:9) اس میں "فی الرقاب" ایک لفظ آیا ہے۔ لفظی معنی یہ ہیں کہ سرکاری آمدنی خرچ کی جائے، گردنوں کو چھڑانے کے لیے۔ اس پر سارے مفسرین اور فقہاء متفق ہیں کہ "رقاب" سے مراد دو قسم کے لوگ ہیں، ایک تو وہ مسلم یا غیر مسلم غلام جو ہماری ملکیت میں ہوں، ان کی رہائی کے لیے یہ سرکاری رقم لگائی جائے دوسرے ہماری رعایا کے مسلم یا غیر مسلم لوگ جو دشمن کے ہاتھوں قید ہو جائیں۔ ان کے فدیہ دینے کی بھی ضرورت ہے۔ اگر حکومت کے بجٹ میں سالانہ ایک مخصوص رقم ملک کے غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے رکھنا لازمی ہو تو بہت آسانی سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ کچھ ہی دنوں کے بعد اس ملک میں ایک بھی غلام باقی نہیں رہے گا۔ کیا ایسی کوئی مثال دنیا کی کوئی متمدن حکومت بھی پیش کر سکتی ہے؟ آج بھی لوگوں کو غلام بنایا جاتا ہے، ان کی مرضی کے خلاف Concentration کیمپوں میں بھیجا جاتا ہے، جہاں وہ غلاموں سے بھی بدتر زندگی گزارتے ہیں۔ بہر حال میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر غلامی انسانیت کے لیے ناسور ہے تو کم از کم 'اسلامی غلامی' انسانیت کے ناسور کا علاج ہے۔

سوال 4: براہ کرم شرع اور قانون فقہ کا فرق واضح فرمائیں۔ اگر ایک ہی مفہوم میں یہ اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں تو عرب دنیا کی یونیورسٹیوں میں کلیۃ الشریعۃ والقانون علیحدہ علیحدہ کیوں بیان ہوتے ہیں؟

جواب: عرض یہ ہے کہ اصولاً ان دونوں میں کوئی فرق نہیں، لیکن اسلامی ممالک میں ہماری بدقسمتی سے ہماری حالیہ تاریخ میں ہم کو ضرورت پیش آئی کہ اپنا قانون چھوڑ کر غیروں کے قانون پر عمل کریں۔ ہماری فرنگی حاکموں نے ہمارے لیے ایسے قانون بنائے جن کو ہم اسلامی قانون کے مطابق نہیں پاتے، وہ قانون اسلامی قانون نہیں ہے۔ لہٰذا شرعی قانون اور غیر اسلامی قانون میں فرق کرنے کے لیے ایک کو "شریعۃ" یا اسلامی فقہ اور دوسرے کو صرف "قانون" کہا جاتا ہے۔

سوال 5: دو جڑواں بہنیں پیدا ہوئیں۔ ان کے بازو آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ اسی طرح جوان ہو گئیں۔ انہیں ایک ساتھ بھوک لگتی ہے اکٹھے ہی بخار ہوتا ہے۔ لیکن جب شادی کا مسئلہ پیدا ہوا تو بعض نے کہا کہ ان کی شادی نہیں ہو سکتی۔ بعض نے کہا کہ ان کی شادی الگ الگ مردوں سے ہونی چاہیے۔ مولانا مودودی صاحب نے فتویٰ دیا کہ ان بہنوں کی شادی ایک مضبوط صحت مند مرد سے کر دینی چاہیے۔ آپ اس کی بارے میں کیا رائے ہے؟ جواب ضرور دیں۔

جواب: یہ سوال مشکل ہے، اس لیے میرا جواب متذبذب ہی رہے گا اور وہ یقینی جواب نہیں ہو گا۔ ابھی چند مہینے پہلے کی بات ہے، پیرس کے اخباروں میں ایک مماثل خبر شائع ہوئی۔ وہاں جو حل کیا گیا تھا، اس کا ذکر وہاں کے ایک فرانسیسی اخبار میں آیا، وہ میں آپ سے بیان کر دیتا ہوں کہ ان دو بہنوں کی شادی ایک جڑواں جوڑے سے کی گئی جس میں دونوں مرد ہی تھے۔ ایک حل یہ بھی ہے جس پر اب آسانی سے عمل ہونے لگا ہے۔ جراحی (سرجری) اب اتنی ترقی کر گئی ہے کہ جڑواں لوگوں کے اگر صرف ہاتھ جڑے ہیں یا صرف پیٹھ جڑی ہے، یا صرف پاؤں، تو آسانی سے آپریشن کے ذریعے علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر وہ اس طرح جڑے ہوئے ہیں، مثلاً پیٹ مشترک ہے تو ظاہر ہے اس صورت میں ان کا آپریشن کرنا ناممکن ہے۔ بہرحال یہ ایسی نادر صورتیں ہیں کہ ان کے بارے میں کوئی عام قانون نہیں بنایا جا سکتا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ مولانا مودودی صاحب ایک اچھے عالم تھے، اور خدا ترس بھی تھے۔ انہوں نے جو فتویٰ دیا ہے اس پر عمل کیا جا سکتا ہے اگرچہ مجھے دو بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرنا غلط معلوم ہوتا ہے جس کی قرآن (23:4) نے (وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ) کہہ کر صریحاً ممانعت کی ہے۔ میں بہتر یہ سمجھتا ہوں کہ ان جڑواں بہنوں کا دو الگ مردوں سے نکاح کیا جائے اور جب ایک بہن کے پاس اس کا شوہر آئے تو تھوڑی دیر کے لیے دوسری بہن چادر اوڑھ کر خود کو غائب کر لے، دو بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرنے کے مقابل میں یہ کم تر برائی ہو گی۔ شاید اس عمل سے بھی استفادہ کیا جا سکا ہے جو فرانس میں پیش آیا تھا۔ بذات خود کوئی خاص جواب دینے سے اپنے آپ کو عاجز پاتا ہوں۔

سوال 6: فقہ جعفریہ اور فقہ حنفیہ میں کیا فرق ہے؟ ان میں اختلاف کی وجہ کیا ہے، جبکہ امام ابو حنیفہؒ، امام جعفرؒ کے شاگرد بیان کیے جاتے ہیں۔ فقہ جعفریہ کے نافذ کرنے میں کیا قباحت درپیش ہے؟

جواب: اس سوال میں ذرا سی خامی ہے۔ یہ فرض کر لیا گیا ہے استاد اور شاگرد سو فیصد متفق ہوں گے۔ چونکہ امام ابو حنیفہؒ، امام جعفر الصادقؒ سے درس لیے تھے لہٰذا ان دونوں کے خیالات میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے۔ یہ میرے نزدیک علمی اور واقعاتی نقطہ نظر سے سو فیصد صحیح نہیں ہوگا۔ دونوں میں اختلاف رائے تھا۔ حتیٰ کہ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے دو شاگرد امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ میں اختلاف رہا ہے۔ یہاں تک گمان کیا جاتا ہے کہ فقہ حنفی میں 15 فیصد باتوں میں امام ابو حنیفہؒ کی رائے پر، اور باقی چیزوں میں ان کی رائے کے بر خلاف ان کے شاگردوں، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ، کی رائے پر عمل کیا جاتا تھا، تو ان حالات میں یہ کہنا کہ فقہ جعفری اور فقہ حنفی بالکل یکساں ہیں درست نہیں، جب وہ یکساں نہیں ہیں تو ظاہر ہے کہ جو لوگ امام ابو حنیفہؒ کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں وہ امام جعفر الصادقؒ کی رائے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ کیونکہ امام جعفر الصادقؒ نبی نہیں ہیں، انسان ہیں۔ نبی کے سوا، کم از کم سنیوں کے نزدیک، کوئی اور معصوم نہیں ہوتا، اور رسول اللہ ﷺ نے خود ہی پوری صراحت کے ساتھ بیان فرما دیا کہ علماء میں آپس میں اختلاف رائے ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، بلکہ وہ خدا کی رحمت ہی ہے۔ ان حالات میں اگر امام ابو حنیفہؒ اپنے استاد امام جعفر الصادقؒ سے اختلاف کرتے ہیں تو استاد کی توہین کے لیے نہیں بلکہ پوری دیانتداری کے ساتھ پوری خدا ترسی کے ساتھ وہ جو رائے رکھتے ہیں، اسے بیان کرتے ہیں، جب قانون میں اختلاف ہے تو ان حالات میں اگر ایک ہی قانون سارے فرقوں کے لیے نافذ کیا جائے، تو وہ کہ پاکستان میں جعفری فقہ نافذ کرنا چاہیں اور حنفیوں کی تعداد بہت بڑی اکثریت رکھتی ہے، تو انہیں مجبور کرنا ایک شورش پیدا کرنے کا وسیلہ بنے گا اور بالکل بے سود سی چیز ہوگی۔ وہ اس پر عمل نہیں کریں گے۔ میں ایک مثال آپ کو دیتا ہوں اس سے اندازہ ہوگا کہ دونوں قوانین میں کس قسم کا فرق پایا جاتا ہے۔ اگر کسی شخص کی وفات ہو جائے اور اس کا ایک بھانجا اور ایک بھتیجا موجود ہو تو حنفی قانون کہتا ہے کہ بھانجے کو کچھ حصہ نہیں ملے گا اور پوری رقم بھتیجے کو ملے گی اور جعفری قانون کہتا ہے کہ پورا ورثہ بھانجے کو ملے گا، بھتیجا محروم رہے گا، ان حالات میں آپ بتائیں کہ ہم ایک ہی قانون کیسے سارے لوگوں پر نافذ کریں، جبکہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یوں ہونا چاہیے اور کچھ لوگ اس ماخذ یعنی قرآن و حدیث سے استنباط کر کے یہ کہتے ہیں کہ یوں نہیں ہونا چاہیے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ایک ہی قانون سارے فرقوں کے لوگوں پر نافذ کرنا مناسب نہیں، یعنی جہاں تک personal قوانین کا تعلق ہے۔ البتہ جو اجتماعی قوانین میں، ان میں فرق نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً پارلیمنٹ کے انتخابات، انتظامیہ Administration کے معاملات وغیرہ۔ اس میں ملک کے مختلف نمائندوں کی

اکثریت جو اصول طے کرے گی اس پر عمل کرنا ہو گا۔ کیونکہ ان مسائل کے متعلق تفصیلیں قرآن و حدیث میں ہمیں نہیں ملیں گی۔ مثلاً نظامِ حکومت کیا ہو؟ اس بارے میں اسلام کوئی حکم نہیں دیتا۔ بادشاہت بھی جائز ہے اور اگر جمہوریت ہو تو وہ بھی جائز ہے اور جماعت کی حکومت ہو تو وہ بھی جائز ہے۔ ان سب کو جب اسلام جائز قرار دیتا ہے تو ان حالات میں ہر دور کے اور ہر ملک کے لوگ باہم مشاورت کے ساتھ خود ہی طے کریں گے کہ ہمیں کون سا طرز حکومت اپنے زمانے کے لیے اختیار کرنا چاہیے۔ آپ شاید اس بات کو ضرورت سمجھیں کہ میں بتادوں کہ میں کیوں بادشاہت کو بھی جائز قرار دیتا ہوں۔ بعض احباب فوراً کہیں گے کہ قرآن مجید میں ملکہ سبا بلقیس کے ضمن میں ذکر آیا ہے (إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا) (34:27) (جب بادشاہ کسی فاتحانہ بستی میں داخل ہوتے ہیں تو وہاں فساد برپا کرتے ہیں) اس سے ہمارے بھائی استدلال کریں گے کہ بادشاہت کے خلاف حکم ہے، مگر میں بڑے ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ قرآن مجید میں اچھے بادشاہوں کا ذکر بھی ہے، اور برے بادشاہوں کا بھی، جہاں ایک طرف فرعون اور نمرود جیسے ظالم بادشاہ کا ذکر آیا ہے، وہاں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام جیسے پیغمبروں کو بھی بادشاہ کا لقب دیا گیا ہے۔ جب ایسے جلیل القدر پیغمبر بادشاہت کر چکے ہیں تو پھر ہم اسے حرام کیسے قرار دے سکتے ہیں۔ قرآن میں یہ آیت جو بلقیس کے سلسلے میں آئی ہے اس کا جواب میں یہ دوں گا کہ یہ بلقیس کے خیالات تھے جو قرآن نے نقل کیے ہیں اس سے زیادہ ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے، اگر آپ کے خیال میں بادشاہت مناسب ہے تو اسے اختیار کیجیے، آپ کے خیال میں مناسب نہیں ہے تو نہ کیجیے۔ خود ہمارے رسول اکرم ﷺ نبی ہی نہیں ساتھ ساتھ بادشاہ بھی رہے ہیں۔ یہ آپ کی توہین نہیں بلکہ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری کا مصداق ہے۔

سوال 7: کیا عصرِ حاضر کے اہم مسائل کو مشاورتی طریق سے ممالک اسلامیہ کے ممتاز علماء اور اسکالر کا ایک عالمی بورڈ بنا کر، حل کیا جا سکتا ہے؟ اس کا طریق کار یا اس کے عملی انتظامات کیا ہونے چاہئیں؟

جواب: میں اسے ناقابل عمل پاتا ہوں۔ اس لحاظ سے کہ ان علماء کی ضرورت صرف ایک دن کے لیے ایک ہفتے کے لیے نہیں ہو گی۔ ساری دنیا کے ماہر ترین علماء کو آپ بے شک بہاولپور میں جمع کر سکتے ہیں۔ ایک دن کے لیے یا ایک ہفتے کے لیے، یا ایک ماہ کے لیے لیکن ان کو ساری عمر یہاں رکھا جائے یہ ناممکن ہو گا۔ عالمی بورڈ کا یہ منصوبہ ناقابل عمل ہے لیکن اگر اجماع کی صورت پیدا کرنے کے لیے کوئی ادارہ تشکیل دینا مقصود ہو تو اس بارے میں تفصیل سے بحث کرنے کا موقع نہیں۔ البتہ مختصراً کچھ عرض کیے دیتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اسلامی ممالک کا جو ذکر یہاں کیا گیا ہے، وہ ناکافی ہو گا۔ مسلمان علماء چاہے جہاں کہیں ہوں، روس میں ہوں یا امریکہ میں، یا پاکستان میں، ان کے ساتھ تعلق رکھنے، اور ان کے مشوروں سے استفادہ کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ انہیں ایک جگہ بلا لیا جائے یا

ایک جگہ رہنے پر مجبور کیا جائے۔ اس کے بر خلاف یہ ہو سکتا ہے کہ ہر ملک میں علماء کی ایک انجمن بنے، جس کو ایک صدر مرکز سے منسلک کر دیا جائے۔ صدر مرکز کی طرف سے جب ایک سوال کسی ملک کو جائے گا۔ مثلاً فرانس کو، تو فرانس کی انجمن کا سیکرٹری فرانس میں رہنے والے سارے مسلمان ماہرینِ فقہ اسلامی کو اس کی نقل بھیجے گا اور ان سے کہے گا کہ اس بارے میں آپ اپنی رائے سے جلد از جلد مدلل طور پر اطلاع دیجیے۔ جب وہ جوابات جمع ہو جائیں تو ان کا خلاصہ صدرِ مرکز کو بھیج دے گا۔ اس طرح صدرِ مرکز کے پاس تمام ممالک کی انجمنوں سے جوابات آئیں گے۔ صدرِ مرکز کے سیکرٹریٹ میں ان جوابات کو مرتب کیا جائے۔ اگر اتفاق رائے ہوتے اسے اجماع قرار دیا جائے اور اگر اتفاق رائے نہیں ہے تو صدر مرکز کو چاہیے کہ دوبارہ وہی سوال ساری شاخوں میں گشت کرائے، اور موافق اور مخالف دونوں فریقوں کی آراء کے ساتھ دلائل کی وضاحت بھی کرے۔ اس مکرّر گشت کے موقع پر ممکن ہے جو لوگ ایک خاص رائے رکھتے تھے اب اپنے فریق مخالف کی دلیلوں کو معقول سمجھ کر اپنی رائے بدل دیں۔ جب بار دیگر جوابات آئیں گے، اس وقت ان کو دوبارہ شائع کیا جا سکتا ہے۔ اتفاق رائے ہو گیا ہے تو الحمد للہ اور اگر اتفاق نہیں بھی ہوا ہے تب بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اتنے لوگ یا فلاں فلاں لوگ یہ رائے رکھتے ہیں، فلاں فلاں لوگ دوسری رائے رکھتے ہیں۔ یہ طریقہ قابلِ عمل ہو گا۔ اس سے ایک شخص جو خاص معیّن کام پر نہیں ہے بلکہ اس ملک کا دوسرا ہے اس کی رائے سے ہم یہاں رہ کر بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔

سوال 8: قرآن کریم نے ربوا کو حرام قرار دیا ہے۔ وہ کون سا ربوا ہے؟ کیا کمرشل انٹرسٹ پر اس کا اطلاق ہو گا یا نہیں ہو گا۔ اگر ہو گا تو اس کی علّت کیا قرار دی جائے گی؟

جواب: میں معاشیات (Economics) کا ماہر نہیں ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ربوا ممنوع ہے۔ ربوا کا مقصد یہ رہا ہے کہ یک طرفہ جوکھم سے منفعت حاصل کی جائے۔ مثلاً ایک شخص سے کچھ رقم بطور قرض حاصل کرتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ اس کو قرض کی ادائیگی تک سالانہ مثلاً 5 فی صد زائد رقم بطور سود ادا کروں گا۔ قرض کی رقم سے میں تجارت کرنا چاہتا ہوں۔ فرض کیجیے کہ مجھے اس تجارت کی منفعت میں سے 5 فی صد سود سالانہ ادا کرنا ہے۔ اگر منفعت اس سے زیادہ ہو اس صورت میں تو کوئی دشواری نہ ہو گی لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ مجھے ایک سال خسارہ ہو۔ اس خسارے کے باوجود میرے لیے لازم ہو گا کہ قرض دہندہ کو حسبِ وعدہ 5 فی صد سالانہ ادا کروں کیونکہ وہ نقصان میں شریک نہیں، صرف منفعت میں شریک ہونا چاہتا ہے۔ اسے اسلام کے اخلاقی اقدار کے منافی قرار دے کر منع کر دیا گیا ہے۔ اس کے بر خلاف اگر ایسے بینک کا سود ہو جس میں قرض دہندہ اور قرض حاصل کنندہ، دونوں منفعت اور خسارے میں برابر کے تناسب سے شریک رہنے پر آمادہ ہیں تو وہ ربوا نہیں رہتا۔ اسے اسلام جائز قرار دیتا ہے۔

سوال 9: حکومت جو دیگر ممالک سے سودی قرض لیتی ہے کیا اس قسم کا سودا کرنا جائز ہو گا؟

جواب: اس کا جواب میرے لیے ناممکن ہے، اس لیے کہ حکومت بعض وقت مجبور ہوتی ہے اور وہی اپنے مفاد کو بہتر سمجھتی ہے۔ چونکہ میں اس کے رازوں میں شریک نہیں ہوں اس لیے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ حکومت ہی نہیں، ہم آپ بھی بوقت ضرورت قرض لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ اس وقت کوئی اللہ کا بندہ مال دار شخص ہمیں بے سود قرض دینے کے لیے نہیں ملتا تو ہم کیا کریں؟ مجبوراً قرض لیں گے اور سُود ادا کرنے کا وعدہ کریں گے۔ خدا شاید ہمیں معاف کر دے گا لیکن اس سُود خور کو معاف نہ کرے گا۔ حکومت بھی اگر سودی قرض لینے پر مجبور رہے تو ممکن ہے خدا اس کی نیک نیتی سے واقف ہو اور اسے معاف کر دے۔ اگر اس کا منشاء شاندار محل بنانا ہے تو اللہ اسے بھی سزا دے سکتا ہے۔

سوال 10: داڑھی عرب کا خاص رواج ہے، یہاں تک کہ مشرک لوگ بھی داڑھی رکھتے تھے۔ رسم و رواج شرعی نقطہ نظر نہیں بن سکتے لیکن آج کل داڑھی کو سنت مؤکدہ سمجھا جاتا ہے۔ ازراہِ کرم اس کی وضاحت کریں۔ شکریہ۔

جواب: میں عرض کروں گا کہ مشرکینِ عرب ہی نہیں، کارل مارکس بھی داڑھی رکھتا تھا، انڈوچائنا کے ہوچی منہ کی بھی داڑھی تھی، لینن کی بھی داڑھی تھی۔ آپ پیرس آئیں گے کہ ہزاروں فرانسیسی نو مسلم داڑھی رکھتے ہیں۔ آپ داڑھی کے فرنچ کٹ سے بھی واقف ہوں گے۔ میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ داڑھی دوسروں کی تقلید میں رکھی جائے، آپ بھی قائل نہیں ہوں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس بارے میں قرآن و حدیث میں کیا احکام ہیں؟ قرآن مجید میں ایک جگہ اشارتاً ذکر آیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کوہ طور سے نیچے اترے تو دیکھا کہ ان کی قوم یعنی یہودی گاؤ پرستی میں مشغول ہیں۔ وہ اپنے بھائی حضرت ہارونؑ کو اپنا نائب بنا کر چھوڑ گئے تھے، ان پر خفا ہوئے۔ قرآنی الفاظ (قَالَ يَا ابْنَ أُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي ۖ إِنِّي خَشِيتُ أَنْ تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي 20:94) ہیں کہ حضرت ہارونؑ کی داڑھی کو کھینچ کر ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا۔ یہ اشارتاً ذکر ہے یعنی داڑھی رکھنا پیغمبروں کی سنت ہے۔ حدیث میں اس سے زیادہ صریح الفاظ ملتے ہیں "داڑھی رکھو" اس حدیث اور سنت رسول کے پیش نظر داڑھی رکھنا محض رسم و رواج نہیں بلکہ اسلامی حکم بن جاتا ہے۔ حکم کے متعلق آپ کو معلوم ہو گا کہ درجات پائے جاتے ہیں۔ یعنی اگر فرض کیجیے کہ قرآن میں صیغہ امر استعمال کر کے کہا گیا ہے کہ "زکوٰۃ دو" اور وہی صیغہ امر استعمال کر کے یہ بھی کہا گیا ہے کہ "خیرات دو" تو ظاہر ہے دونوں کا حکم یکساں نہیں ہے۔ اگر زکوٰۃ دینے سے انکار میں کروں تو حضرت ابو بکر صدیقؓ تلوار کھینچ کر مجھے مجبور کر سکیں گے

کہ زکوٰۃ دوں۔ لیکن اگر میں خیرات سے انکار کردوں تو حضرت ابو بکرؓ ممکن ہے مجھے یہ کہیں کہ یہ برا مسلمان ہے، لیکن مجھے تلوار کے ذریعے مجبور نہ کریں گے۔ یعنی احکام میں درجہ بندی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ داڑھی رکھنا بے شک اسلامی حکم ہے لیکن درجے کا حکم نہیں جیسے اللہ کو ماننا جیسے رسول اللہ ﷺ کا نبی ماننا، یا مثلاً نماز پڑھنا، روزہ رکھنا وغیرہ۔ اس کا درجہ نسبتاً فروتر ہو گا۔

سوال 11: جیسا کہ آپ کہہ چکے ہیں کہ لونڈیوں کو اس لیے پردہ نہ کرنے کی اجازت تھی کہ وہ کام کاج کرتی تھیں، انہیں سودا سلف خریدنے کے لیے باہر جانا پڑتا تھا۔ جبکہ آج کل کے دور میں عورت کو ملازمت کے سلسلے میں باہر جانا پڑتا ہے، تو کیا ان کے لیے بھی وہی حکم ہو گا جو لونڈیوں کے لیے تھا، کیونکہ احکام علت پر مبنی ہوتے ہیں۔ علت کے بدل جانے سے احکام بدل جاتے ہیں۔ فقہی نقطہ نظر سے اس مسئلے کی وضاحت کیجیے۔

جواب: مجھے یقین ہے کہ میری بہنیں جو یہاں موجود ہیں وہ لونڈی بننا پسند نہیں کریں گی۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ لونڈیوں کو پردہ نہ کرنے کی جو اجازت دی گئی تھی اس کی علّت وہی ہے جو میں نے بیان کی۔ میں نے صرف ایک ذاتی رائے ظاہر کی تھی۔ قانون ساز صرف حکم دیتا ہے، قانون کی وجہ اور ضرورت کی توضیح وہ خود نہیں کرتا۔ اسے ہم سوچتے ہیں اور ہماری سوچ چونکہ ہماری ہوتی ہے، قانون ساز یعنی خدا اور رسول (ﷺ) کی نہیں ہوتی۔ اس لیے میں یہ کہوں گا کہ اگر میری رائے میں لونڈیوں کے پردہ نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ انہیں بہت سے کام انجام دینے پڑتے تھے تو میری اپنی رائے ہے، اور یہ رائے واحد علّتِ قانون نہیں ہو گی۔ ہمارے دوست کا کہنا ہے کہ احکام علّت پر مبنی ہوتے ہیں۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ احکام ہمیشہ علّت پر مبنی نہیں ہوتے۔ یہ ممکن ہے کہ شارع، قانون ساز، حاکم یعنی خدا ہماری آزمائش کے لیے ایک چیز کا حکم دے جس کی کوئی خاص علّت نہ ہو۔ وہ ہمیں صرف آزمائش کے لیے حکم دے رہا ہے، یہ نہیں کہ ہماری اس میں فلاں مصلحت ہے، یا اس میں ہمارا فلاں فائدہ ہے۔ اس آزمائش کو آپ علّت قرار دے سکتے ہیں لیکن وہ علّت ایسی نہیں ہو گی جو میری آپ کی سمجھ میں آئے۔ جس چیز کے متعلق قانون کے سرچشمے یعنی قرآن اور حدیث میں صراحت سے ایک حکم دیا گیا ہے، وہاں اِجتہاد اور عقل کام نہیں کر سکتی۔ قرآن میں صراحت ہے کہ یوں کرو تو کرنا پڑے گا، چاہے ہمیں اس کی وجہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

سوال 12: اسلامی نقطہ نظر سے حکمرانوں کو منتخب کرنے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے۔ کیا موجودہ طریقہ انتخابات اسلامی تقاضوں سے ہم آہنگ ہے؟

جواب: میں سمجھتا ہوں کہ اس سوال کے جواب میں کسی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ابھی میں تھوڑی دیر پہلے اس کی طرف اشارہ کر چکا ہوں۔ اسلام میں بادشاہت کی بھی اجازت ہے، جہاں بادشاہ کا بڑا بیٹا خود بخود ولی عہد بن جاتا ہے اور آیت قرآنی " وَوَرِثَ سُلَيمَانُ دَاوُودَ " (16:27) اس کی اجازت بھی دیتی ہے۔ جمہوریت کی بھی اجازت ہے، جماعتی Collegial حکومت کی بھی اجازت ہے۔ وہاں وہ نظام بھی پایا جا سکتا ہے جو ان سب کا ایک مجموعہ یا ان میں سے چند کا مخلوط ہو، جیسے خلافتِ راشدہ میں تھا۔ خلافتِ راشدہ بادشاہت نہیں تھی کیونکہ جمہوریت میں معیّن مدّت کے لیے (چار یا پانچ سال کے لیے) کسی کو منتخب مقرر کیا جاتا ہے اور پھر نئے انتخابات ہوتے ہیں۔ خلافت راشدہ مجموعہ تھی بادشاہت اور جمہوریت کی، یعنی ایک شخص کا تاحیات انتخاب ہوتا تھا اور یہ ساری چیزیں اسلام نے جائز قرار دیں۔ اسلام میں کسی معیّن طرزِ حکومت کو لازم قرار نہیں دیا گیا بلکہ عدل و انصاف کو لازم قرار دیا گیا ہے چاہے اس کو کوئی بھی انجام دے۔ اگر آج حضرت ابو بکر، حضرت عمر یا حضرت علی رضی اللہ عنہم اجمعین زندہ ہوں تو میں بخوشی انہیں سارے آمرانہ اختیارات سونپنے کے لیے آمادہ ہوں کیونکہ مجھے ان کی خدا ترسی پر پورا اعتماد ہے۔ اس کے برخلاف اگر آج یزید زندہ ہو تو اس کو انگلستان کے مہر لگانے والے بادشاہ کے برابر بھی اپنا حکمران بنانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ غرض یہ کہ خواہ انتخاب کیا جائے، خواہ نامزد کیا جائے یا کوئی اور طریقہ اختیار کیا جائے۔ انسانیت کی تاریخ بتاتی ہے کہ کوئی بھی چیز آغاز انسانیت سے لے کر تا قیامت کارآمد نہیں ہو سکتی۔ آج یہ چیز مفید ثابت ہوتی ہے کل اسی چیز کو برا کہہ کر ٹھکرا دیا جاتا ہے اور نئی چیز بنائی جاتی ہے۔ چنانچہ ابتدائی چار خلفاء کے زمانے میں جانشین کے انتخاب کا کوئی قانون نہ ہونے کی وجہ سے اختلاف کی صورتیں پیدا ہوئی تھیں۔ اسی بناء پر حضرت معاویہؓ نے یہ مناسب خیال کیا کہ حکومت میں استقلال پیدا کرنے کے لیے اور حکومت کو خانہ جنگیوں سے بچانے کے لیے بادشاہت کا نظام نافذ کیا جائے۔ اپنے بیٹے کو بادشاہ بنانے کے لیے نہیں بلکہ اُمت کی بھلائی کے لیے انہوں نے بجائے جمہوریت کے بادشاہت کو نافذ کیا۔ کچھ عرصے کے بعد بادشاہت نامناسب پائی گئی تو ہم نے بادشاہت کے خلاف بھی بغاوت کی۔ غرض یہ کہ انسان کبھی ایک ہی چیز پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مطمئن نہیں رہ سکتا۔ حکومت کے اچھے یا برے ہونے کا انحصار حکمران کی شخصیت پر ہے۔ اچھا حکمران چاہے ڈکٹیٹر ہو، خوشی سے عوام اسے قبول کر لیتے ہیں۔ ظالم حکمران چاہے جمہوریت کا صدر ہی کیوں نہ ہو، اسے ہم رد کر دیتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

# خطبہ ۴: تاریخ اصولِ فقہ واجتہاد

محترم وائس چانسلر صاحب! محترم اساتذہ! محترم مہمانان گرامی!

السلام علیکم ورحمۃ وبرکاتہ!

آج کا موضوع اصولِ فقہ کے متعلق ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مقابلتاً ایک ٹیکنیکل مضمون ہونے کی وجہ سے کم دلچسپ ہو گا۔ لیکن جیسا کہ آپ ابھی ملاحظہ فرمائیں گے یہ وہ موضوع ہے جس پر مسلمان بجاطور پر فخر کر سکتے ہیں۔ دنیا کی تاریخِ قانون میں مختلف قوموں نے اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ اضافہ کیا ہے۔ مسلمانوں کا سب سے بڑا کارنامہ غالباً اصولِ فقہ ہے۔ مسلمانوں سے پہلے بھی دنیا میں قانون موجود تھا لیکن اصول فقہ جیسی چیز دنیا میں کہیں نہیں ملتی اور آج بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک امتیازی اضافہ ہے، جس کی بدولت علمِ قانون کی ایک بڑی کمی پوری ہو گئی ہے۔ آپ سب واقف ہیں کہ قانون دنیا کی ہر قوم میں ملتا ہے۔ یہ قانون دو قسم کے رہے ہیں۔ انتہائی تاریک زمانوں سے لیکر آج تک اول تو بن لکھا قانون ہمیں ہر جگہ ملتا ہے یعنی رسم ورواج، جو ہر ایک ملک میں پایا جاتا ہے، جس کا مؤلف یا قانون ساز ہمیں معلوم نہیں ہوتا لیکن اس پر سب لوگ عمل کرتے ہیں۔ دوسرا قانون وہ ہوتا ہے جو کسی بادشاہ یا کسی حکمران کی طرف سے مدون کر کے نافذ کیا جاتا ہے اور بالعموم تحریری صورت میں ہمیں ملتا ہے۔ بہر حال انسان اپنی فطرت کے بنیادی تقاضوں کے پیش نظر اپنی خواہش سے اپنے لیے کوئی قانون بنا کر اس پر عمل کرتا ہے۔ لہذا قانون ہر انسانی معاشرے کی بنیادی خصوصیت ہے۔

جہاں تک تحریری قانون کا تعلق ہے، غالبا قدیم ترین قانون جو ہم تک پہنچا ہے وہ حمورابی بادشاہ کا ہے۔ یہ عراق کا بادشاہ تھا اور جدید ترین مغربی تحقیقات کے مطابق یہ وہی شخص ہے جسے ابراہیم علیہ السلام کا نمرود کہا جاتا ہے۔ اس رائے کی وجہ یہ ہے کہ ان

دونوں کا زمانہ ایک ہے (اٹھارہ سو پچاس برس قبل مسیح) اور ملک بھی ایک ہی ہے۔ حمورابی کا قانون ہم تک تحریری صورت میں پہنچا ہے۔ ایران میں سوس نامی مقام پر کچھ۔ عرصہ قبل کھدائیوں میں ایک سیاہ رنگ کا پتھر ملا جس پر دو آدمیوں کی سی شکلیں ہیں۔ جن میں سے ایک خدا ہے اور دوسرا حکمران حمورابی، جو خدا سے احکام حاصل کر رہا ہے۔ یہ پتھر ستون کی شکل میں ہے جس پر قانون میخی رسم الخط میں کندہ کیا گیا ہے۔ اسے مغربی ماہرین نے اب پڑھ لیا ہے۔ اور اس کے ترجمے بھی دنیا کی اکثر بڑی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ یہ قدیم ترین تحریری قانون ہونے کی وجہ سے قابل ذکر ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ بہترین قانون بھی ہے۔ ایک مثال میں آپ کو دیتا ہوں۔ اس قانون کی دفعات ومندرجات میں سے ایک قانون یہ ہے، جسے سب لوگ قبول کریں گے کہ قصاص لینا چاہیے۔ مثلاً میں کسی کو قتل کروں تو سزائے موت دی جائے۔ اس بنیادی اصول کو حمورابی بادشاہ کے مشیروں نے ترقی دے کر مضحکہ خیز حد تک پہنچا دیا ہے۔ چنانچہ اس میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی گائے کو قتل کر دے تو اس قاتل کی گائے کو قتل کیا جائے۔ ممکن ہے آپ اسے قبول کر لیں۔ میں یہ کہوں گا کہ بجائے اس کے کہ گائے کو قتل کر کے ضائع کریں کیوں نہ اس محروم شدہ شخص کو صلہ دیا جائے جس کی گائے مار ڈالی گئی۔ خیر ہم کہہ سکتے ہیں کہ گائے کے بدلے گائے۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کی بیٹی کو قتل کرے تو قاتل کی بیٹی کو قتل کیا جائے۔ بھلا اس بیچاری کا کیا قصور تھا۔ یہ ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ بجائے اس کے کہ اس کے قاتل کو سزا دی جائے قاتل کی بیٹی کو کیوں سزا دی گئی۔ یہ ادلے کا بدلہ (Tittat for) اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ قصاص کے اس اصول کو حمورابی کے ہاں بے سمجھی سے گویا انتہا تک پہنچا دیا گیا۔ انصاف کے اس اصول کو آج ہماری عقل سلیم قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی لیکن اب سے چار ہزار سال پہلے کے لوگ سمجھتے تھے کہ یہی انصاف ہے اور یہی اچھا قانون ہے خدا کی طرف سے ہمیں ملا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی قوانین ہم کو ملتے ہیں۔ مثلاً مصر میں ہیروغلیفی (Hieroglyphic) کے جو کتبے ہمیں ملے ہیں۔ ان میں بھی قوانین ہیں۔ رومی قانون بھی ملتا ہے۔ یونانی قانون بھی ملتا ہے۔ چینی اور ہندوستانی قوانین بھی ملتے ہیں۔ امریکہ کے پرانے باشندوں ریڈ انڈین (Red Indians) کے ہاں بھی قوانین ملتے ہیں۔ غرض دنیا کے ہر ملک میں قانون ملتا ہے۔ لیکن یہ قانون، علمِ قانون نہیں ہے بلکہ اسے ایک مجموعہ احکام کہا جا سکتا ہے۔ یعنی یہ کرو اور وہ نہ کرو۔ علمِ قانون یا اصولِ قانون کی کمی ہر جگہ نظر آتی ہے۔ یعنی یہ بحث کہ قانون کیا چیز ہے، یہ بحث کہ قانون کس طرح بنتا ہے، کس طرح بدلا جاتا ہے، کس طرح سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح قانون کے دو احکام میں اگر تضاد نظر آئے تو کس قاعدے پر عمل کیا جائے اور کس قاعدے پر عمل نہ کیا جائے؟ غرض یہ کہ قانون اپنے مجرد تصور میں کسی قوم میں موجود نہیں تھا۔ جب تک اسلام کا دور نہیں آگیا اور تاریخ اسلام کی ابتدائی دو صدیوں کے فقہاء نے اس میں اپنا اضافہ Contribution پیش نہیں کر لیا۔ جیسا کہ آپ سے میں نے عرض کیا کہ مسلمان

اس بات پر فخر کر سکتے ہیں،اس معنی میں کہ قوانین تو دنیا کے ہر ملک میں موجود تھے لیکن علم القانون اپنے مجرد تصور میں کسی قوم نے پیش نہیں کیا تھا۔ یہ اصولِ فقہ وہ علم ہے جسکا اطلاق صرف اسلامی قانون پر ہی نہیں بلکہ دنیا کے کسی بھی قانون پر ہم کر سکتے ہیں۔ اصول فقہ کے جن مسائل کا ابھی میں نے ذکر کیا کہ قانون کیا ہے؟ کس طرح بنتا ہے؟ وغیرہ یہ سوالات میں مسلمان سے بھی کر سکتا ہوں، رومی اور یونانی سے بھی اور ہندو سے بھی کر سکتا ہوں، کہ تمہارے ذہن میں قانون کا کیا مطلب ہے؟ قانون کیسے بنتا ہے؟ اور کون بناتا ہے؟ کب بنتا ہے؟ اور اس میں تبدیلی کس طرح ہو سکتی ہے؟ اسے منسوخ کس طرح کیا جاتا ہے؟ اس میں اضافہ کس طرح کیا جاتا ہے؟ قانون کس اساس پر بنایا جاتا ہے؟ یہ سوالات کسی بھی نظامِ قانون سے کیے جاسکتے ہیں۔ اس کے جوابات چاہے مختلف ہوں۔ لیکن یہ علم جو ان مجرد تصورات کے متعلق ہے، اس کو پہلی مرتبہ مسلمان پیش کرتے ہیں اور اس کو اصولِ فقہ کا نام دیتے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ نام کیوں دیا گیا۔ ایک رائے میں پیش کرتا ہے، میری رائے قرآن مجید کی اس مشہور آیت سے ماخوذ ہے، جس سے آپ سب واقف ہیں: (مثل کلمة طيبه كشجرة طيبة اصلها ثابت وفرعها في السماء)(24:14) (اچھی بات کی مثال ایک اچھے درخت کی طرح ہوتی ہے جس کی جڑیں تو زمین میں ثبت ہوتی ہیں لیکن اس کی شاخیں آسمان تک پھیلی جاتی ہیں) یہاں دو خاص لفظ استعمال کیے گئے ہیں جڑ اور شاخیں۔ چنانچہ ہمارے فقہانے اصولِ فقہ کو جڑ قرار دیا اور قانونی قاعدوں یا احکام کو "فرع" قرار دیا۔ یعنی علمِ اصول اور علمِ فروع۔ اصول کے لفظی معنی ہیں جڑیں۔ بہر حال چند اہم ابتدائی تصورات ہوتے ہیں۔ جن کی اساس پر قاعدے بنائے جاتے ہیں۔

یہ چیز غالباً بالکل ابتدائی زمانے میں یعنی عہد نبوی میں یا عہد خلافت راشدہ میں نہ رہی ہو گی۔ لیکن بعد میں اس موضوع پر جو اولین کتابیں لکھی گئیں وہ مسلمان فقہاء کی ہیں۔ گزشتہ صدی تک کسی قوم میں یہ چیز نہیں پائی جاتی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ اس کا چرچا یورپ میں بھی ہونے لگا۔ مجھے یاد ہے، چالیس سال سے زیادہ عرصہ ہوا جب میں 1928ء میں یونیورسٹی لاء کالج میں طالب علم تھا، ان دنوں ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس کا نام ہے "Angorah Reforms" یہ انگریزی زبان مین ایک فرانسیسی پروفیسر کی تالیف تھی۔ لندن یونیورسٹی کی صد سالہ سالگرہ کی تقریب میں اسی فرانسیسی پروفیسر کو دعوت دی گئی تھی۔ اس نے وہاں پر تین لیکچر دیئے۔ جن میں پہلے لیکچر کا موضوع۔ "Angorah Reforms" تھا، اتاترک مصطفی کمال پاشا نے ترکی میں پرانی چیزوں کو منسوخ کر کے نئے قوانین نافذ کیے۔ مثلاً سوئٹزر لینڈ کے کوڈ اور اٹلی کے کوڈ وغیرہ وہاں نافذ کیے گئے اور اسلامی قوانین رد کر دیئے گئے اور دیگر چیزیں جو ترکی میں آئی تھیں ترکی ٹوپی کی جگہ ہیٹ(Hat) کا استعمال وغیرہ۔ یہ لیکچر انہی چیزوں کے بارے میں

تھا۔چونکہ "Angorah Reforms" ایک نئی چیز تھی،اس لیے اس زمانے میں اسکا بڑا چرچا تھا۔دوسرے مضمون کا عنوان "Root of Law" یعنی قانون کی جڑیں تھا۔میں اعتراف کرتا ہوں کہ پہلی بار اس دوسرے مقالے کو پڑھ کر مجھے اپنی میراث کا علم ہوا کہ مسلمانوں نے کیا خاص کارنامہ (Contribution) انجام دیا ہے۔چونکہ کاؤنٹ اوسٹروروگ (Ostrorog) نے، جو اس کتاب کا مؤلف ہے، بیان کیا کہ یہ کسی اور قوم میں نہیں پایا جاتا اور یہ مسلمانوں کی عطا ہے اور اس میں ان چیزوں سے بحث ہوتی ہے، یہ اسلامی کارنامہ (Contribution) جو دنیاوی علم قانون پر روشنی ڈالتا ہے وہ اصولِ فقہ کہلاتا ہے۔اصولِ فقہ کا کچھ مفہوم بیان کرنے سے پہلے مختصراً میں بعض ان چیزوں کو دہراؤں گا جو گزشتہ دنوں اشارتاً آپ سے بیان کر چکا ہوں۔

اسلامی قانون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بعد سے شروع ہوتا ہے، جس کی ابتدا میں کچھ پرانے رسم ورواج ، جو مکہ میں تھے وہ بھی شامل رہے اور رفتہ رفتہ اس کی ترمیم واصلاح قرآن وحدیث کے ذریعے سے ہوتی رہی۔اس میں بعض اور چیزوں کو بھی گوارا کیا جاتا رہا، جیسے معاہدات، سابقہ امتوں کے شریعتیں جو اسلام نے برقرار رکھیں اور اسی طرح کی بعض اور چیزیں۔جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی اور قانون کا ایک سرچشمہ بند ہوگیا یعنی وحی کے ذریعے سے قانون کو بنانے اور بدلنے کی جو صلاحیت ہم میں پائی جاتی تھی وہ ختم ہوگئی تو ہم مجبور ہوگئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے وقت جو چیزیں ہم میں چھوڑی ہیں انہی پر اکتفا کریں۔عام حالتوں میں ہمارے لئے یہ بات مشکلات کا باعث بن جاتی، اگر اس قانون کی ترقی کی صورت خود قانون سازنے یعنی خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نہ بتائی ہوتی، یہ چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کے آخری دنوں سے تعلق رکھتی ہے۔یمن کو جب ایک گورنر بھیجا گیا، یعنی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالی عنہ، تو ان سے حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے دریافت کیا "فبم تحکم" (کس طرح احکام دیا کروگے ؟) جواب دیا۔"بکتاب اللہ" (اللہ کی کتاب کے مطابق)۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا "فان لم تجد" (اگر تم قرآن میں مطلوبہ چیز نہ پاؤ تو کیا کروگے ؟) تو انھوں نے جواب دیا "فبسنة رسول اللہ" (رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی سنت کے مطابق احکام دیا کروں گا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر مزید سوال کیا "فان لم تجد" (اگر سنت میں بھی مطلوبہ چیز نہ ملے تو کیا کروگے ؟) تو ان کے الفاظ تھے "اجتهد برایي ولاآلو" (میں اپنی رائے کے مطابق اجتہاد کروں گا اور کوئی دقیقہ نہیں چھوڑوں گا) اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف پسند فرمایا بلکہ دعا دی اور آسمان کی طرف ہاتھ۔اٹھا کر یہ کہا کہ "اے اللہ! تو نے اپنے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رسول کو جس چیز کی توفیق دی ہے اس سے تیرا رسول خوش ہے۔" اس سے بڑھ کر اور کوئی تعریف نہیں ہو سکتی۔یہ چیز اسلامی قانون کو زندگی دینے والی، برقرار رکھنے والی

اور ہر ضرورت میں کام آنے والی ہے۔اس کی وجہ سے ایک غیر جانبدار شخص بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ اسلامی قانون چودہ سو سال سے لے کر آج تک چلا آرہا ہے اور اس میں آئندہ بھی چلنے کی قوت باقی ہے۔ اگر یہ چیز نہ ہوتی، تو صرف قرآن اور حدیث پر اکتفا کرنے کی صورت میں، ممکن ہے کہ بعض لوگ قرآن کریم کی آیتوں اور حدیثوں سے استنباط نہ کرسکتے اور وہ حیران رہ جاتے کہ ہم کیا کریں واقعۃً یہ صورت بعض وقت پیش آتی ہے کہ ایک چیز سے بعض لوگ سمجھ لیتے ہیں استنباط کرلیتے ہیں اور بعض دوسرے لوگوں کی نظر اس تک نہیں پہنچتی اور وہ ششدر و حیران رہ جاتے ہیں۔

ایک چھوٹی سی مثال آپ کو دوں گا جس کا تعلق امام اعظم (رحمۃ اللہ) سے ہے۔اس سے ان کی ذہانت کا ذکر کرنا مطلوب نہیں ہے بلکہ صرف مثال دینا ہے کہ کس طرح ایک ہی چیز سے بعض لوگ سمجھ جاتے ہیں اور بعض لوگ سمجھ نہیں سکتے۔لطیفے کے طور پر قصہ بیان کیا گیا ہے ایک دن ایک خاندان میں میاں بیوی میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔رات کے وقت پہلے شوہر نے یہ قسم کھائی اور اپنی بیوی سے کہا کہ طلوع آفتاب سے قبل اگر تو مجھ سے بات نہ کرے گی تو تجھے طلاق ہے۔بیوی بھی بہت جلی بھنی تھی، اس نے بھی قسم کھا کر کہا کہ خدا کی قسم طلوع آفتاب سے قبل میں تم سے بات نہیں کروں گی۔پھر دونوں چپ ہو گئے۔سوئے یا نہیں یہ تو معلوم نہیں لیکن دونوں چپ ہو گئے۔اس کے بعد اذان ہوئی اور طلوع آفتاب کا وقت آگیا۔شوہر پہلے نماز کو جاتا ہے اور پھر ابن سیرین نامی مشہور فقیہ کے پاس جاکر سارا قصہ سناتا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ میاں قصور تمہارا ہے، طلاق ہو گئی، کیوں کہ تم نے کہا تھا کہ بیوی اگر طلوع آفتاب تک بات نہ کرے تو طلاق ہو جائے گی۔اس نے بات نہیں کی۔میں کچھ نہیں کرسکتا۔وہ روتا دھوتا امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) کے پاس پہنچا۔وہی قصہ ان کو بھی سنایا۔تو امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) نے کہا کہ کوئی بات نہیں۔تم شوق سے اپنی بیوی کے پاس جاؤ۔طلاق وغیرہ کوئی نہیں ہوئی۔وہ شخص حیرت زدہ رہ گیا اسی عالم میں واپس ابنِ سیرین کے پاس پہنچتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہارے بعد میں امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) کے پاس گیا تھا وہ کہتے ہیں کہ طلاق نہیں ہوئی۔انھیں تعجب ہوا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔چنانچہ اسی شخص کے ساتھ امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) کے پاس آئے۔کہنے لگے: "ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) اللہ سے ڈرو تم کیا غضب کر رہے ہو۔اس کی عورت کو طلاق ہو چکی ہے۔تم کہتے ہو کہ طلاق نہیں ہوئی۔وہ اس کے ساتھ۔رہے گا تو زناکاری ہو گی۔تم اس کے ذمہ دار ہو گے۔خدا کے ہاں کیا جواب دو گے؟" امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) نے کہا: "میاں قصہ ذرا دوبارہ سناؤ۔" اس نے سنایا۔پہلے میں نے بیوی سے کہا تھا کہ اگر طلوع فجر تک اگر بات نہ کرے تو طلاق ہے۔بیوی نے اسی وقت جواب دیا کہ خدا کی قسم میں تجھ سے طلوع آفتاب تک بات نہیں کروں گی۔تو امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) نے کہا میں اپنی رائے پر قائم ہوں۔طلاق نہیں ہوئی کیونکہ اس شخص

نے یہ نہیں کہا کہ عورت کونسی بات کرے۔ جب اس نے کہا کہ میں تم سے بات نہیں کروں گی تو بات کرنا ہی ہوا۔ ان حالات میں یہ شرط کہ عورت بات نہ کرے تو طلاق ہو گی، پیش ہی نہیں آئی۔ آپ نے دیکھا کہ کس طرح ایک ہی واقعہ سے ایک شخص کچھ سمجھ لیتا ہے اور دوسرے شخص کی نظر اس نکتے تک نہیں پہنچتی۔

غرض اسلامی قانون کی ترقی کے متعلق اگر اجتہاد کی اجازت نہ دی جاتی تو سب لوگوں کو صرف قرآن وحدیث پر اکتفاء کرنی پڑتی اور ممکن تھا کہ کسی وقت بڑے سے بڑے عالم اور فقیہ کو کسی نئے مسئلے کے متعلق نہ قرآن مین کوئی حکم ملے اور نہ حدیث میں۔ آپ نے پڑھا ہو گا کہ ایک بار حضرت عمر (رضی اللہ تعالی عنہ) کے ایک فیصلے پر حضرت علیؓ نے کچھ توجہ دلائی تو حضرت عمرؓ نے بے ساختہ کہا "**لولا علی لھلك عمر**"۔ اس اجازت کے تحت جو معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو دی گئی تھی کہ "اجتہاد کرو" اجتہاد کا اصول ہاتھ آگیا۔ اور دشواریاں ختم ہو گئیں۔

خلفائے راشدین کے زمانے میں کبھی کبھی اجتماعی غور وفکر بھی ہوتا تھا۔ لوگ آپس میں بحث کرتے کہ اس بارے میں کیا کرنا چاہیے؟ ایک صاحب اگر ایک چیز بیان کرتے تو دوسرے صاحب اس پر اعتراض کرتے، نہیں صاحب! یہ نہیں ہو سکتا۔ اس میں فلاں خامی ہے، یوں کرنا چاہیے۔ اور اس آپس کے بحث مباحثے سے لوگ کسی نتیجے پر پہنچ جاتے۔ اس زمانے میں خاص کر یہ چیز مفید ثابت ہوئی۔ کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ احکام واقوال ابھی تک جمع نہیں ہوئے تھے۔ بخاری، مسلم اور صحاح ستہ کی کتابیں ابھی لکھی نہیں گئی تھیں بلکہ لوگوں کے علم اور حافظے میں تھیں۔ جب آپس میں مل کر مشورہ کرتے تو اس وقت بعض بھولی بسری باتیں یاد آ جاتیں، کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن یونہی فرمایا تھا۔ اس طرح اسلامی قانون کے متعلق جو معلومات حدیث میں تھیں ان کو جمع کر کے قانونی احکام استنباط کرنے کا آغاز ہو گیا۔

ان علمی مراکز میں جہاں نسلاً نسل تک فقہ کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا، قانون کی تدوین کے کام میں بڑی ترقی ہوئی۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ ممتاز مدرسہ کوفہ کا تھا، جہاں اسلامی قانون کی تعلیم دی جاتی رہی۔ شہر کوفہ آج بھی عراق میں موجود ہے اور اگرچہ ایک چھوٹا سا شہر ہے لیکن اس کی تاریخی اہمیت بڑی رہی ہے اس علاقے کو کچھ خصوصیتیں حاصل ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان خصوصیتوں کے باعث یہ امتیاز اسے حاصل ہے یا محض اتفاقی بات ہے۔ وہ خصوصیتیں یہ ہیں کہ جس مقام پر آج شہر کوفہ آباد ہے۔ پرانے زمانے میں اس کے نواح میں "حیرہ" نامی شہر آباد تھا، جس کے کھنڈرات اب بھی ملتے ہیں۔ حیرہ وہ شہر ہے جو زمانہ

جاہلیت میں تہذیب وتمدن کا بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ یہ شہر اگرچہ ایرانیوں کے قبضے میں تھا، وہاں یمنی عرب آکر آباد ہوگئے تھے۔ جزیرہ نمائے عرب میں یمن کا علاقہ سب سے زیادہ سرسبز وشاداب تھا اور قدیم زمانے میں تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہا تھا۔ جب وہاں کے لوگ حیرہ میں آباد ہوئے تو ان کی تہذیب نے آس پاس کے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ تاریخ کا یہ حیرت انگیز واقعہ ہے کہ ایران کے شہنشاہ نے اپنے ولی عہد کو بچپن میں تعلیم وتربیت کے لیے حیرہ بھیجا۔ اسے پورا اعتماد تھا کہ عرب حکمران کی نگرانی میں تربیت پاکر اسکے بیٹے کا کردار سنور جائے گا۔ اس کا خیال صحیح ثابت ہوا اور بچہ جو بہرام گور کے نام سے مشہور بادشاہ گزرا ہے اس کا شکر گزار رہا، چنانچہ اس بادشاہ کی جو تصویریں ملتی ہیں ان میں اسے بدوی لباس میں ایک اونٹ پر سوار دکھایا گیا ہے۔ بہر حال حیرہ وہ مقام تھا جہاں پرانے زمانے میں ایک بہت ہی ممتاز عربی سلطنت گزر چکی ہے اور عربی یعنی یمنی اور ایرانی روایات کا سنگم ہو کر نئی شکل کا تمدن اس مقام پر نظر آتا ہے۔ یہ اور علاقوں سے ممتاز اور برتر تھا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کے زمانے میں عراق فتح ہوا تو انھوں نے اپنی سیاسی فراست کی بنا پر فوراً فوجی چھاؤنیاں قائم کیں۔ عربوں کو عرب سے بھیجا کہ جاکر اس مفتوحہ علاقے کے اندر کسی ایسے مقام پر آباد ہو جاؤ جو فوجی نقطہ نظر سے اہم ہو تاکہ بوقت ضرورت تمہیں کمک پہنچائی جاسکے اور تم بوقت ضرورت فوراً فساد اور فتنے کے مقام پر جاکر دشمن کی سرکوبی کرسکو۔ انھوں نے، علاوہ اور شہروں کے، حیرہ کو اسلامی چھاؤنی بنانے کے لیے بھی انتخاب کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے اپنی فراست سے یہ بھی معلوم کرلیا کہ پرانے شہر کے اندر مسلمانوں کو بسانا مناسب نہیں۔ اس مقام کو تو انھوں نے چن لیا لیکن شہر کو نہ چنا۔ چنانچہ حکم دیا کہ اس شہر کے مضافات میں ایک نیا شہر بسالو۔ تمہارے علاقے میں اجنبی نہ رہیں اور ان کے علاقے میں تم نہ رہو۔ یہ خالص اسلامی شہر ہو۔ اس میں بھی حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے جو نو آباد کار بھیجے وہ بیشتر یمن کے تھے۔ یمن ہی سے دوبارہ مہاجرین کا ایک سیلاب آتا ہے اور اسی پرانے مقام پر بستا ہے۔ لیکن صرف یمنی ہی نہیں، ان میں غالباً اٹھاون ایسے صحابہ بھی تھے جو جنگ بدر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک رہے۔ الغرض اسلامی روایات کے حامل لوگوں کی ایک جماعت تھی جو شہر کوفہ میں آباد ہوئی اور اسطرح پرانی روایات میں ایک نئی تہذیب کا اضافہ ہوتا ہے۔ جب اس مقام پر کئی ہزار کی اسلامی آبادی ہوگئی تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو اسلامی تعلیم کی ضرورت ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے وہاں کی جامع مسجد میں، جو اس وقت گورنر کے مکان کا جزو تھی، ایک بڑے عالم صحابی کو بھیجا۔ یہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ تھے۔ جن کے تقررنامے میں حضرت عمر رضی اللہ تعالی نے یہ لکھا کہ "اے اہل کوفہ! میں اپنے آپ پر تم کو ترجیح دیتا ہوں اور ایثار کرکے میں اس شخص کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں جس کی مجھے ضرورت ہے۔ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت ہی محترم صحابی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں جو بطور معلم کے تمہارے پاس آتے ہیں۔ ان سے استفادہ کرنے میں غفلت نہ کرنا۔ حضرت عبداللہ بن

مسعود رضی اللہ تعالی عنہ کے متعلق جیسا میں نے بیان کیا،وہ فطرتاً قانون کی طرف مائل تھے۔وہ وہاں مقیم رہے اوراپنے شاگردوں کوزیادہ تر فقہ کی تعلیم دیتے رہے۔ان میں قانونی نکتہ آفرینی اوراستدلال کا خاص ملکہ تھا۔ان کی وفات کے بعد ان کے ایک شاگرد علقمۃ النخعی، پھر انکے شاگرد ابراہیم نخعی، پھر انکے بعد ان کے شاگرد حماد بن ابی سلیمان جو ایرانی تھے، پھر ان کے بعد امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ)جو ایرانی تھے،وہ اس سلسلے میں چوتھی نسل میں وہاں کارفرما ہوئے ہیں۔امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت 80ھ میں ہوئی اوروفات 150ھ میں ۔ عباسی خلافت 132ھ میں شروع ہوئی۔گویابنی امیہ کا آخری دوراور بنی عباس کاابتدائی دوران کے سامنے گزرا۔امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کادوبارہ ذکراس لیے آیاہے کہ ان کی تالیفات میں ایک تالیف"کتاب الرائی"کے نام سے ہے۔جیساکہ آپکو معلوم ہے کہ اگر قرآن وحدیث میں صراحتاًحکم موجود نظر نہ آئےتواجتہادکرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔اجتہادرائے کے ذریعے سے ہوتاہے۔کیونکہ حضرت معاذبن جبل رضی اللہ تعالی عنہ کے الفاظ یہ تھے"اجتهد برائی"(اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا)توامام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب لکھ ڈالی۔"کتاب الرائی"یعنی آدمی رائے کس طرح سے قائم کرے۔مسائل میں رائے کااستعمال کس طرح ہوتاہے۔بدقسمتی سے یہ کتاب ہم تک نہیں پہنچی۔غالباجب بغداد پر ہلاکوخاں کاحملہ ہوااوروہاں کی لاکھوں کتابیں دریائے دجلہ میں پھینک کرتباہ کردی گئیں تو ممکن ہے اس کتاب کے نسخے بھی اس ضائع شدہ ذخیرے میں رہے ہوں اور ضائع ہوگئے ہوں۔مجھے اس سے کوئی بحث نہیں ہے کہ اس کے مندرجات کیاتھے،صرف یہ کہناچاہتاہوں کہ یہ قدیم ترین کتاب ہے جسکی طرف ہمارے مؤلف اشارہ کرتے ہیں اور جو اصول فقہ کے موضوع کی گویااولین کتاب ہے۔

اصول فقہ غالبااپنے موجودہ مفہوم میں پورے کاپورااس میں نہیں ہوگا۔لیکن رائے سے استفادہ کرکے قانون کوبدلنا،قانون کامفہوم معلوم کرنا،اس کی تاویل کرناغالباًاس میں بیان کیے گئے ہوں گے۔یہ اولین کتاب ہے جس کاذکرملتاہے۔ممکن ہے کہ اس موضوع پرپہلے بھی تحریراًاور عملاًکام کیاگیاہو یعنی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے استادوں نے بھی رائے سے کام لے کر فتوے دیے ہوں اور سوالوں کاجواب دیاہو۔لیکن یہ انھوں نے اس اس پرکوئی کتاب لکھی تھی،اب تک ہمیں اس کاپتہ نہیں چلا۔اس لیے فی الحال ہم فرض کریں گے اس موضوع پر پہلی کتاب امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) کی "کتاب الرائی"ہے۔امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) نے قانون کی بہت بڑی خدمت کی۔اس خدمت میں ایک تو"کتاب الرائی"کالکھناہے،اس کے علاوہ ایک اور چیز کی طرف اشارہ کروں گا۔وہ یہ کہ انھوں نے انٹرنیشنل لاءپر بھی ایک کتاب لکھی،جس کاانشاءاللہ کل کے لیکچر میں صراحت سے بیان ہوگا۔انٹرنیشنل لاءبھی ایک ایساعلم ہے جواسلام سے پہلے عملادنیامیں موجودنہیں تھا۔اس چیز کوعلمی حیثیت سے،ساری دنیاکے لوگوں کے استعمال میں آنے

والا، انٹر نیشنل لا بنانا مسلمانوں کا کام ہے۔ اس موضوع پر امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) نے ایک کتاب لکھی، جسے "کتاب السیر" کا نام دیا جاتا ہے۔ اور ایک چیز جس کا مجھے ذکر کرنا ہے وہ یہ کہ انھوں نے علم کا ذوق بھی اپنے شاگردوں میں پیدا کیا۔ اس ذوق کا مطلب یہ نہیں کہ مولوی نے جو بتایا اسے طوطا مینا کی حفظ کریں اور حسب ضرورت دہرا لیا کریں۔ یہ امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) کا تصورِ تعلیم نہیں تھا۔ وہ اپنے شاگردوں میں اجتہاد، فکر اور آزادی رائے کی صلاحیت راسخ کر دیتے تھے۔ چنانچہ ہر مسئلے پر انکے شاگرد آزادنہ اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے اور بحث و تمحیص کے بعد معقول دلائل کی بنیاد پر ردو قبول ہوتا۔ استاد یا شاگرد ہٹ دھری نہیں کرتے تھے۔ اس کے باوجود کہا جا سکتا ہے کہ فقہ حنفی میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے پر شاید پندرہ فیصد احکام میں عمل کیا جاتا ہو اور باقی پچاسی فیصد مسئلوں پر صاحبین کی رائے، یعنی اگر امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد شیبانی رحمۃ اللہ علیہ متفق ہوں تو ان کی رائے پر فتویٰ دیا جاتا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے پر نہیں دیا جاتا۔ یہ سب اس تربیت کا نتیجہ ہے جو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے شاگردوں کو دیتے رہے کہ اندھی تقلید نہ کرنا۔ خود سوچنا، آزادی رائے رکھنا اور حق کے سوا کسی اور چیز کو قبول نہ کرنا۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ امام یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب لکھی تھی، جس کا نام "کتاب الاصول" تھا۔ تصور کیا جاتا ہے یہ اصول فقہ کے متعلق تھی یا غالباً "کتاب الرائی" کی شرح ہو گی۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی "کتاب الرائی" لکھنے کے بعد اس کا درس بھی دیا ہو گا۔ درس کے دوران میں شرح ہوئی ہو گی اور اعتراضات بھی ہوں گے۔ اس مباحثے کے نتیجے کے طور پر امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے "کتاب الاصول" لکھ ڈالی۔ افسوس ہے کہ یہ کتاب بھی ہم تک نہیں پہنچ سکی۔ دوسرے شاگردوں میں ممتاز شاگرد امام محمد شیبانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ایک حالیہ شائع شدہ کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی اس موضوع پر ایک کتاب لکھی تھی۔ اب مطبوعہ کتاب میں امام محمد شیبانی رحمۃ اللہ علیہ کی "کتاب الاصول" کے کچھ حوالے بھی آ گئے ہیں۔ یہ مطبوعہ کتاب ایک معتزلی مذہب کے امام ابو الحسین البصری کی تالیف (المعتمد فی اصول الفقہ) ہے۔ معتزلی فرقے کی کتابیں بہت کم ملتی ہیں۔ اتفاق سے المعتمد کے چار پانچ مخطوطے ملتے ہیں۔ دو استنبول میں ہیں۔ یمن کے ایک نسخے کے فوٹو مصر میں ہیں۔ دوسرا مخطوطہ میرے پاس ہے جو شہر بیت الفقیہ (یمن) کے قاضی صاحب نے ازراہ نوازش مجھے بطور تحفہ دیا تھا۔ ایک نامکمل نسخہ میلانو (اٹلی) میں بھی ہے۔ ان سب نسخوں کی مدد سے اس کتاب کو شائع کیا گیا ہے۔ جو معتزلی اصول فقہ کی ایک اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔ لیکن مجھے اس کتاب سے زیادہ اس کے ایک جملے پر آپ کی توجہ منعطف کرانی ہے۔ امام محمد الشیبانی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ "اصول فقہ چار چیزیں ہیں۔ قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس" یہ گویا ان کی کتاب کا خلاصہ تھا۔ جس کی طرف ابو الحسین البصری کی کتاب میں اشارہ ملتا ہے۔ اس بناء پر میں کہہ سکتا ہوں کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ایک ہی نہیں، متعدد شاگردوں نے "کتاب الرائی" کی شرح کے طور پر اصولِ فقہ کی کتابیں لکھیں۔

ڈالیں۔اس رائے کے قائم کرنے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے آپ سے بیان کیا کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف "کتاب السیر" منسوب ہے، یعنی انٹر نیشنل لاء پر انھوں نے ایک کتاب لکھی تھی۔اگرچہ سوائے چند اقتباسات کے وہ کتاب ہم تک نہیں پہنچی لیکن اسی نام کی کتابیں ان کے کم سے کم تین یا چار شاگردوں نے لکھی ہیں۔ابراہیم الفزاری ایک شاگرد تھے ان کی "کتاب السیر" مخطوطے کی صورت میں موجود ہے۔محمد شیبانی نے "کتاب السیر الصغیر" اور کتاب السیر الکبیر" کے نام سے دو کتابیں لکھیں۔یہ دونوں ہم تک پہنچ چکی ہیں۔اس طرح امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ایک اور شاگرد زفر نے بھی ایک کتاب لکھی جس کا نام "کتاب السیر" تھا۔امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے معاصرین میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایک کتاب لکھی جس کا نام "کتاب السیر" کے نام سے ایک ایک کتاب لکھی۔ایک اور معاصر، واقدی نے جو مشہور مؤرخ تھے، انٹر نیشنل لاء کے موضوع پر اسی نام کی ایک کتاب تصنیف کی تھی۔جس طرح امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی "کتاب السیر" سے متاثر ہو کر اور انٹر نیشنل لاء پر ان کے لیکچروں کی اساس پر، ان کے کئی شاگردوں نے "کتاب السیر" کے نام سے کتابیں تصنیف کیں۔اسی طرح شاید "کتاب الرائی" کی تدریس کے سلسلے میں بھی وہی صورت پیش آئی اور ان کے بعض شاگردوں نے اس موضوع پر بھی کتابیں لکھیں، ممکن ہے کہ اس کو اصول کا نام بھی خود امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہو، "کتاب الرائی" کی تدریس کے سلسلے میں اس امر کا ذکر کرنے کے بعد یہ بتاتا ہے کہ کتاب الاصول یعنی علم الاصول کی جو کتابیں مسلمانوں میں پائی جاتی تھیں ان میں سے ابتدائی تین کتابیں یعنی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی "کتاب الرائی" اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ، امام محمد شیبانی رحمۃ اللہ کی "کتاب الاصول" ہم تک نہیں پہنچیں۔جو کتاب ہم تک پہنچی وہ امام محمد شیبانی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شاگرد امام شافعی رحمۃ اللہ کی ہے۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بیک وقت کئی سلسلوں اور روایتوں (Traditions) سے منسلک تھے۔وہ ایک سو پچاس ہجری میں پیدا ہوئے۔اسی سال امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہو گیا۔براہ راست وہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ نہیں کر سکے، لیکن سالہاسال تک ان کے ممتاز شاگرد امام محمد شیبانی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رہے۔اسی طرح مدینہ منورہ جاکر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی سالہاسال تک درس لیتے رہے۔انھوں نے فلسفہ و منطق کی بھی تعلیم پائی اور علم الکلام کی بھی۔اس زمانے میں معتزلہ فرقے کا بہت بول بالا تھا۔ان سے مباحثے بھی کرتے رہے۔اس لیے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات کئی ایسی چیزیں جمع ہو گئیں جن کے باعث وہ اسلام کی بہت اہم خدمات انجام دے سکے، جن میں سے ایک حسب ذیل ہے۔مسلمانوں میں جیسا کہ آج ہے، پرانے زمانے میں بھی کچھ۔لوگ قدامت پسند تھے اور کچھ جدت پسند۔ان دو متضاد رجحانات کے لوگ ہر معاشرے اور ہر قوم میں پائے جاتے ہیں۔بہر حال اس زمانے میں اگر بعض لوگ حدیث کی تعلیم پانے اور جمع کرنے کے کام میں مشغول تھے تو کچھ لوگ دوسرے علوم سے دلچسپی رکھتے

تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض فقہاء جنھیں قانون کے علم سے دلچسپی تھی، منطق اور فلسفے کی مدد سے اسلامی قانون کو ترقی دینے میں مشغول تھے۔ان کی توجہ حدیث کی طرف سے ہٹ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں اہل حدیث اور اہل رائے میں ایک شدید کشمکش پیدا ہو گئی۔ اہل حدیث سے مراد وہ لوگ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ احکام واقوال کو جمع کرنے اور مطالعہ کرنے میں مشغول تھے اور اہل رائے سے مراد وہ فقہاء تھے جو اسلامی قانون کو جمع کرنے اور قیاس اور استنباط کی مدد سے اس کو ترقی دینے میں مشغول تھے۔ دونوں میں کشمکش اس بناء پر بھی کہ اہل الرائے کو حدیث سے کم واقفیت تھی اور وہ اس بات کو فرض کر لیتے تھے کہ حدیث میں یہ چیز نہیں پائی جاتی۔ اس سکوت کے باعث وہ قیاس کر کے نئے احکام دیا کرتے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا کہ اس مسئلے متعلق حدیث میں ذکر موجود ہوتا لہذا اہل حدیث کہتے یہ لوگ تو کافر ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہوتے ہوئے اسے نظر انداز کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ عمداً ایسا نہیں کرتے تھے۔ انھیں واقفیت نہ ہوتی تھی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے اہل حدیث (محدثوں) سے بھی تعلیم پائی اور اہل الرائے فقہا سے بھی۔ انھیں فلسفہ وکلام پر بھی دسترس حاصل تھی۔ ان کی ذات میں ایسا اچھا اسلام عالم پیدا ہو گیا جو گویا ایک نقطہ اتصال پیدا کرنے اور ربط پیدا کرنے کا باعث بن سکا۔ چنانچہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ رہا ہے کہ اہل حدیث اور اہل الرائے کو متحد کر دیں۔ حدیثوں سے وہ زیادہ واقف تھے اور استنباط واستقراء اور اجتہاد کے فن میں بھی ماہر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایسی چیز بیان کرتے جس سے اہل حدیث بھی خوش رہتے اور اہل الرائے بھی خوش ہوتے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے انھوں نے "کتاب الرسالہ" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اصول فقہ کی قدیم ترین کتاب جو دنیا میں پائی جاتی ہے۔ وہ "کتاب الرسالہ" ہے۔ اب اس کے ترجمے مغربی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ ممکن ہے اردو میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہو یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے الرسالہ، لکھ کر ایک نئے علم کی بنیاد ڈال دی، کم از کم بنیاد مستحکم کر دی، اس میں جو چیزیں بیان کی گئی ہیں۔ بعد کی صدیوں میں بھی ذرا بھی بدلتی ہوئی نظر نہیں آئیں حتی کہ اصطلاحات بھی جو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے استعمال کی ہیں۔ من وعن آج چودہ سو سال تک چلی آ رہی ہیں۔ رسالہ کے معنی ہوتے ہیں خط۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک شاگرد کی درخواست پر، جس نے کہا تھا کہ استاد ہمیں اس موضوع پر یعنی اصول فقہ پر ایک تحریر لکھ دیجئے جس سے ہم استفادہ کریں، ڈیڑھ سو صفحوں کا ایک خط بھیجا۔ اس میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ قانون کسے کہتے ہیں؟ قانون کس طرح بناتے ہیں؟ پرانا قانون کس طرح منسوخ کرتے ہیں؟ الفاظ کو سمجھنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے؟ اس میں لغت، قواعد زبان، بلاغت وعروض کے علوم پر روشنی ڈالی گئی ہے اور مثالیں بھی دی گئی ہیں اور ساتھ ساتھ بہت ہی دقیق انداز میں اپنے مخالفین کے جوابات بھی

دیے ہیں۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں معتزلہ فرقہ عروج پر تھا۔اس فرقے کا نظریہ یہ تھا کہ حدیث پر اعتماد کرنا آسانی سے ممکن نہیں۔چنانچہ اب یہ مشہور ہو گیا ہے کہ معتزلہ حدیث کو رد کرتے تھے۔لیکن یہ افتراء ہے، حقیقت میں ایسا نہیں میں نے ابوالحسین البصری کی جس کتاب کا ذکر کیا ہے وہ معتزلہ فرقے کے مؤلف کی تالیف ہے۔اس میں وہ تفصیل سے بتاتا ہے کہ حدیث پر کس طرح اعتماد کیا جائے، حدیث کے متعلق اس کی جو رائے رہی ہے کوئی سنّی بھی اسکے بیان کردہ اصول سے بہ مشکل اختلاف کر سکے گا۔تو وہ کیا چیز تھی جسکی بنا پر معتزلہ کو مطعون کیا جاتا تھا کہ وہ حدیث کو قبول نہیں کرتے تھے۔اس سلسلے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا کیا، اس کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

معتزلہ فرقے کے علماء کی رائے یہ تھی کہ "اگر حدیث میں کوئی حکم دیا گیا ہو یا اس سے کوئی قانون بنتا ہو تو ضروری ہے کہ اس حدیث کے راوی ایک سے زیادہ ہوں۔خبر واحد یعنی ایک راوی کی بیان کردہ حدیث پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔اس لیے نہیں کہ وہ غلط ہے بلکہ اس لیے کہ قانون کا تقاضا ہے کسی دعوی کی تائید دو گواہ کریں۔اس رائے کی دوسرے مسلمان فقہاء نے تردید کی۔اہل حدیث کے محدثین نے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جواب عالمانہ انداز میں دیا۔اسکے بعد سے معتزلہ کا جو اعتراض تھا کہ خبر واحد ناقابل اعتماد ہے، اس کی اہمیت بالکل ختم ہو گئی اور صرف ایک راوی کی بیان کردہ حدیث پر بھی سب لوگ عمل کرنے لگے۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ سے ایسے بہت سے واقعات انتخاب کر کے بیان کیے جن میں کسی ایک آدمی کی شہادت پر کسی حکم کی تعمیل کی گئی ہو مثلاً انھوں نے کہا کہ ایک دن فجر کی نماز کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو بھیجا کہ مختلف محلّوں میں جا کر لوگوں سے با آواز بلند کہہ دو کہ قبلہ اب بیت المقدس کی جگہ کعبہ کی طرف ہو گیا ہے۔ایک ہی شخص بھیجا گیا۔اس نے کہا کہ نماز میں اپنے رخ کو بجائے بیت المقدس کے کعبے کی طرف موڑلو۔تب لوگوں نے اس پر عمل کیا۔اسکے معنی یہ ہیں کہ عہد نبوی میں ایک شہادت پر عمل کیا جاتا تھا اور یہ کبھی نہیں کہا گیا کہ "اگر دو آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی اطلاع دیں تو ہم مانیں گے ورنہ ہم رد کر دیں گے۔" اسی طرح انھوں نے ایک اور مثال دی کہ ایک دن مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقرر کردہ ایک شخص ڈھنڈورا پیٹتا ہوا نکلتا ہے اور چلا چلا کر کہتا ہے کہ اے مسلمانو! شراب کی ممانعت کا حکم نازل ہوا ہے، شراب نہ پیئو۔یہ صرف ایک آدمی تھا۔حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ بیان کرتے ہیں (اور یہ صحیح بخاری کی حدیث ہے) کہ یہ انکے بچپن کا واقعہ ہے۔جب وہ شخص ڈھنڈورا پیٹتا ہوا ان کے مکان کے پاس سے گزرا، اس وقت وہ اپنے والدین کے مہمانوں کو شراب کے پیالے پیش کر رہے تھے۔شراب کی ممانعت کا حکم سنتے ہی ان کے باپ نے کہا، بیٹا اٹھو اور اس شراب کو ضائع کر دو۔چنانچہ میں نے ایک

ہتھوڑا لیا اور شراب کے پیپے کو توڑ کر اسے بہا دیا۔ جو لوگ شراب پی رہے تھے انھوں نے بھی پیالے پھینک دیے۔ وہاں بھی صرف ایک شخص کی اطلاع پر سب لوگوں نے عمل کیا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بہت سی مثالیں دی ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پر عمل کرنے کے لیے ایک شخص کی گواہی کافی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کارنامہ تھا کہ اہل حدیث اور اہل الرائے کو متحد کر دیا تاکہ اس طرح اسلامی قانون کی زیادہ بہتر خدمت ہو سکے۔ اب تک اہل حدیث صرف حدیث کو پڑھتے، یاد رکھتے اور بیان کرنے پر اکتفا کرتے تھے اور دیگر علوم سے انھیں واقفیت نہیں ہوتی تھی۔ منطق، فلسفہ، استدلال وغیرہ سے انھیں کوئی تعلق نہیں تھا، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ بعض وقت وہ لفظی مفہوم لے کر اس کے اطلاق پر اصرار کرتے جو نامناسب بات تھی۔ دوسری طرف اہل الرائے ہر چیز میں قیاس کرتے اور اچھی طرح تحقیق نہ کرتے کہ حدیثوں میں کسی مسئلے کے متعلق کیا احکام موجود ہیں؟ اس سے بے خبر رہ کر وہ اپنی رائے سے قانون سازی کرتے۔ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ہی کا فیضان ہے کہ محدثین اپنے مواد میں ایک نظم پیدا کرتے ہیں اور بالا بواب حدیثیں لکھتے ہیں ایک ہی موضوع پر متعدد حدیثیں ہوتی ہیں تو انھیں ایک ہی جگہ جمع کرتے ہیں تاکہ ہم غور کر سکیں کہ کون سی حدیث مقدم ہے کون سی حدیث مؤخر ہے، کون سی ناسخ ہے، کون سی منسوخ ہے۔ ایک طرف یہ اور دوسری طرف اہل الرائے بھی حدیث کا مطالعہ کرنے لگے۔ اسطرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی کوشش سے اسلامی قانون کی ترقی کے لیے ایک نئی راہ کھل گئی۔

اس وقت تک چار کتابوں کا بیان ہوا۔ "کتاب الرائے" امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی، "کتاب الاصول" ان کے دو شاگردوں کی اور "کتاب الرسالہ" امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی۔ اس کے بعد سے لے کر اب تک تقریباً چودہ سو سال کا زمانہ ہوتا ہے انہی ابتدائی کتابوں کی شرح کے سوا اور کوئی چیز نہیں ملتی۔ اس علم سے شغف زیادہ تر ترکستان والوں کو رہا ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ اس علم کو ترقی ترکوں نے دی اور ایسی بیسیوں کتابیں لکھی گئیں جو یا تو تکرار پر مبنی ہیں، یا شرح پر یا خلاصوں پر مشتمل ہیں۔ مثلاً ایک بڑی ضخیم کتاب ابو الحسین البصری نے لکھ۔ ڈالی جو دو جلدوں میں ہزار ڈیڑھ ہزار صفحوں پر چھپی ہے۔ اس کا پڑھنا ہر شخص کے لیے آسان نہیں ہے۔ اسکا خلاصہ امام بیضاوی نے بیس صفحوں میں کر ڈالا جو چیستان بن کر رہ گیا۔ پھر بیضاوی کے اس مختصر رسالے کی شرح اور حاشیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ کتاب تو درس کے طور پر بیضاوی کی پڑھائی جاتی تھی۔ لیکن اس کو سمجھانے کے لیے شرحوں اور حاشیوں اور حاشیۃ الحواشی کی ضرورت پیش آتی۔ غرض یہ سلسلہ اب تک چلا آرہا ہے۔

زمانہ حال میں اس میں اگر کسی نے نئی چیز پیدا کرنے کی کوشش کی ہے تو وہ ہمارے مرحوم سر عبد الرحیم تھے، جو ایک زمانے میں ہندوستان کی اسمبلی کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ بعد میں وہ پاکستان میں بھی رہے انھوں نے قانون حیثیت سے پاکستان کی بڑی خدمت کی ہے۔ ایک زمانے میں جب وہ مدراس ہائی کورٹ کے جج تھے تو کلکتہ یونیورسٹی کی دعوت پر غالباً ٹیگور لا لیکچرز کے سلسلے میں، انھوں نے اصول فقہ پر کچھ لیکچر دیے تھے جو محمڈن جیورسپروڈنس (Muhanandan Jurisprudence) کے نام سے کتابی صورت میں چھپ گئے ہیں۔ ان میں انھوں نے ایک تھوڑی سی جدت کی ہے اور یہ کہ پرانی اصولِ فقہ کی کتابوں کے بیانات کو اور مواد کو بھی بیان کر دیا ہے اور حالیہ زمانے میں یورپ میں فلسفہ قانون وغیرہ کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان سے بھی استفادہ کرکے اسلامی اور یورپی اصول قانون کے موازنے کی کوشش کی ہے۔ اس لحاظ سے عبد الرحیم کی محمڈن جیورسپروڈنس اصول فقہ کی ایک ایسی کتاب ہے جو ہمارے پرانے اصول فقہ کی کتابوں میں ایک نیا باب کھولتی ہے۔ اس میں ہمیں ایسی چیزیں بھی ملتی ہیں جنکا ذکر پرانی اصول فقہ کی کتابوں میں نہیں ملتا۔ مثال کے طور پر پرانی اصول فقہ کی کتابوں میں پہلا سوال یہ ہو گا کہ قانون کے ماخذ کیا ہیں؟ وہ کہیں گے قرآن وحدیث اور اجماع و قیاس۔ ان میں یہ ذکر نہیں ہو گا کہ قوانین کس کس موضوع کے ہوتے ہیں۔ کچھ۔ عبادات ہیں، کچھ معاملات ہیں، کچھ قانون تعزیرات و قانون وراثت ہے۔ لیکن اور بھی چیزیں ہیں، جیسے انٹرنیشنل لاء اور کانسٹی ٹیوشنل لاء وغیرہ۔ ہماری پرانی فقہ کی کتابوں میں انکا کوئی ذکر نہیں آیا جسٹس سر عبد الرحیم نے اصولِ قانون کے یورپی مؤلفین کی طرح ان قوانین کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ ان کا علمی کارنامہ ہے کہ قدیم وجدید معلومات کو اپنی جامع کتاب میں سمو دیا ہے۔ اب آخر میں مجھے اجتہاد کے بارے میں اشارۃً کچھ کہنا ہے جس کا اعلان میرے لیکچر کے موضوع کے طور پر کیا گیا ہے۔ اجتہاد کیا چیز ہے؟ میرے گذشتہ دنوں کے بیانات سے آپ اندازہ کر چکے ہوں گے اجتہاد کرنے کی اجازت رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ تعالی عنہ کو اس شرط پر دی تھی کہ قرآن وحدیث میں انکو سکوت نظر آئے۔ اگر قرآن میں صراحت آتی ہے تو بھی اجتہاد کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اجتہاد صرف اس وقت کیا جاتا ہے جب یہ دونوں بنیادی اساس یعنی قرآن وحدیث ہمارے سوال کے متعلق خاموش نظر آئیں۔ قانون سازی کی اس کوشش یعنی اجتہاد کو ہمارے فقہاء نے بہت ترقی دی اور اس کے لیے لطیف فرق کی بنا پر بہت سے نام دیے ہیں۔ چنانچہ اجتہاد کا لفظ بھی ہے قیاس کا لفظ بھی ہے۔ استدلال کا لفظ بھی ہے اور اسی طرح استصلاح کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ سب بالکل مترادف چیزیں نہیں بلکہ ان میں باہم لطیف سا فرق پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں "استحسان" کا میں خاص طور پر ذکر کروں گا۔ استحسان حنفی مذہب کی ایک خصوصیت ہے جس کو دوسرے فقہی مکاتب فکر کے لوگ پسند نہیں کرتے۔ یہ ناپسندیدگی ایک غلط فہمی کی بنیاد پر ہے، لیکن بہر حال اسے پسند نہیں کرتے چنانچہ آپ کو حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام ہے "الرد علی

الاستحسان" جو استحسان کی تردید کے دلائل پر مبنی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے ہمیں نظر آتا ہے کہ انہوں نے استحسان کا ایک فرضی مفہوم لے کر اسکی تردید کی ہے۔ حنفی مکتب فکر کے مطابق استحسان کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی مسئلے کے ظاہری حالات کی بنا پر کوئی بات ذہن میں آتی ہے تو اس پر اکتفانہ کی جائے بلکہ گہرے غور و فکر کے بعد عمیق تر حقائق کے پیش نظر حکم دیا جائے۔ چنانچہ استحسان سے کام لینے والے حنفی ائمہ محض ظاہری حالات کو کافی نہیں سمجھتے اور ایک عمیق تر سبب معلوم کر کے اس کی بنیاد پر احکام دیتے ہیں۔ ایک مثال میں آپ کو دوں گا۔ فرض کیجئے کہ میں آپ میں سے کسی کے سپرد کچھ امانت کروں، کہ اسے فلاں کو پہنچادو تو توقع یہی کی جائے گی آپ وہی چیز منزل مقصود تک پہنچادیں گے۔ آج کل ہمارے ڈاک خانوں سے منی آرڈر بھیجا جاتا ہے۔ ایک رقم آپ ڈاک خانے کے سپرد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس امانت کو تم فلاں شخص تک پہنچادو۔ جو رقم آپ ڈاک خانے کے سپرد کرتے ہیں، امانت کا عام اصول تو یہی ہے کہ وہی رقم پہنچائی جائے۔ لیکن ڈاک کے موجود نظام کے مطابق آپ کی رقم سرکاری خزانے میں جمع ہو جاتی ہے اور منی آرڈر وصول کرنے والے کو متبادل رقم ادا کر دی جاتی ہے۔ اصل رقم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ یہی استحسان کا مفہوم ہے۔ اگرچہ یہ طریقہ امانت کے قانون کی ابتدائی یا سطحی مفہوم سے کسی حد تک مختلف ہے لیکن اس طریقے سے امانت کا حق ادا کرنے میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے، اور اصلی اور متبادل رقموں کا مالیت میں کوئی فرق بالکل نہیں ہوتا۔ اس مختصر تشریح کا منشا اصل میں یہ تھا کہ مسلمانوں نے علمِ قانون کو اپنے اجتہادِ فکر کی بدولت اس طرح مدون کیا کہ اسلامی قانون کو اس کے قانون ساز رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی وفات کے بعد آپکی غیر موجودگی کے باعث کوئی دشواری پیش نہ آئی اور آج بھی اسلامی قانون اسی اصول کی وجہ سے اپنی جگہ محفوظ اور ہر دور میں قابل عمل ہے۔ ایک نکتہ بیان کر کے میں اس لیکچر کو ختم کرتا ہوں۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ کسی قانون کو یا تو خود قانون ساز بدل سکتا ہے یا اس سے بالاتر شخصیت۔ اس سے کمتر شخصیت کو قانون بدلنے کی اجازت نہیں۔ اگر اللہ نے کوئی حکم دیا تو اللہ ہی اسکو بدل سکتا ہے۔ اسی طرح نبی کے حکم کو یا خود وہی نبی بدلے گا یا اللہ اور یا اللہ کا بھیجا ہوا کوئی دوسرا نبی۔ نبی سے فروتر شخص مثلاً کوئی فقیہ اسے نہیں بدل سکتا۔ اس لحاظ سے اسلامی قانون کے جو احکام قرآن میں ہیں انھیں کوئی اور شخص نہیں بدل سکتا لیکن ایک فقیہ کی رائے دوسرا فقیہ رد کر سکتا ہے اور اپنی رائے پیش کر سکتا ہے۔ جیسا کہ میں گزشتہ لیکچر میں بیان کیا تھا۔ کہ یہ چیز انفرادی قیاس ورائے اور استنباط ہی سے متعلق نہیں بلکہ اجتماعی رائے کے متعلق بھی درست ہے۔ کم از کم حنفی مذہب میں یہ بات قبول کر لی گئی ہے کہ نیا اجماع پرانے اجماع کو منسوخ کر سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک چیز پر اجماع پایا جاتا ہے۔ اجماع کے سامنے ہم سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ قیامت تک کوئی شخص اس کے خلاف زبان نہ کھولے۔ اگر کوئی شخص جرات کر کے ادب کے ساتھ، دلیلوں کے ساتھ، اس کے خلاف اپنی رائے پیش کرے اور پھر اس نئی رائے کو دوسرے فقہاء بھی قبول کریں تو ایک

نیا اجماع ہو جاتا ہے۔ یہ نیا اجماع پرانے اجماع کو منسوخ کر دیتا ہے۔ یہ اصول مشہور حنفی امام ابو الیسر البزدوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "اصول الفقہ" میں بیان کیا ہے۔ امام بزدوی رحمۃ اللہ علیہ چوتھی اور پانچویں صدی کے درمیان کے فقیہ گزرے ہیں۔ اسلامی قانون میں ان کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ان کے اس بیان کی وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اجماع ہمارے لیے مصیبت کا باعث نہیں بن سکتا۔ اجماع اگر کسی نامناسب چیز پر ہو گیا اور حالات کے بدلنے کی وجہ سے ہم ان پر عمل نہ کر سکتے ہوں تو اس کی گنجائش ہے کہ اجماع کے بدلنے کا بھی ہم سامان پیدا کر لیں اور قیاس کے ذریعے سے ایک نیا اجماع پیدا کر کے پرانے اجماع کو بدل دیں۔

السلام علیکم ورحمۃ وبرکاتہ،

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## سوالات وجوابات

برادران کرام! خواہران محترم! السلام علیکم ورحمۃ وبرکاتہ!

متعدد سوالات آئے ہیں، اپنی بساط کے مطابق جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

**سوال نمبر1:** موجودہ دور میں پاکستان میں اجتہاد کا کیا طریقہ ہونا چاہیے؟ اسکی وضاحت فرمائیں۔ اسی طرح اس دور میں اجماع اور قیاس کا کیا طریقہ ہو گا؟

**جواب:-** میرا خیال ہے کہ پاکستان اور غیر پاکستان کا سوال بے محل ہے۔ ساری دنیا کے مسلمانوں کا یہ مشترکہ معاملہ ہے۔ جس چیز کے متعلق قرآن وحدیث میں صراحت نہیں ہے اور ایک ایسا مسئلہ پیدا ہوا ہے جسکی ہمیں ضرورت ہے تو اس کے لیے ہم اجتہاد کے ذریعے سے اسلامی نقطہ نظر معلوم کرنے کی کوشش، انفرادی طور پر بھی کریں اور باہمی مشاورت سے بھی یعنی اجتماعی طور پر بھی۔ سب لوگ متفق ہوتے ہیں۔ تو فبہا ورنہ ہماری حکومت کو جو رائے اپنے پارلیمنٹ کے ارکان کی کثرت رائے کی بنیاد پر مناسب معلوم ہو گی، اس پر عمل کرایا جائے گا۔ اجماع اور قیاس کا ابھی یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ اصل چیز صرف اجتہاد ہے۔ کچھ خفیف سے فرق کی وجہ سے اس کے مختلف نام ہو گئے ہیں۔ کس طرح اجتہاد قیاس کہلائے گا، کس طرح اجتہاد استحسان کہلائے گا، یہاں مجھے تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں۔ قیاس اور اجماع عملاً ایک ہی چیز ہیں۔ صرف اتنا ہی فرق ہے کہ اجتہاد ایک آدمی کی رائے ہوتی ہے اور اجماع وہ ہے جس پر سارے فقیہ اور قانون کے ماہرین متفق ہو جائیں۔ میں غالباً کسی لیکچر میں عرض کر چکا ہوں کہ مسلمانوں میں اجماع کا تصور پایا جاتا ہے لیکن بدقسمتی سے گزشتہ چودہ سو سال سے اجماع کو ایک ادارے کی حیثیت دینے کی طرف ہم نے توجہ نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہے کہ کسی چیز پر اجماع ہوا ہے یا نہیں، اس کے معلوم کرنے کا آج ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں، ابتدائی صدیوں ہی سے مسلمان تین براعظموں ایشیاء، یورپ اور افریقہ میں پھیلے ہوئے تھے مگر کبھی یہ صورت ممکن نہ ہو سکی کہ کسی سوال کو سارے

فقہاء کے پاس بھیج کر ان کی آراء کو جمع کیا جاتا، کیا سب لوگ اس جواب پر متفق ہیں؟ شاید پرانے زمانے میں یہ چیز ممکن بھی نہیں تھی، کیونکہ وسائل نقل وحمل کی دشواریاں تھیں۔ لیکن زمانہ حال میں اسکے امکانات پیدا ہوگئے ہیں۔ اسی لیے میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اسلامی ممالک تک اپنے آپکو محدود رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں بھی مسلمان موجود ہیں، انکو ایک نظام کے اندر منظم کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ مثلاً ہر ملک میں انجمن فقہاء قائم کی جائے۔ کسی مقام پر اس کا ایک صدر مرکز ہو۔ یہ مرکز پاکستان میں بھی ہو سکتا ہے اور پاکستان سے باہر بھی، حتی کے ماسکو اور وشنگٹن میں بھی ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی امر مانع نہیں کیونکہ یہ صرف مسلمانوں کا ایک مخصوص ادارہ ہوگا۔ جہاں بھی مرکز ہو اس کو ایک سوال پیش کیا جائے گا۔ اگر سیکرٹریٹ کی رائے میں وہ سوال واقعی اسکا متقاضی ہو کہ مسلمان فقہائے عالم اپنی رائے دیں، تو وہ اس سوال کو ساری شاخوں کے پاس روانہ کر دے گا، اسلامی ممالک کی شاخوں کو بھی اور غیر اسلامی ممالک کی شاخوں کو بھی۔ ہر شاخ کے سیکرٹری اپنے ملک کے سارے مسلمان قانون دانوں کے پاس اس سوال کی نقل روانہ کر کے درخواست کرے گا کہ تم اپنا مدلل جواب اسکے متعلق روانہ کرو، جب اسکے پاس یہ جوابات جمع ہو جائیں تو وہ مرکز کو روانہ کرے گا، کہ یہ متفقہ جواب ہے۔ اگر اختلافی جواب تو اختلاف کے ساتھ۔، لیکن ہر فریق کی دلیلوں کے ساتھ۔۔ اس عملی پہلو پر بھی آپکو توجہ دلاؤں کہ مرکز کی زبان عربی ہونی چاہیے اور انفرادی طور پر ہر ملک میں کوئی مقامی زبان ہو سکتی ہے مثلاً اگر وہ سوال پاکستان میں آئے تو یہاں کے علماء اپنے جوابات اردو میں دے سکتے ہیں یا کسی اور زبان میں۔ لیکن یہاں سے مرکز کو جو جواب جائے گا وہ عربی میں ہونا چاہیے تا کہ ساری دنیائے اسلام کے فقہاء اس سے آسانی سے استفادہ کر سکیں۔ کیونکہ میری رائے میں ہم اچھا فقیہ اسکو کہیں گے جسے اچھی عربی آتی ہو غرض جب ساری شاخوں کے پاس سے جواب آجائے اور دیکھا جائے کہ اس پر سب کا اتفاق ہے تو اس امر کا اعلان کیا جاسکتا ہے کہ اس جواب پر سب لوگ متفق ہیں۔ لیکن اگر اختلاف ہو تو اختلافی دلیلوں کا ایک خلاصہ تیار کیا جائے اور دوبارہ اسکو گشت کرایا جائے تا کہ جن لوگوں کی پہلے ایک رائے تھی، ان کے سامنے مخالف دلیلیں بھی آجائیں۔ اور انھیں غور کرنے کا موقع ملے، ممکن ہے وہ اپنی رائے بدل کر اس دوسری رائے پر متفق ہو جائیں جو انکے مخالفین کی تھی۔ جب اسطرح سامنے مخالف دلیلیں بھی آجائیں۔ اور انھیں غور کرنے کا موقع ملے، ممکن ہے اور اپنی رائے بدل کر اس دوسری رائے پر متفق ہو جائیں جو انکے مخالفین کی تھی۔ جب اسطرح کافی غور وبحث کے بعد دوبارہ تمام شاخوں سے مرکز کے پاس جواب موصول ہو جائیں تو یہ معلوم ہو جائے گا کہ کس چیز پر اجماع ہوا ہے اور کس چیز پر اختلاف رائے ہے۔ نیز یہ کہ اختلافی پہلو پر اکثریت کی رائے کیا ہے؟ ان سب نتائج کو ایک رسالے کی صورت میں شائع کیا جائے جس میں جوابات مع دلائل درج ہوں۔ یہ میرا تصور ہے کہ ہمارے زمانے میں اجماع کو، اگر ہم ایک ادارہ بنانا چاہیں تو کس طرح بنائیں اور کس طرح اس سے استفادہ کریں۔ یہ قطعاً ممکن نہیں

ہے کہ دنیا بھر کے ماہرین فقہائے اسلام کو مستقل طور پر کسی ایک جگہ جمع کر دیا جائے۔وہ کسی چندروزہ اجتماع میں شرکت کے لیے تو آسکتے ہیں لیکن ساری عمر ایک مقام پر گزارنا ان کے لیے ممکن نہیں ہے۔اورنہ ہی ان ملکوں کے لیے جہاں کے باشندے ہیں، فائدہ مند چیز ہوگئی۔کیونکہ انکے خدمات سے ان کے ہم وطن محروم ہو جائیں گے۔اس کے بر خلاف اگر اس طرح کی انجمن بنائی جائے تو وہ اپنی رائے آسانی کے ساتھ دے سکتے ہیں۔اور اس سے ساری دنیا کے لوگ استفادہ کر سکتے ہیں۔لیکن شرط یہ ہے کہ ہمارے فقہاء وصول شدہ خط کا جواب بھی دیں۔بد قسمتی سے خط کا جواب دینے میں تساہل وتغافل اب ہم سے بہت عام ہوگیا ہے۔مجھے یاد ہے کہ میں ایک مرتبہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی التاریخ الکبیر پڑھ رہا تھا، جو محدثین کے حالات کی کتاب ہے۔اس میں انھوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہ کا ایک قول نقل کیا ہے۔بخاری حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ "خط کا جواب دینا اسی طرح واجب ہے جسطرح سلام کا جواب دینا"۔اگر اس پر ہمارے زمانہ حال کے فقہاء عمل کرنا پسند کریں تو امت ان سے استفادہ کرے گی۔ورنہ جہاں ہماری دیگر بے شمار برائیاں ہیں۔ان میں یہ برائی بھی سخت ہے کہ لوگ کم ہی جواب دینا پسند فرماتے ہیں۔

**سوال نمبر2:-** اسلامی قانون میں فیصلہ ظاہری عمل کی بنیاد پر دیا جاتا ہے، جس طرح جبری طلاق، ایسا کیوں ہے؟ نیت پر اعتبار نہیں کیا جاتا۔اسکی کیا وجہ ہے؟

**جواب:-** بظاہر اسکی وجہ یہ ہے کہ نیت ایک ایسی چیز ہے جو ہمیں نظر نہیں آتی اور اسکا امکان بھی ہے کہ ایک آدمی ابتداء ایک نیت رکھتا ہے اور جب اس سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ جھوٹ بیان کرتا ہے کہ میری نیت یہ نہ تھی۔ان حالات میں حدیث کے الفاظ کو اگر ہم دیکھیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قرار دیا ہے کہ ظاہر پر عمل کیا جائے، کیونکہ باطن کا علم صرف خدا ہی کو ہو سکتا ہے۔چنانچہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک دن ایک جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک قریبی صحابی حضرت اسامہ بن زید بن حارثہ رضی اللہ تعالی عنہ جو آپ کے آزاد کردہ غلام اور متبنی حضرت زید کے بیٹے بھی تھے انھوں نے ایک دشمن کا دست بدست مقابلہ کیا۔آخری لمحے میں جب حضرت اسامہ رضی اللہ تعالی عنہ کی تلوار اسکے سر کے قریب پہنچ رہی تھی تو اس نے اشھدان لا الہ الا اللہ بلند آواز سے کہہ دیا۔اس کے باوجود حضرت اسامہ رضی اللہ تعالی عنہ نے ہاتھ نہیں روکا اور اس کا سر قلم کر دیا۔جب اس کی اطلاع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت خفا ہوئے۔اسامہ نے کہا کہ اس شخص نے تو صرف ڈر کر کلمہ شہادت پڑھا تھا۔حقیقت میں دل سے مسلمان نہیں ہوا تھا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ تھے: "ھلاشققت قلبہ"

(کیاتونے اسکادل چیر کراسکے اندر دیکھاتھا کہ وہ ایساتھا)۔دوسرے الفاظ میں ظاہر پر عمل کرنے کے سواہمارے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔مغرب کی اعلی ترین ایجادوں کے باوجودانسان کے باطن کاحال معلوم کرنااب تک ممکن نہیں ہوسکا۔اگرکسی دن یہ ممکن ہوجائےتوہوسکتاہے ہم اس پر عمل کریں،لیکن فی الحال اس پر عمل کرناانصاف کے خلاف ہی ہوگا۔لوگ اپنے برے اعمال کے خمیازے سے بچنے کے لیے جھوٹ بولا کریں گے اوراگر جھوٹ کو قانوناہماراقاضی یاحاکم عدالت قبول کرنے پر مجبور ہوجائےتووہ انصاف نہیں ہوگا،ظلم ہوگا۔

**سوال نمبر3:-** اگرنئےاجماع کوپرانےاجماع پرفوقیت دی جاسکتی ہےتوکیایہ اصول صحابہ کےاجماع اورائمہ اربعہ کےاجماع کورد کرنے میں بھی قابل عمل ہوگا؟

**جواب:-** بجائے اصولی بحث کرنے کے میں یہ سوال کروں گاآپ کوئی ایسی چیز بتائیں جس پر صحابہ کااجماع ہواہو،جس پرچاروں اماموں کااجماع ہواہو،اورپھرمیں آپکوجواب دوں گاکہ اس کے بدلنے کی ضرورت ہوگی یانہیں۔فرضی سوالات میں وقت ضائع کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں۔میں سمجھتاہوں کہ جس پرسارے صحابہ متفق ہوچکے ہوں،جس پرسارےائمہ حنفی،شافعی متفق ہوں،وہ قطعاایسی چیز نہیں ہوگی،جوآج ہماری عقلوں کے لیے ناقابل قبول ہو۔اسے اصولاًمیں قبول کرنے کوتیار نہیں ہوں۔آپ مجھے معین مثال دیں پھرمیں بتاسکتاہوں کہ اس قاعدے کے اطلاق،کہ نیااجماع پرانے زمانے کے فقہاء کے سامنے پیش کریں گے۔جب تک ان کااجماع نہ ہو،پرانااجماع ہی واجب التعمیل ہوگا۔صحابہ کااجماع یاائمہ کااجماع ہی برقراررہے گاجب تک کسی مسئلے پرواقعتاًنیااجماع عمل میں نہ آئے۔

**سوال نمبر4:-** اگرخلافت علی منہاج النبوۃ ہوتووہ حکومت کس مسئلے میں اجتہاد کرے گی۔اگرکسی مسئلے میں اجتہاد کرے گی توآیاعوام کے لیے قابل قبول ہوگا؟

**جواب:-** اگرایسی خلافت ہوجیسی کہ آجکل ہے۔توظاہرہے کہ حکومت کااجتہاد قابل قبول نہ ہوگا۔اس صورت میں جوقرآن وحدیث سے خوداستدلال نہ کرسکتاہوکیاکرے گا۔کیونکہ آجکل بہت سے مسائل میں علمائےکرام نے مختلف آراء دی ہیں۔اگرچہ میں سوال کامقصد شاید نہیں سمجھالیکن ایک بات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراؤں گا،وہ یہ کہ اسلام میں ایک روایت(Tradition) عجیب وغریب رہی ہے جوکسی اورقوم میں ہمیں نظرنہیں آتی۔یعنی اورممالک میں قانون سازی حکومت

کا اجارہ ہوتی ہے، جب کہ اسلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ چیز کبھی یوں نہیں رہی۔ اسلامی قانون کا یہ اصول ہے کہ عدالت کو حکومت سے آزاد رہنا چاہیے۔ یہ اصول مغرب میں بھی قبول کر لیا گیا ہے اور ہمارے ہاں بھی برقرار اور جاری ہے۔ اسی طرح عہد نبوی کے بعد سے لے کر آج تک اسلام میں قانون سازی ایک پرائیویٹ چیز رہی ہے۔ کبھی حکومت کا اجارہ (Monopoly) نہیں رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان فقہاء پوری آزادی کے ساتھ۔ قانون کی ترقی میں مشغول رہے۔ قانون سازی صرف حکومت کی پارلیمنٹ تک محدود نہیں رہی، ورنہ اسلامی قانون کی ترقی اس طرح نہیں ہو سکتی تھی جس طرح عمل میں آئی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اسلام کا یہ اصول، قانون اور حکم ہے بلکہ اسلامی روایت (Tradition) یہ ہے کہ قانون سازی حکومت کا اجارہ نہیں، ورنہ حکومت کی سیاسی ضرورتوں کی وجہ سے قانون متاثر ہو گا۔ اگر میں وزیرِ قانون ہوں تو صدر مملکت کی ضرورت اور بعض وقت اسکی منشاء کا لحاظ کر کے مسودہ قانون پارلیمنٹ میں پیش کروں گا اور اپنے اثرات ڈال کر، کہ میں اکثریتی پارٹی یا حکومتی پارٹی کا لیڈر رہوں، اپنے ارکان کو حکم دوں گا کہ اس مسودہ قانون کے خلاف رائے نہ دو۔ اس صورت میں اکثریت کی رائے سے جو قانون بنے گا وہ سیاسی ضروریات سے متاثر ہو گا۔ اسکے برخلاف اگر مسلمان فقہاء کو حسبِ سابق آزادی رہے کہ قانون سازی وہ خود کریں یعنی احکام کے متعلق اپنے قیاس و اجتہاد کے ذریعے سے رائے دیں، تو وقتی سیاست اور حکومت کے احکام کا کوئی اثر نہیں پڑے گا، ایک شخص اپنی رائے دے گا، دوسرا شخص اس کے برعکس رائے دے گا، تیسرا شخص شاید دونوں کے بین بین رائے دے گا اور اسطرح ایک عام بحث و مباحثہ کے بعد ہم کسی بہتر نتیجے پر پہنچ سکیں گے جو ملت کے لیے، حکومت کے لیے اور ساری انسانیت کے لیے کارآمد ہو سکتا ہے۔ میرا تصور اسکے متعلق یہ ہے۔ ضروری نہیں کہ اس رائے سے آپ بھی متفق ہوں۔

**سوال نمبر 5:-** امت مسلمہ میں سے پہلا اجماع کب ہوا اور کس بات پر ہوا؟

**جواب:-** مجھے معلوم نہیں۔ پہلا اجماع غالباً عہد صحابہ میں ہوا ہو گا۔ لیکن کس مسئلے پر اور کب ہوا تھا۔ یہ کہنا دشوار ہے۔ ممکن ہے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ کے زمانے میں ہوا ہو۔ مثلاً زکوۃ نہ دینے والوں سے جنگ کے متعلق، کیونکہ یہ اولین مسئلہ تھا جس میں کچھ۔ اختلاف پیدا ہوا تھا۔ بڑے بڑے صحابہ مثلاً حضرت عمرؓ جیسے صحابی کی بھی رائے تھی کہ فی الحال اس پر اصرار نہ کیا جائے اور جو لوگ صرف زکوۃ دینے سے انکار کرتے ہیں، انھیں کافر نہ قرار دیا جائے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کو جواب دیا کہ قرآن میں صلوۃ اور زکوۃ دونوں کو ایک ہی سانس میں بیان کیا گیا ہے۔ (اقیموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ) جس طرح ایک شخص نماز پڑھنے سے انکار کرے تو میں مرتد قرار دینے پر مجبور ہوں۔ یہی

معاملہ زکوۃ کا بھی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ پہلا اجماع ہو۔ یا شاید اس امر پر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کو ایک خلیفے کی ضرورت ہے۔

**سوال نمبر6:-** کیا اجتہاد کا حق ہر شخص کو ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو ہر شخص کے اجتہادی اختلاف کی بناء پر اختلافات کی کثرت ہو جائے گی۔ اسکا حل کیا ہو سکتا ہے؟

**جواب:-** میں نے ابھی آپ سے گزارش کی کہ اجتہاد کا حق فنِ قانون اور اسلامی فقہ کے ماہرین کو ہو گا، ہر عام آدمی کو نہیں ہو گا۔ ان میں اختلاف رائے ہو تو کوئی حرج نہیں۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ کس طرف اکثریت کی رائے ہے اور کس طرف اقلیت کی رائے ہے۔ اولا فرق ثانی یعنی مخالف کی دلیل کو معلوم کرنے کے بعد ہمیں موقع ملے گا کہ اسے قبول کریں یا رد کر دیں۔ اس میں میرے نزدیک کوئی دشواری نہ پرانے زمانے میں پیدا ہوئی اور نہ آئندہ زمانے میں پیدا ہونے کا امکان ہے۔ کیونکہ اختلاف رائے کی وجہ سے فائدہ ہی فائدہ ہوتا ہے بشرطیکہ وہ اختلاف نیک نیتی سے کیا جائے، صرف اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لیے نہیں یا اس لیے نہیں کہ فلاں نے یہ بیان کیا ہے۔ لہذا میں اسکی تردید ضرور کروں۔ غالباً اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اختلاف رائے کو روکنا نہیں چاہیے۔ اسے صحیح رخ میں صحیح راستے پر لگانے کی کوشش کرنا مفید ہو گا۔

**سوال نمبر7:-** اگر ایک غیر مسلم آپ سے یہ کہے کہ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ براہ کرم آپ مجھے وہ فرقہ بتا دیں جس کے عقائد و نظریات پر عمل پیرا ہو کر وہ صحیح مسلمان بن سکے گا۔ نیز اس بارے میں آپ ذاتی طور پر اسے کیسے مطمئن کریں گے؟ شکریہ۔

**جواب:-** میں سمجھتا ہوں کہ اسکا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی فرقے کے اندر یا مذہب کے اندر ہے تو پورے خلوص اور پورے یقین کے ساتھ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اسکا یہی مذہب ٹھیک ہے۔ لہذا اس کے پاس آنے والے طالبعلم کو بغیر اصرار کے اس پر چلانے کی کوشش کرے گا۔ میرا اپنا طرز عمل اس بارے میں کچھ مذبذب سا رہا ہے۔ پیرس میں بعض نو مسلم فرانسیسی مجھ سے پوچھتے رہے ہیں کہ ہم نے سنا ہے کہ مسلمانوں میں بہت سے فقہی مذاہب(School of Law) ہیں، حنفی شافعی، مالکی، ہم کسے اختیار کریں۔ مالکی مذہب میرا مذہب نہیں ہے۔ لیکن فرانس میں شاید اسی پچاسی (80،85) فیصد یا اس کے سے بھی زیادہ لوگ مالکی مذہب کے ہیں۔ لہذا میں ان سے کہتا ہوں کہ مالکی مذہب تمہارے ماحول کے لیے موزوں تر ہے۔ میں خود مالکی مذہب کا نہیں ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ تم اس ماحول میں جذب ہونے کے لیے مالکی مذہب کے رہو تو یہ زیادہ مناسب ہو گا۔ یہ میرا طرز عمل رہا ہے۔ اس

بارے میں آپکو اختیار ہے آپ جس طرح چاہیں عمل کریں اور ظاہر ہے کہ آپ اسی مذہب کی طرف اس نو مسلم کو بلائیں گے جو آپ کی رائے میں صحیح ہو گا۔

**سوال نمبر 8:-** اگر وہ شرعی دلیلوں میں تعارض پیدا ہو جائے تو مجتہد کو کس طرف رجوع کرنا چاہیے اور کیوں ؟

**جواب:-** یہ مجتہد خود فیصلہ کرے گا۔ میری رائے یہ ہے کہ اس کے سامنے دو دلیلیں ہوں تو اسکی رائے اسکا ذہن اور اسکا ضمیر جس چیز کی طرف مائل ہو گا۔ وہ اسی کا حکم دے گا۔ کوئی قاعدہ نہیں ہے بلکہ یہ انفرادی چیز ہو گی۔ محض سہولت ہمیشہ بہتر اور مفید چیز نہیں ہوتی۔

**سوال نمبر 9:-** مجتہد کے استنباطی احکام کے لیے کون سا طریقہ کار ہے ؟

**جواب:-** اس کے لیے آپ اصولِ فقہ کی کسی کتاب کو آسانی سے پڑھ سکتے ہیں۔ اجتہاد کی بحث میں بتایا گیا ہے کہ آدمی کو کسی مسئلے کا حکم دینے کے لیے سب سے پہلے قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ قرآن میں وہ چیز نہ ملے تو حدیث کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ حدیث میں نہ ملے تو اس سے پہلے کے جو فقہاء اور مجتہد گزرے ہیں، یعنی جہاں ان میں اجماع پایا جاتا ہے تو اسکی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اور ان میں بھی کوئی چیز نہ ملے تو ذہن سے سوچ کر ایسا حکم دینا چاہیے جو اس حکم دینے والے کی رائے میں سب سے زیادہ قابل قبول ہو۔ یعنی خدا ترسی کے ساتھ۔ اس کو حکم نکالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ نہیں کہ چونکہ فلاں صاحب مجھے بطور وکیل کے فیس دے رہے ہیں۔ لہذا ان کی مرضی کے مطابق میں قانون وضع کر دوں۔ وکیل بے شک کوشش کرے گا کہ اسکا مؤکل مقدمہ جیت جائے۔ لیکن اگر اس سے اس کی پرائیویٹ حیثیت سے کوئی سوال کیا جائے وہ ایسا نہیں کرتا۔ وہ ایسی چیز پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جو اس کی رائے میں حق کے مطابق ہے اور خدا کی قبولیت کا امکان رکھتی ہے۔

**سوال نمبر 10:-** امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ حدیث کی تدوین کے سلسلے میں ایک شہادت کو بھی قبول کرنے پر زور دیتے ہیں۔ لیکن اسلامی قانون شہادت اکثر صورتوں میں واحد شہادت کو قبول نہیں کرتا۔ یہ تضاد کیسے حل کیا گیا ہے ؟

**جواب:-** میرے خیال میں اسکا جواب یہ ہے کہ قاضی کے سامنے اگر ایک مقدمے کے فیصلے کے سلسلے میں کوئی مسئلہ آئے تو وہ گواہیاں طلب کرے گا۔ لیکن حدیثوں کا مسئلہ ہی دوسرا ہے۔ اگر ایک ثقہ راوی کے ذریعے سے کوئی حدیث ہم کو پہنچ چکی ہے یعنی

خبر واحد ہے تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اسے قبول کرو۔ مگر اس بارے میں کہ عدالت کے سامنے کوئی دعوی پیش کیا جائے تو اکثر صورتوں میں اس کی دو گواہوں کی ضرورت ہو گی لیکن بعض صورتوں میں ایک گواہی بھی کافی ہوتی ہے۔ مثلاً بچے کی پیدائش کے بارے میں صرف دائی کا بیان کہ یہ بچہ اس عورت کے بطن سے پیدا ہوا ہے کافی سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس موقع پر دوسرے لوگ موجود نہیں ہوتے۔ لیکن زنا کے مقدموں میں چار گواہوں کی ضرورت قرآن نے قرار دی ہے تو وہاں دو نہیں بلکہ چار کی ضرورت ہو گی۔ کہنا یہ ہے کہ حدیث کو قبول کرنا ایک الگ چیز ہے اور مقدمے کا فیصلہ کرتے وقت کسی گواہی کو قبول کرنا ایک دوسری چیز ہے۔ معتزلہ فرقے میں خاص کر اسکے ایک مشہور امام "نظام" کا خیال تھا کہ اس حدیث کو ہم قبول نہ کریں جسے دو راویوں کے ذریعے ہم تک نہ پہنچایا گیا ہو۔ لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ جواب مجھے معقول نظر آتا ہے کہ عہد نبوی میں ایسا نہیں کیا جاتا رہا۔ لہذا ہمیں ضرورت نہیں کہ اس قدر اصرار کریں، ورنہ نتیجہ یہ ہو گا کہ حدیثوں کی بہت بڑی تعداد سے ہم محروم ہو جائیں گے اور یہ ہمارے لئے علمی اور دینی نقصان ہو گا۔ یہ کوئی تضاد نہیں ہے جس کے حل کرنے کی ضرورت ہو۔ حدیث کو ایک راوی کی بنیاد پر قبول کیا جائے۔ لیکن دعوے کو عدالت میں دو گواہوں کی بنا پر قبول کیا جائے۔

**سوال نمبر 11:-** کیا شارع کی منشا کے بغیر یا خلاف، احکام میں تغیر کیا جا سکتا ہے؟ مثلاً جنگ قادسیہ میں سعد بن ابی وقاص کا ابو محجن ثقفی کو شراب (خمر) پر معاف کر دینا یا حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کا قبیلہ مزینہ کے ایک آدمی کی شکایت پر حاطب بن ابی بلتعہ کے غلاموں کو قطع ید کا حکم سنا کر منسوخ کر دینا۔

**جواب:-** پہلے سوال کے متعلق مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ انتہائی خصوصی حالات میں ایسا بھی عمل میں آیا ہے کہ کسی قانون کا اطلاق نہ کیا گیا ہو یا ملتوی کیا گیا ہو۔ چنانچہ جنگ قادسیہ میں ایک سپاہی نے، جسے شراب نوشی کے الزام میں درے لگانے کی بجائے عارضی طور پر قید کر دیا گیا تھا، اس قید سے عارضی مدت کے لیے چھٹی لی اور جا کر ایسی بہادری سے لڑا کہ اس جنگ کی کایا پلٹ گئی۔ اس سے مسلمانوں کو فائدہ ہوا۔ جب سعد بن ابی وقاص نے اسے کہا کہ جاؤ میں تمہیں معاف کرتا ہوں تو ابو محجن ثقفی کو بڑا دکھ ہوا۔ انھوں نے کہا کہ اگر مجھے درے لگادیے جاتے تو اللہ کے ہاں معاف ہو جاتا۔ مجھے اللہ کے سامنے جواب دہی کے لیے تیار ہونا ہے۔ میں توبہ کرتا ہوں کہ آئندہ شراب نہیں پیوں گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ سعد بن ابی وقاص کی فراست تھی کہ اس شخص کے ضمیر کو بیدار کرنا چاہیے اور وہ تدبیر یہ ہے کہ اسکو معاف کر دیا جائے۔ ممکن ہے ان صحابہ کے متعلق اور صورتوں میں بھی ایسے ہی واقعات پیش آئے ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالی کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ یہ وہ شخص ہے کہ جب وہ کسی راستے

پر چلتاہے تو شیطان کو ادھر سے گزرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ان میں اتنی بے نفسی Selflessness پیدا ہوگئی تھی کہ کبھی ذاتی خواہش کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔وہ اللہ ،رسول اور اسلام کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔چنانچہ ایک زمانے میں جب قحط پڑا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے اس زمانے میں قحط کے دوران غذائی اجناس کی چوری کرنے والے کے ہاتھ کاٹنا بالکل ہی بند کر دیا یہ انکا اجتہاد تھا۔اس بارے میں ممکن ہے کہ کسی کو منطق اور اصول کی بنا پر اختلاف ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر منطق والے صاحب اس زمانے میں بر سر اقتدار اور خلیفہ ہوتے تو وہ بھی وہی کرتے جو حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے کیا تھا۔میرا خیال ہے۔میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس جواب سے آپ کو اتفاق ہو گا یا نہیں۔

**سوال نمبر12:-** فقہ اسلامی کے ضمنی ماخذ استحسان، مصالح اور عرف کو مختصر توضیح کیجئے۔

**جواب:-** استحسان سے مراد یہ ہوتا ہے کہ فوری طور پر جو ظاہری مفہوم ذہن میں آتا ہے،اسکی جگہ اسکی عمیق تر وجہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے،اسکو استحسان کہا گیا ہے۔فوری ذہن میں آنے والی چیز پر نہیں بلکہ اس عمیق تر چیز پر عمل کرنا زیادہ بہتر ہے،یہ استحسان کہلاتا ہے۔مصالح مرسلہ بھی عملاً وہی چیز ہے۔اس چیز میں مفاد عامہ کی مصلحت پیش نظر ہوتی ہے،کہ ایسا ہے تو منطق پر عمل کرنے کی جگہ امت کی مصلحت،سہولت آسانی اور ملک میں امن وامان کو بر قرار رکھنے کی کوشش کرنا بہتر ہے،مصالح مرسلہ کہلاتے ہیں۔عرف کے معنی میں بتا چکا ہوں کہ ملک کے رسم ورواج کو کہتے ہیں۔اسے کس نے بنایا،کب بنایا ہمیں کوئی علم نہیں۔جس کو قانون نے منسوخ نہیں کیا۔وہ عرف رہتا ہے اور بر قرار رہتا ہے۔یہ عرف ہر ملک ہو گا۔چاہے ہندوستان یا پاکستان کا ہو۔عرب کے قبیلوں کا ہو،چین کا ہو،افریقہ کا ہو،جہاں بھی ہم جائیں اور کوئی نیا طرز عمل کسی چیز کے متعلق نظر آئے جو قرآن وحدیث سے نے منسوخ نہیں کیا تھا تو اسے ہم قبول کر سکیں گے۔اگر وہ ہمارے رائے میں معقول بھی ہو۔

**سوال نمبر13:-** کیا یہ درست ہے کہ عراق میں ذخیرہ حدیث بہت کم پہنچا،اس لیے امام حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے قیاس سے فقہی مسائل استنباط کیے اور اس میں اہل عجم کے مزاج کی خوب رعایت کی،اس لیے اسے قبول عام حاصل ہوا؟

**جواب:-** میں اس خیال کے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بہت ہی ابتدائی زمانے کے فقیہ ہیں۔ان کی ولادت 80ھ میں ہوئی تھی۔جو کوشش عہدِ نبوی سے اس وقت تک حدیث کو مدون کرنے کے لیے شروع ہوئی تھی،ابھی تک تکمیل کو نہیں پہنچی تھی اور جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے وہ متخصص لوگوں (Specialists) کا کام تھا۔کچھ۔لوگ حدیث سے دلچسپی رکھتے

تھے اور کچھ لوگ فقہ سے اور ابھی تک ایسی کتابیں شائع نہیں ہوئی تھیں، جیسے بخاری، مسلم، حدیث کی کتابیں ہیں انکو ایک فقیہ بھی آسانی سے حاصل کر کے پڑھے۔ اگر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فقہ کے کام کو چھوڑ کر حدیث کی تلاش میں لگ تو انھیں ساری عمر گزارنا پڑتی اور فقہ کا علم ان کی قانونی صلاحیت سے محروم ہو جاتا۔ عراق میں احادیث پہنچ چکی تھیں۔ مگر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بعض صورتوں میں حدیث نہ ہونے کی بنا پر اجتہاد کر کے ایک رائے دی۔ لیکن امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے فوراً ہی بعد یعنی پچاس ساٹھ سال کے اندر حدیث کے ذخیرے فقہاء کی دسترس میں بھی آ گئے۔ حنفی مذہب ہی کے فقہاء نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کے خلاف رائے دی اور وہ حنفی مذہب کا جز بن گئی۔ جیسا کہ میں نے آپ سے کہا کہ بہت سی صورتوں میں صاحبین کی رائے پر عمل کیا جاتا ہے، ابو حنیفہ کی رائے پر عمل نہیں کیا جاتا، لیکن اسے حنفی مذہب ہی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ایک زمانے میں فقہیوں کو حدیثوں کا علم کم تھا، لیکن انھوں نے حدیثوں سے انکار بالکل نہیں کیا تھا۔ یہ کہنا کہ یہ عجمیت اور ایرانیت کی بنا پر تھا، میری رائے میں قطعاً غلط ہے۔

سوال نمبر 14:- آپ نے فرمایا کہ قانون بدلنے والا یا تو خود قانون ساز ہو یا اس سے بالاتر شخصیت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قحط کے دور میں چوری کے لیے قطع ید کی سزا ملتوی کر دی جب کہ نہ تو وہ مقنن تھے، نہ وہ پیغمبر۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب:- میں سمجھتا ہوں انھوں نے قرآن مجید کی اس آیت (الا من اضطر) (173:2) سے استدلال کیا ہے۔ اگر اضطرار کی حالت پیدا ہو جائے تو جیسا کہ عام قاعدہ ہے کہ "الضرورات تبیح المحظورات" حالتِ اضطرار میں ممنوعات بھی مباح ہو جاتے ہیں، یا (Necessity know no Law) ضرورت کسی قانون کی پرواہ نہیں کرتی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خیال یہ تھا کہ چونکہ قحط کے زمانے میں حالت اضطرار کی کیفیت ہوتی ہے، لہٰذا اس قدر رعائت کی جائے اگر ایسا نہ کیا جاتا ممکن ہے بہت سے لوگ مر جاتے اور ان کے مرنے یعنی خود کشی کرنے کا وبال حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر پڑتا۔ ظاہر ہے ایک خدا ترس حکمران اس صورت حال کو برداشت نہیں کر سکتا۔

**سوال نمبر 15:-** اجماع سے کیا مراد ہے، اجماع امت یا اجماع علماء؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی جس حدیث سے اجماع کا ثبوت ملتا ہے۔ اس میں تو اجماع امت کے لیے فرمایا گیا ہے کیا یہ اجماع ممکن ہے؟ کیونکہ مسلمان دنیا کے مختلف ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس صورت میں کون سا اجماع قانون بن سکے گا، اجماع اہلِ عراق یا اجماع اہلِ پاکستان؟

**جواب:-** میں سمجھتا ہوں کہ سوال کرنے والے دوست اگر میرے بیان سے واقف ہو چکتے جو ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے بتایا کہ اجماع کو کسطرح منظم کیا جاسکتا ہے اور کسطرح Insitutionalize کیا جاسکتا ہے، تو سوال کا ایک جزء باقی نہ رہتا ہے۔ میں اس سوال کا جواب دے چکا ہوں کہ اجماع امت اور اجماع علماء میرے نزدیک ایک ہی چیز ہیں۔ اجماع امت سے مراد یہ نہیں ہے کہ ہر ان پڑھ شخص کی بھی رائے لی جائے بلکہ اسکے معنی یہ ہیں کہ امت کے علماء کی رائے، جیسا کہ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے عرض کیا ہے کہ کسی شخص کو کسی خاص علم سے کوئی واقفیت اور لگاؤ نہیں ہے تو اسے مہم جو (Adventurer)بن کر اس علم میں دخل دینا، نہ اسکے لیے مناسب ہو گا اور نہ اس علم کے لیے سود مند ہو گا۔ لہذا اس سے مراد علماء ہی ہیں اور علماء میں بھی یہ شرط لگاؤں گا فقہاء کی، یعنی جس شخص کو علمِ قانون سے دلچسپی اور وقفیت ہے اور اس میں ایک حدتک خصوصی لگاؤ ہو اسی کو رائے دینے کا حق ہو گا۔ رائے دینے کے معنی یہ نہیں کہ رائے کو قبول بھی کیا جائے۔ وہ رائے دے گا، دوسرا شخص اس کے خلاف رائے دے گا۔ مثلاً میں نے رائے دی جو ناقص تھی، اسے آپ رد کرنے کی کوشش کی۔ اب تیسرا شخص فیصلہ کرے گا کہ میری رائے قبول کرے یا دوسرے شخص کی رائے۔ اس لیے میری رائے میں، رائے دینے میں کوئی ممانعت نہیں ہونی چاہیے بلکہ رائے قبول کرنے میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ آپ فیصلہ کریں کہ کون سی رائے امت کے لیے اور اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی صلاحیت رکھنے والی ہے اور کونسی رائے نہیں۔

السلام علیکم ورحمۃ وبرکاتہ۔

# خطبہ ۵: اسلامی قانون بین الممالک

محترم صدر! محترم وائس چانسلر اور مہمانانِ گرامی!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

"انٹرنیشنل" کے لیے عام طور پر "بین الاقوامی" کا لفظ مستعمل ہوتا ہے اس کے باوجود میں نے عمداً "بین الممالک" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اولاً میں اس کی توجیہ کردوں کہ قانون اصل میں سلطنتوں کے آپس کے تعلقات کے متعلق ہوتا ہے، حالتِ جنگ میں بھی اور حالتِ امن میں بھی سلطنت کے باشندوں کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یعنی دو قوموں کے تعلقات سے اس میں بحث نہیں ہوتی بلکہ دو مملکتوں کے معاملات و مفادات سے بحث ہوتی ہے اس لیے میں اردو میں "بین الممالک" کی اصطلاح کو "بین الاقوامی" پر ترجیح دیتا ہوں۔ آج کل اس کے لیے "بین الملل" کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔ جو اسی غلط فہمی پر مبنی ہے کیونکہ ملت کے معنی قوم کے ہیں، سلطنت کے نہیں۔ لیکن کبھی کبھی عربی میں "بین الدول" کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو میرے نزدیک زیادہ صحیح ہے۔ یہاں "دولت" مملکت کے معنی میں ہیں۔ اس مختصر توجیہ کے بعد اصل موضوع پر کچھ عرض کرتا ہوں۔

جس طرح کل کے موضوع کے ضمن میں، میں نے عرض کیا تھا کہ اصول فقہ ایسی چیز ہے جس پر مسلمان فخر کرسکتے ہیں، اسی طرح آج کا موضوع یعنی قانون بین الممالک بھی ایک ایسا علم ہے جو مسلمانوں کا ہی مرہونِ منت ہے اور مسلمانوں نے ہی سب سے پہلے اس کو وجود بخشا۔ یہ ذرا عجیب سا دعویٰ ہے اس لیے کہ جب اس قانون کا تعلق دوخود مختار سلطنتوں کے باہمی تعلقات سے ہے اور خود مختار سلطنتیں آج سے نہیں بلکہ ہزاروں سال سے سماج میں موجود ہیں، ان میں جنگیں بھی ہوتی رہی ہیں، ان میں آپس میں پرامن تعلقات بھی رہے ہیں اس لیے یہ کہنا کہ انٹرنیشنل لاء مسلمانوں کا مرہونِ منت ہے اور مسلمانوں نے ہی اسے وجود بخشا ہے، یہ بات

تھوڑی سی وضاحت کی محتاج ہے۔ اصل میں اگر ہم اس علم کے آغاز پر غور کریں تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس کا آغاز سلطنتوں سے نہیں بلکہ اس سے بہت پہلے کے ایک زمانے کے افراد سے ہوتا ہے۔ ہر فرد اپنی جگہ خود مختار ہے، اس لیے اس قانون کی اساس ابتداً افراد کے باہمی تعلقات پر ہونی چاہئیے۔ لیکن ہم اپنی علمی ضرورتوں کی وجہ سے اس کو افراد کے تعلقات سے نہیں ملاتے بلکہ ذرا اور بعد کے زمانے سے شروع کرتے ہیں۔ افراد کے بعد کنبوں اور خاندانوں کا زمانہ آتا ہے۔ ایک کنبے یا ایک خاندان کے تعلقات دوسرے کنبے یا خاندان سے ہو، یہ بھی ایک معنی میں انٹر نیشنل چیز بن جاتی ہے۔ جب کہ ہر کنبہ اپنی جگہ خود مختار ہو اور دوسرا کنبہ بھی مساوی خود مختاری کا حامل ہو تو ان کے کچھ باہمی تعلقات ہوتے ہیں۔ جن کے لیے قاعدوں کی ضرورت ہو گی۔ لیکن اسے بھی ہم نظر انداز کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی حیثیت اتنی اہم نہیں ہے کہ اس علم کے شایان شان ہو۔ اس کے بعد قبیلوں کا دور شروع ہوتا ہے۔ ایک قبیلے میں بہت سے خاندان ہوتے ہیں اور ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ قبیلے خود مختار رہے ہیں۔ مثلاً اسلام سے پہلے عرب میں ہر قبیلہ اتنا ہی خود مختار ہوتا تھا جتنی آج کل کی بڑی سلطنتیں ہیں۔ وہ نہ صرف حالتِ امن کے تعلقات میں بلکہ حالتِ جنگ میں بھی خود مختاری رکھتا تھا۔ ہر قبیلے کا سردار دوسرے قبیلے کے خلاف اعلان جنگ کر سکتا تھا، صلح کر سکتا تھا، معاہدے کر سکتا تھا۔ غرض وہ تمام کام سرانجام دے سکتا تھا جن کو اب ایک سلطنت یا ایک مملکت اپنی امتیازی شان سمجھتی ہے۔ لیکن کسی نہ کسی وجہ سے ہمارے اہل علم قبائلی دور کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں اور اس کا آغاز مملکت سے کرتے ہیں، چاہے وہ چھوٹی ہی کیوں نہ ہو۔ مملکت سب سے پہلے ایک شہر (City state) کی صورت میں وجود میں آئی ہے۔ غالباً فرنگی مصنفین اس کو سٹی اسٹیٹ سے اس لیے شروع کرتے ہیں کہ ایک زمانے میں یونان میں شہری مملکتیں پائی جاتی تھیں۔ ان میں آپس میں جنگیں بھی ہوتی تھیں، پر امن تعلقات بھی رہا کرتے تھے۔ بہر حال جو بھی ہوا گرچہ اسلام سے بہت پہلے یونان میں سٹی اسٹیٹ کا وجود تھا لیکن یہ صرف یونان سے مخصوص چیز نہیں ہے بلکہ دنیا کے ہر حصے میں ہمیں نظر آتی ہے، حتیٰ کہ عرب میں بھی قبل از اسلام سٹی اسٹیٹ کا وجود نظر آتا ہے۔ عرب میں قبیلے بھی تھے اور شہر بھی تھے۔ قبیلہ اور شہر کا یہ فرق گویا اسلام کے انٹر نیشنل لاء کا ایک پیشرو تھا۔ وہاں قبیلے خانہ بدوش آبادیوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ ان کے پاس کوئی بستی نہیں ہوتی تھی جہاں وہ سال کے بارہ مہینے رہیں۔ اس کے بر خلاف شہر تھے جہاں کے رہنے والے خانہ بدوشی کی زندگی نہیں گزارتے تھے۔ اس طرح عرب میں ہم کو بیک وقت شہری مملکتیں بھی ملتی ہیں اور قبیلے بھی ملتے ہیں۔ غالباً یونان میں ایک زمانے میں ایسا رہا ہو گا لیکن جس زمانے کے حالات سے مغربی مصنفین بحث کرتے ہیں۔ اس زمانے میں وہاں شہری مملکتیں تھیں، یعنی لوگ بستیوں میں آباد تھے۔ بہر حال زیر بحث علم کا آغاز اس دور سے ہوتا ہے جب انسان فرد سے گزر کر کنبے اور خاندان سے گزر کر قبیلے سے بھی گزر کر اس سے وسیع تر یونٹ یعنی شہری مملکتوں میں بسنے لگا تھا۔ میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر صرف فرد کا معاملہ فرد کے ساتھ ہو تو وہ بہت کمزور ہوتا ہے۔ چنانچہ مرد

اور عورت دو مل کر ایک کنبہ بناتے ہیں تاکہ اپنے فرائض منصبی کی تکمیل کریں اور تنہا ہونے کی بجائے دو آدمی ہوں تو اپنے کسی بھی دشمن خواہ وہ فطرت کے مظاہر ہوں، یا اپنے ہم جنس انسان ہوں یا کوئی جانور، ان سب کے مقابلے کی ان میں قوت آتی ہے۔ اس کے بعد جب افراد کو بھی محسوس ہوا کہ ہم دو آدمیوں کو دوسرے دو آدمی شکست دے سکتے ہیں جو ہم سے زیادہ طاقتور ہیں، تو انہوں نے سوچا کہ بہتر ہے کہ ہم بجائے زوجین کے (یعنی مرد اور عورت) بڑے کنبے میں رہیں تاکہ دوسرے دو افراد سے آسانی کے ساتھ مقابلہ کر سکیں۔ جس سے کنبہ وجود میں آیا۔ لیکن جب یہ دیکھا کہ کنبے بھی بہت کمزور ہیں اور ایک کنبے کا مقابلہ دوسرے کنبے سے ہو تو بعض اوقات مقابلہ نہیں کرسکتے ہیں تو کنبے سے وسیع تر دائرے یعنی قبیلے میں رہنا پسند کیا گیا۔ اجتماعیت (یا اپنی تعداد کو بڑھانے) کا یہ رجحان، انٹر نیشنل لاء اور انسانی فطرت کا ایک بنیادی پہلو ہے۔ اس لیے کنبوں سے گزر کر قبیلوں سے بھی گزر کر شہری مملکتوں میں انسان بسنے لگا۔ کیونکہ ایک شہر میں کئی قبیلے رہتے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ تنہا کسی قبیلے کے مقابلے میں اپنے آپ کو محفوظ بھی پاتا تھا اور شہر کے اطراف مثلاً فصیل وغیرہ بنا کر اپنی حفاظت کا انتظام کرتا اور زیادہ اطمینان کے ساتھ زندگی گزارتا تھا۔

قدیم یونان کی تاریخ میں شہری مملکتوں کے تعلقات کی نوعیت کچھ ایسی تھی جس کی بنا پر میں اس کو انٹر نیشنل لاء قرار دینے کے لیے آمادہ نہیں۔ یونان کے باشندے سب ایک ہی نسل کے تھے، سب ایک ہی زبان بولتے تھے، ایک ہی مذہب رکھتے تھے لیکن الگ الگ شہروں میں رہتے اور ہر شہر اپنی جگہ مطلق آزاد وخود مختار ہوتا۔ آپس میں لڑائیاں اور جنگیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ لیکن مغربی مصنفین کے بیان کے مطابق یونان کی شہری ریاستوں میں اگر کچھ معین قواعد تھے تو صرف ہم نسل یونانیوں کے ساتھ برتاؤ کے متعلق تھے۔ ایک یونانی شہر جو خود مختار مملکت کی صورت رکھتا، دوسرے یونانی شہر کے ساتھ تعلقات میں چند معین قواعد پر عمل کرتا مگر باقی ساری دنیا کے متعلق اپنی اپنی صوابدید کے سوا کوئی معین ضابطہ یا قاعدہ نہیں تھا۔ کبھی کچھ برتاؤ ہوتا اور کبھی کچھ، کوئی اس سے باز پرس کا حق نہیں رکھتا تھا، یونانی قانون بین الممالک میں خامی یہ تھی وہ صرف ایک محدود تعداد کے انسانوں سے متعلق تھا۔ باقی ساری دنیا کو وحشی قرار دے کر یونانی اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ ان کے ساتھ کسی معینہ قاعدے پر عمل کریں۔ یہ معینہ قاعدے جو ہم وطن وہم نسل لوگوں کے متعلق تھے، وہ بھی آج ہمیں وحشت کے حامل نظر آتے ہیں کہ انٹر نیشنل لاء کے آغاز میں قدیم ترین مثالیں ہم کو یونان میں ملتی ہیں، جہاں خود مختار شہری مملکتیں حالتِ امن وجنگ میں چند معینہ قواعد پر عمل کرتی تھیں۔ لیکن وہ صحیح معنوں میں انٹر نیشنل نہ تھا۔

اس کے بعد فرنگی مصنفین کے نزدیک انٹرنیشنل لاء کے ضمن میں رومی دور قابلِ ذکر ہے۔ اس دور میں شہری مملکتیں باقی نہیں رہی تھیں لیکن شہر روما جو ابتداً ایک خود مختار شہر تھا، ایک بڑی وسیع سلطنت کے پایہ تخت کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ جو یورپ کے علاوہ شمالی افریقہ اور ایشیا تک کے کچھ علاقوں پر مشتمل تھی۔ اس دور میں جنگ بھی ہوتی رہی اور پرامن تعلقات بھی ہوتے رہے لیکن میں اس دور کو بھی قانون بین الممالک کے لیے موزوں نہیں سمجھتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرنگی مصنفوں کے بیان کے مطابق، رومی سلطنت اگر جنگ یا امن کے زمانے میں معین قواعد پر عمل کرتی تو ساری دنیا کے ساتھ نہیں بلکہ صرف ان سلطنتوں کے ساتھ جن سے اس کے معاہدے رہے ہوں۔ مثلاً ایک سلطنت سے اس کے تعلقات پیدا ہوئے، دوستانہ معاہدہ ہوا اور پھر بعد میں کسی وجہ سے جنگ چھڑی تو وہ اس قابل سمجھی جاتی تھی کہ اس کے ساتھ معینہ قواعد پر عمل کیا جائے۔ باقی دنیا کے لیے کوئی قاعدہ نہیں تھا، صرف ذاتی صوابدید پر عمل ہوتا تھا۔

ایک مثال سے شاید آپ پر واضح ہو سکے کہ حقیقت کیا تھی۔ ابتدائی زمانے میں جنگ سے پہلے اعلانِ جنگ کی ضرورت سمجھی جاتی تھی اور اعلانِ جنگ کا طریقہ یہ تھا کہ فوج روانہ ہوتی، دشمن کی سرحد تک پہنچتی تو ایک پادری یا مذہبی رہنما، ایک نیزہ دشمن کی سرزمین میں گاڑتا اور یہی اعلانِ جنگ سمجھا جاتا تھا، اس کے بعد جنگ شروع ہو سکتی۔ بعد کے زمانے میں جب رومی سلطنت بہت وسیع ہو گئی تو دشمن کی سرحد تک پہنچنے میں ہفتوں لگ جاتے تھے۔ ایسے میں ان پادریوں کو شہر روما سے وہاں تک جانے میں دقت محسوس ہونے لگی۔ اس کا انہوں نے ایک حل سوچ لیا اور وہ یہ کہ شہر روما کے سرکاری خزانے میں مختلف ملکوں کی مٹی تھیلوں میں بھر کر رکھ لی گئی۔ جب اعلانِ جنگ کی ضرورت ہوتی تو اس خاص ملک کا تھیلہ نکالا جاتا اور پادری صاحب اس تھیلے میں نہایت متانت کے ساتھ اپنا نیزہ گاڑ دیتے، اس طرح کی عجیب وغریب باتیں انسانی تاریخ میں ملتی ہیں۔ لیکن اس موضوع کے سلسلے میں نہ صرف یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ہم رومی عہد کو بھی انٹرنیشنل لاء کے لیے موزوں نہیں قرار دیتے۔ ان کا قانون اگرچہ جنگ وامن کے متعلق ہی تھا لیکن وہ اسے ساری دنیا کے لیے یکساں نہیں برتتے تھے۔ انٹرنیشنل لاء کے مشہور مورخ، اوپن ہائم نے اس موضوع پر ایک ضخیم کتاب تصنیف کی ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ "رومن دور میں غیر ممالک کے ذکر یا ان کے معاملات بحث کی نہ تو ضرورت ہے اور نہ گنجائش ہے"۔ اس کی یہ رائے رومیوں کے اس دعویٰ پر مبنی ہے کہ دنیا رومیوں کا کرہ، اور رومیوں کی ملکیت ہے۔ کوئی اپنے گھر کے اندر قانون بین الممالک کا استعمال نہیں کرتا۔ لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ رومی دور میں رومی سلطنت اور اس سے تعلقات رکھنے والے ملکوں کے باہر اجنبی ممالک سے تعلقات میں انٹرنیشنل لاء کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس کے بعد یکایک ایک ہزار سال کی جست لگا کر یورپی مورخ بیان کرتے ہیں کہ انٹر نیشنل لاء چودھویں صدی عیسوی میں شروع ہوتا ہے۔ اس دوران جو اسلامی دور گزرا ہے اس کا کوئی ذکر وہاں نہیں ملتا۔ بہر حال جسے مغربی مصنفین ماڈرن انٹر نیشنل لاء کہتے ہیں، میں اس کو بھی انٹر نیشنل لاء کہنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۸۵۶ء تک معینہ قاعدوں پر یورپ میں صرف عیسائی سلطنتوں کے آپس کے تعلقات کے ضمن میں عمل کیا جاتا رہا۔ غیر عیسائی سلطنتوں کے لیے ان معینہ قواعد پر عمل کرنے کی ضورت نہیں سمجھی جاتی۔ ۱۸۵۶ء میں پہلی مرتبہ مجبوراً یورپی عیسائی سلطنتوں نے اعتراف کیا کہ اس قاعدے کا اطلاق ایک غیر عیسائی سلطنت یعنی ترکی کے ساتھ بھی ہو گا، اس کے بعد تقریباً ساٹھ ستر سال کا وقفہ پڑا اور دوسری سلطنت جس کو یورپی حکومتوں نے انٹر نیشنل لاء کے وقاعد کا اہل سمجھا وہ جاپان تھا، جب اس نے ۱۹۰۵ کی جنگ میں روس کو شکست دی۔ اس کے بعد پہلی جنگ عظیم شروع ہوتی ہے۔ اس وقت کچھ اور سلطنتوں کو بھی اس کا اہل سمجھا گیا۔ اس سلسلے میں کچھ شرطیں رکھی گئیں جن کو پورا کرنے کے بعد کسی سلطنت کو لیگ آف نیشنز کا رکن بنایا جاتا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد لیگ آف نیشنز کی بجائے "مجلس اقوام متحدہ" کا قیام عمل میں آیا۔ اس میں بھی ہر ملک کو اپنی ذاتی حیثیت سے رکن نہیں بنایا جاتا جب تک کہ کم سے کم دو ایسی سلطنتیں جو پہلے سے مجلس اقوامِ متحدہ کی ممبر ہوں، سفارش نہ کریں اور یہ اطمینان نہ دلائیں کہ یہ واقعی ایک متمدن ملک ہے، انٹر نیشل لاء پر عمل کرتا ہے اور اس کا مستحق ہے کہ اس کے ساتھ انٹر نیشنل لاء کے مطابق عمل کیا جائے۔

ان حالات میں، میں اپنے اس ابتدائی بیان کو دھراتا ہوں کہ اگر انٹر نیشنل لاء چند مخصوص قوموں کے لیے نہیں بلکہ اس کا اطلاق دنیا کے تمام ملکوں پر یکساں ہونا چاہیے تو اس قانون کا آغاز مسلمانوں سے ہوا اور شاید اب بھی مسلمانوں ہی کے ہاں وہ قانون ہے، کسی دوسرے کے پاس تا حال نہیں آیا۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ اس وقت مجلس اقوامِ متحدہ کا خود بخود یا بہ استحقاق خود ممبر بننا کسی سلطنت کے لیے ممکن نہیں ہے، جب تک دو ممبر سلطنتیں اس کی سفارش نہ کریں اور اس کی ذمہ داری نہ لیں کہ یہ واقعی ایک متمدن سلطنت ہے۔ اس کے بر عکس اسلامی قانون میں اس فرق و امتیاز کی گنجائش نہیں کہ کوئی ملک مسلمانوں کے معیار کے قواعد پر عمل کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ حتیٰ کے ہم دیکھیں گے کہ اگر کوئی دشمن ہمارے ساتھ غیر انسانی برتاؤ بھی کرے، تب بھی ہم اس کے ساتھ اپنے قواعد کے مطابق انسانیت کا برتاؤ کریں گے۔ ان حالات میں مجھے یہ کہنے مین کوئی تامل نہیں کہ قانون بین المالک، جو حقیقت میں بین المالک بھی ہو اور قانون بھی ہو مسلمانوں سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا آغاز کس طرح ہوا؟ اور چیزوں کی طرح یہ بھی رسول اکرم ﷺ کی سیرت پر مبنی ہے کیونکہ جب مکہ معظمہ میں اسلام شروع ہوا تو ابتداء میں بہت سی عملی دشواریاں تھیں کیونکہ مسلمانوں

کے پاس کوئی علیحدہ مملکت نہیں تھی۔ وہ ایک دشمن شہر یعنی مکہ ہی میں رہتے تھے اور ہم اس کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ وہ مملکت کے اندر ایک مملکت (State within a State) کی حیثیت رکھتی تھی۔ یعنی مسلمانوں کی آبادی شہر مکہ میں تو تھی، لیکن شہر مکہ کے پرانے نظام کے تحت نہیں تھی۔ شہر مکہ کا جو پرانا حاکم تھا اس کی وہ اطاعت نہیں کرتے تھے اور شہر مکہ کے جو قوانین تھے ان کی بھی وہ اطاعت نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی ہر ضرورت کے لیے اپنے سردار رسول اکرم ﷺ سے رجوع کرتے۔ ان کا اپنا علیحدہ قانون تھا، اپنی علیحدہ تنظیم تھی۔ میں یہ بھی کہتا چلوں کہ اسلام کے آغاز پر شہر مکہ واقعی ایک شہری مملکت کی حیثیت رکھتا تھا۔ قریش میں کچھ آزاد قبیلے تھے جو خانہ بدوش لوگوں پر مشتمل تھے اور قریش ہی میں کچھ اور قبیلے تھے جو شہر مکہ میں بس گئے تھے۔ ایسے شہروں کے حالات پر اب تک کم کام کیا گیا ہے، البتہ طائف اور مکہ کے متعلق بعض چیزیں تحریر ہوئی ہیں لیکن اور بھی شہر تھے، مثلاً شہر مدینہ کے حالات پر قانونی نقطہ نظر سے میری نظر سے آج تک کوئی چیز نہیں گزری۔ اس کے متعلق بہت کم ایسی چیزیں ملتی ہیں جن کا تعلق اسلام سے پہلے کے ادوار سے ہو۔

شہر مکہ میں جب اسلام کا آغاز ہوا تو مسلمانوں کی حیثیت ایک مملکت در مملکت کی تھی لیکن جب ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو وہاں چند ہی ہفتوں کے اندر مسلمانوں نے ایک مملکت قائم کر دی جس کا دستور بھی ہم تک پہنچا ہے اور یہ ایک مثال ہے اس امر کی کہ مملکت کس طرح قائم ہوتی ہے۔ پرانی سلطنتوں سے متعلق ہمیں بالکل معلوم نہیں ہوتا کہ وہاں سلطنت کس طرح قائم ہوئی؟ شہر مدینہ کے متعلق ہمیں معینہ طور پر تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ پہنچے تو دیکھا کہ اس شہر میں کئی قبیلے رہتے ہیں جن میں تقریباً ۱۲۰ سال سے آپس میں لڑائی بھڑائی کا سلسلہ جاری ہے۔ اور وہاں کوئی مرکزیت، تنظیم یا حکومت بالکل نہیں پائی جاتی۔ ایسے میں حضور ﷺ نے تجویز پیش کی کہ دفاعی وعدالتی اغراض کے لیے اہلِ مدینہ اپنے آپ کو منظم کر لیں اور اپنے لیے سردار منتخب کر لیں۔ آپ ﷺ کی اس تجویز کو مقامی باشندوں اور قبیلوں نے قبول کیا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو گا کہ رسول اللہ ﷺ کو کیوں سردار بنایا گیا؟ جبکہ مسلمان وہاں اکثریت میں نہیں تھے اور وہاں مسلمان بھی دو طرح کے تھے: مدنی مسلمان یعنی انصار اور مکی مسلمان یعنی مہاجر، ساتھ ہی ساتھ مدینہ کے مشرک بھی تھے جنہوں نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ یہودی بھی تھے اور کچھ عیسائی بھی وہاں پائے جاتے تھے۔۔ اس تنوع اور باہمی اختلاف کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کو مدینہ کا سردار منتخب کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ شہر مدینہ کے قبیلوں میں آپس میں سخت لڑائی جھگڑے تھے، اس لیے عملاً یہ ناممکن تھا کہ ان قبیلوں میں آپس میں سے کسی ایک قبیلے کے کسی شخص کو سردار منتخب کیا جائے تو دوسرے اسے قبول کر لیں۔ ب کو کیا جائے تو الف قبول نہیں کرتا، الف کو کیا

جائے توجہ قبول نہیں کرتا۔ ان حالات میں انہیں یہ مناسب معلوم ہوا کہ کسی اجنبی کو سردار بنالیں۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کو سردار منتخب کر لیا گیا اور سردار اور رعیت کے حقوق و فرائض دونوں تفصیل کے ساتھ ایک دستاویز میں لکھے گئے۔ یہی دستاویز ہے جسے ہم شہری مملکتِ مدینہ کا دستور کہہ سکتے ہیں۔ وہ دستور جو ہم تک پہنچا ہے اس میں اندرونی انتظامات کے متعلق کافی تفصیل سے احکامات دیے گئے ہیں اور مذہبی آزادی کا بھی اس میں صراحت سے ذکر ہے۔ دفاع کے انتظامات اور جنگ و صلح کے قواعد بھی اس میں درج ہیں۔ بہر حال جب یہ مملکت قائم ہو گئی تو بہت جلد مسلمانوں کو جنگوں سے دوچار ہونا پڑا۔ چنانچہ ۲ ہجری میں میدانِ بدر میں مکہ والوں کا، یعنی شہری مملکت کا، اس شہری مملکت مدینہ کے مسلمانوں سے مقابلہ ہوا۔ انٹر نیشنل لاء میں چونکہ عموماً دو ہی چیزوں سے بحث ہوتی ہے: حالتِ جنگ اور حالتِ امن میں غیروں کے ساتھ ہمارے تعلقات۔ رسول اکرم ﷺ کو حالتِ امن کے صرف چند مہینے ملے اور اس کے بعد یہ جنگ پیش آئی۔ انٹر نیشنل لاء کا دوسرا جز یعنی حالتِ جنگ کے قوانین کیا ہیں؟ رسول اللہ ﷺ کے طرزِ عمل سے ہمیں اس کی نظیریں ملنے لگتی ہیں۔ یعنی اعلانِ جنگ کیا جائے یا نہ کیا جائے؟ جنگ میں صرف بالغ مردوں کو قتل کیا جائے جو ہتھیار اٹھا کر حملہ کر سکتے ہیں یا دشمن کے ہر فرد کو، بچے کو بھی، بیمار کو بھی، عورت کو بھی، غلام کو بھی قتل کر سکتے ہیں؟ صرف میدانِ جنگ میں قتل کیا جائے یا میدانِ جنگ کے باہر بھی اسے قتل کیا جا سکتا ہے؟ اسی طرح اگر مثلاً دشمن کے آدمیوں کو ہم جنگ میں گرفتار کر لیں تو جنگی قیدیوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے؟ کیا انہیں قتل کر دیا جائے؟ یا انہیں مفت رہا کر دیا جائے، یا انہیں فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے یا انہیں تبادلہ اسیر ان کے طور پر یعنی ہمارا جو قیدی ان کے پاس ہے اس کے معاوضے میں دشمن کا قیدی جو ہمارے پاس ہے رہا کریں وغیرہ۔ اس طرح کی بیسیوں تفصیلیں جو قانونِ جنگ سے متعلق ہیں۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ کا طرزِ عمل مسلمانوں کے لیے نظیر بنتا گیا، کبھی تو قولی حدیث کے ذریعے سے اور کبھی فعلی حدیث کے ذریعے سے۔ بہر حال دونوں طریقوں سے اسلامی قانون اسلامی قانون بنتا گیا۔ اور انٹر نیشنل لاء کا اسلامی تصور وجود میں آیا۔ اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں اس کا کوئی امتیاز نہیں تھا کہ غیر مسلم اجنبی کس مذہب کا ہے، یہودی ہے، بت پرست ہے، لا مذہب ہے، اس کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔ سب کے ساتھ معینہ قواعد برتے جاتے تھے۔ مثلاً اعلانِ جنگ کی ضرورت ہے تو یہ اعلانِ جنگ اس سلطنت کے ساتھ بھی کیا جاتا تھا جس کا کوئی مذہب ہے، اس سلطنت کے ساتھ بھی کیا جاتا جو بت پرست ہے، اس سلطنت کے ساتھ بھی کیا جاتا جو کسی چیز کی قائل نہیں ہے وغیرہ۔

غرض اس طرح رسول اللہ ﷺ کی دس سالہ مدنی زندگی اسلامی انٹر نیشنل لاء کے اکثر قواعد کو معین و مدون کرنے کا باعث بنی۔ چنانچہ جب اس موضوع پر کتابیں لکھی جانے لگیں تو مسلمان مصنف حسبِ معمول پہلے قرآن کی طرف دیکھتے، اور قرآنی آیات کا

ذکر کرتے، ورنہ رسول اللہ ﷺ کے عمل کو زیرِ بحث لاتے کہ فلاں موقع پر رسول اللہ ﷺ نے یوں کہا یا کیا تھا، لہٰذا وہ اسلامی قانون ہے۔ یہ اسلامی انٹر نیشنل لاء حضور اکرم ﷺ کی مدنی زندگی کے دور سے تعلق رکھتا ہے۔ مکی زندگی طرف ہم کم ہی رجوع کر سکتے ہیں کیونکہ وہ مملکت در مملکت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس زمانے میں جنگ بھی نہیں ہوئی۔ چاہے مسلمانوں کو اذیت دہی کے سلسلے میں قتل کیا جاتا رہا ہو، لیکن جنگ نہیں ہوتی تھی۔ اس کے بعد مسلمانوں میں فقہ کی ترقی ہوئی جس کا میں نے پہلے بھی ذکر کیا تھا۔ جب مسلمان علماء فقہ پر کتابیں لکھنے لگے تو ان کا تصور مغربی تصور کے مقابلے میں بہت وسیع رہا۔ کسی بھی مغربی قانون کو زیادہ جامع بنانے کے لیے پہلے ہی دن سے اس کو دین و دنیا دونوں کا حامل بنایا اور اس میں صلوٰۃ، زکوۃ، روزہ، حج جیسی عبادتوں کا بھی ذکر کیا، تجارتی معاملات اور وراثت کا ذکر بھی کیا اور اس میں انٹر نیشنل لاء کا بھی ذکر کیا، ایک لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان فقہاء کا تصور یہ رہا کہ انٹر نیشنل لاء کوئی انٹر نیشنل چیز نہیں ہے بلکہ ہماری اپنی چیز ہے۔ ہماری چیز اس معنی میں کہ اجنبی ممالک سے، حالتِ امن یا حالتِ جنگ میں جس قاعدے پر ہم عمل کریں، وہی ہمارا انٹر نیشنل لاء ہے۔ یہ نہیں کہ اس کو اوروں کے مشورے اور رضامندی سے مدون کیا جائے اور پھر اس پر عمل کیا جائے بلکہ ان کے نزدیک اسلامی انٹر نیشنل لاء اسلامی انٹرنل لاء کا ایک جزو تھا۔ اسی لیے جب مسلمان فقہاء مجموعہ قوانین مدون کرنے لگے تو انہوں نے عبادات، معاملات، رواج اور وراثت وغیرہ کے ساتھ انٹر نیشنل لاء کا بھی ذکر ضروری سمجھا۔ اس کو بظاہر انہوں نے "سیر" کا نام دیا۔ میں بظاہر کا لفظ اس لیے استعمال کر رہا ہوں۔ کیونکہ اس وقت ہمارے پاس جو قدیم ترین فقہ کی کتاب ہے، وہ امام زید بن علی رحمتہ اللہ علیہ کی کتاب "المجموع فی الفقہ" ہے۔ امام زید رضی اللہ عنہ زیدیہ فرقہ کے بانی اور امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پوتے، اور امام زین العابدین کے بیٹے تھے، زید بن علی زین العابدین بہت بڑے عالم تھے۔ انہون نے "المجموع فی الفقہ" کے نام سے کو کتاب لکھی ہے، اس میں ایک باب انٹر نیشنل لاء سے متعلق ہے، جس کو "کتاب السیر" کا نام دیا گیا ہے۔ "سیر" جمع ہے لفظ "سیرت" کی۔ مشہور حنفی امام سرخسی نے اپنی "کتاب المبسوط" میں لکھا ہے کہ سیرت سے مراد حکمران کا وہ طرزِ عمل ہوتا ہے جو اجنبیوں سے حالت جنگ اور حالت امن میں ملحوظ رکھا جائے اور اس میں وہ اضافہ کرتے ہیں کہ غیر مملکت کے لوگ ہی نہیں ہمارے مملکت کے اندر کے باشندوں میں بھی کم از کم دو کے متعلق اس کا اطلاق ہو گا۔ ایک تو مرتدوں کے متعلق اور دوسرے باغیوں کے متعلق۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انٹر نیشنل لاء کا اسلامی تصور، اس تصور کے مقابلے میں جو آج کل مغرب میں پایا جاتا ہے زیادہ وسیع ہے۔ بہر حال امام زید بن علی نے پہلی مرتبہ "سیر" کی اصطلاح انٹر نیشنل لاء کے معنی میں استعمال کی اور اس وقت سے لے کر آج تک اس سے اختلاف نہیں کیا گیا۔ ہر مولف حنفی، شافع، مالکی، حنبلی، شیعی وغیرہ سبھی یہی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ایک واحد استثناء اور وہ بھی نامکمل استثناء اس فرقے سے متعلق ہے جسے ہم خوارج کا نام دیتے ہیں۔ اس مذہب کی فقہ کی کتاب میں، جو بڑی مشکل سے میں نے

حاصل کی، اس میں اس بات کا عنوان بجائے ''کتاب السیر'' کے ''کتاب الدماء'' یعنی خونوں کا قانون رکھا گیا ہے کیونکہ اس میں جنگ اور خون ریزی سے بحث ہوتی ہے۔ میں نے اس کی مزید تحقیق کی تو تاریخ سے معلوم ہوا کہ جو کتاب میرے پاس ہے وہ ایک ہم عصر مؤلف کی کتاب سے اخذ کی گئی ہیں اور وہ پرانا مؤلف اس کو ''سیر الدماء'' کا نام دیتا ہے۔ وہی ''سیر'' کا لفظ جو ہم استعمال کرتے ہیں وہ اس کو ''دماء'' یعنی خون کے ساتھ ملاتا ہے۔ ''سیر الدماء'' یعنی خونوں کے متعلق طرز عمل۔ لیکن حالیہ مؤلفوں نے ''سیر'' کے لفظ کو بوجھل پایا اور اسے حذف کرکے ''کتاب الدماء'' نام رکھا۔ الغرض، انٹر نیشنل لا کے متعلق قدیم ترین کتاب جو ہمیں دستیاب ہوئی ہے، وہ امام زید بن علی رحمتہ اللہ علیہ کی ہے۔ جن کی وفات ۱۲۰ ہجری میں ہوئی۔ ایک معنی میں وہ امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے استاد سمجھے جاسکتے ہیں۔ انہوں نے اموی سلطنت کے خلاف بغاوت کی لیکن ان کے ساتھیوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ آخرکار وہ گرفتار ہوئے اور انہیں ۱۲۰ ہجری میں قتل کر دیا گیا۔ امام ابو حنیفہ کی وفات ۱۵۰ھ میں ہوئی، ۱۲۰ھ اور ۱۵۰ھ کے مابین انہوں نے ایک مستقل کتاب لکھی جس کا نام "کتاب السیر" تھا۔ اس کی تاریخ دلچسپ ہے۔ امام ابو حنیفہ وہ فقیہ ہیں جنہوں نے یہ فتویٰ دیا کہ اگر ساری تدبیریں اور کوششیں ناکام ہو جائیں تو اسلامی سلطنت کے مسلمان حکمران کے خلاف بھی تلوار لے کر بغاوت کی جاسکتی ہے۔ دوسرے فقہاء اس طرح فتوی دینے سے جھجکتے تھے بلکہ امام ابو حنیفہ نے یہ فتوی دیا تو انہوں نے اس کی تردید کے لیے کتابیں لکھیں۔ بہر حال امام ابو حنیفہ کا فتویٰ اس حدیث پر مبنی ہے: من رایٰ منکم منکراً فلیغرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ و ذلك اضعف الایمان یعنی اگر کوئی کسی برائی کو دیکھے تو چاہیئے کہ اسے بزور بدل دے اور اس کی اصلاح کرے۔ اگر بزور بدلنے کا اس کے لیے امکان نہ ہو تو کم از کم زبان سے، یعنی سمجھا بجھا کر، اسے بدلنے کی کوشش کرے۔ اور اگر اس کا بھی امکان نہیں ہے تو کم از کم دل ہی میں اس کو برا سمجھے۔ اگر کوئی شخص برائی کو دیکھ کر دل میں بھی اس کو برا نہیں سمجھتا تو وہ اچھا مسلمان نہیں۔ کم از کم دل میں برا سمجھنا یہ اضعف الایمان یا ضعیف ترین ایمان ہے۔ یہ امام ابو حنیفہؒ کا استدلال تھا۔ دوسرے امام جو اس کے خلاف رائے رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ بغاوت نہیں کرنی چاہیئے، ان کا استدلال ایک دوسری حدیث تھی۔ وہ حدیث تھی کہ اگر حکمران تمہارے ساتھ عدل کرتا ہے تو خدا کا شکر ادا کرو اور اگر تم پر ظلم کرتا ہے تو صبر کرو۔ تو ایک ہی معنی میں دو حدیثیں ملتی ہیں جن میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ سیاق وسباق جدا جدا ہے۔ امام ابو حنیفہ یہ بھی نہیں کہتے کہ ہر وقت، ہر چھوٹی بات پر، حکومت سے بغاوت کرو بلکہ وہ شرط لگاتے ہیں کہ پر امن وسائل کی ساری کوششیں رائگاں ہو جائیں تو اس وقت جائز ہے کہ حکمران کے خلاف ہتھیار اٹھائیں جائیں۔ بہر حال جس موضوع سے میں بحث کر رہا ہوں اس میں یعنی انٹر نیشنل لاء کی تاریخ میں اس کتاب کی اہمیت یہ ہے کہ جب امام امام ابو حنیفہ نے وہ کتاب لکھی تو

فوراً ایک معاصر فقیہ امام اوزاعی نے اس کی تردید میں ایک رسالہ لکھا۔ بدقسمتی سے اس وقت ہمارے پاس نہ امام ابو حنیفہ کی کتاب موجود ہے اور نہ امام اوزاعی کا رسالہ، بجز ان اقتباسات کے جو امام شافعی نے اپنی "کتاب الام" میں جمع کیے ہیں۔ اس سے نظر آتا ہے کہ کن چیزوں کے متعلق امام ابو حنیفہ کی رائے سے امام اوزاعی نے اختلاف کیا تھا۔ جب امام اوزاعی نے، جو دمشق کے فقیہ تھے، امام ابو حنیفہ جو کوفہ یعنی عراق کے فقیہ تھے، کی کتاب پر ایک رسالہ لکھا تو امام ابو حنیفہ نے مناسب نہیں سمجھا کہ خود اس کا جواب دیں۔ ان کے ایک شاگرد امام ابو یوسف نے اس کا جواب لکھا۔ یہ کتاب بھی ہمارے پاس محفوظ نہیں، لیکن امام شافعی کی "کتاب الام" میں جو اقتباسات ہیں، ان میں اس کا بھی ذکر آتا ہے۔ چنانچہ ان اقتباسات کی مدد سے ایک کتاب مرتب کی گئی جو حیدرآباد دکن میں "مجلس دائرۃ المعارف" کے اہتمام سے شائع ہو گئی ہے۔ اس کتاب سے امام ابو حنیفہ، امام اوزاعی، امام ابو یوسف اور آخر میں خود امام شافعی کے نقطہ نظر اور ان کے اعتراضات و جوابات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس طرح امام شافعی کی مذکورہ تصنیف کی بدولت ان نایاب کتابوں کا ایک بڑا نادر ذخیرہ ہمارے پاس محفوظ ہو گیا ہے اگرچہ وہ کتابیں کامل طور پر ہم تک نہیں پہنچیں۔ اس سلسلے میں ابن حجر نے اپنی کتاب "توالی التاسیس" میں جو امام شافعی کی سوانح عمری ہے، ایک جگہ لکھا ہے کہ "سیر" پر سب سے پہلے امام ابو حنیفہ نے ایک کتاب لکھی، جس کا جواب امام اوزاعی نے دیا اور اس کا جواب الجواب امام ابو یوسف نے لکھا، پھر ان پر تبصرہ امام شافعی نے اپنی "کتاب الام" میں کیا ہے، انٹرنیشنل لاء سے متعلق تالیفوں کے آغاز کی یہ سرگزشت تھی۔

انٹرنیشنل لاء کا ذکر سب سے پہلے زید بن علی کی "کتاب المجموع" میں آیا ہے، لیکن اس کتاب کا صرف ایک باب اس موضوع سے متعلق ہے۔ جیسا کہ ابن حجر نے بیان کیا۔ اس موضوع پر ایک مستقل کتاب سب سے پہلے امام ابو حنیفہ نے تصنیف کی اور وہ یقیناً اپنے معمول کے مطابق اپنے شاگردوں کو اس موضوع پر درس بھی دیتے رہے ہوں گے۔ امام ابو حنیف کے درس کا طریقہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے وہ اپنے خیالات بیان کرتے، پھر اپنے شاگردوں سے بھی بحث کرتے اور پوچھتے کہ تمھاری کیا رائے ہے؟ اس بحث کی وجہ سے مختلف پہلو واضح تر ہو جاتے تھے۔ امام ابو حنیفہ کے لیکچروں کے اقتباسات کی مدد سے ایک وسیع اور جامع کتاب لکھی جا سکتی تھی اور غالباً ایسا ہی ہوا ہو گا۔ امام ابو حنیفہ کی کتاب ہم تک ہم تک پہنچی نہیں ہے لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ بیس پچیس صفحوں کا رسالہ ہو گا۔ لیکن ان کے شاگردوں میں سے امام محمد شیبانی، امام زفر اور امام ابراہیم الفزاری کی کتابیں سینکڑوں صفحوں پر مشتمل ہیں۔ میرا خیال ہے، ممکن ہے کہ صحیح نہ ہو، کہ جب امام ابو حنیفہ اپنی کتاب کا درس دیتے رہے تو اس درس کی یادداشتیں کتابی صورتوں میں مدون ہوئیں جو بعد میں شاگردوں کی طرف منسوب ہو گئیں۔ ان میں امام الفزاری کی کتاب ایک مخطوطے کی صورت میں مراکش میں موجود ہے۔

میں نے ایک مرتبہ اس کو پڑھنے کی کوشش کی، لیکن چونکہ یہ کوفی خط میں ہے اس لیے بڑی مشکل سے صرف چند صفحے پڑھے اس کے بعد اسے التواء میں ڈال دیا۔ اب تک اس کے فوٹو میرے پاس پڑے ہوئے ہیں۔ اس کی اشاعت کی نوبت ہی نہیں آئی۔

امام محمد شیبانی نے کو امام ابو حنیفہ کے شاگردوں میں سے تھے، اس موضوع پر دو کتابیں لکھیں، کتاب الصغیر اور کتاب السیر الکبیر، کہا جاتا ہے کہ پہلے انہوں نے السیر الصغیر لکھی تو امام اوزاعی نے طنزاً کہا کہ عراق والوں کو اس موضوع پر لکھنے کی جرات کیسے ہوئی جب کہ وہ علم حدیث سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتے۔ اس پر امام محمد شیبانی نے کتاب السیر کے نام سے ایک جامع تر کتاب لکھی اور اس کا ایک ایڈیشن تیار کیا جو اتنا بڑا تھا کہ اسے جب خلیفہ ہارون الرشید کے پاس تحفہ دینے کے لیے لے جایا گیا تو گاڑی میں ڈال کر لے جانا پڑا۔ بہر حال کتاب السیر الکبیر ہمارے پاس پہنچی ہے، ایک شرح کی صورت میں۔ اس کو شرح سے الگ کر کے ہم دوبارہ مرتب کر سکتے ہیں لیکن شرح بھی بہت اچھی ہے۔ امام سرخسی نے جو پانچویں صدی ہجری کے مشہور حنفی فقیہ گزرے ہیں، اس کتاب کی شرح لکھی ہے۔ امام سرخسی کی تالیف "شرح السیر الکبیر" کے بارے میں ایک بڑی عبرتناک بات آپ سے عرض کرتا چلوں۔ امام سرخسی ایک بہت ہی ذہین، حق گو اور بے باک فقیہ تھے۔ ان کے بارے میں یہ واقعہ مشہور ہے کہ ان کو قید کر دیا گیا۔ میرے استادِ محترم، مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کی رائے یہ تھی کہ غالباً امام سرخسی کو ایک فتویٰ کی بنا پر قید کی سزا دی گئی تھی۔ ان کے زمانے میں جو قرہ خانی حکمران تھے، انہوں نے بہت سے ظالمانہ ٹیکس لگا دیے تھے۔ حکومت کی آمدنی حکمران کی فضول خرچی کے لیے کافی نہیں ہوتی تھی تو روز بروز نئے ٹیکس لگائے جاتے تھے۔ امام سرخسی نے فتویٰ دیا کہ ظالمانہ ٹیکس ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کون سا حکمران ہے جو اس گستاخی کو معاف کر سکتا ہے؟ لیکن وہ بہت بڑے فقیہ تھے اس لیے یہ جرات نہیں ہوئی کہ انہیں سزائے موت دی جائے بلکہ ان کو ایک اندھے کنویں میں قید کر دیا گیا۔ اس قید کے چودہ سال کے دوران کسی طرح انہیں حکمران یا مجلس کے مہتمم سے یہ اجازت مل گئی کہ ان کے شاگرد کنویں کی منڈیر پر آکر بیٹھیں اور استاد کے ارشادات کو نوٹ کرتے رہیں۔ مجلس کے مہتمم کی اس علم دوستی کا میں بھی ممنون ہوں، یقیناً آپ بھی ہوں گے۔ اس چودہ سال کے عرصے میں با آواز بلند املا کرانے کے ذریعے امام سرخسی نے جو کتابیں لکھی ہیں ان کی فہرست دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ جاتا ہوں۔ غالباً آپ جانتے ہوں گے کہ "کتاب المبسوط" تیس جلدوں میں چھپ چکی ہے۔ یہ پوری کتاب کنویں کے اندر سے املا کرائی گئی۔ شرح السیر الکبیر چار جلدوں کی ضخیم کتاب ہے، وہ بھی اس قید خانے میں املا کرائی گئی۔ اس طرح شرح فلاں، فلاں کوئی درجن بھر کتابیں ہیں جو اس قید خانے کی تالیف ہیں۔ خدا نے ہمیں آزادی نصیب کی ہے۔ ہمیں چاہیئے

کہ اس آزادی سے فائدہ اٹھائیں اور عالم سے سبق لیں جس نے قید خانے کے اندر، جہاں ایک بھی کتاب ان کے پاس نہیں تھی، اپنا علمی کام جاری رکھا اور علم کی وہ خدمت سرانجام دی کہ بڑے سے بڑے عالم بھی اس کے عشر عشیر پر فخر کریں۔

بہر حال ان تالیفوں میں سے ایک شرح السیر الکبیر ہے۔ یہاں ایک مسئلے کی وضاحت کر دوں کہ کیا کوئی شخص کتاب المبسوط اور شرح السیر الکبیر جیسی ضخیم کتابیں بغیر مواد سامنے موجود ہوئے املا کرا سکتا ہے؟ میری گزارش یہ ہے کہ استاد کے پاس کتابیں نہیں تھیں لیکن شاگردوں کوئی رکاوٹ نہیں تھی کہ کوئی کتاب لائیں اور پڑھیں، استاد اس کی شرح کرے۔ چنانچہ کتاب المبسوط جو تیس جلدوں میں لکھی گئی ہے وہ اصل میں کتاب الکافی کی شرح ہے۔ سات آٹھ سو صفحوں کا اس کا مخطوطہ میں نے استنبول میں دیکھا ہے۔ اسے غالباً شاگرد پڑھتے تھے۔ شاگردوں کی آواز کو کنویں کے اندر سن سکتے تھے اور اندر سے جملہ بہ جملہ اس کی شرح کرتے جاتے اور شاگرد نوٹ کرتے جاتے تھے، غرض شرح السیر الکبیر اس طرح تالیف ہوئی اور میری دانست میں آج دنیا میں اس موضوع کی قدیم ترین کتاب ہے۔ اس کے علاوہ اگر ہم امام ابراہیم الفزاری کے رسالہ کو کتاب قرار دیں تو وہ ابھی تک چھپی نہیں ہے۔ سرخسی کی شرح السرالکبیر سنہ ۱۳۳۵ھ میں حیدر آباد دکن میں شائع ہوئی تھی، لیکن بد قسمتی سے اب تک اس کا کوئی نیا مکمل ایڈیشن نہیں آیا۔ مصر میں اس کے نئے ایڈیشن کی کوشش شروع ہوئی لیکن آدھے سے بھی کم حصہ اب تک چار جلدوں میں شائع ہوا ہے، باقی حصہ میرے ان لیکچروں کے وقت تک چھپ نہیں سکا۔ اس کتاب کی اہمیت دیکھ کر یونیسکو Unesco نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا جائے، یہ کام میرے سپرد ہوا اور میں نے اس کا ترجمہ مکمل کر کے بھیج دیا، لیکن اب تک اس کی اشاعت کی بھی نوبت نہیں آئی۔ بہر حال اس ترجمہ کے سلسلے میں میرے سامنے حیدر آباد دکن دائرہ المعارف کا ایڈیشن بھی رہا اور صلاح الدین منجد کا شائع کردہ نیا ایڈیشن بھی میرے سامنے رہا۔ میں نے دیکھا وہ دونوں ناکافی ہیں۔ مجھے خوش قسمتی سے استنبول جانے کا سالہا سال تک موقع ملتا رہا اور تین تین مہینے ہر بار رہ کر وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کر موقع پاتا رہا۔ چنانچہ اس کتاب کے ترجمہ میں جہاں کہیں مجھے کوئی دشواری نظر آئی میں ان مخطوطوں کی طرف رجوع کرتا جو استنبول میں ہیں۔ ایک مخطوطہ مجھے بیروت میں بھی ملا اور ایک پیرس میں بھی ملا جو سب سے قدیم نسخہ ہے اور ان مخطوطوں کی مدد سے میں ان مقامات کا جن کا کوئی مطلب سمجھ میں نہیں آتا صحیح لفظ معلوم کر سکا اور اس طرح یہ ترجمہ مکمل ہوا۔

انٹرنیشنل لاء کی تاریخ میں، جیسا میں نے ابھی آپ سے عرض کیا، یہ کتاب جو امام محمد شیبانی نے لکھی ہے، بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ان کے ہم عصر لوگوں میں ابراہیم الفزاری جو امام ابو حنیفہ کے شاگرد تھے، انہوں نے بھی ایک کتاب لکھی۔ یہی نہیں بعض اور

ممتاز اور مشہور فقہاء نے بھی اس موضوع پر کام کیا چنانچہ امام مالک نے بھی کتاب السیر کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ بد قسمتی سے اب یہ کتاب ناپید ہے۔ ان کی کتاب المؤطا میں مشکل آدھے صفحے کا ایک باب ضرور ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ ہماری ضرورتوں کے لیے کافی نہیں۔ اسی طرح ان کے ایک اور معاصر، مشہور مورخ واقدی نے بھی "کتاب السیر" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ وہ بھی اب نایاب ہے لیکن امام شافعی کی "کتاب الدم" میں "سیر الواقدی" کے نام سے ایک بہت طویل اقتباس ہے تقریباً پچاس ساٹھ بڑی تقطیع کے صفحوں کا۔ شاید وہ واقدی کی کتاب کی نقل یا اقتباس ہو۔ اس موضوع پر ابتدائی کتابیں تھی اور آخری کتابیں بھی یہی ہیں۔ یعنی ایک خاص زمانے میں کسی خاص ضرورت سے مستقل کتابیں لکھی جانے لگیں۔ پھر اس کے بعد شاید اس کی ضرورت نہ رہی اور یکا یک یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ لیکن اس علم سے مسلمانوں کی دلچسپی بر قرار رہی، اس معنی میں فقہ کی جتنی کتابیں ابتدا سے لیکر آج تک لکھی گئیں چاہے وہ کسی بھی مذہب اور فرقے کی ہوں، حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، شیعی یا فاطمی وغیرہ، ان سارے مؤلفوں کی کتابوں میں "کتاب السیر" کا باب ضرور ملتا ہے۔ مجھے کچھ مقابلہ کرنے کا موقع ملا تاکہ یہ معلوم کروں کہ شیعہ، سنی اور فاطمی وغیرہ مؤلفوں کے خیالات میں اس موضوع سے متعلق کوئی فرق ہے یا نہیں؟ حیرت ہے کہ ان میں کوئی فرق نہیں ملتا۔ ہم عقائد کی بنا پر ضرور جھگڑیں گے، سنی شیعوں سے، شیعہ سنیوں سے، لیکن ان کی فقہ میں کوئی ایسا امتیاز نظر نہیں آتا کہ یہ شیعہ قانون ہے اور یہ سنی قانون ہے۔ سبھی اپنے آپ کو اولاً قرآن اور ثانیاً سیرت پر مبنی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے میں کیا فرق ہو گا۔ تاریخی واقعات میں چاہے ایک کا راوی فلاں اور دوسری کا راوی فلاں دوسرا اصحابی ہو لیکن جس چیز کا ذکر ہو گا اس چیز میں کوئی فرق پیدا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ گزشتہ تیرہ سو سال سے جو فقہ کی کتابیں چار دانگِ عالم میں لکھی جاتی رہیں اور مختلف مذہبوں کے مؤلفوں کے قلم سے نکلی ہیں، ہم ان مین ہر جگہ "کتاب السیر" کو پاتے ہیں۔ حتیٰ کہ جو کتاب کتابوں کا اقتباس کہی جاتی ہے، یعنی "فتاوائے عالمگیری" اس میں بھی اس پر ایک باب ہے بہت ہی دلچسپ معلومات اس سے ملتی ہیں خصوصاً اس بنا پر کہ بعض ایسی کتابیں جن سے عالم گیر بادشاہ کے زمانے میں استفادہ ممکن تھا، اب نایاب ہو گئی ہیں اور ان کے اقتباسات اس میں ملتے ہیں۔ ان کتابوں کا جو سلسلہ شروع سے جاری رہا وہ ایک معنی میں شرح اور تمثیل ہو سکتا تھا، یعنی اصولوں اصولوں کی حد تک کوئی فرق نہیں ہوتا۔ مثالیں زیادہ دی جاتی ہیں، تشریحیں اور تفصیلیں زیادہ کی جاتی ہیں۔ کہیں کہیں مجھے ایسا نظر آیا کہ بعض ممالک کی خصوصیات کی وجہ سے بعض چیزوں کا ذکر کرتے ہیں، جن کو بعض دیگر ممالک کے لوگ بیان نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر امام سرخسی اپنی کتاب میں جنگ کے دوران میں بیلوں کا ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ لوگ بیلوں پر بیٹھ کر دشمن سے جنگ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی ملک میں ہو گا جہاں بیل ہوتے ہیں۔ ورنہ اور ملکوں میں مثلاً عرب میں بیلوں کا ذکر نہیں آئے گا۔ اسی طرح مالکی مذہب کے مورخ اور مؤلف جن کا تعلق شمالی افریقہ سے ہے اورر ان کے تعلقات اسپین وغیرہ سے زیادہ قریبی رہے، اکثر

زہریلی چیزوں کا ذکر کرتے ہیں۔ یعنی تیر میں زہر شامل کیا جاتا تھا تاکہ اگر دشمن زخمی ہو تو اس کا زخم اچھا نہ ہو پائے۔ اس کا ذکر مجھے اور مقاموں کی کتابوں میں نہیں ملا۔ غالباً اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کا رواج دوسرے ملکوں میں نہیں تھا۔ اسی طرح امام سرخسی کی کتابوں میں سامان لانے اور لے جانے کے لیے گاڑیوں کا ذکر آتا ہے۔ دوسرے مؤلفوں کی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ غالباً ان کے زمانے میں جانور پر سامان لاد دیا جاتا تھا۔ گاڑی کے اندر سامان رکھ کر اس کو جانور کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچانے کا رواج ان ملکوں میں نہیں تھا۔ غرض بہت سی مخصوص معاشرتی مثالیں ہمیں ان کتابوں میں ملتی ہیں۔ یہ چند تفصیلیں انٹرنیشنل لاء کی تاریخ کے سلسلے میں، میں نے آپ سے بیان کیں۔ اب کچھ مختصراً اس کے مندرجات کا آپ سے ذکر کروں گا کہ انٹرنیشنل لاء میں کیا چیزیں بیان ہوتی ہیں۔ آج کل ہمارے زمانے میں "Public International Law" اور Private International Law دو مختلف فن اور مختلف علم سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے فقہاء کی کتابوں میں یہ امتیاز نہیں ملتا۔ ایک ہی کتاب میں دونوں علوم کے احکام بیان کرتے ہیں۔ کچھ مثالیں دے کر واضح کروں گا کہ ان دونوں علوم میں کیا فرق ہے۔ Private International Law میں ایک حکومت کے تعلقات دوسری سلطنت کی رعیت سے ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف Public International Law میں ایک حکومت کے تعلقات دوسری حکومت سے ہوتے ہیں۔ اس کی رعیت سے براہ راست تعلقات نہیں ہوتے۔ یہ بنیادی فرق ہے۔ میں آپ کو کچھ مثالیں دیتا ہوں۔ مثلاً قومیت (Nationality) کا قانون کہ ایک شخص کو کس شہریت کا حامل سمجھا جائے گا یا وہ اپنی قومیت کو بدل سکتا ہے یا نہیں؟ اگر بدل سکتا ہے تو ان احکام و قواعد کے ذریعے سے؟ اس کا ذکر پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء میں آئے گا۔ پبلک انٹرنیشنل لاء میں اس کا ذکر نہیں آئے گا۔ اس اور بھی چیزیں ہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان مؤلفوں کے تصور کے مطابق اس پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء میں مسلمانوں کے اندرونی تعقات کا ذکر بھی آجاتا ہے۔ مثلاً شیعہ اور سنی فرقوں کے تعلقات پر قانونی نقطہ نظر سے بحث ہوتی ہے۔ فرض کیجئے ایک حاکم کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوتا ہے۔ مرنے والا مذہباً شیعہ ہے اور اس کی بیوی جو وارث بنی ہے، وہ سنی ہے۔ کس قانون کے مطابق وراثت تقسیم کی جائے گی؟ اس مسئلے کا تعلق مسلمانوں کے پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء سے ہو گا۔ اسی طرح فرض کیجئے کہ ایک مسلمان فردِ رعیت نے کسی اجنبی ملک کے فردِ رعیت سے کاروبار اور تجارت وغیرہ کے سلسلے میں معاہدہ کیا۔ اجنبی ملک کا قانون حکم دیتا ہے کہ جو شخص سرکاری طور پر بالغ نہ ہو یعنی اس کی عمر اٹھارہ سال سے کم ہو تو اسے معاہدہ کرنے کا حق نہیں، اس کا کیا ہوا معاہدہ لغو سمجھا جائے گا۔ اسلامی قانون میں عمر کا تعین نہیں ہے بلکہ جسمانی بلوغ دیکھا جاتا ہے جو ممکن ہے اٹھارہ سال سے کم عمر میں ہو جائے۔ ایک مرتبہ کسی جھگڑے کی وجہ سے مقدمہ عدالت کے سامنے آتا ہے اور وکیل صاحب کہتے ہیں کہ میرے مؤکل نے جب معاہدہ کیا تھا، وہ نہ بالغ تھا، اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، لہٰذا معاہدہ کالعدم قرار دیا جائے۔ اس قسم کے

جو مسائل ہوتے ہیں ان کا تعلق پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء سے ہوتا ہے اور اس کے قواعد مقرر ہیں کہ مدعی علیہ کے قانون کے مطابق عمل کیا جائے گا، مدعی کے قانون کے لحاظ سے نہیں کیا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ اس کے برخلاف پبلک انٹرنیشنل لاء میں تین چیزوں قانونِ امن، قانونِ جنگ اور قانونِ غیر جانبداری سے بحث ہوتی ہے۔ قانونِ غیر جانبداری کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی جنگ میں ہماری حکومت مثلاً غیر جانبدار رہے تو اس کے تعلقات دونوں فریقینِ جنگ کے ساتھ کس طرح کے ہوں گے؟ یا فریقِ جنگ کے تعلقات ان ملکوں سے جو جنگ میں شریک نہیں ہیں، کس طرح کے ہوں گے؟ اس کی کچھ تفصیلیں اس باب میں ملتی ہیں۔ قانونِ امن میں زیادہ تر تین چار چیزوں سے بحث ہوتی ہے۔ Sovereignty یعنی حاکمیت یا اقتدارِ اعلیٰ سے کہ کس مملکت کو خود مختار سمجھا جائے۔ انٹرنیشنل لاء کی جدید کتابوں میں، واقعتاً خود مختار سلطنتوں کے علاوہ باغیوں کو بھی شامل کیا جاتا ہے، مگر اس وقت جب ان کی بغاوت ترقی کر کے ایک حد تک مستحکم ہو جائے اور وہ کسی علاقہ پر خود مختارانہ طور پر حکمرانی کرنے لگیں۔ اسی طرح اس میں Sovereignty کی تفصیلات ہوتی ہیں کہ کن کن چیزوں میں Sovereignty کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً فرض کیجیے کہ برٹش انڈیا میں انگریزی دور میں ایک علاقہ تھا جس پر انگریز براہ راست حکومت کرتے تھے۔ لیکن کچھ ریاستیں بھی تھیں جیسے بہاولپور، حیدر آباد اور کشمیر وغیرہ۔ آیا ان ریاستوں کو انٹرنیشنل لاء کی اغراض کے لیے مملکت تسلیم کیا جائے گا یا نہیں؟ اگر کیا جائے گا تو اس کے قواعد کیا ہوں گے؟ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اگر وہ ریاست سو فیصد خود مختار نہ ہو لیکن اسے ایک حد تک خود مختاری حاصل ہو مثلاً اسے اس کی اجازت ہو کہ اپنا ایک سفیر رکھے، چاہے ساری دنیا کی مملکتوں میں نہیں، صرف ایک ہی سلطنت میں تو بھی ہم اسے انٹرنیشنل لاء کا موضوع قرار دیں گے۔ غرض اسی طرح کی تفصیلیں اس باب میں ملتی ہیں۔ ایک دوسرا باب جائیداد (Property) کے متعلق ہے جس میں زیادہ تر فتوحات سے بحث ہوتی ہے۔ ہم ایک دوسری سلطنت کا کچھ علاقہ فتح کرلیں تو کیا وہ خود بخود ہماری سلطنت کا جزو بن جاتا ہے یا اس کے لیے کوئی رسمی کاروائی درکار ہے؟ اگر ہے تو وہ کیا ہوتی ہے؟ اسی طرح جائیداد کی فروخت کرنے کے متعلق بھی اس میں بعض دلچسپ چیزیں ملتی ہیں یعنی کبھی تو فتح کے ذریعے کسی علاقے پر قبضہ ہوتا ہے، کبھی تبادلہ علاقہ کے ذریعے سے ایک علاقہ دوسری سلطنت کو دیا جاتا ہے یا کبھی تحفہ کے طور پر۔ اس کی بہت سی مثالیں اسلامی تاریخ ہند میں ملتی ہیں۔ دو حکمرانوں میں ایک علاقہ کے متعلق جھگڑا ہوتا ہے، بالآخر اس بات پہ مصالحت ہو جاتی ہے کہ میری بیٹی کا نکاح تمہاری بیٹی سے ہو جائے تو میں جہیز میں وہ علاقہ تمہیں دے دوں گا، ہار مان کر نہیں دوں گا وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کی بہت سی چیزیں تاریخ میں پیش آتی رہی ہیں۔ جائیداد کے متعلق جو قواعد ہیں ان کا بھی اس میں ذکر کیا جاتا ہے۔

اس میں ایک اور چیز کا ذکر آتا ہے Jurisdiction: یعنی دائرہ اختیار سماعت کے متعلق کہ ایک ملک کے قواعد دوسرے ملک کی رعیت پر چلیں گے یا نہیں، اور چلیں گے تو کس حد تک چلیں گے اور کون سا قانون نافذ ہو گا؟ اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی چیز آپ کے سامنے عرض کروں۔ امام محمد شیبانی کی "السیر الکبیر" میں ایک باب بہت دلچسپ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر غیر ملک کے لوگ ہمارے ملک میں آئیں اور ہماری عدالت سے رجوع کریں تو ہمارا قاضی ان پر انہی کا قانون نافذ کرے گا۔ فرض کیجئے کہ دو ہندو پاکستان آئے۔ ان میں آپس میں جھگڑا ہوا اور وہ ہماری عدالت سے رجوع کرتے ہیں تو ہندوؤں یا ہندوستان کا قانون ان پر نافذ ہو گا، پاکستانی قانون کے مطابق عمل نہیں کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں وہ کہتے ہیں کہ ہمارے فقہاء اور ہمارے قاضیوں کو غیر ملکیوں کے قانون سے واقفیت پیدا کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ وہ غالباً عہدِ نبوی کی بعض مثالوں سے استدلال کرتے ہیں۔ مثلاً لکھا ہے کہ ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں چند یہودی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک نوجوان جوڑے کو پکڑ کر کہا کہ انہوں نے آپس میں زنا کیا، تو رسول کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ توریت میں زنا کا کیا حکم ہے؟ شروع میں انہوں نے کہا کہ ان کے منہ پر کالک لگائی جائے اور انہیں گدھے پر اس طرح سوار کرایا جائے کہ گدھے کے منہ کی طرف ان کی پیٹھ ہو۔ گدھے کی دم کی طرف ان کا منہ ہو اور انہیں سارے شہر میں ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے گھمایا جائے۔ رسولِ کریم ﷺ نے کہا، نہیں تم جھوٹ کہتے ہو! پھر کہا کہ توریت کا نسخہ لاؤ اور جب نسخہ لایا گیا تو فرمایا کہ ایک نومسلم یہودی حضرت عبد اللہ بن سلامؓ کی موجودگی میں پڑھو۔ یہودی نے پڑھنا شروع کیا۔ ایک مقام پر انگلی رکھ کر آگے بڑھ گیا۔ حضرت عبد اللہ بن سلامؓ نے کہا "یہ انگلی اٹھا کر نیچے عبارت پڑھو۔" وہاں لکھا تھا کہ زنا کی سزا رجم ہو گی۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ نے ان کو رجم کرایا۔ یہ نظیر بتاتی ہے کہ اجنبیوں پر اسلامی قانون نافذ نہیں کیا جاتا، بلکہ انہی کا قانون نافذ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ امام محمد شیبانی نے کئی صفحوں کی طویل بحث میں بتایا ہے کہ اجنبیوں پر اجنبیوں کا قانون ہماری عدالت میں کس انداز سے نافذ ہوتا ہے۔ اسی طرح انٹر نیشنل لاء کے قانون میں امن (Law of Peace) کا تعلق سفارت سے ہے۔ قدیم زمانے میں مستقل سفیر نہیں ہوتے تھے بلکہ معینہ غرض کے لیے معینہ مدت کے لیے بھیجے جاتے تھے اور کام سرانجام دینے کے بعد واپس آجاتے تھے۔ اس سلسلے میں امیر علی نے History of Saracens میں لکھا ہے کہ مستقل سفیروں کا آغاز یورپ سے دو سو سال پہلے مسلمانوں میں ہوا۔ یہ ایک دلچسپ چیز ہے۔ قانونِ جنگ میں جن مسائل پر بحث ہوتی ہے۔ وہ یہ ہیں کہ انسانوں کے متعلق قانونِ جنگ کیا ہے؟ قانون کے متعلق قانونِ جنگ کیا ہے؟ جنگ کے خاتمے پر جو معاہدہ یا صلح نامہ ہوتا ہے، اس میں کن عناصر و شرائط کا ہونا ضروری ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ مختصراً یہ کہ انٹر نیشنل برتاؤ یعنی ایک مملکت کے دوسری مملکت سے باہمی تعلق میں جن اصول و ضوابط پر عمل کیا جاتا ہے اس کا مجموعہ انٹر نیشنل لاء کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔

## سوالات و جوابات

برادران کرام! خواہران محترم! السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

کچھ سوالات جو آپ کی طرف سے آئے ہیں ان کے جوابات دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

**سوال ۱:** آپ نے فرمایا کہ بقول سید امیر علی مستقل سفیروں کا آغاز یورپ سے پہلے مسلمانوں نے تقریباً دو سو سال قبل کیا۔ یہ مسلمانوں کی کون سی حکومت کے زمانے میں ہوا؟

**جواب:** اگر آپ میرے ماخذ History of saracens کو دیکھیں تو آپ کو اس کی تفصیل مل جائے گی۔ خلاصہ یہ ہے کہ بنو عباس کے آخری دور میں مسلمانوں کی آزاد سلطنتیں قائم ہو گئی تھیں۔ اس سلسلے میں امیر علی نے لکھا کہ خلیفہ کا نمائندہ ان عملاً آزاد اسلامی مملکتوں میں ہوتا تھا اور ان عملاً آزاد مملکتوں کا ایک نمائندہ خلیفہ کے دربار میں مستقلاً رہتا تھا۔ یہ نہیں کہ کسی متعین کام کے لیے آیا اور چلا گیا ہو۔

**سوال ۲:** مکی دور میں مسلمان ریاست مکہ کی اطاعت نہیں کرتے تھے۔ اس کے لیے کیا تاریخی دلیل ہے کہ مسلمان اہلِ مکہ کے اس دستور کی اطاعت نہیں کرتے تھے جو اسلامی تعلیمات کے بھی خلاف نہیں تھا۔ کیا یہ اطاعت اولی الامر کے خلاف نہیں ہے؟ کیا اسے غیر مسلم بغاوت کا نام نہیں دے سکتے؟

**جواب:** میں نے بیان کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے والے اہلِ مکہ اپنے ہر مسئلے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ چاہے ان کا آپس میں جھگڑا ہو یا کسی چیز پر بغیر جھگڑے کے عمل کا سوال ہو۔ شہری مملکت مکہ میں دو قسم کے وزیر عدلیہ پائے جاتے تھے، ایک دیوانی مقدمات کے لیے اور ایک فوجداری مقدمات کے لیے، لیکن مسلمان ان افسروں کے پاس نہیں جاتے

تھے، غرض میرا منشاء یہ ہے کہ اس ابتدائی زمانے میں مسلمان اپنی ہر چیز کے لیے رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اس کو میں نے مملکت در مملکت کا نام دیا۔ جب مسلمان اہلِ مکہ کی مملکت کو قبول ہی نہیں کرتے تھے تو اس کے احکام کی اطاعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اولی الامر اس وقت ہوں گے جب وہ ہمارے اولی الامر ہوں گے۔ اہلِ مکہ اس کو یقیناً بغاوت سمجھتے ہوں گے اسی لیے وہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو اذیتیں بھی دیتے تھے۔ بعض کو انہوں نے قتل بھی کیا اور یہ داستان تاریخِ عالم کے المیوں میں سے ایک ہے کہ کس طرح اہلِ مکہ ہر اچھی چیز کو دیکھتے ہوئے بھی محض اپنی ہٹ دھرمی کے باعث اس کو قبول کرنے سے سالہاسال تک انکار کرتے رہے۔ لیکن الحمدللہ اس المیے کا اختتام اچھا ہوا۔ یعنی فتح مکہ کے دن ایک چھوٹا سا واقع پیش آیا جس کی وجہ سے سارے اہلِ مکہ اپنی دشمنی کو بھول کر خلوصِ دل سے اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ وہ واقعہ یہ تھا کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ نے سارے شہر میں ڈھنڈورا پٹوایا کہ شاید رسول اللہ ﷺ تم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں، ہر شخص آئے۔ چنانچہ کعبہ کی مسجد کے احاطے میں میں سب لوگ آئے اور سوچ رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں کوئی سزا سنائیں گے۔ غرض پریشانی کے عالم میں مکہ کے مفتوح لوگ وہاں آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ کعبے کی چھت پر چڑھ کر اذان دیں۔ ایک غیر مسلم نے جب کعبہ کی چھت پر سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان دیتے ہوئے سنا تو اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک دوسرے مشرک کے ساتھ کانا پھوسی کی کہ خدا کا شکر ہے میرا باپ آج زندہ نہیں ہے ورنہ وہ برداشت نہ کر سکتا کہ خدا کے گھر پر ایک کالا گدھا چڑھ کر رینگے (نعوذ باللہ)۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد حاضرین سے مخاطب ہو کر کچھ اشارۃً انہیں بتایا کہ گزشتہ بیس سال سے تم میرے ساتھ جو سلوک کرتے رہے ہو، اب اس سلسلے میں مجھ سے کیا توقع رکھتے ہوں؟ رسول اللہ ﷺ کا جواب تاریخی نقطہ نظر سے بھی قابلِ ذکر ہے، نفسیاتی نقطہ نظر سے بھی، اور اس کے نتائج بھی حیرت انگیز ہیں۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ چاہتے تو یہ حکم دیتے کہ ان سارے اہلِ مکہ کو قتل کر ڈالو۔ آپ کے پاس فوج تھی، قوت تھی اور شہر پر قبضہ ہو چکا تھا۔ اور شاید وہ اس کے مستحق بھی تھے کہ انہیں سزائے موت دی جائے۔ کم از کم یہ حکم دے سکتے تھے کہ اہلِ مکہ کی ساری جائیداد لوٹ لو کیونکہ وہ مسلمانوں کی جائیدادیں لوٹ چکے تھے۔ یہ حکم بھی دے سکتے تھے کہ ان کو غلام بنالو۔ اس کے وہ مستحق بھی تھے اور اس کا امکان بھی تھا۔ مگر خدا کے آخری پیغمبر ﷺ نے ان میں سے کچھ بھی نہیں کیا۔ آپ ﷺ کے منہ سے ایک ہی جملہ نکلا "آج کے دن تم سے کوئی بازپرس نہیں، کوئی محاسبہ نہیں، جاؤ تم سب کو رہا کیا جاتا ہے -------- لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء۔" اس پر وہی شخص جو ابھی تھوڑی دیر پہلے حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر طعن کر رہا تھا، بے اختیار یکایک اٹھا اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے حاضر ہو کر کہا "اے

محمدؐ میں عتاب بن اسید ہوں یعنی آپ ﷺ کا مشہور دشمن: اشهد لا اله الاالله و اشهد ان محمداًرسول الله۔ اس اعلانِ معافی کا نفسیاتی اثر یہ ہوا کہ عتاب بن اسید ہی نہیں، سارے شہر مکہ نے راتوں رات خوشدلی کے ساتھ اسلام قبول کیا اور پھر جب دو سال بعد آپ ﷺ کی وفات ہوئی، اور بہت سے قبیلے مرتد بھی ہوئے، تو جن لوگوں نے اسلام پر برقرار رہ کر، بغیر ہچکچائے، اسلام کی خدمت کے لیے خود کو پیش کیا ان میں سب سے آگے اسی شہر مکہ کے لوگ تھے، جسے مسلمانوں نے بزور، اور قوت کے ذریعے سے فتح کیا تھا۔ میں اس قصہ کی تکمیل کرتا ہوں کہ جب عتاب بن اسید نے کلمہ پڑھا تو رسول اللہ ﷺ کا جواب کیا تھا؟ جواب یہ تھا کہ میں تمہیں شہر مکہ کا گورنر مقرر کرتا ہوں۔ ایک سیکنڈ پہلے کے دشمن کو اسی مفتوحہ شہر کا مطلق العنان حکمران بنا کر مدینہ واپس آجاتے ہیں اور مکہ میں اپنا ایک سپاہی بھی Garrison کے طور پر نہیں چھوڑتے اور اس پر آپ کو پچھتانا بھی نہیں پڑا۔ یہ چند باتیں ہیں جو ہمیں اس سلسلے میں پیش نظر رکھنی چاہئیے۔ اسلام دیگر قسم کی دنیاوی اور مادی تحریکوں کی طرح نہیں تھا۔ وہ ربانی عنایت تھی جو انسانوں تک پہنچائی گئی اور اس پر عمل کرنے والا وہ کردار تھا جس نے تاریخِ عالم میں اپنا لاثانی نقش چھوڑا ہے۔ آج بھی جو لوگ غیر جانبداری سے مطالعہ کر سکتے ہیں وہ اس پر سر دھننے پر مجبور ہیں۔ ان حالات میں میں نہیں سمجھتا کہ مسلمانانِ مکہ کو اہلِ مکہ کی اطاعت کرنے کی ضرورت تھی، کیونکہ وہ ایک نئی آئیڈیالوجی پیش کر رہے تھے جس میں اہلِ مکہ کے لیے بھلائی تھی، بشرطیکہ وہ اسے قبول کرتے۔

**سوال ۳:** انٹرنیشنل لاء کے تاریخی ارتقاء کے سلسلے میں آپ نے یونانی اور رومی سلطنتوں کے قوانین کا ذکر کیا۔ اس سلسلے میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا قومِ سبا کے ساتھ سفارت کا ذکر قرآن پاک میں واضح طور پر ملتا ہے۔ اس ضمن میں اس کا کیا مقام ہے؟

**جواب:** یونانیوں اور رومیوں کے علاوہ اور بھی قوموں کے ذکر کی ضرورت ہے، ہندوؤں یہودیوں بلکہ ریڈ انڈین لوگوں کا ذکر بھی آسکتا ہے۔ ہمارے پاس بہت سی معلومات ہیں لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے میں ان کا ذکر نہیں کر سکا۔ یہوسدی قانون کے سلسلے میں حضرت سلیمان علیہ السلام بھی آئیں گے۔ یہودی قانون صرف وہ نہیں ہے جو حضرت موسی علیہ السلام کے زمانے میں تھا بلکہ ان کے بعد کی صدیوں میں اس میں تبدیلیاں اور اضافے بھی ہوتے رہے۔ لیکن یہودی قانون کا کم از کم موجودہ توریت کی بنا پر تاریخِ اسلام کے درخشاں ابواب سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ کتاب تثنیہ کو آپ پڑھیں، اس میں ان کے بیان کے مطابق خدا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیتا ہے کہ جب تم کسی شہر کے قریب پہنچو، اس پر قبضہ کرنے کے لیے، تو پہلے وہاں کے لوگوں کے سامنے امن پیش کرو، اگر وہ اس کو قبول کرکے اپنے دروازے کھول دیں تو تم شہر میں فاتحانہ داخل ہو جاؤ اور مفتوحہ شہر کے سارے لوگ تمہارے خراج گزار بنیں گے اور تمہارے خدمت گار رہیں گے۔ اس کے برخلاف اگر وہ مقاومت کریں اور تم بعد میں اس شہر کو تلوار کے زور پر فتح کرلو تو وہاں کے

کسی متنفس کو زندہ نہ رکھو۔ مرد، عورت، بچے، بوڑھے، گدھے، اونٹ، جانور وغیرہ ان سب کو تہ تیغ کر کے ختم کر دو۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب قانون ہے۔ اس کے بعد حضرت یوشع علیہ السلام کی کتاب توریت ہمیں ملتی ہے، وہاں بھی اسی Genocide کے قانون پر عمل کیا جاتا ہے۔ ایسی باتیں ملتی ہیں کہ یہودی فلاں شہر میں گئے اور انہوں نے وہاں کی عورتوں، بوڑھوں، دودھ پیتے بچوں اور جانوروں وغیرہ سب کو قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد حضرت اشموئیل علیہ السلام کی کتاب دیکھیے۔ اس میں بھی ہمیں یہی چیزیں ملتی ہیں۔ یہ تھا وہ قانون جو یہودیوں کے دین نے سکھایا۔ شاید اسی کا اثر ہے کہ آج بھی ہم اسرائیل میں وہ بات نہیں پاتے جو ایک متمدن قوم میں ہونی چاہیئے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام یقیناً پیغمبر تھے۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ موسیٰ علیہ السلام، یوشع علیہ السلام اور اشموئیل علیہ السلام کی طرف موجودہ توریت میں جو چیزیں منسوب ہیں وہ صحیح بھی ہیں یا نہیں۔ یقیناً یہودی تاریخ میں بھی انٹرنیشنل لاء ملتا ہے، حالتِ جنگ میں بھی اور حالتِ امن میں بھی۔ ظاہر ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا جو تعلق ملکہ بلقیس سے رہا وہ اس کی ایک مثال ہے۔ وہ حالت امن کے روابط کے سلسلے میں ورنہ جنگ دونوں میں نہیں ہوئی تھی۔

**سوال ۴:** آنجناب نے فتنہ ارتداد کے خلاف جہاد کے بارے میں پہلے اجماع ہونے کی رائے ظاہر کی تھی۔ بخاری شریف میں آنحضرت ﷺ کی وفات کے بیان میں مذکور ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ جو یہ کہے گا کہ رسول اللہ ﷺ فوت ہوگئے ہیں میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔ اس پر حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ نے خطبہ دیا اور کچھ قرآنی آیات تلاوت کیں۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسرے تمام صحابہ خاموش ہوگئے۔ کیا اس واقعہ کو صحابہ کا پہلا اجماع قرار نہیں دیا جاسکتا جو آنحضرت ﷺ کی وفات پر صحابہؓ کے مابین ہوا؟

**جواب:** میں عرض کروں گا کہ اجماع اسی وقت ہوتا ہے جب قرآن و حدیث ساکت ہوں اور جب قرآن کی آیت پیش کی جائے اور اس پر سب سر تسلیم خم کریں تو میں اسے فنی نقطہ نظر سے "اجماع" نہیں کہوں گا۔

**سوال ۵:** پاکستان میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اپنی سوسائٹی کو اسلامی رنگ دینے کے لیے اسلامی قانون ضروری ہے۔ دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ جب تک انفرادی اصلاح نہ ہو جائے، اس وقت تک اسلامی قوانین نہ پورے طور پر نافذ ہوسکتے ہیں اور نہ ہی معاشرے کو اسلامی رنگ دیا جاسکتا ہے۔ آپ کی رائے میں کون سا خیال درست ہے؟

**جواب:** اگرچہ یہ سوال آج کی تقریر سے متعلق نہیں، بہر حال میں یہ عرض کروں گا کہ اگر ہم اسلامی معاشرے کی اصلاح کے بعد اسلامی قانون نافذ کرنا چاہیں تو اس کے انتظار میں قیامت آجائے گی۔ اس لیے بیک وقت اصلاح کی کوشش بھی جاری رکھنی چاہیئے اور اسلامی قانون بھی نافذ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اسلامی قانون بہت سے لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ سزا کے خوف سے نیک بنیں۔ مثال کے طور پر ایک چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزا پر بہت سے لوگ اعتراض کرتے ہیں اور اسے وحشیانہ قرار دیتے ہیں۔ میں ان کی خدمت میں عرض کروں گا کہ اگر ہاتھ کاٹنے کی سزا نافذ کی جائے تو مملکت کے سارے باشندے بے ہاتھ والے نہیں ہو جائیں گے۔ ایک یا دو آدمیوں کا ہاتھ کٹتا ہے پھر اس سے سب لوگوں کو عبرت حاصل ہوگی اور کسی کو چوری کی جرات نہیں رہے گی۔ یہ چیز بہتر ہے کہ ایک دو آدمیوں کے ہاتھ کٹیں، پھر سارے لوگ اطمینان سے سو سکیں۔ نہ چوری کا ڈر، نہ ڈاکے کا خوف۔ یا وہ صورت جو میں نے اپنی آنکھوں سے پیرس میں دیکھی ہے کہ چور کو اپنے گھر سے بھی زیادہ آسائش سے جیل خانوں میں رکھا جاتا ہے۔ اس وجہ سے بعض کام چوروں کو ترغیب مقصود ہوتی ہے کہ بجائے محنت کر کے کمانے کے، جس سے ذرا تکلیف ہوتی ہے، سرکاری مہمان نوازی کا لطف اٹھائیں۔ بہر حال عرض کرنا یہ ہے کہ میری رائے میں نفاذ قانونِ اسلامی اور تربیتِ اسلامی دونوں کاموں کو بیک وقت ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہوا تھا۔ اس کے برخلاف عمل کیا جائے تو ہمیں قیامت تک انتظار ہی کرنا پڑے گا۔

**سوال ۶:** اسلام میں دوسری ریاست پر جارحیت کرنا جائز نہیں لیکن مدینہ کی ریاست جب مضبوط ہوگئی تو مکہ پر حملہ کرنے میں پہل کی گئی۔ اس کی کیا وجہ تھی؟

**جواب:** مکہ پر حملہ کرنے میں مسلمانوں نے پہل کی تھی، اس کا ثبوت آپ کو پیش کرنا چاہیئے غالباً آپ کو یاد ہو گا کہ حدیبیہ مقام پر ۶ھ میں مسلمانوں اور اہلِ مکہ کے درمیان صلح ہوئی تھی، اس میں شرط یہ تھی کہ فریقین ایک دوسرے پر پوشیدہ یا اعلانیہ، ظلم و تعدی کرنے سے باز رہیں گے۔ اس کے باوجود جب اہلِ مکہ کے حلیف قبیلہ بنو کنانہ اور مسلمانوں کے حلیف قبیلہ بنو خزاعہ میں جھگڑا ہوا تو اہلِ مکہ نے معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بنو کنانہ کو ہتھیار فراہم کیے، پھر چھپ کر قبیلہ بنو خزاعہ پر حملہ کیا اور مسلمانوں کو قتل بھی کیا۔ اسی صورتحال میں مسلمانانِ مدینہ سزا اور انتقام کے طور پر اہلِ مکہ پر حملہ کرتے ہیں۔ اسے جارحانہ حملہ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ ابتداء ان کی طرف سے ہوئی تھی اور جواب مسلمانوں نے دیا تھا۔ البتہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں پھر کہوں گا کہ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ایک سپہ سالار کی حیثیت سے ایسا کارنامہ سر انجام دیا جس پر آدمی آج بھی ششدر رہ جاتا ہے۔ اس زمانے میں (۱۰) دس ہزار کی فوج چھپ کر کہیں نہیں جاسکتی تھی اور رفتار اتنی سست تھی کہ مدینہ سے مکہ جاتے ہوئے اگر آج دو گھنٹے لگتے ہیں تو

اس وقت دو ہفتے لگتے تھے۔ اس کے باوجود مسلمانوں کی فوج مدینہ سے مکہ شہر کے مضافات میں پہنچ کر کیمپ ڈالتی ہے۔ اس وقت تک مکہ والوں کو کوئی اطلاع نہیں تھی۔ پھر شہر مکہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہوتا ہے تو ایک قطرہ خون بہائے بغیر۔ پھر اس کے بعد کا قصہ میں نے ابھی آپ سے بیان کیا کہ کس طرح آنحضرت ﷺ کے ایک جملے سے، کہ آج تم پر کوئی ذمہ داری باقی نہیں، جاؤ سب کو رہا کیا جاتا ہے، نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی کایا پلٹ گئی اور وہ سب کے سب راتوں رات پورے خلوص کے ساتھ مسلمان ہو گئے۔ بہر حال تاریخی واقعات کی روشنی میں فتح مکہ کو جارحانہ جنگ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

**سوال۷:** رومن لاء دنیا کے قدیم ترین قوانین میں شمار ہوتا ہے اور اس کے اثرات دنیا کی مختلف اقوام کے قوانین پر مرتب ہوئے ہوں گے۔ رومن لاء میں کچھ قانون کافی اچھے ہوں گے۔ مختصراً بتائیں کہ اسلامی قانون کس حد تک اور کن کن نمایاں شعبوں میں رومن لاء سے متاثر ہے؟

**جواب:** اگر آپ کو عربی آتی ہے تو میں عرض کروں گا کہ آپ کے کتب خانے میں ایک کتاب "هل للقانون الرومی تاثیر علی الفقه الاسلامی؟" ابھی ابھی آئی ہے، جو عربی زبان میں ہے۔ اس میں پانچ مؤلفوں کے مقالوں کا ترجمہ ہے اور ان پانچوں نے اسی موضوع سے بحث کی ہے کہ آیا اسلامی قانون پر رومی قانون کا اثر ہوا ہے یا نہیں؟ ان مؤلفوں میں سے ایک اطالوی ہے، ایک انگریز ہے، ایک فرانسیسی ہے وغیرہ وغیرہ۔ حیرت ہوتی ہے کہ پانچوں کے پانچوں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اسلامی قانون پر رومی قانون کا قطعاً کوئی اثر نہیں ہوا اور اس پر وہ بھی حیرت کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک فرانسیسی مؤلف نے اپنے مضمون کا عنوان ہی "The Mystery of the Foundation of Muslim Law" رکھا اور اس مضمون میں اپنی حیرت کا اظہار کیا ہے کہ اسلامی قانون خود بخود کیسے بن گیا؟ دوسرے الفاظ میں سب ہی تسلیم کرتے ہیں کہ اسلامی قانون پر اگر رومی قانون کا اثر ہوتا تو اس کا کوئی وسیلہ ہونا چاہیئے تھا۔ اولاً رومی قانون لاطینی زبان میں ہے لیکن موجود صدی کے نصف دوم تک عربی یا کسی اور مشرقی زبان میں، اس کے کسی ترجمے کا پتا نہیں چلتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی فتوحات کی ابتداء ہی سے قرآنی احکام کے تحت، ہر قوم کو قانونی خود مختاری دے دی تھی۔ یعنی اگر دو عیسائیوں میں جھگڑا ہوا تو قانون بھی عیسائی ہوگا، جج بھی عیسائی ہوگا، فریقین بھی عیسائی ہوں گے، غرض یہ کہ انہیں اسلامی عدالت میں آنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اگر دو مسلمانوں میں جھگڑا ہوتا تو قرآن کے مطابق فیصلہ کیا جاتا، ایک اور چیز کی طرف میں اشارہ کرتا ہوں کہ اسلامی فقہ کی کتابوں میں اور رومی قانون کی کتابوں میں سے ایک ایک کو لیجئے، اگر ایک نے دوسرے سے ماخوذ ہے تو ظاہر ہے کہ جس نے اخذ کیا ہو تو اس پر اصل ماخذ کے کچھ نہ کچھ اثرات باقی رہ جاتے ہیں۔ مگر ہمیں اسلامی قانون میں ایسی کوئی چیز

نظر نہیں آتی۔ مثلا! رومی قانون کو "یس" کا نام دیتے ہیں اور مسلمان "فقہ" کا۔ "یس" کے معنی ہیں حقوق اور فقہ کے معنی ہیں معرفت۔ مسلمانوں نے اپنے قانون کو یس یا حقوق کا نام کبھی نہیں دیا۔ اگرچہ موجودہ دور میں ترکی، ایران، مصر وغیرہ میں حقوق کی اصطلاح برتی جارہی ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے طلباء یورپ کے مختلف ملکوں مثلاً فرانس، جرمنی، برطانیہ اور اٹلی وغیرہ میں قانون پڑھتے ہیں، وہاں اس کے لیے "حقوق" کا لفظ پڑھتے ہیں۔ تو وہ اصطلاح اپنے ہاں بھی برتنے لگتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں نے اپنے قانون کو علم الحقوق نہیں کہا بلکہ اسے علم الفقہ ہی کہتے رہے۔ میں مغربی ممالک کی فہرست میں انگلستان اور امریکہ کو شامل نہیں کرتا کیونکہ انگریزی لفظ Law کے معنی حقوق کے نہیں ہیں۔ میرے ذہن میں یہاں فرانسیسی، جرمن، اطالوی زبانوں کی اصطلاح ہے، خاص کر فرانس کی علمی تاثیر ترکی، فارسی اور عربی ممالک میں بہت رہی ہے۔

دوسری چیز یہ کہ رومن لاء کی کتاب کھولیے تو اس کا پورا مواد تین اقسام پر مشتمل نظر آئے گا۔ قسم اول کا نام ہوگا "Persons" یعنی اشخاص کا قانون، پھر "Property" مال کے متعلق قانون، جب کہ تیسری قسم کو "Action" مقدمات کا نام دیا گیا ہے۔ اسلامی قانون کی کتاب کھولیے تو پہلے عبادات ملیں گی یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج۔ اس کے بعد معاملات ملیں گے۔ اس کے بعد قانونِ تعزیرات ہوگا۔ اگر رومی قانون سے اسلامی قانون متاثر ہوا ہوتا تو کم از کم ان خالص تکنیکی چیزوں میں تو اس کے اثرات باقی رہتے یعنی اسلامی قانون بھی اشخاص، مال اور مقدمات پر مبنی ہوتا لیکن ایسا بالکل نہیں ہوتا۔ پھر اس کو بھی دیکھیے کہ اسلامی قانون میں بلا استثناء حنفی مالکی، شافعی اور شیعہ وغیرہ تمام فرقوں کی کتابوں میں عبادات کا ذکر پہلے آتا ہے لیکن کسی رومی قانون کی کسی کتاب میں عبادات کا ذکر کبھی نہیں آتا۔ غرض یہ کہ اسلامی قانون پر اگر رومی قانون کا اثر پڑا ہے تو جن لوگوں کو اس کا دعویٰ ہے وہ اس کا ثبوت پیش کریں۔ ہمیں تو کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

اس سلسے میں ایک اور چیز بھی بیان کی جاسکتی ہے وہ یہ کہ جس زمانے میں مسلمانوں نے ان علاقوں کو فتح کیا جو بیزنطینی سلطنت کا حصہ تھے، اس زمانے میں وہاں پر رومی قانون نافذ ہی نہیں تھا، مختلف وجوہ سے مقامی باشندوں کو خود مختاری دے دی گئی تھی اور ان کے معاملات عدلیہ کو ان کے مذہب کے افسروں یعنی پادریوں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ جب رومی قانون کا اس علاقے میں وجود ہی نہیں تھا، جہاں مسلمانوں نے قبضہ کیا تھا، تو اس سے متاثر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک اور چیز بھی ہمارے مؤلف بیان کرتے ہیں کہ رومی قانون کی تعلیم شہر بیروت میں ہوتی تھی۔ بعض مولفوں نے کہا ہے کہ غالباً اس مدرسہ کے اثرات مسلمانوں پر پڑے ہونگے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مدرسہ اسلام سے دو سو سال پہلے بند ہو چکا تھا۔ اس زمانے میں وہاں اس کا وجود ہی نہیں تھا۔ غرض اگر اس

کتاب "ھل للقانون الرومی تاثیر علی الفقہ الاسلامی" کو پڑھیں، جو آپ کے کتب خانے میں آچکی ہے تو آپ کو وہ ساری دلیلیں مل جائیں گی جو ان مختلف مولفوں نے اپنے نظریہ کے سلسلے میں پیش کی ہیں۔

**سوال۸:** کل آپ نے ایک سوال کے جواب کے سلسلے میں فرمایا تھا کہ میرا خیال ہے کہ سب سے پہلے امت مسلمہ کا اجماع دور صدیقی میں، مانعین زکواۃ کے بارے میں ہوا حالانکہ سب سے پہلے اجماع خلافت صدیقی پر ہوا تھا۔

**جواب:** ممکن ہے آپ کا بیان صحیح ہو۔ میں نے کہا تھا کہ شاید پہلا اجماع مانعین زکوٰۃ سے جنگ کے بارے میں ہوا۔ باقی آپ کا جو بیان ہے کہ اجماع خلافت صدیقی پر ہوا، اس میں مجھے ذرا تامل ہے، آپ کو غالباً معلوم ہو گا کہ چند صحابہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کبھی بیعت نہیں کی، چند نے کچھ دیر سے کی، اور اجماع کے معنی ہیں کہ سب متفق ہوں، ایک بھی خارج نہ ہو، ورنہ اجماع نہیں ہوتا۔ غالباً آپ کو معلوم ہو گا کہ سعد بن عبادہ انصاری رضی اللہ عنہ نے کبھی بیعت نہیں کی۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلیفہ بننے کے بعد جب جنگیں شروع ہوئیں تو ایک فوج میں شریک ہو کر مدینہ سے بھی چلے اور اور ان کی وفات حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے زمانے میں اسی عدم بیعت کی حالت میں ہوئی۔ کچھ لوگ دیر سے بیعت کرتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واقعہ سے آپ سب لوگ واقف ہیں۔ ان حالات میں اس کو اجماع کہنے میں مجھے ذرا تامل ہے۔

**سوال۹:** شرعی قانون کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ اس کے ساتھ روحانی برتری اور تقدس کا تصور وابستہ ہوتا ہے۔ جو قانون موضوعہ کے ساتھ نہیں ہوتا۔ اس پر روشنی ڈالیے۔

**جواب:** میں سمجھتا ہوں کہ اس پر کوئی روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں، آپ خود جس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں وہی کافی ہے۔ اسلامی قانون پر اگر عمل کریں تو صرف حکومت کی اطاعت نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ کی بھی اطاعت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اطاعت کے معنی یہ ہیں کہ ہم کو دوزخ میں نہیں بھیجا جائے گا۔ اگرچہ غلام کو اپنے آقا کے احکام کی تعمیل پر جزا دینے یا انعام دینے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا، وہ اپنے فریضہ کو انجام دے رہا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے، بے پایاں رحمت سے، اپنے غلام کو فرائض کی انجام دہی پر جنت کا بھی وعدہ کیا ہے۔ یہ وہ پہلو ہے جو دینوی قانون میں آپ کو نظر نہیں آئے گا۔

**سوال۱۰:** ایک اسلامی حکومت بین القوامی تعلقات میں دوسری مملکت سے تجارت بھی کرتی ہے۔ آج کل سب مملکتیں اپنا کاروبار سود کی بنیاد پر چلا رہی ہیں۔ اسلامی بین الاقوامی قانون اس بارے میں کیا کہتا ہے؟

**جواب:** میں سمجھتاہوں اس میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ اگر آپ تجارت کریں تو سود کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف اگر آپ قرض لیں تو سود کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اگر مسلمان آپس میں تجارت کا انتظام کریں اور باہم سود نہ لیں اور قرض کی صورت میں زیادہ سے زیادہ مضاربت کے اصول پر عمل کریں تو ہم سود سے بچ سکتے ہیں۔ انٹر نیشنل اور غیر انٹر نیشنل لا کے باعث سود کے متعلق اسلامی احکامات بدل نہیں سکتے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اس پر عمل کرسکتے ہیں یا نہیں کرسکتے۔ جب تک ہم غلام رہے، انگریز ہم پر بڑائی مسلط کرتے رہے۔ ہم مجبور تھے، لیکن اب ہم آزاد ہیں۔ ہمارے پاس صلاحیتیں بھی ہیں، امکانات بھی ہیں جن سے مدد لے کر ہم اپنے آپ کو اس سے بچاسکتے ہیں۔

**سوال ۱۱:** مجید خدوری ایک عراقی عیسائی ہے۔ اس نے اپنی کتاب Islamic Law of Nations میں جہاد کی تعریف یوں کی ہے۔ "Jihad is a collective duty imposed upon Muslim to fight the unbeliver wherever he is." آپ نے اپنی کتاب The Muslim conduct of Islam میں Islamic Faith اور Islamic Rules میں فرق کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ: "Islamic rule is established by all Means including Jihad"

کیا اس نوعیت کا جہاد، اقوامِ متحدہ کے چارٹر سے متصادم نہیں۔ موجودہ دور میں جہاد کے قابل عمل ہونے پر اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں؟

**جواب:** مجھے یاد نہیں کہ آیا میں نے اپنی کتاب میں صرف یہ جملہ لکھا ہے۔ جہاں تک میں کہہ سکتا ہوں، اسلام نے جارحیت شروع کرنے کی اجازت نہیں دی صرف دفاعی جنگ کی اجازت ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی آیت ہے:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ [۲:۱۹۰]

یعنی ان لوگوں سے جنگ کرو، جو تم سے جنگ کرتے ہیں۔ اس کے معنی دفاعی جنگ کے ہوں گے۔ قاتلوا فی سبیل اللہ کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے جنگ کرو۔ اپنی بڑائی، برتیری یا کسی اور دنیاوی فائدے کے لیے۔ اسے جہاد کا نام دیا گیا ہے۔ باوجود جنگ شروع ہو جانے کے "تعدی اور تجاوز نہ کرو" بلکہ ایک ایسا برتاؤ ہو جو انسانیت کے لحاظ سے قابل قبول ہو۔ جب جارحانہ جنگ کی اجازت نہیں، صرف دفاعی جنگ کی اجازت ہے تو پھر پرامن بقائے باہمی (Peaceful Co-existence) کے سلسلے میں کوئی دشواری پیدا نہیں ہوتی۔ اسلام خود یہی چاہتا ہے۔ ایک چھوٹا سا نکتہ اس سلسلے میں آپ سے بیان کردوں۔ انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے

جو، نقل کفر کفر نباشد کے طور پر دہراتا ہوں۔ جو لوگ امن لاتے ہیں وہ اللہ کے بیٹے کہلاتے ہیں۔ یہاں امن لانے والے کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ لفظ "مسلم" کا ترجمہ ہے۔ اس مشہور حدیث سے آپ واقف ہوں گے: المسلم من سلم المسلمون من لسانه و یدہ یعنی مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ مسلم کے معنی ہیں امن لانے والا۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قول کا میں یہ ترجمہ کروں گا۔ کہ مسلمان ہی اللہ کے بیٹے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے اور جب اسلام خود امن پر زور دیتا ہے تو یہ کہنا کہ اسلام پر امن بقائے باہمی کے اصول کے خلاف ہے، میرے خیال میں درست نہیں ہو گا۔ باقی مجید خدوری کے اس بیان سے مجھے اتفق نہیں کہ To fight the unbeliever wherever he is جب تک اس کی تشریح نہ کی جائے اس وقت تک یہ بیان گمراہ کن ہو گا۔ البتہ یہ چیز صحیح ہے کہ اگر اعلان جنگ ہو چکا ہے تو دشمن کے لوگ جہاں بھی ہوں ہمیں ان سے جنگ کرنے کا حق ہوتا ہے۔ لیکن یہ حق ہمارے دشمن کو بھی حاصل ہوتا ہے میں سمجھتا ہوں اس قدر جواب آپ کے لیے کافی ہو گا۔

**سوال ۱۲:** صرف لینن گراڈ میں Blockade کے نتیجہ میں بارہ ملین انسان لقمہ اجل بن گئے۔ Blockade کو جنیوا کنونشن آرٹیکل نمبر 3 کے تحت ممنوع قرار دیا گیا ہے، اسلامی قانون بین الاقوام کا Blockade کے بارے میں کیا نظریہ ہے؟ کیا کوئی Indispensable commidity of life روکی جا سکتی ہے؟

**جواب:** مجھے تھوڑا سا شبہ ہے کہ بارہ ملین آدمی لینن گراڈ کے محاصرہ کے دوران میں مرے۔ غالباً پوری جنگ میں جرمنی، روس، انگلستان، سب ملکوں کے ملا کر اتنے لوگ مرے ہوں گے۔ یہ نہیں کہ بارہ ملین آدمی لینن گراڈ میں مرے ہوں۔ جہاں تک Blockade یا Siege کا تعلق ہے۔ عہد نبویؐ میں اس کی دو قسم کی مثالیں ملتی ہیں۔ ایک تو جنگ کے دوران میں دشمن کے گاؤں یا محلے کا محاصرہ کیا جائے۔ جیسے مدینہ میں بنی قینقاع کے یہودیوں، بنی نضیر اور بنی قریظہ کے یہودیوں کا مسلمانوں نے محاصرہ کیا اور وہ بھوک سے مجبور ہو کر ہتھیار ڈالتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ چیز، اس نبوی طرز عمل کی بناء پر جائز ہو گی۔ ایک دوسری مثال خیبر کی جنگ ہے۔ وہاں بھی یہی چیز نظر آتی ہے۔ مسلمان محاصرہ کرتے ہیں۔ یہود کے پاس جب تک گھر کے اندر کچھ چیزیں موجود تھیں وہ کھاتے پیتے رہے، جب مجبور ہوئے تو ہتھیار ڈال دیئے۔ ایک دوسری مثال لیجیے، یہ مکہ سے متعلق ہے۔ غالباً ۶ھ کا واقعہ ہے۔ ایک نجدی شخص ثمامہ بن اثال رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسلمان ہوتے ہیں۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے اچھے طرزِ عمل سے متاثر ہو کر مسلمان ہوتے ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں کہ اسلام لانے سے ایک منٹ پہلے میرے لیے دنیا کے بدترین شخص آپ ﷺ تھے یا پھر اب یہ کیفیت ہے کہ اب دنیا کے محبوب ترین شخص میرے لیے آپ ﷺ ہیں۔ جب انہوں نے اسلام قبول کیا تو چلتے ہوئے اعلان کیا کہ نجد کے غلوں کے انبار میں

سے مکہ والوں کو اب ایک دانہ بھی فروخت نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ اپنے وطن واپس پہنچ کر مکہ والوں اناج دینا بند کر دیا. جس کے باعث، ہمارے مورخ لکھتے ہیں، کہ مکہ میں قحط پیدا ہو گیا۔ کچھ دنوں تک جیسے تیسے بن پڑا کام چلتا رہا، پھر مکہ والوں نے یا شاید خود ابو سفیان نے تنگ آ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ تو حسنِ خلق کی تعلیم دتے ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ احسان کرو۔ اب آپ ہی کے رشتے دار بھوکے مر رہے ہیں۔ آپ کو چاہئیے کہ آپ نرمی فرمائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجا جائے کہ بر آمد کی ممانعت blockade ختم کر دیں۔ رسول اللہ ﷺ کے طرزِ عمل میں ہمیں دونوں طرح کی مثالیں ملتی ہیں۔ دشمن کو مجبور کرنے تک محاصرہ جاری رکھتے ہیں اور دشمن کو مجبور کیے بغیر کسی مصلحت سے محاصرے اٹھا لیتے ہیں، جس میں غالباً یہ مصلحت ہوتی ہے کہ دشمن متاثر ہو گا۔ اسلام کے حسنِ سلوک کے باعث وہ اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

# خطبہ ٦: دین (عقائد، عبادات، تصوف)

محترم وائس چانسلر صاحب! محترم اساتذہ کرام اور محترم مہمانان گرامی!

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ!

رسول اللہ ﷺ کی ذات محض خوش اعتقادی کے لحاظ سے نہیں، واقعاتی حیثیت سے بھی بہت ہی جامع شخصیت ہے۔اس شخصیت کی وضاحت کے لیے ایک مورخ اور سوانح نگار کو مختلف پہلوؤں کا ذکر کرنا پڑتا ہے۔آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری، تمام سابقہ پیغمبروں کے خصائل رسول اللہ ﷺ میں ملیں گے۔

اگر ہم لفظ نبی کے معنی محدود کر لیں کہ نبی دین سکھاتا ہے آپ ﷺ نے ہمیں دین کی تعلیم بھی دی ہے اور اگر اس کے وسیع معنی لیں تو وہ تمام کارنامے جو آپ ﷺ نے انجام دیے، وہ سب ہی منصب نبوت کے اجزاء یا شعبے ہوں گے۔نبوت کی تمام شاخوں یا شعبوں کا اگر ہم علیحدہ علیحدہ ذکر کرنا چاہیں تو ایک نشست میں ساری چیزوں پر روشنی ڈالنا ناممکن ہوگا۔ظاہر ہے کہ انسب کارناموں میں دین کی تعلیم ہی کو اولیت حاصل ہے، کیونکہ اسی کے لیے آپ ﷺ بعثت سے لے کر وفات تک، ساری عمر سعی فرماتے رہے۔خوش قسمتی سے ہمیں دین کے سلسلے میں ایک سہولت یہ حاصل ہے کہ خود آپ کی ہی ایک حدیث میں اس کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔یہ حدیث صحاح ستہ کی ساری کتابوں یعنی بخاری و مسلم وغیرہ میں موجود ہے۔ایک روایت میں یہ صراحت بھی آتی ہے کہ اس واقعے کا تعلق حضور ﷺ کی زندگی کے آخری دور بلکہ شاید آخری سال سے ہے۔وہ حدیث یہ ہے کہ ایک دن ایک اجنبی مسجد نبوی میں داخل ہوتا ہے، جسے کوئی نہیں پہچانتا۔اس کے جسم پر سفید براق کپڑے ہیں اور اس کے سر کے بال بے حد سیاہ ہیں۔لکھا ہے کہ

وہ شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر، آپ کے سامنے گھٹنوں سے گھٹنے ملا کر بیٹھ گیا اور پوچھا کہ اے محمد(ﷺ) ایمان کیا چیز ہے؟ حضور ﷺ نے اس کی تشریح فرمائی اس جواب پر اجنبی سائل کہتا ہے: "آپ نے بہت ٹھیک کہا" راوی کا بیان ہے کہ ہم سب لوگ حیرت زدہ تھے کہ یہ کون ہے جو سوال بھی پوچھتا ہے اور جواب کی توثیق بھی کرتا ہے۔ پھر اس کے بعد اس نے دوسرا سوال کیا کہ اسلام کیا چیز ہے؟ اس کی بھی حضور ﷺ نے تشریح فرمائی۔ اس جواب پر بھی اس نے کہا "آپ ٹھیک کہتے ہیں"۔ پھر پوچھا کہ احسان کیا چیز ہے؟ احسان کی بھی حضور ﷺ نے تشریح فرمائی۔ اس پر بھی یہی کہا کہ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اس کے بعد آخری سوال کیا کہ قیامت کب آئے گی؟ حضور ﷺ کے الفاظ یہ تھے کہ "اس بارے میں سائل سے زیادہ مجھ (ﷺ) کو کوئی علم نہیں" یعنی نہ میں جانتا ہوں نہ تم جانتے ہو، صرف خدا ہی جانتا ہے۔ اس کے بعد وہ شخص اٹھا اور باہر چلا گیا۔ حضور ﷺ نے کسی صحابیؓ سے کہا کہ دیکھو، یہ کون ہے؟ وہ اس کے پیچھے گئے اور چند لمحوں میں وواپس آ کر کہا وہ غائب ہو گیا ہے، معلوم نہیں اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ اس کے بعد جو واقعہ پیش آیا وہ مختلف روایتوں میں مختلف طریق سے بیان ہوا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے فوراً کہا۔ دوسری روایت میں ہے کہ چند دن بعد کہا کہ یہ شخص جبرئیلؑ تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے۔ جس روایت میں کئی دنوں کے بعد حضور ﷺ نے بیان فرمایا اس روایت میں اس جملے کا اضافہ بھی ہے کہ آج تک جبرئیلؑ کو پہچاننے میں مجھے دشواری پیش نہیں آئی، کہ میں نہ پہچان سکوں۔ گویا اگر جبرئیلؑ امتحان کے لیے آئیں تو یہ ضروری نہیں کہ رسول اللہ ﷺ بھی ان کو پہچان سکیں۔ بہر کیف اس حدیث میں تین چیزوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ ایمان کیا چیز ہے؟ اسلام کیا چیز ہے؟ احسان کیا چیز ہے؟ انہیں تین باتوں کو بہ الفاظِ دیگر عقائد، عبادات اور تصوف کہا جا سکتا ہے۔ بظاہر یہ موضوع غیر دلچسپ ہے کہ کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ ایمان سے کیا مراد ہے؟ اللہ کو ایک ماننا، رسول اللہ کو ایک ماننا۔ اسی طرح عبادات کے بارے میں ہم میں سے ہر ایک شخص واقف ہے کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ چار چیزیں ہم پر فرض ہیں۔ کچھ باتیں تصوف کے متعلق بھی ہر شخص کو معلوم ہیں۔ لیکن اگر ہم ان میں سے ہر چیز کے مختلف پہلوؤں کو لے کر دیگر مذاہب سے مقابلہ کریں تو اس موضوع میں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔

پہلے ایمان و عقائد کو لیجئے۔ اس کے بہت سے اجزاء اور عناصر ہیں۔ مثلاً توحید الٰہی پر ایمان، اللہ کی بھیجی کتابوں پر ایمان، اس کے رسولوں پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، آخرت اور روز جزاء پر ایمان، خیر و شر کے من جانب اللہ ہونے

پر ایمان۔اگر ہم ان عقائد کا دیگر مذاہب کے مماثل عقائد سے مقابلہ کریں تو اسلام کی امتیازی حیثیت ظاہر ہوتی ہے اور ایسے نکتے نظر آتے ہیں جن پر واقعی آدمی سر دھننے لگتا ہے۔عقائد کے سلسلے میں پہلی چیز اللہ پر ایمان ہے۔بعض ادیان اللہ کے ایک ہونے کے قائل ہیں اور اس بات کو صراحت کے ساتھ بیان بھی کرتے ہیں۔حتیٰ کہ عیسائی بھی، جن کے متعلق عام طور پر یہ تصور ہے کہ وہ تثلیث پر ایمان رکھنے کے باعث ایک نہیں بلکہ تین خداؤں کو مانتے ہیں۔اسی طرح پارسی بھی خدا کے ایک ہونے پر ایمان کا اظہار کرتے ہیں۔ہندوؤں کے ہاں بھی بعض فرقے ایسے ہیں جو توحید ربانی پر ایمان رکھتے ہیں۔اگر ہم غور سے دیکھیں تو نظر آتا ہے کہ اسلام کا نظریہ توحید، بہ نسبت اور دینوں کی تعلیم کے زیادہ معقول زیادہ سادہ اور زیادہ اچھا ہے۔مثال کے طور پر عیسائیوں کے ہاں، جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا، تثلیث کا تصور پایا جاتا ہے۔لیکن کسی عیسائی سے پوچھو اور اس سے کہو کہ تم تین خداؤں پر ایمان رکھتے ہو تو وہ تم سے لڑ پڑے گا۔ کہے گا قطعاً نہیں، ہم ایک ہی خدا کو مانتے ہیں: باپ، بیٹا اور روح القدس، یہ تینوں ایک ہی خدا کے مظہر ہیں۔میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔صرف چند اشارے کروں گا کہ ان کا یہ بیان، کہ تثلیث سے مراد توحید ہی ہے، داخلی تضاد کے باعث ناقابل قبول ہو جاتا ہے۔چنانچہ ابھی حال ہی میں کوئی سال ڈیڑھ سال کا عرصہ گزرا پیرس میں ایک عیسائی ادارے کی طرف سے مجھے دعوت ملی کہ کسی اسلامی موضوع پر لیکچر دوں اور میں اس میں اسلامی عقائد کا ذکر کروں۔ وہاں میرا تعارف کراتے ہوئے وہاں کی پروٹسٹنٹ یونیورسٹی کے ریکٹر (Rector) نے بظاہر مجھ کو سمجھانے کے لیے اصرار اور تکرار سے کہا کہ عیسائی تین خداؤں کو نہیں مانتے، ایک ہی خدا کو مانتے ہیں۔اس کے بعد میں نے اپنی تقریر شروع کی اور اس کا مجھے جواب دینا ایک لحاظ سے ضروری ہو گیا۔میں نے کہا کہ اگر عیسائی واقعی صرف ایک خدا کو مانتے ہیں تو بسر و چشم، لیکن عیسائیوں کے ہاں ایک طرف اصرار کے ساتھ یہ ادعاء ہے کہ خدا ایک ہے اور دوسری طرف ان کے ہاں آمنت باللہ کی طرح کی جو Creed پائی جاتی ہے اسی میں ایسی چیزیں بیان کی ہوتی ہیں جو اس کی تائید نہیں کرتیں بلکہ تردید کرتی ہیں۔غالباً آپ کو علم ہو گا کہ جس طرح مسلمانوں کے ہاں "آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلَآئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ " کی طرح ایک Creed پائی جاتی ہے۔اسی طرح عیسائیوں کے ہاں بھی ہے، جس کے الفاظ کم و بیش اس طرح ہوتے ہیں کہ میں خدا پر ایمان لاتا ہوں اور خدا کے اکلوتے بیٹے حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لاتا ہوں۔جن کو فلاں بادشاہ کے زمانے میں تکلیف دے کر صلیب پر مارا گیا۔پھر وہ جہنم میں گئے تین دن وہاں رہے اس کے بعد آسمان پر گئے وہاں خدا کے داہنے ہاتھ پر بیٹھے۔آئندہ زمانے میں وہ دوبارہ آئیں گے تا کہ زمین پر زندوں اور مردوں کا حساب لیں۔پھر اس کے بعد

کچھ اس طرح کے الفاظ ہوتے ہیں کہ "گوشت پوست ہی کے ساتھ ہمارا حشر ہوگا اور ابدی زندگی حاصل ہوگی" تو میں نے اشارہ کیا کہ "اگر یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ آسمان پر جانے کے بعد خدا کے داہنے ہاتھ پر بیٹھے تو کوئی شخص خود اپنے داہنے ہاتھ پر نہیں بیٹھتا۔اس کے معنی یہی ہوں گے کہ حضرت عیسیٰؑ الگ ہیں اور خدا الگ ہے۔وہ خدا کے معزز مہمان ہو سکتے ہیں کہ خدا کے داہنے ہاتھ پر بیٹھے ہیں لیکن وہ خود خدا نہیں ہو سکتے۔" اس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ عیسائیوں کے ہاں توحید کا تصور ہونے کے باوجود اظہار (Formulation) اس طرح ہوتا ہے جو قابل قبول نہیں رہتا بلکہ خود اپنی تردید کرتا ہے۔

غرض توحید کے متعلق مسلمانوں کا تصور اتنا سادہ ہے اور اس قدر پر زور ہے کہ اس طرح کی کوئی چیز دوسرے مذاہب میں نظر نہیں آتی۔ابھی میں نے پارسیوں کے مذہب کا ذکر کیا ہے۔زردشت بھی خدا کے ایک ہونے کا قائل ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہاں ثنویت یعنی دو خداؤں کا تصور بھی پیدا ہو گیا ہے۔زردشت کہتا ہے برائی کو خدا کی طرف منسوب نہیں کیا جا رہا، نہ صرف یہ کہ خدا خود برا کام نہیں کرتا بلکہ یہ بھی کہ برائی کا پیدا کرنے والا بھی خدا نہیں ہو سکتا، یہ خدا کی ذات کے منافی ہے کہ خدا جیسی پاک ہستی برائی کو پیدا کرے۔لہذا وہ کہتا ہے کہ برائی کا خالق الگ ہے اور بھلائی کا خالق الگ۔اس طرح دو الگ خالق یا خدا ہیں۔یہ نظریہ تو نیک نیتی پر مبنی ہے کیونکہ خدا کی عظمت کا احترام کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ خدا برائی پیدا نہیں کرتا لیکن سوال یہ ہے کہ دنیا میں چونکہ اکثر اوقات برائی کو غلبہ حاصل ہوتا ہے اور بھلائی کو شکست ہوتی ہے، گویا بھلائی کا خدا مغلوب ہو جائے، کیا ہم اسے خدا تسلیم کریں گے؟ علمی نقطہ نظر سے یہ دشواریاں جو اس طرح کے تصورات سے پیدا ہوتی ہیں وہ اسلامی تعلیم توحید میں بالکل نہیں، اسلامی عقیدہ توحید میں زور دیا گیا ہے کہ اللہ جل شانہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ایک طرف کامل نفی ہے، دوسری طرف استثناء کے ذریعے سے محدود بھی کر دیا گیا ہے کہ صرف یہی اللہ ہے۔یہ زور بیان کسی اور مذہب کی تعلیم میں نظر نہیں آتا۔حتی کہ یہودیوں کے ہاں بھی صرف اتنا ہے کہ خدا ایک ہے لیکن یہ زور کہ لا الہ الا اللہ (کوئی معبود نہیں بجز اللہ کے) وہ امر ہے جو یہود کی تعلیم میں بھی نہیں ملتا۔

اس کے بعد دوسرا عقیدہ فرشتوں سے متعلق ہے۔اس کو بھی اکثر مذہب قبول کرتے ہیں۔پارسی، یہودی، عیسائی اور مسلمان سب اس پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن وقت کی کمی کے سبب میں اس پر بحث نہیں کروں گا۔

اس کے بعد عقائد کا تیسرا جزو کتابیں ہیں یعنی میں اللہ تعالی کی بھیجی ہوئی کتابوں پر ایمان لاتا ہوں۔ یہ اتنا اہم کلمہ ہے کہ اس کے مماثل ہمیں کوئی چیز دوسرے مذاہب میں نظر نہیں آتی، وہ اس لیے کہ اگر یہاں یہ کہا جاتا ہے "میں کتاب پر ایمان لاتا ہوں" یعنی قرآن مجید پر تو یہ صرف ایک کتاب ہوتی لیکن ہمیں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ایک کتاب پر نہیں بلکہ خدا کی بھیجی ہوئی ساری کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔اس عقیدے میں ایک طرف فراخ دلی اور وسیع القلبی کا پہلو ہے اور دوسری طرف اسلام کے عالمگیر ہونے اور ابتداء سے لے کر قیامت تک مسلسل جاری رہنے کا تصور بھی ہے۔کیونکہ اگر ہم کتابوں پر ایمان لائیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ آدمؑ سے لے کر محمد رسول اللہ ﷺ تک جتنی بھی کتابیں آئی ہیں وہ سب مختلف لوگوں کی نہیں ہماری اپنی کتابیں ہیں۔مثلاً توریت یہودیوں کی ہی کتاب نہیں بلکہ ہماری کتاب بھی ہے۔انجیل عیسائیوں ہی کی کتاب نہیں بلکہ ہماری کتاب بھی ہے۔ ایسی تعلیم ہمیں دوسرے مذاہب میں نہیں ملتی۔ عام طور پر دوسرے مذاہب والے یہ کہتے ہیں کہ سارے مذاہب غلط ہیں، انہیں چھوڑ دو، صرف ہمارا مذہب سچا ہے۔میں بھی بطور مسلمان کے یہی کہوں گا کہ میرا دین سچا ہے لیکن دوسرے مذاہب بھی اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے سچے اور الہی مذہب ہیں، اگرچہ ان پرانے مذاہب پر عمل نہیں کرتا۔اسلامی تعلیم یہ ہے کہ خدا کی بھیجی ہوئی ساری کتابیں خدا ہی کا حکم ہیں اور اسی بنا پر ہمارے لیے قابل احترام ہیں۔ مگر اس اصول کی بنا پر کہ آخری کتاب پر عمل کرتے ہیں۔ اس سے پہلے کی کتابوں پر عمل تو نہیں کرتے لیکن ان کو تسلیم ضرور کرتے اور ان کا احترام کرتے ہیں۔اس سے پہلے ایک نفسیاتی فائدہ اور بھی ہے کہ اگر میں کسی یہودی یا کسی عیسائی کو یہ کہوں کہ تیرا مذہب جھوٹا ہے، تیری نجات کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ تو اسلام قبول کر لے، تیرے پاس جو کتابیں ہیں وہ لغو اور جلا دینے کے قابل ہیں تو اسے دکھ ہوگا اور غالبا وہ جوش غضب سے اس قدر مغلوب ہو جائے گا کہ اسلام کی حقانیت کے بارے میں میری کوئی بات سننے یا ماننے کے لیے تیار نہ ہوگا۔اس کے بر خلاف اگر میں اس سے یہ کہوں کہ تمہارا دین سچا ہے، تمہارے ہاں کی کتاب بھی سچی ہے، وہ اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی کتاب ہے اور وہی اللہ، جس نے تمہیں یہ کتاب دی، اس نے ایک آخری کتاب بھی بھیجی ہے۔تم اس کو پڑھو اور غور کر کے دیکھو کہ اس میں کیا بیان ہوا ہے۔وہ نسبتا زیادہ خوش دلی کے ساتھ اس کو پڑھنے اور غور کرنے کے لیے تیار ہو گا۔اسی طرح اللہ کے تمام رسولوں پر ایمان لانے کا جو حکم دیا گیا ہے، اس میں وہی فراخ دلی، وسیع القلبی، تحمل اور رواداری کا پہلو نظر آتا ہے۔میں نے مسند احمد بن حنبل میں ایک حدیث پڑھی ہے جو دوسری کتابوں میں بھی ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ آدمؑ سے لے کر اب

تک اللہ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی بھیجے ہیں، جن میں 315 رسول تھے۔گویا 315 صحیفے نازل ہوئے۔باقی ایک لاکھ تیئس ہزار چھ سو پچاسی پیغمبروں نے اپنے اپنے پیش رو نبی کی کتاب پر عمل جاری رکھا۔ظاہر ہے کہ سارے پیغمبر مختلف زمانوں اور دنیا کے مختلف ملکوں میں آئے ہوں گے اور ان کی زبانیں بھی مختلف رہی ہوں گی کہ وَمَآ أَرۡسَلۡنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهِ (قرآن 4:14)

پیغمبر کے منصب اور مقصد کے بارے میں بھی مختصراً کچھ عرض کر دوں تو بہتر ہو گا کیونکہ اس بارے میں مختلف مذاہب میں کچھ تھوڑا سا فرق نظر آتا ہے۔بعض مذاہب میں عقیدہ یہ ہے کہ اللہ انسان کے قالب میں جنم لیتا ہے جس شخص کے اندر اللہ حلول کر جاتا ہے اس کا ہر قول اللہ کا قول، ہر فعل اللہ کا فعل ہوتا ہے۔دوسرا تصور یہ ہے کہ اللہ اپنے کسی برگزیدہ بندے کے پاس اپنا پیغام بھیجتا ہے۔یہ پیغام اس تک مختلف طریقہ سے پہنچایا جاتا ہے۔کبھی تو اللہ کی براہ راست اس نبی کے کان تک پہنچتی ہے، جیسا کہ حضرت آدم اور حضرت موسیٰ کے متعلق ہے کہ خدا نے ان سے بات کی، کبھی یہ ہوتا ہے کہ وہ پیغام ایک فرشتہ لاتا ہے اور انسان تک پہنچاتا ہے۔فرشتے کا لفظ فارسی مصدر "فرستادن" کا اسم مفعول ہے یعنی بھیجا ہوا۔اس سے مراد وہ نوری مخلوق ہے جو اللہ کا پیغام انسان تک پہنچاتی ہے۔ان فرشتوں میں یہ خامی نہیں ہوتی کہ پیغام کا کوئی جزو بھول جائیں یا اس کے پہنچانے میں کوئی غلطی کریں۔فرشتے خدا کا جو پیغام لاتے ہیں، اس کو ہم اصطلاحاً "وحی" کہتے ہیں۔سوال یہ ہے کہ وحی کیا چیز ہے؟ جو لوگ مسلمان نہیں ہیں، اور اسلام پر اعتراض کرتے رہے ہیں، وہ وحی پر بھی اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ایک بیماری ہے۔گزشتہ صدی کا ایک مشہور مستشرق اشپرنگر برطانوی دور حکومت میں ہندوستان میں رہا تھا۔اس نے علم طب کی تعلیم حاصل کی تھی اور عربی دان بھی تھا۔ چنانچہ اس نے سیرت النبی ﷺ پر جرمن کی کتابوں میں عربی ماخذوں سے استفادہ کیا۔لیکن وحی کے متعلق اپنی ذاتی رائے پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ مرگی کی بیماری معلوم ہوتی ہے۔نزول وحی کے متعلق عربی کی کتابوں میں جو روایات اور بیانات ہیں کہ وحی آتی تو رسول اللہ ﷺ کا چہرہ سرخ ہو جاتا، آپ پسینے پسینے ہو جاتے اور سکتے کا عالم طاری ہو جاتا۔تو اشپرنگر کہتا ہے کہ یہ علامت مرگی کی ہیں۔چونکہ میں ڈاکٹر نہیں ہوں، کہہ نہیں سکتا کہ اس کا یہ بیان کس حد تک صحیح ہے بہرحال اس نے یہ اعتراض کیا ہے، لیکن اس کے متعلق اگر میں اپنی رائے ظاہر کر سکوں تو وہ یہ ہے کہ اشپرنگر نے وحی کے بارے میں اور وحی کی کیفیت سے متعلق ساری معلومات جمع نہیں کیں، بلکہ صرف چند چیزیں

لیں اور ان کی اساس پر کہا کہ یہ فلاں بیماری کی علامت ہیں۔میرے خیال میں یہ صحیح علمی اور دیانتدارانہ طریقہ نہیں ہو سکتا چنانچہ میں نے وہ حدیثیں جمع کیں جن میں وحی کے نزول کے وقت کا مشاہدہ مختلف صحابیوں سے مروی ہے۔مثلاً ایک صحابی فرماتے ہیں کہ ہم نے دیکھا فلاں دن یکایک رسول اللہ ﷺ کی حالت متغیر ہو گئی۔وحی نازل ہونے لگی اور اس وقت کی یہ کیفیت چند لمحوں میں دور ہو گئی اور رسول اللہ ﷺ اپنی معتاد بشری حالت میں آ گئے، وغیرہ وغیرہ۔ ایسی جو حدیثیں میں نے جمع کیں ان میں ایک بات غیر معمولی ہے، جس کی طرف اشپرنگر کے بیان میں کوئی اشارہ تک نہیں چہ جائیکہ وہ اس کی توجیہ یا اس سے استدلال کی کوشش کرتا۔وہ یہ ہے کہ جب وحی نازل ہوتی تو وہ تمام صحابہ جن کو اس کا مشاہدہ ہوا تھا، کہتے ہیں کہ اس وقت رسول اللہ ﷺ اتنے بوجھل ہو جاتے کہ اس بوجھ کا تحمل تقریباً ناممکن ہو جاتا۔چنانچہ اگر آپ کسی اونٹنی پر سوار ہوتے اور اس وقت وحی نازل ہونے لگتی تو اونٹنی آپ کے بوجھ کو برداشت نہ کر سکتی اور مجبور ہو جاتی کہ بیٹھ جائے۔اگر وہ بیٹھنا نہ چاہتی یا بیٹھ نہ سکتی تو اس کے پاؤں سیدھے ہو جاتے اور اکڑنے لگتے، گویا کہ وہ اب چیخ کر ٹوٹ جائیں گے۔ایک اور روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے، لوگوں کی کثرت تھی، حضرت زید بن ثابت کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا زانو میرے زانو پر تھا۔آپ پر وحی نازل ہونے لگی۔اتنا بوجھ محسوس ہوا کہ مجھے خوف ہوا کہ میری ران کی ہڈی چیخ کر ٹوٹ جائے گی۔رسول اللہ ﷺ کی ذات نہ ہوتی تو میں چیخ کر اپنا پاؤں کھینچ لیتا۔میرے لیے تقریباً ناممکن تھا کہ میں آپ کا بوجھ سہار سکوں۔جیسا کہ میں نے کہا کہ اس کی توجیہ اشپرنگر کے بیان میں اعتراض کی عبارت میں نہیں ہے۔اس کے علاوہ اور مؤلفوں نے بھی خیال آرائی کی ہے لیکن وہ بھی اس نکتے پر چپ سادھ لیتے ہیں اور اس سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔یہ بات میرے نزدیک بہت اہم اور غیر معمولی ہے۔مجھے یا آپ کو ایسی کیفیت کبھی پیش نہیں آ سکتی۔عام بشری کیفیت پر قیاس کر کے میں اس کی توجیہ کبھی نہیں کر سکوں گا کہ وحی کیا چیز ہے؟ وحی صرف پیغمبر پر آتی ہے اور پیغمبر کی بھی چوبیس گھنٹے وہ حالت نہیں رہتی بلکہ کبھی کبھی اللہ کوئی پیغام بھیجتا ہے تو اس پر وہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ایک طرف یہ چیز ہے دوسری طرف میرے ایک ڈاکٹر دوست نے مرگی کی بیماری کے متعلق علمی نقطہ نظر سے کچھ تازہ ترین معلومات مہیا کی ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ مرگی کا بیمار تشنج کی حالت میں ہوتا ہے، ہاتھ پاؤں مارتا ہے، بے قرار ہوتا ہے۔دوسرے یہ کہ اس کی زبان سے کچھ آوازیں نکلتی ہیں لیکن وہ بالکل ناقابل فہم ہوتی ہیں۔وہ کچھ کہتا ضرور ہے لیکن کوئی ایسی بات نہیں ہوتی جسے ہم سننے والے سمجھ سکیں اور یہ کہ مرگی والے شخص کی اولاد میں بھی یہ مرض منتقل ہو جاتا ہے۔ان حالات

میں غور کرنا چاہیے کہ تشنج اور ہاتھ پاؤں مارنے اور بے قرار ہو جانے کا کوئی ذکر رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اور وحی کے مشاہدات سے متعلق روایتوں میں نہیں ملتا۔اس لحاظ سے مرگی کا انتساب رسول اللہ ﷺ کی طرف درست معلوم نہیں ہوتا اس کے برعکس ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ رسول اللہ وحی کے وقت ہمیشہ ساکت و صامت ہو جاتے تھے۔یہ نہیں کہ آپ ہاتھ پاؤں مارتے تھے یا تشنج کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی، کبھی نہیں کبھی نہیں، ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا۔ دوسری چیز ہمیں یہ بھی نظر آتی ہے کہ وحی کے دوران شروع سے آخر تک اور وحی کے ختم ہو جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی زبان سے جو آوازیں نکلتیں وہ قابل فہم عبارتیں ہوتیں، یعنی قرآن کی آیتیں جن کو سن کر ہر شخص سمجھ سکتا تھا، یہ نہیں کہ جانوروں کی طرح چیخیں مارتے ہوں یا جیسے کہ بیمار بعض اوقات کراہتا ہے اور ایسی آوازیں نکالتا ہے جو سمجھ میں نہیں آ سکتیں، ایسا کبھی نہیں ہوا۔یہ صحیح ہے کہ ایک زمانے میں وحی کے دوران ہی رسول اللہ ﷺ بلند آواز سے وحی سناتے۔بعض اوقات وحی کے ختم ہونے کے بعد سناتے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں ایک آیت ہے کہ لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ (16:75) یعنی ابتداء ہی سے جیسے جیسے وحی نازل ہوتی اور جیسے جیسے فرشتہ آپ کو کچھ الفاظ پہنچاتا رسول اللہ ﷺ اسی وقت اس کو با آواز بلند دہراتے رہتے۔اس طرح کی فوری تبلیغ آپ کی نیک نیتی پر مبنی تھی کہ کچھ بھول نہ جائیں تو اللہ نے کہا ایسا نہ کریں، پہلے سکون کے ساتھ پوری وحی کو سن لیں، وہ آپ کے ذہن سے غائب نہیں ہوگی، ہم اسے محفوظ رکھیں گے۔وحی کا نزول ختم ہونے کے بعد آپ اسے دوسرے تک پہنچائیں۔اس کے بعد سے رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس معمول کو بدل دیا اور وحی کے اختتام تک سکوت فرماتے۔ان تفصیلات کی روشنی میں ہمیں نظر آتا ہے کہ مرگی کی بیماری، تشنج وغیرہ بے معنی آوازوں کا آپ کی زبان سے نکلنا، ان باتوں کا کوئی وجود نہیں ہے۔اسی طرح رسول اکرم ﷺ کی چھ سات لڑکے لڑکیاں ہوئیں اور لڑکیوں کی اولاد اب تک دنیا میں باقی ہے اور مرض کے توارث سے تاریخ ساکت ہے۔

اس کے علاوہ ایک طویل فہرست ایسی حدیثوں اور روایتوں کی ہے جن میں لکھا ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ منبر پر کھڑے خطبہ دے رہے تھے۔یکایک آپ کی حالت غیر ہو گئی اور وحی نازل ہونے لگی۔آپ ﷺ کی زبان سے آواز نکلنا بند ہو گئی اور آپ چپ چاپ کھڑے رہے۔چند لمحوں کے بعد وہ حالت دور ہو گئی۔پھر آپ نے خطبہ دینا شروع کیا اور فرمایا مجھ پر ابھی فلاں وحی نازل ہوئی ہے اور اس کی تبلیغ فرما دی۔ایک دوسری روایت میں کہا گیا ہے کہ

ایک دن رسول اللہ ﷺ کھانا کھا رہے تھے۔ایک گوشت کا ٹکڑا بدستور آپ کے ہاتھ میں رہا، گرا نہیں۔یعنی اپنی ذات پر آپ کا کنٹرول برقرار رہا۔اس طرح کی اور حدیثیں بھی ہیں جن میں ہمیں نظر آتا ہے کہ وحی کے نزول کے وقت رسول اللہ ﷺ کو اپنے آپ پر ویسا ہی کنٹرول رہتا تھا جیسا کہ عام حالت میں ہوتا ہے، سوائے اس فرق کے کہ اس وقت آپ بے حرکت ہو جاتے اور آپ کے جسم سے پسینہ نکلنے لگتا حتی کہ انتہائی شدید سردی کے زمانے میں بھی پسینے کے قطرے ایک قطار کی صورت میں آپ کی پیشانی سے گرنے لگتے۔اس کے سوا کوئی اور فرق نظر نہیں آتا یا یہ کہ آپ کے چہرے کا رنگ، چند لمحوں کے لیے غالباً خون کی تیز گردش کی وجہ سے، سرخ ہو جاتا یا ذرا سانولا ہو جاتا۔اس کے علاوہ ہمیں اور کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

مغربی مورخوں کی تالیفات میں ایک اور چیز نظر آتی ہے وہ کہتے ہیں کہ جب وحی نازل ہوتی تو رسول اللہ ﷺ لیٹ جاتے اور آپ کے چہرے کو ڈھانپ دیا جاتا،جیسا کہ پرانے کاہنوں کی عادت تھی۔میں نے اس بارے میں تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ آپ کے چہرے کو ڈھانپ دینا اور آپ کا لیٹ جانا صرف ایک مرتبہ پیش آیا، ورنہ عام طور پر ایسی کوئی صورت کبھی واقع نہیں ہوئی۔مثلاً اونٹنی پر ہیں، یا منبر پر کھڑے ہوئے خطبہ دے رہے ہیں تو وہاں چہرے یا جسم کو کسی کپڑے سے ڈھانپ دینے اور آپ کے لیٹ جانے کی کوئی صورت کبھی پیدا نہیں ہوئی۔وہ ایک واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت عائشہؓ کی عفت کے بارے میں جھوٹے بہتان لگائے گئے تھے تو ایک دن آپ حضرت عائشہؓ سے ملنے کے لیے ان کے والد حضرت ابوبکرؓ کے مکان پر گئے کیونکہ اس زمانے میں وہ اپنے والدین کے گھر تھیں۔وہاں رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے گفتگو کی، کچھ سوالات کیے۔پھر یکایک آنحضرت ﷺ پر وحی کا نزول شروع ہوا۔راوی لکھتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ لیٹ گئے اور آپ کے چہرے پر حضرت ابو بکرؓ اور ان کی بیوی نے احتراماً ایک چھوٹا سا کپڑا ڈال دیا، اس خیال سے کہ کہیں رسول اللہ ﷺ کی متغیر حالت دیکھ کر ہم ہنس نہ پڑیں یا ان پر بے ادبی سے نظر نہ پڑ جائے۔ اس ایک روایت کے علاوہ اور اس خاص واقعہ کے علاوہ کہیں یہ نظر نہیں آتا کہ وحی کے نزول کے وقت رسول اللہ ﷺ کے چہرے کو لوگ ڈھانپ دیتے ہوں۔ایک اور واقعے کا ذکر کیا جا سکتا ہے جس میں لیٹنے کا ذکر نہیں ہے لیکن چہرے کو ڈھانپنے کا ایک طریقہ نکل آتا ہے۔وہ یہ ہے کہ ایک صحابی کہتے ہیں کہ مجھے اسلام لانے سے پہلے یہ معلوم ہوا تھا کہ پیغمبر اسلام ﷺ پر وحی آتی ہے۔پھر اللہ نے مجھے توفیق دی اور میں مسلمان ہوا تو میری تمنا تھی کہ

وحی کے نزول کے وقت رسول اللہ ﷺ کو دیکھوں۔میری اس تمنا سے کچھ اور لوگ بھی واقف تھے۔اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ حجۃ الوداع کے موقع پر، میری موجودگی میں، یکایک رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل ہونے لگی۔حضرت عمرؓ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ تم رسول اللہ ﷺ کو نزول وحی کی حالت میں دیکھنا چاہتے تھے، اگر تمہاری یہ تمنا برقرار ہے تو آؤ میں تمہیں دکھاؤں۔تو راوی یہ کہتے ہیں کہ اس وقت رسول اللہ ﷺ ایک پردے کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔پردے کی دوسری طرف ہم لوگ تھے۔حضرت عمرؓ نے اس پردے کو ذرا کھینچ کر کہا اندر دیکھ لو۔میں نے دیکھا رسول اللہ ﷺ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور سانس قدرے زور زور سے لے رہے ہیں۔ان دو واقعات کے سوا، جن میں ایک مرتبہ چہرے پر پردہ ڈالنے کا ذکر ہے اور ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے پردے کے پیچھے بیٹھنے کا ذکر ہے، اور کسی روایت میں ایسی تفصیل نہیں ملتی جو کاہنوں کی حالت اور اس طرح کی چیزوں سے مشابہت رکھتی ہو۔

بہرحال وحی کیا چیز ہے؟ اس کی تشریح ہمارے لیے ناممکن ہے کیونکہ وحی ہم میں سے کسی پر نہیں آتی۔وحی کے وقت رسول اللہ ﷺ کی حالت جیسی ہوئی تھی اسے ہم مختلف لوگوں کے مشاہدے کے حوالے سے بیان کر سکتے ہیں۔کچھ مشاہدے تو وہ ہیں جو میں نے آپ سے بیان کیے۔کچھ یہ ہیں کہ ایک صحابی نے جرات کر کے ایک مرتبہ براہ راست رسول اللہ ﷺ سے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ! آپ پر جب وحی نازل ہوتی ہے تو اس وقت آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟ وہ جواب بھی دلچسپ ہے۔اس جواب کا ذکر کر کے میں اس بحث کو ختم کروں گا۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بعض اوقات میرے کانوں میں گھنٹی بجتی ہے اور بہت سخت تکلیف کی حالت ہوتی ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا میری جان نکل جائے گی۔ اس وقت میں کچھ آوازیں سنتا ہوں۔وہ آوازیں میرے دماغ میں پتھر پر کندہ نقش کی طرح ثبت ہو جاتی ہیں۔اس حالت کے ختم ہونے کے بعد وہ مجھے ایسے ہی یاد ہوتی ہیں گویا کہ مجھے زبانی یاد تھیں۔تو لوگوں کے سامنے دہراتا ہوں۔لیکن بعض اوقات کوئی شخص نظر آتا ہے، یا تو آدمی کی شکل میں اور اس وقت وہ آدمی کی طرح مجھ سے بولتا ہے۔بعض اوقات وہ پرندے کی شکل میں ہوتا ہے یعنی ایک انسان جس کے پر بھی ہوں اور فضا میں اڑتا رہتا ہے یا کھڑا رہتا ہے اور وہ مجھے مخاطب کر کے کچھ چیزیں کہتا ہے اور میں انہیں سنتا ہوں، میں بھول نہیں سکتا، وہ میرے حافظہ میں نقش ہو جاتی ہیں اور پھر میں انہیں دہراتا ہوں۔یہ رسول اللہ ﷺ کا بیان ہے۔یہ الفاظ کافی اہم ہیں کہ اتنی شدید تکلیف ہوتی ہے گویا میری جان نکل جائے گی۔یہ رسول اللہ ﷺ محسوس کرتے تھے۔اس لیے کوئی حیرت

کی بات نہیں کہ آپ کا وزن بھی اتنا زیادہ ہو جاتا تھا کہ کسی اونٹنی کو بھی اس کا تحمل ممکن نہیں ہوتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ خود محسوس کرتے تھے کہ یہ غیر معمولی حالت ہے، یہ ہے وحی کی کیفیت اور اس سے زیادہ ہم کوئی اور چیز بیان نہیں کر سکتے۔ یہ خصوصی کیفیت جو اللہ کے نبی ﷺ کو ہوتی ہے ہم اس کو عام انسانوں کی کیفیتوں اور ڈاکٹروں کے مرض کی تشخیص سے حل نہیں کر سکتے۔

**اسلامی عقائد:** آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ کے بعد وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ہے یعنی آخرت کا ذکر آتا ہے۔ عقائد کے نقطہ نظر سے آخرت پر ایمان تو ہمیں لانا ہی ہے لیکن نفسیاتی نقطہ نظر سے بھی ہی بات بڑی اہم ہے کہ ہر انسان سے اس کے اعمال کے متعلق حساب و کتاب لیا جائے گا اور اس کے نیک و بد اعمال کے مطابق جزا و سزا دی جائے گی۔ آخرت اور یوم حساب پر ایمان، جزا کی امید اور سزا کا خوف، یہ ایسے تصورات ہیں جو انسان کو اچھے کام کرنے کی ترغیب دیتے اور بری باتوں سے روکتے اور بچاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی چیز میرے ذہن میں آتی ہے۔ ہم سب اللہ کے بندے ہیں، وہ ہمارا آقا ہے اگر وہ ہمیں کچھ حکم دے تو مالک ہونے کی وجہ سے ہمیں ہر حکم دے سکتا ہے اور ہمارا فریضہ ہو گا کہ ہم اسے انجام دیں۔ اگر ایک ملازم، اس سے بھی بڑھ کر ایک غلام، اپنے آقا کے احکام کی تعمیل کرے تو اس کی جزاء پانے کا، کسی شاباشی کے حاصل کرنے کا کوئی حق نہیں ہوتا، اس کے بر خلاف اگر کوئی غلام اپنے آقا کے حکم کی اطاعت نہیں کرتا تو سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جنت کی اصولاً کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ صرف دوزخ کی ضرورت ہے کہ ہم اللہ کے بندے ہیں، اللہ کی اطاعت نہ کریں تو اللہ ہمیں سزا دے سکتا ہے، اسے اس کا کامل حق ہے لیکن اگر ہم اس کے احکام کی تعمیل کریں تو ہمیں کوئی حق نہیں کہ اللہ ہمیں جنت انعام میں دے۔ اس کے باوجود یہ اللہ کی مہربانی اور رحمت ہے کہ ہمیں جنت بھی دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں تشویق بھی ہے اور تہدید و تنبیہ بھی ہے۔

اب میں جنت و دوزخ کے متعلق چند الفاظ آپ سے بیان کروں گا۔ ہندوؤں کا تصور اور بدھ مت والوں کا تصور اس کے بارے میں کچھ اور ہی ہے۔ یہ دلچسپ ضرور ہے لیکن ظاہر ہے کہ اسے مسلمان قبول نہیں کر سکتے۔ وہ کہتے ہیں کہ کائنات کا وجود ازل سے ابد تک صرف اتنا ہی ہے جتنا ایک بلبلے کا وجود، جو دریا میں موج کے تلاطم سے پانی کی سطح سے اچھلتا پڑتا ہے پھر آن کی آن میں دوبارہ گر کر دریا کے پانی میں غائب ہو جاتا ہے۔ انسان کی ہستی بھی اس کائنات

میں محض اس بلبلے کی طرح ہے۔اسی طرح ان کا تصور تناسخ یہ ہے کہ آدمی اچھا کام کرے تو اسے جزا ملے گی، میں ابھی بیان کروں گا کہ کیا ملے گی اور اگر برا کام کرے گا تو سزا ملے گی۔ہندوؤں کے عقائد کے مطابق یہ ہے کہ وہ سزا اس برائی کی نوعیت کی ہوگی۔اگر اس نے تھوڑی برائی کی ہے تو مرنے کے بعد غلام کے طور پر پیدا ہوگا۔اگر اس نے اس سے بھی زیادہ برائی کی ہے تو وہ مرنے کے بعد کتا یا بلی بن جائے گا، اس کی برائی اگر اس سے بھی زیادہ ہے تو وہ درخت بن جائے گا، اس سے بھی بڑی برائی ہے تو وہ پتھر بن جائے گا۔جمادات، نباتات، حیوانات یہ سب ارتقائی مدارج ہیں۔اس لحاظ سے وہ کہتے ہیں کہ اگر کسی کو پتھر بننے کی سزا دی گئی ہے تو اس پتھر کے ارتقاء کے ذریعے سے صدیوں کی مدت کے بعد درخت بننے کا موقع ملے گا۔اگر درخت اپنی مدت حیات میں مفید کام کرتا رہے تو اس درخت کو صدیوں کے بعد جانور بننے کا موقع ملے گا۔وہ جانور اگر اچھے کام کرتا ہے تو اسے ادنیٰ قسم کا انسان یعنی شودر بننے کا موقع ملے گا۔اگر شودر کی حیثیت سے اچھے کام کرتا رہے اور اپنے فرائض انجام دیتا رہے تو مرنے کے بعد وہ ویش بنے گا۔اس کے بعد کھتری بنے گا، اس کے بعد برہمن بنے گا۔اگر برہمن کی حیثیت سے اپنی زندگی اچھی گزاری تو مرنے کے بعد دوبارہ خدا کی ذات میں ضم ہو جائے گا۔جس طرح کہ وہ بلبلہ دوبارہ پانی میں گرا اور پانی بن گیا، تو برہمن دوبارہ خدا بن جائے گا۔اگر برہمن نے زندگی برائی کے ساتھ گزاری تو اسے وہی سزا ملے گی اور دوبارہ اس کو جانور اور درخت اور پتھر وغیرہ بننا پڑے گا اس طرح ہزاروں لاکھوں سال گزر جائیں گے۔یہ ان کا آواگون یا تناسخ کا تصور ہے۔ مسلمانوں کا تصور اس بارے میں جنت اور دوزخ کا ہے۔خود قرآن میں اور حدیث میں صراحت سے بیان کیا گیا ہے کہ جنت میں جانوروں اور پرندوں کا گوشت کھانے کو ملے گا۔وہاں شراب کی،شہد کی اور دودھ کی نہریں ہوں گی۔تو اس کا مفہوم یہ لینا پڑے گا کہ ہمارے عرفان و شعور کے مطابق، ہمارے ذہن میں آسائش اور لذت کا جو تصور ہے اس تصور کے مطابق بتایا گیا ہے کہ جنت میں یہ نعمتیں ہوں گی، ورنہ قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ کہا گیا کہ وہاں وہ چیزیں ہیں جن کا تمہیں تصور بھی نہیں ہو سکتا۔جب ہمیں ان کا تصور نہیں ہو سکتا، جیسے کہ حدیث کے صاف الفاظ میں جنت میں وہ چیزیں ہیں جنہیں نہ کسی آنکھ نے کبھی دیکھا، نہ کسی کان نے کبھی سنا، نہ کسی کے دل و دماغ میں ان کا خیال تک کبھی گزرا، پھر اسے ہم کیسے سمجھائیں گے۔انسانی زندگی میں انسان چاہتا ہے کہ اس کو خوبصورت بیوی ملے، اچھی غذائیں ملیں وغیرہ وغیرہ۔تو قرآن مجید میں سمجھانے کے لیے ایسی ہی چیزوں کا ذکر آیا ہے جو انسان کو فطرتاً مرغوب ہیں۔ بہرحال حور و قصور کی حقیقت تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن اگر یہ چیزیں نہ بھی ہوں تو کوئی تضاد نہیں کیونکہ قرآن خود

کہتا ہے کہ تمہیں وہاں پر تمہاری خواہش کی ہر چیز ملے گی اور حدیث میں صراحت ہے کہ وہاں جو چیزیں ہیں ان کا تمہیں تصور بھی نہیں ہو سکتا، تو دونوں امکانات باقی رہتے ہیں۔

عقائد کے سلسلے میں آخری چیز، کہ برائی اور بھلائی دونوں اللہ کی طرف سے ہیں، بہت پیچیدہ ہے۔اس میں ایک طرف تو پارسیوں کے مذہب کی تردید ہوتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ نیکی کا خدا الگ ہے اور برائی کا خدا الگ ہے۔اس نظریے میں منطقی اعتبار سے خامی ہے کہ اگر نیکی کسی وقت مغلوب ہو جائے تو دوسرے معنوں میں اس کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ نیکی کا خدا مغلوب ہو گیا، اس کے باوجود ہم اسے خدا مانتے رہیں، اسے عقل قبول نہیں کرتی۔اس کے برخلاف اسلام کہتا ہے کہ والقدر خیرہ و شرہ، من اللہ تعالیٰ یعنی خیر و شر دونوں اللہ کی طرف سے ہیں۔تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سزا کیوں دی جاتی ہے؟ جبر و قدر کا یہ مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے۔اس پر دنیا کے ہر مذہب میں صدیوں سے بحث ہوتی آ رہی ہے اور اب تک اس کا کوئی حل نہیں نکل سکا۔اگر ہم ایک جواب دیں کہ انسان مجبور ہے اور وہی کرتا ہے جو خدا نے مقرر کر رکھا ہے تو اس پر کچھ اعتراض ہوتے ہیں۔یہ ایک دوہری مشکل (Dilemma) ہے، یعنی دونوں صورتیں قابل اعتراض ہو جاتی ہیں۔اسی وجہ سے رسول کریم ﷺ نے بڑی سختی سے تاکید کی ہے کہ اس بحث میں نہ پڑو، تم سے پہلے کی قومیں اس مسئلے پر بحث کرنے لگیں اور گمراہ ہو گئیں۔ان حالات میں اصولاً مجھے مزید بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہونا چاہیے، لیکن میں تھوڑی سی توضیح کرتا ہوں جیسا کہ میں نے آپ سے کہا کہ اگر انسان کو مجبور قرار دیا جائے یعنی ایک مشین کی طرح وہی کام کرتا ہے جو خدا نے مقرر کر رکھا ہے، تو ہم یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہم برائی کریں تو سزا کیوں دی جاتی ہے؟ یہ اعتراض اور یہ سوال ٹھیک ہے لیکن یہی بھلا مانس انسان یہ کیوں نہیں سوچتا کہ اگر میں بھلائی کرتا ہوں تو وہ بھی خود بخود بلا ارادہ ہو گی، پھر مجھے جنت کا کیا حق ہے؟ اس پر وہ چیزیں ہمارے ذہن میں نہیں آتیں بلکہ ہم خود طے کرتے ہیں کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے تو اس کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ اللہ کو معلوم نہیں کہ انسان کیا کرنے والا ہے، حالانکہ وہ عالم الغیب ہے۔ساری اگلی اور پچھلی چیزوں کو ان کے وجود میں آنے سے پہلے سے جانتا ہے۔اگر ہم انسان کو قادر قرار دے دیں تو اس کے معنی یہ نکلتے ہیں کہ اللہ کو علم نہیں ہے کہ میں کیا کرنے والا ہوں اور اللہ ہمارے اس کام کو، جو ہم کرنے والے ہیں، خود پیدا نہیں کرتا بلکہ وہ ہم خود پیدا کرتے ہیں۔ یہ ہے وہ دوہری مشکل (Dilemma) جس کی بناء پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس بحث میں نہ پڑو۔حقیقت میں یہ

دونوں مختلف سطحوں کی، مختلف درجات کی اور دو مختلف مداروں میں گھومنے والی چیزیں ہیں۔ انسان کی ذمہ داری اور جواب دہی، زمینی تصور ہے۔ اللہ کی قدرت، اللہ کا مقرر کرنا، یہ آسمانی تصور ہے۔ ان دونوں میں کسی طرح کے تصادم کا کوئی امکان نہیں پایا جاتا۔ گویا میں اپنے ہر کام کا زمینی مفہوم میں ذمہ دار ہوں، اور ہر چیز آسمانی مفہوم میں خدا کی طرف سے پیدا ہوتی ہے، اس میں کوئی تضاد یا تصادم نہیں ہے، یہ اس تصور کا خلاصہ ہے۔

ایک آخری چیز میں اس بحث کو ختم کروں گا۔ ایک دن یکایک میرے ذہن میں انکشاف سا ہوا اور یہ عجیب و غریب انکشاف تھا۔ وہ یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو خلیفہ کیوں بنایا؟ ہم میں دوسری مخلوقات کے مقابلے میں کوئی خاص فوقیت نہیں، کیا یہ استبدادی فیصلہ ہے؟ یا انتخاب ہوا ہے؟ میری توجہ قرآن مجید کی اس آیت کی طرف مبذول ہوئی إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا (72:33) (ہم نے ایک امانت پیش کی، آسمانوں اور آسمانوں پر رہنے والوں کے سامنے اور زمین اور زمین پر رہنے والوں کے سامنے۔ حتیٰ کہ پہاڑوں کے سامنے بھی، مگر کسی کو بھی یہ ہمت نہ ہوئی کہ اس امانت کو قبول کرے، سبھی ڈرے اور سبھوں نے انکار کر دیا، اگر قبول کیا تو انسان نے، جو ظالم بھی ہے اور جاہل بھی ہے)۔ میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ جب خلیفۃ اللہ کا عہدہ پیش کیا گیا تو ہر مخلوق نے چاہا ہوگا کہ وہ عہدہ مجھے مل جائے۔ سب نے پوچھا ہوگا کہ کس شرط پر یہ عہدہ مل سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "تقدیر تو میں کروں گا اور ذمہ دار تم ہو گے" سب نے کہا ہوگا کہ "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تقدیر تو کرے اور ذمہ دار ہم ہوں؟" سب ڈرے اور کسی نے قبول نہ کیا سوائے انسان کے، جو ایک ظالم اور جاہل مخلوق ہے۔ اس نے کہا "یا رب میں قبول کرتا ہوں"۔ اس کا یہ بھولا پن اللہ تعالیٰ کو پسند آیا، کہا اچھا میں تجھے خلیفہ بنا دیتا ہوں۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ انسان اتنا جاہل نہیں تھا جتنا ہمیں نظر آیا ہے۔ انسان نے غالباً یہ سوچا کہ "خدا ظالم تو ہو نہیں سکتا، وہ مجھے اس چیز کی سزا نہیں دے گا جو میں نے نہیں کی۔ لاؤ عہدہ قبول کر ہی لیں، پھر دیکھا جائے گا۔ وہ غفور و رحیم ہے۔" تقدیر و تدبیر کے متعلق میرا تصور یہ ہے کہ جب انسان نے یہ قبول کیا کہ اللہ کرے اور ذمہ دار میں ہوں تو اب اس سے یہ پوچھنے کا حق نہیں کہ مجھے سزا کیوں دی جاتی ہے؟

یہ عقائد کے متعلق مختصر سی گفتگو تھی۔ اب میں مختصراً عبادات کے بارے میں کچھ بیان کروں گا۔ اسلام اپنی محدود معنی میں اطاعت کرنے اور اپنے آپ کو دوسرے کے سپرد کر دینے کا نام ہے۔ جب جبرئیل نے آنحضرت ﷺ

سے پوچھا کہ اسلام کیا چیز ہے؟ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ نماز پڑھنا، روزے رکھنا، زکوٰۃ دینا اور حج کرنا۔ نماز کا مقابلہ اگر ہم دوسری قوموں اور دوسری ملتوں کی عبادات سے کریں تو ہمیں اسلام کی بڑی فوقیت نظر آتی ہے۔ یہودیوں کی عبادت کا طریقہ ہے کہ وہ اپنے مذہبی معبد کو جاتے ہیں اور ان کا امام توریت کھول کر گھنٹے دو گھنٹے مسلسل تلاوت کرتا ہے اور سارے لوگ مرد اور عورتیں ادب کے ساتھ سنتے ہیں۔ پھر تلاوت ختم ہو جاتی ہے، سارے لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ہمارے ہاں کی طرح رکوع و سجدہ، قیام و قعود وغیرہ نہیں ہوتا۔ پارسیوں کے ہاں آپ نے سنا ہو گا، آتش پرستی ہوتی ہے۔ اس کی بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ میں اس تفصیل میں نہیں جاتا صرف اشارۃً آپ سے ذکر کرتا ہوں۔ اس کی تھوڑی سی توجیہ بعد میں کروں گا۔ ہندوؤں کے ہاں گائے کی پوجا ہوتی ہے۔ عیسائیوں کے ہاں ایک طرح سے صلیب کی پرستش ہوتی ہے۔ یہ کیا چیزیں ہیں؟ بظاہر یہودی اور پارسی اور عیسائی ہماری ہی طرح کے انسان ہیں، صاحب عقل و فہم بھی ہیں، اس کے باوجود کیا بات ہے کہ وہ ایسی جاہلانہ حرکات کرتے ہیں کہ آگ کی پوجا کرتے ہیں، لکڑی کی پوجا کرتے ہیں اور گائے (جانور) کی پرستش کرتے ہیں۔ ایک دن میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ کسی کی تعریف دو طرح سے ہو سکتی ہے، براہ راست بھی اور بالواسطہ بھی، مثلاً کسی مصور سے ہم کہیں کہ تم بڑے ماہر مصور ہو تو ظاہر ہے کہ وہ اس تعریف ے خوش ہو جائے گا۔ لیکن اگر مصور سے مخاطب ہوئے بغیر اس کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے ایک کی طرف اشارہ کر کے ہم کہیں کہ کیا نفیس تصویر ہے تو اس بالواسطہ حمد و ثنا سے بھی اس مصور کو اتنی ہی خوشی ہوگی جتنی براہِ راست تعریف سے ہو سکتی ہے۔ پرانے مذہبوں میں بالواسطہ حمد و ثناء کو اختیار کیا گیا۔ مثلاً جس زمانے میں پارسی مذہب وجود میں آیا، اس وقت انسان نے آگ کو اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ آگ سے فائدہ اٹھانا اور اس کی ہلاکتوں سے بچنا، انسان نے سیکھ لیا تھا، تو اس وقت اس نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے مظاہر اور شواہد میں سب سے طاقتور چیز آگ ہے، کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، جو بھی اس کے قریب جاتا ہے وہ جل کر ختم ہو جاتا ہے لہٰذا پارسی مذہب کے بانیوں نے کہا کہ ہم خدا کی تعریف کرنا چاہتے ہیں تو اس کے بہترین مظہر یعنی آگ کی پرستش کرنا چاہیے۔ ہندوستان میں جب آریہ آئے تو انہوں نے زرعی معیشت میں گائے کو سب سے زیادہ مفید اور منفعت بخش پایا، تو خدا کی اس سب سے بڑی نعمت کے گن گانے لگے، اور خدا کی نعمتوں کی سب سے بڑی علامت کے طور پر اس کا احترام کرنے لگے۔ اللہ ایک منعم ہے، لہٰذا اس کا شکر ادا کرنے کے لیے وہ اس کی سب سے اچھی نعمت کی تعریف کرتے ہیں اور اس کا ادب کرتے ہیں۔ یوں بالواسطہ اللہ کا ادب کرنا اور اللہ کی تعریف کرنا

چاہتے ہیں۔یہودیوں کے ہاں اپنی عبادت میں صرف توریت کی تلاوت کی جاتی ہے، جس کو وہ خدا کا کلام کہتے ہیں۔خدا کے کلام کی تلاوت ان کے نزدیک عبادت ہے۔کلام اللہ کی تلاوت کے معنی ہیں کہ ہم اللہ کے احکام سے واقفیت حاصل کریں، اس پر عمل کریں اور اس کے مطابق اس تک پہنچیں۔اس میں ایک عمیق مفہوم ہے: اللہ موجود ہے لیکن وہ ہمیں نظر نہیں آتا، یہ نہیں کہ وہ نہ ہو، وہ ہے اور ہم ہی اندھے ہیں کہ اسے دیکھ نہیں سکتے، لیکن بن دیکھے بھی ہم اس سے محبت کرتے ہیں اور اس تک پہنچنا چاہتے ہیں۔اس کا راستہ بھی ہمیں نہیں معلوم۔یہ راستہ بھی صرف خدا ہی جانتا ہے۔ ایک اندھے کی ظاہر ہے کہ صرف آواز ہی کے ذریعے سے رہنمائی کی جا سکتی ہے۔اس لیے اندھے عاشق کو اس کا مہربان معشوق (اللہ سبحانہ و تعالیٰ) آواز کے ذریعے سے، کلام کے ذریعے سے اپنا راستہ بتاتا ہے (مثلاً آگے بڑھ، داہنے مڑ، بائیں مڑ، سیڑھیوں پر چڑھ، اتر وغیرہ وغیرہ) یہ ہے رمز جو توریت کی تلاوت میں مضمر ہے۔عیسائیوں کے ہاں ایک طرح کی وحدانیت کا تصور بھی ہے اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ ان لوگوں کو اس پر اصرار بھی ہے۔ان کے ہاں عبادت کے مراسم میں کئی چیزیں شامل ہیں۔ایک طرف تو وہ یہودیوں کی توریت ہی کی طرح سے انجیل کے اقتباسات کو عبادت کے وقت تلاوت کرتے ہیں۔دوسری طرف ایک چیز ہے جسے کمیونین کا نام دیا جاتا ہے۔کمیونین، پروٹسٹنٹ لوگوں کے ہاں نہیں ہے، زیدہ تر کیتھولک اور آرتھوڈوکس فرقوں میں پایا جاتا ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ نماز یعنی عبادت کی تکمیل ہونے کے بعد ان کا پادری انہیں روٹی کا ایک ٹکڑا دیتا ہے، جسے وہ کھاتے ہیں اور شراب کے چند گھونٹ دیتا ہے جسے وہ پیتے ہیں اور تصور یہ ہوتا ہے کہ ہم خدا کی ذات میں مدغم ہو گئے ہیں، کیوں؟ انجیل میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جب رومیوں نے گرفتار کیا اور انہیں سولی پر چڑھایا جانے والا تھا تو آخری رات کو جب وہ اپنے حواریوں کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے تو انہوں نے یکایک ایک روٹی اٹھائی اور اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھا کر کہا کہ اسے کھاؤ یہ میرا جسم ہے۔پھر ایک گلاس اٹھایا اور کہا کہ اسے پیو یہ میرا خون ہے۔انجیل کے اس بیان کردہ واقعہ کو عیسائیوں کے ہاں بہت اہمیت دی گئی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم روٹی کھائیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جسم بن جاتے ہیں اور شراب پئیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خون بن جاتے ہیں۔چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا ہیں اس لیے روٹی کھانے اور شراب پینے سے ہم خدا کو اپنے اندر مدغم کر لیتے ہیں۔یہ تصور بھی رمز کی حد تک قابل قبول ہے۔

اب ہم دیکھیں گے کہ اسلام میں عبادت کا کیا طریقہ ہے۔ نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھی جاتی ہے جس میں اللہ کی حمد و ثناء ہے یعنی گویا ہم براہ راست حمد و ثنا کرتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں ضرورت نہیں کہ کسی رمز کے ذریعے اللہ کی حمد کریں۔ براہ راست اور بالواسطہ دونوں چیزیں حمد کا ذریعہ بن سکتی ہیں اور اسلام نے چاہا کہ اللہ جو ذات واجب الوجود ہے اس کی تعریف بھی براہ راست ہونی چاہیے۔ بہرحال اسلام نے بتایا کہ اللہ کی تعریف خود اللہ کے بتائے ہوئے الفاظ کے ذریعے سے کریں۔ یہودیوں کے ہاں توریت کے متعلق جو تصور ہے کہ اللہ کا کلام ہمارا رہنما ہے اس لیے چاہیے کہ ہم اس کی تعمیل کریں۔ اپنی نماز میں بھی ہم قرآن مجید یا کلام اللہ ہی پڑھتے ہیں۔ عیسائیوں کے ہاں کمیونین کا جو تصور ہے کہ ہم خدا کی ذات میں مدغم ہو گئے، وہ ایک مادی واسطے سے ہے۔ اسلام نے دیکھا کہ اللہ کی ذات مجرد ہے اس لیے اس سے تقرب بھی مجرد طور سے ہونا چاہیے۔ وہ طریقہ مسلمانوں کے ہاں تشہد ہے۔ نماز کے اختتام کے وقت قیام، رکوع، سجود، حمد و ثناء غرض کائنات میں سے ایک نوع کے طریقہ عبادت کے ذریعے سے اللہ کو اپنی اطاعت شعاری کا یقین دلا کر ہم اپنے آپ کو اس بات کے قابل تصور کرتے ہیں کہ ہمیں اللہ کے حضور میں باریابی کا شرف حاصل ہو۔ جب کسی چھوٹے کو بڑے کے حضور میں باریابی کا موقع ملتا ہے تو چھوٹا سلام کرتا ہے اور بڑا مہربانی سے جواب دیتا ہے۔ التحیات کے معنی ہیں آداب عرض کرنا۔ یہ چیز معراج کے واقعے سے لی گئی ہے حضور ﷺ نے التحیات للہ کہا۔ اس پر اللہ نے مہربانی سے جواب دیا "السلام علیك ایها النبی و رحمة الله و برکاته"۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کا بھی خیال فرمایا اور فوراً ہی کہا "السلام علینا و علی عباد الله الصالحین" اور ہم سب حقیر امتیوں کو بھی، ان برکات میں جو اللہ کی طرف سے نازل ہو رہی تھیں، شامل کر لیا۔ حاضری اور ملاقات کو سلام اور جواب سلام کے ذریعے سے ہم نے رمز کے طور پر اختیار کیا ہے۔ اللہ کی ذات میں مدغم ہو جانے کا تصور ہمارے نزدیک ناقابل قبول ہے۔ اس کی جگہ ہم اللہ کا قرب حاصل کرتے ہیں۔ اس کے حضور میں حاضر ہو کر آداب بجا لاتے ہیں۔ وہ ہمارے سلام کو قبول کرتا ہے اور ہم پر رحمت و برکت نازل کرتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی عبادت ایک طرح سے سارے مذاہب عالم کے بلکہ ساری کائنات کے طریقہ ہائے عبادت کا خلاصہ ہے۔ کائنات میں تین طرح کی چیزیں پائی جاتی ہیں، جمادات، حیوانات اور نباتات۔ جمادات کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کبھی حرکت نہیں کرتے، بلکہ ساکت رہتے ہیں۔ نماز میں ہم پہلے بے حرکت کھڑے ہو جاتے ہیں، گویا جمادات کی عبادات کا طریقہ ہماری عبادت میں قیام کے ذریعے شامل ہو گیا۔ حیوانات ہمیشہ

رکوع کی حالت میں رہتے ہیں اور یہ ان کی عبادت ہے۔ہماری نماز میں رکوع کی حالت اسی کی مماثل ہے۔درخت اپنی جڑوں کی طرف جھکے ہوئے سجدے کی حالت میں رہتے ہیں یعنی نباتات اپنی عبادت میں سجدے کی حالت میں رہتے ہیں۔لہذا اسلامی عبادت میں نباتات کا طریق عبادت شامل ہے۔صرف جمادات، حیوانات اور نباتات ہی کی نہیں، نماز میں کچھ خالص انسانی خصوصیات بھی ہیں جیسے التحیات۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی عبارت سارے دینوں بلکہ ساری کائنات کی عبادتوں کا مجموعہ ہے، اس لیے ان سب سے فائق ہے۔

اب میں روزے کے متعلق کچھ عرض کروں گا۔حال ہی میں پیرس میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے جسے ایک یورپین غیر مسلم (غالباً کیتھولک) ڈاکٹر ژوفرائے (جوفرائے) نے لکھا ہے۔اس کا عنوان "روزہ" ہے۔اسے پڑھتے ہوئے مجھے بعض عجیب و غریب باتیں معلوم ہوئیں۔اس کا کہنا ہے کہ روزہ طبی نقطہ نگاہ سے بھی انسانوں کے لیے مفید ہے۔وہ ایک دلچسپ انکشاف کرتا ہے کہ روزہ انسانوں میں ہی نہیں بلکہ کائنات کی اور چیزوں مثلاً درختوں اور حیوانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔اگرچہ اس کا ہمارے موضوع سے کوئی براہ راست تعلق نہیں تاہم آپ کی دلچسپی کے لیے عرض کرتا ہوں۔جہاں تک حیوانوں کا تعلق ہے ان کے متعلق اس نے ذکر کیا ہے کہ ایسے وحشی جانور جو بالکل فطری حالت میں رہتے ہیں۔جس زمانے میں برف باری ہوتی ہے، انہیں کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں ملتی اور بعض اوقات اس کا سلسلہ کئی کئی مہینوں تک جاری رہتا ہے۔جن علاقوں میں برفباری شدید ہوتی ہے وہاں برف کی وجہ سے مہینوں تک زمین نظر نہیں آتی۔اس صورت میں ایسے جانور جو اپنی غذا خود حاصل کرتے ہیں، انہیں کوئی چیز نہ کھانے کو ملتی ہے نہ پینے کو، اس کے باوجود وہ نہیں مرتے۔اس نے لکھا ہے کہ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ جانور، پرندے، سانپ وغیرہ سب پہاڑوں کی غاروں میں چلے جاتے ہیں اور وہیں سو جاتے ہیں اس کو Hibernation کہتے ہیں۔یعنی سردی کے زمانے کی نیند، اس کا سلسلہ ہفتوں بلکہ مہینوں تک جاری رہتا ہے۔وہ بیان کرتا ہے کہ نہ کھانے اور نہ پینے کی حالت، یعنی روزے کے باعث ان جانوروں میں نئے سرے سے جوانی آ جاتی ہے۔جب سردیوں کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے اور بہار کا موسم آنے لگتا ہے تو ایسے پرندے، جو ان غاروں میں ہیں، ان کے پرانے پر جھڑ جاتے ہیں اور نئے پر نکل آتے ہیں۔جن کی طراوت اور رنگوں کی خوشنمائی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نئے سرے سے جوان ہو گئے ہیں۔اسی طرح وہ سانپ کے متعلق لکھتا ہے کہ اس کی جھلی جھڑ جاتی ہے اور اس کو ایک نئی کھال یا نیا چمڑا ملتا ہے جو چمک دمک میں پہلے سے بہتر ہوتا ہے۔اس

زمانے میں ان جانوروں میں واقعی ایک جوانی سی آ جاتی ہے۔اپنی تعداد بڑھانے کے لیے نر کو مادہ سے ملنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔اس زمانے میں ان روزہ رکھے ہوئے جانوروں میں پہلے سے زیادہ قوت اور پہلے سے زیادہ جوانی آ جاتی ہے۔اسی طرح درختوں کے متعلق وہ بیان کرتا ہے کہ سردیوں خصوصاً برفباری کے زمانے میں درختوں کے سارے پتے جھڑ جاتے ہیں انہیں کوئی پانی نہیں دیا جاتا۔ان کی کسی قسم کی آبپاشی نہیں کی ہوتی، گویا وہ روزہ رکھتے ہیں۔روزے کی مدت ہفتوں اور مہینوں تک چلی جاتی ہے۔یہ روزہ ختم ہونے پر درختوں کو ایک نئی جوانی حاصل ہوتی ہے۔یعنی جو نئی کونپلیں ان میں پھوٹتی ہیں اور نئے پھول اور پھل لگتے ہیں، وہ ان درختوں کی نئی جوانی، نئے حسن اور نئی قوت پر دلالت کرتے ہیں۔ان مشاہدات کی روشنی میں ڈاکٹر جوفرائے کا کہنا ہے کہ انسانوں کو بھی ہر سال روزے رکھنے چاہئیں، یہ ان کی صحت کے لیے بہتر ہوگا۔یہ ان کو نئی توانائی اور نئی جوانی عطا کرے گے۔اس نے بہت سی لمبی بحثیں کی ہیں کہ آج کل بہت سی بیماریاں ایسی ہیں جن کا ابھی تک کوئی علاج دریافت نہیں ہوا۔ان کا علاج طویل یا مختصر فاقہ کشی، یعنی روزے کے ذریعے کیا جاتا ہے۔آخر میں اس کا نتیجہ نکالا ہے کہ انسانوں کو ہر سال سات ہفتے لازماً روزہ رکھنا چاہیے اور ہر ہفتے میں ایک دن روزہ چھوڑ دینا چاہیے۔اس طرح اسے (7x6=42) بیالیس روزے رکھنے چاہئیں۔اسے ہم ان کا چلہ کہہ سکتے ہیں۔اس کی رائے میں انسان کی صحت کو محفوظ رکھنے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔یہ "طبی" مشورہ عیسائی دینی عقائد و احکام سے متاثر ہے۔

انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبوت ملنے سے قبل ایک صحرا میں معتکف ہوئے اور مسلسل چالیس دن روزہ رکھا تھا۔ابتدائی عیسائی اس کی یاد میں خود بھی روزہ رکھنے لگے مگر عمل درآمد ہر جگہ یکساں نہ تھا۔سن 439ء سے پہلے شہر روما کے عیسائی صرف تین ہفتے روزہ رکھتے تھے، تو اسکندریہ والے سات ہفتے جن میں سارے سنیچر اور اتوار مستثنیٰ ہوتے بجز ایک "مقدس سنیچر" کے۔اس طرح چھتیس روزے ہر سال رکھے جاتے تھے، اور وہ خیال کرتے تھے کہ 36 کی تعداد سال کا دسواں حصہ ہے اور مال کی طرح، غذا کا بھی دسواں حصہ "زکوٰۃ" میں دینا چاہیے (لیکن عیسائیوں کے ہاں شمسی سال رائج ہے جس کے 365 یا 366 دن ہوتے ہیں، اس لیے "سال کا دسواں حصہ" ایک فرضی امر تھا) اور یوں بھی صبح سے تین بجے تک ہی روزہ رکھا جاتا تھا اور روزہ اکیس سال کی عمر پر واجب ہوتا ہے۔سنن ابن ماجہ میں ایک حدیث نبوی بیان ہوئی ہے کہ "ہر چیز پر زکوٰۃ ہے، اور جسم کی زکوٰۃ روزہ ہے"۔ایک اور حدیث یہ بیان کی

ہے کہ جو کوئی رمضان کا پورا مہینہ روزے رکھے، پھر اس کے بعد کے مہینے شوال میں چھ دن روزے رکھے تو یہ پورا سال روزہ رکھنا متصور ہوتا ہے۔یہ اصل میں ایک آیت کریمہ (16:6) پر مبنی ہے۔"کوئی ایک نیکی کرتا ہے تو اسے دس گنا ثواب دیا جائے گا"۔ یہ بہت ٹھیک بیٹھتا ہے کہ ایک مہینے کے دس مہینے اور چھ دن کے ساٹھ دن یعنی دو مہینے (10+2=12 یا پورا سال)شمار ہوتا ہے ایک اور طریقہ حساب یہ ہے کہ رمضان کبھی انتیس کا ہوتا ہے اور کبھی تیس کا، اور ستہ شوال کے باعث کبھی 35 اور کبھی 36 دن روزے رکھے جاتے ہیں جن کا دس گنا کبھی 350 اور کبھی 360 دن ہوں گے جن کا اوسط 355 ہو گا اور قمری سال میں اتنے ہی دن ہوتے ہیں۔

ہندوؤں کے ہاں روزہ ہے لیکن زمانہ اور تعداد زیادہ معین نہیں اور لزوم بھی کم ہے۔بانیان مذہب کی تاریخ پیدائش اور سورج گرہن اور چاند گرہن جیسے اثر انداز کرشمہ ہائے قدرت کے موقعوں پر دیندار لوگ روزہ رکھتے ہیں اور سہ پہر کے تقریباً تین بجے افطار کر لیتے ہیں۔میکسیکو کے سرخ فام لوگوں کے دینی سرگروہ سالانہ (160) دن روزہ رکھتے ہیں، گویا ایک دن ایک آڑ۔حدیث میں ہے کہ یہ حضرت داؤد علیہ السلام کی بھی عادت تھی۔بعض ممالک میں قدیم زمانے میں موسم بہار میں روزہ رکھنا واجب کیا گیا تھا تاکہ غیر شادی شدہ لوگوں میں زناکاری کم ہو۔ایک حدیث میں بھی ہے کہ کسی کے پاس بیوی نہ ہو تو باعفت رہنے کے لیے روزہ رکھا کرے۔

دوسری قوموں کا حج یا تو اپنے کسی بزرگ، کسی ولی، کسی بانی مذہب کی قبر کی زیارت کرنا ہے یا مظاہر قدرت اور عجائبات میں سے کسی بہت ہی عجیب چیز کی زیارت کرنا ہے، چنانچہ ہندو دریائے گنگا کے منبع کی زیارت کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس میں بڑا ثواب ہے۔دریائے گنگا اور جمنا کا سنگم، جو الہ آباد کے مقام پر ہے، اس کی زیارت میں بڑا ثواب سمجھتے ہیں۔اسی طرح عیسائیوں کے ہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جو مبینہ قبر ہے، ہر چند کہ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر جا چکے ہیں اور قبر خالی ہے، لیکن ان کے نزدیک اس قبر کی زیارت کرنا بہت ثواب کا کام ہے۔عام عیسائی جو بیت المقدس نہیں جا سکتے ہیں، وہ سینٹ پیٹر کی قبر کی، جو ویٹیکن اٹلی میں ہے، زیارت کرنا ثواب سمجھتے ہیں اور مذہب کے نام تک سے نفرت کرنے والے کمیونسٹ جب انگلستان جاتے ہیں تو ان کے نہایت ہی محترم افراد مثلاً وزیر اعظم اور وزیر خارجہ بھی کارل مارکس کی قبر کی زیارت کو ضرور جاتے ہیں، جو انگلستان میں دفن ہے۔گویا ان کے ہاں بھی حج پایا جاتا ہے لیکن یہ سارے حج یا تو مظاہر قدرت کے کسی مقام کی زیارت یا اپنے کسی مقدس آدمی

کی قبر کی زیارت پر مشتمل ہیں۔ مسلمانوں کا حج ان سب سے مختلف ہے اور وہ ہے اللہ کے گھر کی زیارت۔ اس کے حضور میں، اس کے مکان میں حاضر ہو کر باریابی حاصل کرنا۔ کعبے کو علامتی طور پر بیت اللہ کہا جاتا ہے۔ یہ ایک رمز ہے جس کی توجیہ ان نوجوانوں کے لیے شاید دلچسپی کا باعث ہو جنھوں نے کبھی اس پہلو پر غور نہیں کیا۔ اللہ کے اسماء حسنٰی ننانوے ہیں۔ قرآن مجید میں ایسے نام بھی ہیں جو اللہ کی صفات کے مظہر ہیں مثلاً رازق، خالق وغیرہ وغیرہ، ان ناموں میں سے جو نام میری رائے میں انسان اور خدا کے تعلق کی سب سے بہت نمائندگی کرتا ہے وہ نام ہے "ملک" بادشاہ جب ایک نام کسی ایک غرض کے لیے منتخب کر لیا گیا تو انسانی سوسائٹی میں ان نام کے ساتھ جو لوازم ہیں ان کو بھی قبول کرنا ہو گا۔ بادشاہ سے کچھ چیزیں خاص طور پر منسوب ہیں مثلاً بادشاہ کا ایک تخت ہوتا ہے۔ قرآن میں اس کا ذکر آیا ہے خدا کا عرش ہے۔ عرش کے معنی تخت کے ہیں۔ بادشاہ کے پاس فوجیں ہوتی ہیں (وَلِلّٰهِ جُنُودُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ) (4:48) (آسمانوں اور زمینوں کی فوجیں اللہ ہی کی ہیں) بادشاہ کے پاس خزانے ہوتے ہیں (وَلِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ) (7:63) (زمین و آسمان کے خزانے اللہ ہی کے ہیں)۔ بادشاہ کے پاس ملک ہوتا ہے (وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ) (189:3)۔ جب سلطنت کا رقبہ وسیع ہو تو بادشاہ پایہ تخت یا صدر مقام تجویز کرتا ہے۔ پایہ تخت کے لیے انگریزی زبان کے ایک لفظ سے آپ واقف ہوں گے(Metropolis) ۔ یہ ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں "شہروں کی ماں" اس معنی میں قرآن (92:6) کا لفظ ہے "امر القریٰ" اور شہر مکہ "ام القریٰ"ہی کے نام سے مشہور ہے، گویا اللہ کی سلطنت کا وہ صدر مقام ہے۔ جب ایک میٹروپولس یا ام القریٰ ہو تو وہاں بادشاہ کا محل بھی ہو گا، چنانچہ بیت اللہ الحرام، اللہ کا مکان یا اللہ کا گھر وہاں پر موجود ہے گویا کعبہ جو بیت الحرام ہے (قرآن 97:5) یہ اس بادشاہ کا محل ہے، کسی ملک میں بادشاہ ہو تو یہ ہمیشہ رواج رہا ہے کہ رعایا کے نمائندہ پایہ تخت کو جا کر بادشاہ کے ہاتھ پر بیعت کرتے اور اپنی اطاعت کا یقین دلاتے ہیں۔ حج کے سلسلے میں جب لوگ مکہ معظمہ جاتے اور کعبے کے سامنے حاضر ہوتے ہیں تو وہ حجر اسود پر اپنا ہاتھ رکھتے ہیں اور حجر اسود کو (اور اگر دور ہوں تو ہاتھ سے اشارہ کر کے اپنے ہاتھ کو) بوسہ دے کر طواف کا آغاز کرتے اور اسے جاری کرتے ہیں۔ اس کو ہمارے فقہاء دو ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ اسے استلام بھی کہتے ہیں اور بیعت بھی کہتے ہیں۔ بیعت کے معنی ہیں اپنے آپ کو بیچ دینا۔ اپنے آپ کو (اللہ کے ہاتھ) فروخت کر دینا اور کہہ دینا کہ اے اللہ! میں اپنی ذات کو تیرے سپرد کرتا ہوں۔ ہم اللہ سے ایک معاہدہ کرتے ہیں اور اس

معاہدے کی تکمیل کرتے ہیں۔معاہدے کرنے کا عام طور پر ایک طریق یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتا تھا، چنانچہ ہم اپنا ہاتھ اللہ کے ہاتھ پر رکھتے ہیں۔اس لفظ سے آپ گھبرائیے نہیں کہ اللہ کے ہاتھ پر ہم اپنا ہاتھ رکھتے ہیں۔ایک متواتر حدیث ہے جسے پانچ صحابہ نے روایت کیا ہے۔اس کے الفاظ ہیں الحجر الاسود یمین اللہ فی الارض (حجر اسود زمین پر اللہ تعالیٰ کا دایاں ہاتھ ہے) چنانچہ اللہ کے دائیں ہاتھ پر ہم معاہدہ کرتے اور بیعت کرتے ہیں۔جب اپنی بیعت کے ذریعے سے اپنے بادشاہ کو ہم اطمینان دلا دیتے ہیں کہ ہم اس کے سچے اور مخلص مطیع ہیں تو سب سے بڑا اعزاز، وہ مالک جو ہم کو عطا کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اپنے گھر کی پاسبانی کے لیے ہمیں اپنا سنتری بنائے۔ کعبے کے اطراف ہم طواف کرتے ہیں یعنی بادشاہ کے گھر کی حفاظت کرتے ہیں۔ساری عمر یا روزانہ چوبیس گھنٹے پہرہ دینے کے بجائے سات مرتبہ طواف کرنا کافی قرار دیا گیا ہے۔سات کا عدد رمزیہ یا علامتی (Symbolic) ہے۔چنانچہ وقت جس کی ابتداء معلوم ہے نہ انتہا، اس لامحدود شے کو جب ہم نے شمار کی غرض سے محدود کرنا چاہا تو ہم نے سات ہی کا عدد استعمال کیا۔ہفتے میں سات دن ہوں گے، وہی سات دن بار بار اپنے آپ کو دہراتے رہیں گے اور بہت سی چیزیں مثلاً سبع السمٰوات وغیرہ۔سات کا ہندسہ بطور رمز غیر محدود کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔لہٰذا اللہ کے گھر کی پاسبانی کے لیے اگر ہم سات مرتبہ اس کے اطراف چکر لگائیں تو یہ ابدی طور پر اپنے فریضے کی انجام دہی کے ہم معنی ہو جاتا ہے۔قصر شاہی کی پاسبانی بڑا اعزاز ہے، اور انتہائی قابل اعتماد سپاہیوں کو عطا کیا جاتا ہے کیونکہ بادشاہ کی جان و مال گویا ان سنتریوں کے رحم و کرم پر منحصر ہوتی ہے۔یہ گفتگو حج کے ایک جز یعنی کعبے کی زیارت اور کعبے کے طواف کے متعلق تھی۔لیکن حج میں کچھ اور چیزیں بھی ہیں۔صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا اور چکر لگانا، اسی طرح عرفات کو جانا اور پھر منیٰ کو جانا۔چند الفاظ میں ان کے متعلق بھی عرض کروں گا کہ ان میں کیا رمز پایا جاتا ہے۔صفا اور مروہ کے متعلق آپ کو معلوم ہو گا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ ہے۔اللہ کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور اپنی بیوی حضرت ہاجرہ کو ایک بے آب و گیاہ صحرا میں تنہا چھوڑ کر چلے گئے اور جاتے وقت صرف ایک مشکیزہ پانی اور تھوڑی سی کھانے کی کوئی چیز دے گئے۔دو ایک دن بعد جب پانی اور غذا کا ذخیرہ ختم ہو گیا تو دودھ پیتا بچہ، حضرت اسمٰعیل علیہ السلام، پیاس سے بے قرار ہو کر رونے چلانے لگا۔حضرت ہاجرہ پانی کی تلاش میں نکلتی ہیں۔کسی طرف بھی پانی کے آثار نظر نہیں آتے۔قریب ہی ایک چٹان تھی، سوچا کہ اگر چٹان پر چڑھوں تو شاید ذرا دور سے جائزہ لے سکوں۔صفا کا پہاڑ ایک چھوٹی سی چٹان کی صورت میں اب بھی موجود ہے، اس پر چڑھتی

ہیں، آس پاس نظر ڈالتی ہیں، کہیں پانی نظر نہیں آتا۔ پھر دیکھتی ہیں کہ آگے ایک اور چٹان ہے جسے مروہ کا پہاڑ کہا جاتا ہے، دوڑتی ہوئی وہاں جا کر اس کے اوپر چڑھتی ہیں۔ آس پاس دیکھتی ہیں تو وہاں بھی کچھ میسر نہیں۔ماں کی مامتا مایوس نہیں ہوتی۔ واپس آتی ہیں بچے کو دیکھتی ہیں پھر صفا پہاڑ پر چڑھتی ہیں پھر مروہ پر چڑھتی ہیں۔کچھ نظر نہیں آتا۔ اس طرح سات مرتبہ چکر لگاتی ہیں وہی سات کا ہندسہ جو ابدیت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ساتویں مرتبہ جب بچے کے پاس آئیں تو دیکھا کہ بچے نے جہاں پیاس سے مجبور ہو کر اپنے ننھے سے پاؤں کی ایڑیاں زمین پر ماری تھیں، وہاں سے ایک چشمہ (زمزمہ) پھوٹ پڑا اور پانی نکل آیا۔ اس سے زیادہ تفصیل غیر ضروری ہے۔صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنے کو ارکان حج میں اس لیے شامل کیا گیا کہ یہ واقعہ ماں کی مامتا کی یادگار ہے اور ماں کی مامتا اس بے پناہ شفقت و محبت کی علامت ہے جو خالق کو اپنی مخلوق کے ساتھ ہے۔اس کے بعد حاجی مکے سے عرفات کو جاتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں روایت کے مطابق جنت سے زمین پر آنے کے بعد مدت کے بچھڑے ہوئے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی بیوی حضرت حوا کی دوبارہ ملاقات ہوئی تھی اور حضرت آدم علیہ السلام کا گناہ بھی اللہ تعالیٰ معاف کر دیتا ہے۔نسل آدم کے لیے ان کے جد اعلیٰ کی یہ سب سے اہم یادگار ہے۔ہم بھی انہیں کی طرح خدا سے مغفرت کی التجا کرتے ہیں۔ اس کے بعد منیٰ آتے ہیں۔ منیٰ کے متعلق روایت ہے کہ جب اللہ نے آزمائش کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو قربان کرنے کا حکم دیا تو انہوں نے اس حکم کی تعمیل منیٰ میں کی تھی۔لکھا ہے کہ وہ مکے سے اپنے بیٹے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چلے اور اللہ کے حکم سے بڑھتے بڑھتے مکے سے آگے تقریباً تین میل کے فاصلے پر منیٰ پہنچے۔شیطان نے جب اللہ کے ان بندوں کو رضائے الٰہی کی طلب میں سخت ترین آزمائشوں سے بھی بڑی خوشی سے گزرتے دیکھا تو انہیں بہکانے کے لیے انسان کی شکل میں نمودار ہوا۔ اولاً حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ کہا کہ تم نے خواب کی بات پر کیسے یقین کر لیا کہ اللہ تمہیں ایسا حکم دے رہا ہے۔ ممکن ہے خواب میں شیطان آیا ہو۔حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی فراست نبوی سے فوراً پہچان جاتے ہیں کہ یہ شیطان ہے۔چنانچہ مٹھی بھر سنگریزے زمین سے اٹھا کر اس کو پھینک مارتے ہیں۔ شیطان بھاگ کر غائب ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ایک نئی شکل میں پھر آتا ہے اور اس بار حضرت ہاجرہ کے پاس پہنچتا ہے اور کہتا ہے مائی تیرا شوہر تیرے اکلوتے بیٹے کو قتل کرنا چاہتا ہے لیکن حضرت ہاجرہ بھی شیطان کو پہچان جاتی ہیں، وہ بھی پتھریاں اٹھا کر مارتی ہیں اور اسے وہاں سے بھاگنے پر مجبور کرتی ہیں۔ شیطان غائب ہو جاتا ہے۔ پھر اس ننھے بچے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے پاس آ کر کہتا ہے کہ منے تیرا باپ

تیری گردن پر چھری پھیرنا چاہتا ہے، اس سے بہت تکلیف ہوتی ہے، باپ سے کہہ دو میں یہ نہیں چاہتا۔کم عمری کے باوجود حضرت اسمعیل علیہ السلام میں نبوت کی فراست تھی۔انہوں نے بھی شیطان کو پتھریاں پھینک کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔اس کے بعد کے واقف سے آپ واقف ہیں۔حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسمعیل علیہ السلام کو زمین پر منہ کے بل لٹاتے ہیں۔اپنی آنکھوں پر ایک پٹی باندھتے ہیں اور پورے عزم و استقلال سے بیٹے کی گردن پر چھری چلا دیتے ہیں۔پھر پٹی کھولتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیٹا تو کھڑا مسکرا رہا ہے اور اس کی جگہ ایک بھیڑ یا بکری تھی،جو ذبح ہو گئی تھی۔اللہ کو تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتحان لینا مقصود تھا۔انہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ میں رضائے الٰہی پر ہر چیز قربان کر دوں گا۔اللہ نے انہیں سخت ترین آزمائش میں ڈالا کہ بڑی منتوں اور مرادوں کے بعد تقریباً سو سال کی عمر میں جو پہلا بیٹا پیدا ہوا، اسی کو ذبح کرنے کا حکم دیا۔بندگی اور حق پرستی کا یہ کمال دیکھئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس آزمائش میں بھی پورے اترے۔سنت ابراہیمی کی ادائیگی کے لیے ہم منیٰ میں شیطان کو کنکریاں مارتے ہیں اور قربانی کرتے ہیں۔یہ بھی ارکان حج میں شامل ہے۔جن تین مقامات پر شیطان پر کنکریاں پھینکی جاتی ہیں اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل میں جو شیطانی وسوسے آڑے آتے ہیں ان کا مقابلہ کریں۔

زکوٰۃ کے بارے میں آج کچھ زیادہ عرض کرنے کا موقع نہیں ہے۔صرف اتنا کہوں گا کہ زکوٰۃ ارکان عبادات میں سے ایک ایسا رکن ہے جو مال کے ذریعے ادا کیا جاتا ہے۔اسلام دین اور دنیا کا جامع ہے (فی الدنیا حسنۃ و فی الاخرۃ حسنۃ) کی تعلیم دیتا ہے۔لہٰذا زکوٰۃ میں بھی مالی ایثار کے ذریعے سے اصلاح باطن کا پہلو اور معاشرے کی مادی فلاح و بہبود کا پہلو بھی موجود ہے۔اس کا کسی اور دن مفصل ذکر کروں گا، ان شاء اللہ۔

اب آخر میں میں تصوف کے متعلق بھی مختصراً کچھ عرض کروں گا۔جس حدیث شریف کا میں نے ابتداء میں ذکر کیا تھا۔اس میں حضرت جبرئیل نے رسول اللہ ﷺ سے اولاً ایمان کے متعلق سوال کیا، پھر اسلام کے متعلق اور پھر احسان کے متعلق۔احسان کے لفظی معنی کسی چیز کو حسن عطا کرنا، خوبصورت بنا دینا ہے۔زندگی کا کوئی کام ہو، اسے سنوارنا اور خوبصورت طریقے سے انجام دینا، یہی احسان ہے۔جب ہم اس لفظ کو مذہبی اصطلاح کے طور پر استعمال کرتے ہیں تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ احکام الٰہی کو سچے دل سے قبول کرنا اور عبادت میں خلوص پیدا کرنا۔ہمارے اسلاف نے اس اخلاص فی العمل کو "سلوک" اور "طریقت" کا نام دیا ہے۔سلوک اور طریقت دونوں کے معنی ہیں راستہ

چلنا اور اس سے مراد ہے اللہ کی طرف جانے کا راستہ۔ بعد میں اسی مفہوم کے لیے تصوف کا لفظ استعمال ہونے لگا۔ تصوف کی وجہ تسمیہ بیان کرنے میں بہت سی باتیں کہی گئی ہیں۔ یہاں اس بحث کا موقع نہیں ہے۔ البتہ رسول اکرم ﷺ نے احسان کی جو تعریف بیان کی ہے اس کا ذکر ضروری ہے۔ جب رسول اکرم ﷺ سے جبرئیل نے پوچھا کہ "احسان" کیا ہے؟ تو رسول اکرم ﷺ نے ایک ایسا جواب دیا جو اپنے اختصار اور معنی کی گہرائی کے باعث ایک معجزہ بیانی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "تم اللہ کی اس طرح عبادت کرو گویا کہ اللہ تمہارے سامنے موجود تمہاری حرکتوں کو دیکھ رہا ہے، اگرچہ تم اسے نہیں دیکھتے لیکن اللہ تمہیں دیکھتا ہے" بالفاظ دیگر حضور خداوندی کا تصور انسان اپنے اندر اس طرح لائے کہ اسے اللہ اپنے سامنے محسوس ہو گویا کہ اللہ اس کے ظاہر و باطن کو دیکھ رہا ہے۔ اگر ہم اپنے اندر حضور خداوندی کے تصور کو اتنا ترقی دے لیں کہ یہ تصور ہماری پوری شعوری زندگی پر حاوی ہو جائے تو ظاہر ہے کہ ہمارے لیے یہ قطعاً ناممکن ہوگا کہ اللہ کے احکام کی خلاف ورزی اور اس سے انحراف کریں۔ آقا سامنے موجود اور نگرانی کر رہا ہے تو کون سا غلام یا نوکر آقا کے احکام کی خلاف ورزی کی جرات کرے گا۔ یہ ہے تصوف کا خلاصہ۔ باقی ساری چیزیں ذیلی ہیں ہم اپنی اصلاح نفس اور اپنی روحانی قوتوں کو ترقی دینے کے لیے مختلف تدبیریں اختیار کر سکتے ہیں۔ مثلاً نفلی روزے رکھنا، تسبیح پڑھنا، نفل نمازیں پڑھنا وغیرہ وغیرہ۔ ان کا ذکر حدیثوں میں بھی آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے سب لوگوں کو ایک ہی طریقہ نہیں سکھایا یعنی نوافل کے سلسلے میں کسی کو کچھ اور کسی کو کچھ بتایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہر شخص کی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں۔ اس ضمن میں یہ عرض کر دوں کہ سعودی عرب کے علماء تسبیح پڑھنے کو بدعت قرار دیتے ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں یہ چیز نہیں تھی۔ ایک حبشی طالب علم، جس نے فرانس میں تعلیم پائی تھی اور آج کل جدہ یونیورسٹی میں ملازم ہے، اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تسبیح پڑھنا جائز ہے؟ میں سے اس بارے میں کبھی تحقیق نہیں کی تھی لیکن رسول اللہ ﷺ کے زمانے کا ایک واقعہ یاد آیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ایک دعا مجھے دو ہزار مرتبہ روزانہ سونے سے پہلے پڑھنے کی تاکید فرمائی تھی۔ دو ہزار ایک ایسا ہندسہ ہے جس کا انگلیوں پر شمار کرنا مشکل ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ ذہین آدمی تھے، انہوں نے ایک ڈوری لی اور اس میں دو ہزار گرہیں ڈال لیں۔ اس کے ذریعے وہ تسبیح پڑھا کرتے تھے۔ اب چاہے تو اس تسبیح میں گرہیں ہوں یا اس کے اندر منکے ہوں یا کوئی اور چیز ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ واقعہ میں نے اس حبشی طالب علم کو لکھ کر بھیجا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ مطمئن ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے ایک اور حدیث ملی جو صحیح بخاری میں ہے۔ وہ یہ کہ ایک

مرتبہ رسول اللہ ﷺ ایک عورت کے پاس سے گزرے جس نے اپنے سامنے کنکریوں کا ایک ڈھیر رکھ لیا تھا۔ وہ درود پڑھا کرتی تھی، ایک کنکری اٹھاتی اور درود پڑھ کر ادھر ڈال دیتی۔ اس کے بعد دوسری کنکری اٹھاتی۔ کنکریوں کا ڈھیر گویا اس کی تسبیح تھی۔ یہ ایک غیر ترقی یافتہ (Primitive) طریقہ ہے۔ لیکن مقصود یہی ہے کہ ہم اپنے انجام شدہ کام کی صحیح مقدار بھول نہ جائیں اور اس ذریعہ سے معلوم ہوتا رہے کہ کتنا کام ہو چکا ہے اور کتنا کام باقی ہے۔ رسول اللہ ﷺ صحابہ کو جن چیزوں کی تاکید کرتے تھے ان میں نفل روزے بھی تھے اور نمازیں بھی، درود اور وظائف بھی اور مختلف موقعوں پر پڑھنے کی مختلف دعائیں بھی۔ ہر صحابی اپنی صلاحیت اور قابلیت کے مطابق مختلف طریقے اختیار کرتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں سلوک اور تصوف کی حقیقت بس یہی تھی۔ بعد کے زمانے میں تصوف میں دوسرے تصورات بھی شامل ہونے لگے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے مسائل پر بحثیں ہونے لگیں۔ ان چیزوں کو نبوی تصوف سے کوئی تعلق اس بناء پر نہیں ہے کہ یہ بحثیں رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں نہیں پائی جاتیں۔ بلکہ بعد کے لوگوں کی پیدا کردہ ہیں۔ اسلامی تصوف وہی ہے جس کی تفسیر رسول اللہ ﷺ نے اس معجزانہ جملے کے ذریعے فرمائی کا اللہ کی عبادت یعنی اللہ کے احکام کی تعمیل اس طرح کرو گویا اللہ حاضر و ناظر ہے، ہمارے اعمال اور ہمارے خیالات ہر چیز کو دیکھ رہا ہے، اگرچہ ہم اسے نہیں دیکھ سکتے۔ خدا حافظ !

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## سوالات وجوابات

برادران کرام! خواہران محترم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ!

متعدد سوالات جو آپ کی طرف سے آئے ہیں ان کے جوابات دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

**سوال 1:** اسلامی عقائد کے مطابق قسمت، تقدیر، مقدر کے معنی واضح کریں مثلاً ایک آدمی پانی میں ڈوب کر مرتا ہے تو کہتے ہیں کہ اس کی موت ایسے ہی لکھی گئی تھی۔دوسری مثال یہ ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو قتل کر دیتا ہے، مقتول کی قسمت ایسی لکھی گئی تھی۔کیا قاتل کے مقدر میں نہیں ہے کہ وہ دوسرے مسلمان کو قتل کرے گا؟ اگر قسمت ایسی تھی تو روز آخرت اس کی سزا کیوں ہے؟ فرمان خداوندی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر درخت کا پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔وضاحت کریں۔آپ نے فرمایا کہ برائی اور بھلائی Automatic ہیں لیکن ایک بات مد نظر رکھیں گے بھلائی کے لیے انسان کو قربانی دینا پڑتی ہے، تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے۔برائی میں انسان کو لذت نصیب ہوتی ہے۔ دنیاوی تکلیف کا صلہ ضرور ملنا چاہیے اور دنیاوی ناجائز عیش و عشرت کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

**جواب:** معلوم نہیں میرے دوست نے میری پوری تقریر سنی ہے یا نہیں؟ کیونکہ تقدیر کے متعلق میں کافی تفصیل سے اپنے خیالات واضح کر چکا ہوں اور یہ بھی عرض کر چکا ہوں کہ یہ ایک طرح کا مخمصہ (Dilemma) ہے۔ہم اس مسئلے کا نہ ایک پہلو لے سکتے ہیں، نہ دوسرا پہلو جو پہلو بھی اختیار کریں گے، اس پر اعتراضات ہوں گے اس کا کوئی حل نہیں ملتا۔اس لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ خدا کے سامنے ہم ذمہ دار ہیں، یہ بھی صحیح ہے۔خدا ہر چیز پر قادر ہے، بشمول ہمارے لیے ہمارے اعمال کو مقرر کرنے کے، وہ بھی اپنی جگہ برقرار ہے۔یہ دونوں کس طرح ہیں، مجھے دوبارہ دہرانے کی ضرورت نہیں لیکن ایک بات کو میں دہرائے دیتا ہوں۔ہم لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ میں برائی کروں تو مجھے

سزا کیوں دی جاتی ہے جبکہ خدا اس کو مقرر کرتا ہے۔میں نے کہا تھا کہ بھلائی کا بھی یہی حال ہے، بھلائی بھی ہمارے مقدر میں ہے۔اگر میں اس کو کرتا ہوں تو مجھے اس کی جزا پانے اور جنت میں جانے کا حق کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے اسی سیاق و سباق Context میں ذکر کیا تھا۔

**سوال2:** ڈارون کا نظریہ ارتقاء اگر سائنسی نقطہ نظر سے صحیح ہے تو اسلام اور سائنس میں تضاد ہے۔آپ اس تضاد کو حل کرنے کے بارے میں ارشاد فرمائیں۔

**جواب:** آپ نے یہ پہلے ہی فرض کر لیا ہے کہ ڈارون کے نظریے کو اسلام نے رد کر دیا ہے اس کو ثابت کرنا آپ پر واجب ہے۔بعد میں دیکھیں گے کہ یہ چیز اسلام کے موافق ہے یا مخالف۔ میں عرض کروں گا کہ ڈارون کا نظریہ ہمارے ہاں بعض اوقات اس لیے پیچیدگی پیدا کرتا ہے کہ ہم فرض کرتے ہیں کہ ڈارون ایک ملحد تھا، خدا کو نہیں مانتا تھا، حالانکہ ڈارون کی سوانح عمری پڑھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ خدا کا قائل تھا۔جب اس نے اپنے آبائی فن علم طب کی تعلیم مکمل کر لی، ڈاکٹر بن گیا تو یکایک کایا پلٹ گئی۔دنیا سے وہ نفور ہو گیا اور خدا کی طرف مائل ہوا۔چنانچہ کیمبرج یونیورسٹی میں اس نے عیسائی مذہب کی تعلیم حاصل کی جہاں طلباء کو تقابل ادیان (comparative religion) کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔یہاں ڈارون نے اسلام کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے عربی زبان بھی پڑھی تھی۔ اس کے خطوط کا جو مجموعہ شائع ہوا اس میں کئی خط اس نے اپنے عربی کے استاد کے نام لکھے ہیں اور بے حد ادب و احترام سے اس کا نام لیا ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ اس زمانے میں کیمبرج یونیورسٹی میں عربی نصاب کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان میں یا تو "اخوان الصفا" کے اقتباسات ہوں گے یا ابن مسکویہ کی "الفوز الاصغر" کے انتخابات۔ان دونوں کتابوں میں ارتقاء کا نظریہ بیان کیا گیا ہے اور آپ کو معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ ان مسلمان مؤلفوں کی زندگی میں کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور کبھی انہیں کافر قرار نہیں دیا گیا۔اخوان الصفا اور ابن مسکویہ کی الفوز الاصغر، تیسری چوتھی صدی ہجری کی کتابیں ہیں۔ان میں لکھا ہے کہ خدا پہلے مادہ کو پیدا کرتا ہے اور اس مادہ کو ترقی کی قوت عطا کرتا ہے۔لہٰذا مادہ اولاً غبار یا دھوئیں کی صورت اختیار کرتا ہے پھر ترقی کرتے ہوئے پانی کی صورت اختیار کرتا ہے، پھر ترقی کرتے ہوئے جمادات کی صورت اختیار کرتا ہے۔جمادات ترقی کرتے ہوئے مختلف قسم کے پتھر بنتے ہیں اور بالآخر وہ مرجان کی صورت اختیار کرتے ہیں جو ہوتے تو پتھر ہیں لیکن ان میں درخت کی سی شاخیں ہوتی ہیں۔پھر جمادات کے

بعد نباتات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔درخت ترقی کرتے جاتے ہیں اور سب سے آخری مرحلے میں ایسا درخت ملتا ہے جو جانور کی خصوصیات سے بہت قریب ہوتا ہے۔یہ ہے کھجور کا درخت۔اور درختوں کے مقابلے میں کھجور کے درخت میں نر اور مادہ الگ الگ ہوتے ہیں اور درختوں کے بالمقابل جن کی ساری شاخیں بھی اگر ہم کاٹ دیں تو درخت مرتا نہیں، کھجور کا سر کاٹ دیں تو درخت مر جاتا ہے۔اس لیے کھجور کے درخت کو اعلیٰ ترین پودے اور ادنیٰ ترین حیوان سے مشابہت ہے۔پھر اس کے بعد ادنیٰ ترین قسم کا حیوان پیدا ہوتا ہے وہ ترقی کرتے کرتے کیا بنتا ہے۔ابن مسکویہ بیان کرتا ہے اور "اخوان الصفا" میں بھی وہی بیان کیا گیا ہے کہ وہ بندر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔یہ ڈارون کا بیان نہیں یہ مسلمان حکماء کا بیان ہے۔پھر اس کے بعد ترقی کرتا ہے تو ادنیٰ قسم کا انسان بنتا ہے۔وحشی انسان، وہ ترقی کرتے کرتے اعلیٰ ترین انسان بنتا ہے۔یہ بشر ولی اور پیغمبر ہوتا ہے، پھر اس سے بھی ترقی کر کے فرشتہ بنتا ہے۔پھر فرشتوں کے بعد ذات باری تعالیٰ خدا کی ذات ہوتی ہے۔ہر چیز خدا سے شروع ہو کر پھر خدا ہی کی طرف جاتی ہے۔و الیہ المرجع و الماب یہ ہے ہمارے حکماء کا بیان۔جب یہ چیزیں مسلمان حکماء نے بیان کیں اور ان پر مسلمان فقہاء نے ان کی زندگی میں کبھی کفر کا فتویٰ نہیں دیا تو اس کو اسلام کے خلاف قرار دینا ایک غور طلب بات ہے۔میں آگے چلتا ہوں قرآن مجید میں آدم علیہ السلام کی پیدائش کے متعلق یہ ضرور بیان کیا گیا ہے کہ اللہ نے انہیں مٹی سے پیدا کیا۔ہمارا تصور یہ ہے کہ اللہ ایک کمہار کی طرح مٹی کو لیتا ہے اور اس کی مورت بناتا ہے اس کے اندر روح پھونکتا ہے اور حضرت آدم علیہ السلام بن جاتے ہیں۔ممکن ہے ایسا ہوا ہو میں انکار نہیں کر سکتا لیکن آپ ان آیتوں (37:18، 5:22، 11:35، 67:40) کو کیا کریں گے جن میں بار بار یہ کہا گیا ہے کہ اللہ نے انسان کو "مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا"۔ظاہر ہے کہ مٹی سے کبھی نطفہ پیدا نہیں ہوتا۔حیوان اور انسان سے نطفہ نکلتا ہے۔اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اللہ نے سارے درمیانی مدارج کی تفصیل کو وہاں حذف کر دیا اور کہا کہ مٹی تمہاری اصل ہے اور تمہاری پیدائش کا آخر وسیلہ تمہارے باپ کا نطفہ ہے جو تمہاری ماں کے رحم میں رہتا ہے اور اس طرح تم پیدا ہو جاتے ہو۔ایک آیت (14:71) کو لیجیے۔ قَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا (خدا نے انسان کو طور بہ بطور پیدا کیا) "طور" وہی لفظ ہے جس سے تطور (Evolution) کا لفظ بنایا گیا ہے۔خدا نے انسان کو طور بہ طور پیدا کیا، اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ خدا نے انسان کو اولاً جمادات کی شکل میں بنایا، پھر وہ جمادات ترقی کرتے ہوئے نباتات بنتے ہیں، پھر حیوان بنتے ہیں۔غرض اس میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا، شاید آپ کی واقفیت کے لیے ایک چیز عرض کروں کہ آپ کی یونیورسٹی لائبریری میں ایک چھوٹا سا مضمون عربی زبان

میں آپ کو ملے گا جس کا عنوان ہے "خلق الکائنات و تطور الانواع حسب آراء المفکرین المسلمین" اسے آپ دیکھ سکتے ہیں جس میں آپ کو یہ ساری تفصیلیں ملیں گی۔اس میں بہ کثرت مسلمان عالموں اور صوفیوں کے بیانات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

**سوال3:** کیا اسلام میں روحانیت و مادیت برابر ہیں یا روحانیت زیادہ اور مادیت کم؟ پھر کیا روح کو دلائل سے ثابت کیا جا سکتا ہے؟

**جواب:** مجھے اس بارے میں ماہر اور متخصص ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں۔لیکن میں کہوں گا کہ انسان جب روح اور جسم دونوں سے بنایا گیا ہے تو ان دونوں پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔جسم کے لیے ہم کھاتے ہیں، پیتے ہیں، سوتے ہیں، آرام کرتے ہیں، غرض مختلف کام سر انجام دیتے ہیں۔ایک ہماری روح بھی ہے اس کے لیے بھی ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہے تاکہ اس کی زندگی برقرار رہے۔وہ اسی طرح زندہ رہے جس طرح ہمارا جسم زندہ رہتا ہے۔لہٰذا قرآن کریم نے اور رسول اللہ ﷺ نے جب ہمیں حکم دیا کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، زکوٰۃ دو، حج کرو تو اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں ہی چیزوں کا ذکر کیا گیا، مادے کا بھی اور روح کا بھی۔ان میں کیا تناسب ہوگا، میں نہیں جانتا، لیکن میں عرض کروں گا کہ جس طرح چوبیس گھنٹے میں پانچ نمازیں یعنی چوبیس منٹ اپنی روح کے لئے خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور باقی سارا وقت ہمیں دیا گیا ہے جس طرح چاہو، صرف کرو۔چاہے محض مادیت کے لیے صرف کرو یا مادیت اور روحانیت دونوں کے لیے، یہ انفرادی چیز ہوگی اور اس کے لیے کوئی حکم یا تعین شریعت کی طرف سے نہیں۔شریعت کا حکم صرف یہ ہے کہ اپنی روحانی زندگی کے لیے روزانہ مثلاً پانچ وقت نمازیں پڑھو اور بعد میں سارا باقی وقت میری مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔میں ہی انتخاب کروں گا کہ مجھے روحانیت پر توجہ کرنی چاہیے یا نہیں کرنی چاہیے۔

**سوال 4:** عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ نفسیات مذہب کی بیخ کنی کرتی ہے، کیا یہ صحیح ہے؟

**جواب:** میں نہیں جانتا کہ آپ ان دونوں میں تضاد کیوں پاتے ہیں۔نفسیات کے معنی صرف یہ ہیں کہ انسان خاص کر دوسرا انسان جو کام کرے گا اس کا اندازہ ہم پیش بینی سے کر لیتے ہیں اور اس کے مطابق اس سے نپٹنے کی کوشش

کرتے ہیں۔یہ چیز مجھے اسلام کے خلاف نظر آتی اگر آپ اس کی توضیح کر سکتے کہ کس نقطہ نظر سے آپ اسے اسلام کی بیخ کنی کرنے والا علم کہتے ہیں تو شاید میں کوئی جواب دے سکتا۔

**سوال5:** آپ نے فرمایا کہ جب رسول اللہ ﷺ پر وحی آتی تھی تو آپ کا وزن بڑھ جاتا تھا۔ایسا تو اکثر ہوتا ہے کہ جب انسان کسی مسئلے پر سوچ رہا ہو تو آس پاس کا علم نہیں ہوتا۔مگر وزن بڑھنے کی کیا وجہ ہے؟ براہ کرم اس کا جواب ضرور دیں۔

**جواب:** میں آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ وحی کی ماہیت معلوم کرنے کے لیے جن قابل ترین مغربی لوگوں نے کوشش کی انہیں سوائے اس کے کوئی جواب نظر نہیں آیا کہ وحی ایک بیماری ہے لیکن جب بیماری سے اس کو مشابہ قرار دیتے ہیں تو اس کی علامتیں وحی کی صورت میں نظر نہیں آتیں۔میں نے بتایا تھا کہ حضور ﷺ کا وزن بڑھ جاتا تھا، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا تجربہ صحابہ کو ہوا تھا۔ایسا کیوں ہوتا تھا؟ یہ ہمارے لیے بیان کرنا ناممکن ہے، اس لیے یہ چیز صرف نبی کو پیش آتی ہے۔ہم آپ کو پیش نہیں آئی۔اس کی کوئی توجیہ نہیں کر سکتا سوائے اس کے کہ ایک واقعے کا اظہار کروں کہ جب وحی آتی تو رسول اللہ ﷺ کے جسم مبارک میں اتنا وزن ہو جاتا تھا کہ اونٹنی بھی آپ کا وزن برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

**سوال6:** آپ نے فرمایا کہ ہندوؤں کے ہاں جنت و دوزخ کا تصور نہیں ملتا تو ان کے ہاں سرگ اور نرک سے کیا مراد ہے؟ کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں کے ہاں تصور یہ ہے کہ عالم ارواح قدیم ہے اور نئی روح پیدا نہیں ہوتی بلکہ وہی ارواح تناسخ یا جونی چکر یا آواگون کے نام سے دوسرے اجسام میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے اس عمل کو Transmigration of Soul بھی کہتے ہیں۔براہ کرم اس کی صحیح حقیقت اور روح کے اسلامی تصور پر روشنی ڈالیے۔

**جواب:** میں اس کے متعلق صرف اس کے سوا کیا عرض کروں کہ روح کے متعلق جب رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا تو رسول اللہ ﷺ جواب نہ دے سکے۔انتظار کرنے پر وحی آئی (وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلرُّوحِ ۖ قُلِ ٱلرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّى) (آپ سے پوچھا جاتا ہے کہ روح کیا ہے؟ کہہ دیجیے کہ وہ اللہ کے حکم سے ہے) اس سے زیادہ تفصیل وہاں نہیں ملتی اور اس کے سوا میں کوئی چیز بیان کرنے کے قابل نہیں ہوں۔باقی ہندوؤں کے ہاں سرگ اور نرک وغیرہ کے تصورات کی

طرف آپ نے جو اشارہ کیا ہے ان کی نوعیت اور تفصیل سے میں ناواقف ہوں۔میں نے کہا کہ ہندوؤں کے مذہب میں بہت سی چیزیں ملتی ہیں۔توحید کے تصورات بھی ملتے ہیں، توحید کے خلاف چیزیں بھی ملتی ہیں، چنانچہ سرگ اور نرک کا تصور ایک مخصوص مفہوم رکھتا ہے۔اس سے مراد مسلمانوں کے ہاں کی ایسی جنت جس میں حوریں بھی ہوں، جس میں کھانے کو پرندوں کا گوشت بھی ملتا ہو، جہاں شراب اور شہد اور دودھ کی نہریں بہتی ہوں، اس طرح کی چیزیں ان کے ہاں نہیں ملتیں۔یہی حال سزا کے متعلق ان کے تصورات میں ہے جن کو وہ "نرک" کے نام سے ادا کرتے ہیں۔ظاہر ہے کہ ان کی کیفیت نہ مسلمانوں کو معلوم ہے، نہ عیسائیوں، نہ کبھی تم نے سنا نہ کبھی میں نے ایسی کوئی چیز دیکھی ہے، نہ ان کا تصور تمہارے ذہن میں آ سکتا ہے۔اس کے سوا کوئی چیز عرض کرنے کا اپنے آپ کو اہل نہیں پاتا۔

**سوال7:** درج ذیل آیت قرآنی میں مسجدوں کے ساتھ یہود و نصاریٰ کی عبادت گاہوں یعنی گرجاگھروں، کلیساؤں اور خانقاہوں کا ذکر بھی ہے، جن میں کثرت سے اللہ تعالیٰ کا نام لیا جاتا ہے۔براہ کرم وضاحت فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کو غیر مسلموں کی عبادت بھی اسی طرح پسند ہے جس طرح مسلمانوں کی؟ ﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا﴾ (۲۲:۴۰)

**جواب:** یہاں گرائمر کے لحاظ سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا " يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا " (وہاں اللہ کا بہت نام لیا جاتا ہے) اس کا تعلق آخری لفظ سے ہے یا سارے بیان کردہ مقامات سے ہے۔یہ ایک سوال ہے جس کو میں حل نہیں کر سکوں گا۔باقی اصل سوال کا جواب میں یہ دوں گا کہ جس زمانے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہیں آئے تھے۔اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قانون انسانیت کے لیے رائج تھا اور انسانوں کے لیے لازمی تھا کہ یہودیوں کی یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے مطابق عمل کریں، اور یہی صحیح عبادت تھی۔جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آ گئے تو ضروری تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے مطابق لوگ عمل کریں، مثلاً گرجاؤں میں عبادت کریں۔جب محمد ﷺ بھی آ گئے تو اب نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت واجب العمل رہی، نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت بلکہ حضرت محمد ﷺ کی شریعت پر عمل کرنے کی ضرورت ہوئی۔جنہوں نے مسجدوں میں نمازیں پڑھنے کا حکم دیا۔ان میں آپس میں کوئی تضاد نہیں اور اللہ حکم دیتا ہے کہ نئے نبی ﷺ کے آنے کے بعد سارے لوگ اسے قبول کر لیں لیکن یہ ضرور ہے کہ کچھ قبول کریں گے، کچھ قبول نہیں کریں گے۔ان میں جنگیں بھی ہوں گی اور خدا کہتا ہے

کہ ان جنگوں کے ذریعے سے اگر خدا ایسا نہ کرتا یعنی ایک آدمی دوسرے سے لڑ کر اپنی اپنی مدافعت کرتا، یا دوسرے کو شکست دے دیتا، ایسا نہ کرتا تو یہ عبادت گاہیں تباہ ہو جاتیں۔بہت سیدھی سادی بات ہے کہ فرض کیجیے مسلمانوں پر یہودی حملہ کریں اور مسلمان مدافعت نہ کریں تو ظاہر ہے وہ مسلمانوں کی مسجدوں کو تباہ کر دیں گے۔اسی طرح فرض کیجیے کہ کسی وجہ سے انتقامی یا دفاعی جنگ کے باعث مسلمان یہودیوں سے جنگ کرتے ہیں۔اگر یہودی اپنا مقابلہ نہ کر سکیں تو ظاہر ہے کہ مسلمان اور چیزوں کے ساتھ شاید ان کی عبادت گاہوں کو بھی ختم کر دیں گے۔خدا ہی ایک ملت کو دوسری ملت سے جنگی مقابلہ کرنے کی تلقین کرتا ہے۔اس ذریعے سے دنیا میں انسانوں کی حفاظت کا انتظام ہوا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اور چیزوں کی طرح تقدیر یہاں بھی کام کرتی ہے اور یہی تقدیر ہر انسان کو اجازت بھی دیتی ہے کہ اپنے وطن کی حفاظت کی خاطر مقابلہ کرے، چنانچہ مسلمانوں کو اجازت ہے کہ اگر کوئی اس پر حملہ کرتا ہے تو اس سے جنگ کرے، اس کو قتل بھی کرے، اس کو اسیر بھی کرے، اس کو لوٹ بھی لے اور اس طرح خدا کے نام کا بول بالا کرنے کی کوشش کرے۔یہ جنگ اپنی ذات کے لیے نہیں ہوگی بلکہ اس آیت کے مطابق (وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ) (190:2) جنگ اللہ کی راہ میں کرو۔یہ نہیں کہ اپنے لیے۔" قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ " کن لوگوں سے جنگ کرو؟ " الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ " جو تم سے جنگ کرتے ہیں لیکن اس جنگ کے باوجود تعدی نہ کرو اور یہ بھی کہ تعدی کرنے والوں کو اللہ پسند نہیں کرتا۔مسلمانوں کو بھی تنبیہ کر دی گئی ہے کہ کبھی یہ نہ سمجھ لینا کہ آخری دین کامل ہونے کے باعث تمہیں کوئی خصوصیت حاصل ہو گئی ہے۔تمہیں دراز دستی کی ہرگز اجازت نہیں۔فی امان اللہ!!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

# خطبہ ۷: عہدِ نبویؐ میں مملکت اور نظم ونسق

صدر محترم! محترم وائس چانسلر صاحب! محترم اساتذہ کرام! محترم مہمانان!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

قرآن مجید کے مطابق، مذہب اسلام کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ جسے اس آیت کریمہ (2:201) میں بیان کیا گیا ہے (رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً) یعنی اسلام دین و دنیا دونوں جہانوں کی بھلائی چاہتا ہے، دونوں عالم کے لیے کوشش کرنے کی اجازت دیتا ہے اور دونوں جہانوں میں کامیاب بننے کا راستہ بتاتا ہے۔ دین اسلام میں جہاں ایک طرف نماز، روزہ اور حج جیسی روحانی چیزوں کا ذکر ہے، وہاں زکوٰۃ کا ذکر بھی ہے، جو ایک مالی مسئلہ ہے لیکن اسے رکن ایمان اور رکن دین بنایا گیا ہے۔ آج میرے پیش نظر صرف یہ بتانا ہے کہ کن حالات میں پیغمبر اسلام ﷺ کو اس بات پر مجبور ہونا پڑا کہ ایک حکومت قائم فرمائیں۔ حکومت کی اقامت پر مجبور ہونے کا لفظ میں اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ نبی دنیا اور دنیوی اقتدار کا طالب نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود پیغمبر اسلام ﷺ ایک مملکت قائم کرتے ہیں اور اس مملکت کے حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے حکمرانی بھی فرماتے ہیں۔ یہ کن حالات میں ہوا اور کس طرح یہ مشکل کام انجام پایا؟ اور پھر اس مملکت میں، جس کا وجود ہی نہ تھا، ہر چیز کا نظم ونسق آپ ﷺ نے قائم کر دیا اور ایسا نظم ونسق چھوڑا کہ وہ آپ کے بعد صدیوں تک چلتا رہا اور نسل آدم آنحضرت ﷺ کے نظام جہاں بانی سے فائدہ اٹھاتی آ رہی ہے۔ بہر حال قبل اس کے اسلامی مملکت کے متعلق کچھ عرض کروں، غالباً بے محل نہ ہو گا کہ جزیرہ نمائے عرب میں رسول پاک ﷺ سے پہلے مملکت کی کیا صورت حال پائی جاتی تھی، اس کی طرف کچھ مختصراً اشارہ کروں۔

یہ حیرت انگیز بات ہے کہ شہر روما ہی نہیں، بلکہ ایتھنز شہر کے وجود میں آنے سے بھی پہلے جنوبی عرب خصوصاً یمن میں ایک مملکت پائی جاتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں عرب کا تمدن یورپ کے قدیم تمدنوں سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ جو مملکتیں یمن میں قائم کی گئی ہیں، ان کا نظم ونسق اچھا خاصا ترقی یافتہ نظر آتا ہے۔ یمن کے آثار قدیمہ اور وہاں کے کتبوں سے جو معلومات حاصل کی گئی ہیں، ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عربوں کو امور حکمرانی اور رعایا کے فلاح و بہبود کے انتظامات سے بہت دلچسپی رہی اور وہاں ایسے کارنامے وجود میں آئے کہ آج ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ ایک چھوٹے سے صحرائی ملک میں یہ کام کیسے انجام پائے؟ مثال کے طور پر قرآن مجید کی تلاوت کرنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ وہاں ایک مرتبہ "سیل العرم" کے سانحہ کا ذکر ہے، جو یمن میں رونما ہوا تھا۔ ایک مقام پر دریا میں بند باندھ کر ایک بہت بڑا تالاب بنایا گیا تھا۔ بند ٹوٹ جانے سے زبردست سیلاب آیا اور بہت نقصان ہوا تھا۔ وہاں کی رعایا کو ترک وطن کر کے دیگر علاقوں میں بسنے پر مجبور ہونا پڑا۔ وہ تالاب جو آج بھی یمن میں موجود ہے، اپنی اس شکست حالت میں بھی اتنا عظیم الشان ہے کہ اس کی مرمت کے لیے کئی ارب روپے درکار ہیں۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب قدیم یونان کا مشہور شہر ایتھنز بھی وجود میں نہیں آیا تھا۔ بہر حال عرض کرنا یہ ہے کہ یمن میں ملکہ بلقیس کی حکمرانی تھی جو حضرت سلیمانؑ کی ہم عصر تھی۔ اس کے بعد عرصہ دراز تک مختلف حکمران وہاں حکومت کرتے رہے اور وہاں کی فطری زرخیزی اور مختلف قیمتی پیداواروں کی وجہ سے اس ملک پر ایشیا، یورپ اور افریقہ، غرضیکہ ہر طرف سے حملے بھی ہوتے رہے۔ چنانچہ یونانیوں نے بھی یمن پر حملہ کیا اور ان کے یونانی کتبے آج تک یمن میں بعض مقامات پر ہمیں ملتے ہیں۔ عہد نبویؐ سے پہلے حبشہ کے بادشاہ نے وہاں کے حکمرانوں کو شکست دے کر یمن پر قبضہ کر لیا۔ کہتے ہیں کہ وہاں جو عیسائی حبشی بادشاہ تھا، اس نے اپنے پایۂ تخت صنعاء میں ایک عظیم الشان گرجا بھی بنایا تھا۔ اسے جلن یہ ہوئی تھی کہ لوگ صحرا کے بے آب وگیاہ شہر مکہ میں حج کے لیے کیوں جاتے ہیں؟ چنانچہ اس بادشاہ نے ایک فوج تیار کرائی اور کعبہ کو ڈھانے کے عزم سے مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ قرآن مجید کے "سورۂ فیل" (105) میں اسی کا ذکر ہے۔ ہمارے مورخ لکھتے ہیں کہ جس سال اصحاب الفیل کا مکہ پر حملہ ہوا اسی سال رسول اکرم ﷺ کی ولادت ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ حملہ یمن کے مقامی لوگوں کی مرضی کے خلاف ہوا تھا۔ یمن میں حبشیوں کی حکومت تھی جو اجنبی لوگ تھے۔ چنانچہ مقامی یمنی باشندوں نے حبشیوں کے تسلط سے آزاد ہونے کے لیے ایک قومی تحریک شروع کی اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے یمن کے سردار ایران گئے، اور ایران کے بادشاہ سے مدد کی درخواست کی۔ اس روایت کے دلچسپ الفاظ یہ ہیں کہ ایک سردار نے کسریٰ سے کہا کہ ہمارے ملک پر کوؤں نے قبضہ کر لیا ہے، آپ ہمیں مدد دیجیے۔ اس نے پوچھا کون سے کوے؟ ہندوستان کے کوے یا افریقہ کے؟ کسریٰ نے خیال کیا کہ عرصے سے جو تمنا تھی کہ میں یمن پر قبضہ کروں، اب یہ موقع ہاتھ آیا ہے، اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ لہٰذا اس نے فوج سے مدد کی، جنگ میں حبشیوں کو شکست دی اور اس

علاقے پر ایرانیوں کے ماتحت مقامی سردار کی سربراہی میں حکومت قائم ہوئی۔ اس زمانے میں مکہ سے عبد المطلب یمن جاتے ہیں اور اس حکمران کو اپنی طرف سے اور اپنے ملک کی طرف سے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ اس کی تفصیل ہمیں ملتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یمن اور مکہ کے تعلقات بہت قریبی تھے۔

یمن میں یمنی حکمران برائے نام حاکم تھا۔ جلد ہی ایرانیوں نے اپنے قبضے اور اپنی فوج کی موجودگی سے بے جا فائدہ اٹھا کر اسے بے دخل کر دیا اور خود ہی وہاں حکومت کرنے لگے۔ عہد نبویؐ کے دورِ آخر میں جب یمن میں اسلام کی اشاعت ہوئی تو اس زمانے میں ایران میں ایرانی حکومت ضعف و انحطاط کا شکار ہو چکی تھی۔ اس صورتحال سے فائدہ اٹھا کر یمنیوں نے ایران کے خلاف بغاوت کی۔ اس وقت یمن کا جو ایرانی گورنر تھا، اس نے اسلام قبول کر لیا۔ اس طرح اس نے اپنے آپ کو اور اپنے ہم نسل ایرانی ساتھیوں کو، جو یمن میں تھے، بچانے کی کوشش کی، جس سے یمن میں ایک انٹرنیشنل پیچیدگی پیدا ہو گئی۔ اس پہلو پر بحث کا موقع نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ عرب میں قدیم ترین حکومتیں ہمیں یمن میں نظر آتی ہیں اور صرف وہیں نہیں اور مقامات پر بھی حکومتوں کا پتہ چلتا ہے۔

اب میں مکے کی طرف آتا ہوں کیونکہ یہاں پر رسول اکرم ﷺ کی ولادت ہوئی۔ ہم اولاً یہ معلوم کریں گے کہ وہاں کوئی حکومت تھی یا نہیں؟ اگر تھی تو کس قسم کی حکومت تھی؟ مکہ کے متعلق آپ سب اچھی طرح واقف ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس شہر کی بنا ڈالی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کو جب اللہ نے حکم دیا کہ اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی ماں حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کو فلسطین سے لا کر اس بے آب و گیاہ میدان میں چھوڑ دیں تب وہاں کوئی آبادی نہیں تھی۔ حضرت ابراہیمؑ واپس چلے جاتے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد حضرت اسمٰعیل کو پیاس محسوس ہوتی ہے۔ جہاں وہ پیاس کی شدت سے ایڑیاں رگڑ رہے تھے وہیں زمزم کا چشمہ ابل پڑتا ہے۔ اتفاق سے ایک قافلہ ادھر سے گزر رہا تھا۔ پانی کے آثار دیکھ کر قافلے والے وہاں ٹھہر جاتے ہیں۔ پھر وہاں پانی کی کثرت کی خبر سن کر اور لوگ بھی آ کر بسنے لگتے ہیں۔ رفتہ رفتہ آبادی بڑھنے لگتی ہے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اپنی ماں کے ساتھ وہیں رہتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد ان کی شادی مقامی عرب قبیلے کے ایک گھرانے سے ہوتی ہے اور اس قبیلے کی آبادی مکے میں پھیلتی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں اب تک ایک اہم واقعہ، یعنی کعبے کی از سرِ نو تعمیر کا ذکر کرنا ہے۔ اسلامی روایت کے مطابق جب حضرت آدم علیہ السلام دنیا میں آئے اور جنت کی جگہ زمین پر رہنے لگے تو یہاں ان کو ایک طرح کی کمی محسوس ہوئی۔ وہ جنت میں دیکھتے تھے کہ فرشتے خدا کی عبادت کے لیے بیت المعمور کے اطراف طواف کرتے ہیں، زمین پر کوئی عبادت گاہ موجود نہیں تھی۔ انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ مجھے عبادت گاہ کی نعمت سے محروم نہ رکھا جائے۔ چنانچہ اللہ نے فرشتوں کو آدم علیہ السلام کے لیے مامور کیا کہ زمین پر بھی بیت المعمور کی طرح عبادت

گاہ تعمیر کی جائے۔ فرشتوں نے زمین پر بھی بیت المعمور کے عین نیچے ایک مقام کا انتخاب کیا اور وہاں کعبہ کی تعمیر کی۔ حدیث میں علامتی طور پر (symbolically) یہ الفاظ ہیں کہ اگر بیت المعمور سے کوئی پتھر پھینکا جائے تو سیدھے کعبے کی چھت پر گرے گا۔ یہ کعبہ جو حضرت آدم علیہ السلام کے لیے بنایا گیا وہ زمین پر حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان کے زمانے تک قائم رہا۔ طوفان کے بعد اس کے کوئی آثار باقی نہیں رہے۔ ضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں اس کی تعمیر جدید کا کوئی پتہ نہیں چلتا لیکن ان کے بعد جو بڑے پیغمبر آئے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے۔ اللہ نے انہیں حکم دیا کہ کعبہ کو از سر نو تعمیر کریں۔ انہوں نے آمنا و صدقنا، سر آنکھوں پر، لیکن مجھے معلوم نہیں کہ پہلا کعبہ کس مقام پر واقع تھا؟ اللہ نے کہا دیکھو، تمہارے سامنے بادل کا جو ٹکڑا اس وقت حرکت کرتا ہے، تم اس کے سائے کے پیچھے پیچھے چلو اور جس مقام پر سایہ رک جائے گا، وہی مقام ہے جہاں کعبہ تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس سائے کے پیچھے چلتے گئے۔ بالآخر وہ اس مقام پر پہنچے جہاں اب کعبہ ہے اور یہاں بادل نے حرکت ختم کر دی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سائے کے طول و عرض پر نشان لگائے اور یہ تھا کعبہ کا خاکہ۔ انہوں نے وہاں تھوڑی سی کھدائی کی تو پرانی بنیاد کے آثار وہاں موجود ہیں۔ اسی بنیاد پر انہوں نے نئی عمارت کی تعمیر شروع کر دی۔ اس وقت ان کے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام بھی بڑے ہو چکے تھے۔ چنانچہ اپنے بیٹے کی مدد سے انہوں نے وہاں چار دیواروں سے گھیر کر ایک بہت ہی سادہ قسم کی عمارت بنائی۔ جب وہ دیواریں قد سے بھی اونچی ہونے لگیں تو اس وقت انہیں ضرورت پیش آئی کہ دیواروں کو مزید بلند کرنے کے لیے کوئی سہارا لیا جائے۔ چنانچہ وہ ایک پتھر پر کھڑے ہو کر کعبہ کی تعمیر کرنے لگے۔ یہ پتھر "مقام ابراہیم" کے نام سے آج بھی موجود ہے۔ ایک زمانے میں وہ کعبہ کے عین سامنے دیوار کے پاس تھا، جہاں کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام عمارت بناتے تھے۔ اسلامی مورخ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ طغیانی آئی تو یہ پتھر بہہ گیا اور بہت مشکل سے دستیاب ہوا۔ تب اس کو پرانے مقام پر رکھنے کے بجائے کعبہ کے اندر رکھ دیا گیا۔ پھر کچھ زمانے کے بعد اس کو نکالا گیا اور ایک دوسرے مقام پر رکھ دیا گیا اور اب سعودی دور میں تازہ ترین صورتحال یہ ہے کہ کعبے کے سامنے اس کو ایک کانچ کے صندوق کے اندر بند کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ بہرحال حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک عبادت گاہ تعمیر کی اور اس کو خدائے واحد کا مکان (بیت اللہ) قرار دیا۔ بائبل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے اس میں لکھا ہے کہ جب وہ عراق سے ترک وطن کر کے فلسطین آئے تو انہوں نے مختلف مقامات پر "بیت ایل" تعمیر کیے۔ "بیت" وہی لفظ ہے جو عربی میں ہے اور "ایل" کے معنی ہیں "اللہ کا گھر۔ بائبل کے مطابق انہوں نے فلسطین کے بہت سے مقامات پر اللہ کی عبادت گاہیں تعمیر کیں اور مقامی باشندوں کو بتایا کہ اپنے پروردگار اور خالق کی کس طرح عبادت کریں۔

یہ مقامِ حیرت نہیں کہ جب ابراہیم علیہ السلام اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ عرب میں آئے تو مکہ میں اس بچے اور اس کی اولاد کے لیے اور دوسرے رشتہ داروں کے لیے بھی انہوں نے ایک "بیت ایل" یا بیت اللہ تعمیر کیا جو اب تک چلا آتا ہے۔ قرآن مجید (إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ 96:3) میں ذکر ہے کہ کعبہ دنیا میں وہ قدیم ترین عبادت گاہ ہے جو اللہ کے لیے تعمیر کی گئی ہے۔ اگر ہم یہ بیان ان معنوں میں لیں کہ وہ قدیم ترین گھر جو اب تک دنیا میں موجود ہے تو اس میں کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا لیکن اگر یہ کہیں کہ سب سے پہلے جو گھر تعمیر کیا گیا وہ کعبہ ہے تو اس لحاظ سے اعتراض ہو گا کہ آخر اور بھی تو پیغمبر دنیا میں آ چکے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ادریس علیہ السلام وغیرہ ہوئے ہیں ان کے زمانے میں بھی اللہ کی عبادت و اطاعت ہوتی تھی اور ان کے ہاں بھی کوئی عبادت گاہ ہو گی جو کعبہ سے پہلے ہو گی اس لیے اگر ہم کعبہ کا بانی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قرار نہ دیں بلکہ اس سے پہلے یعنی حضرت آدم علیہ السلام کی بنائی ہوئی عبادت گاہ قرار دیں تو پھر قرآن کے بیان میں کسی کو اعتراض نہیں ہو گا۔ صرف میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو مکان بنایا، اس پر یہودیوں اور عیسائیوں کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اور بھی مقامات پر "بیت ایل" بنائے تھے۔ جب اور بھی گھر بنائے تھے تو حجاز میں بنانے پر کیوں اعتراض کیا جائے؟ بہر حال بیت اللہ کا حج جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے معین کیا تھا، اس کا سلسلہ کافی عرصہ تک جاری رہا اور اس کے نگران پہلے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تھے اور اس کے بعد ان کی اولاد اس کی متولی رہی۔ بعد میں جنگیں ہوئیں اور بیرونی لوگ مکہ پر آکر قابض ہوتے رہے ہیں۔ یہ ایک طویل قصہ ہے جس میں اس وقت بیان نہیں کر سکتا۔ کہنا یہ ہے کہ جس زمانے میں آنحضرت ﷺ پیدا ہوئے اس وقت مکہ کی چند خصوصیتیں ہمیں حیرت انگیز نظر آتی ہیں، وہ یہ کہ مکہ نہ صرف بہت مالدار اور تجارتی شہر تھا بلکہ ساتھ ساتھ اس کے نظم و نسق کے لیے ایک حکومت بھی پائی جاتی تھی۔ جس میں بارہ وزیر ہوا کرتے تھے۔ یہ چیزیں ایسی ہیں جن پر ہمیں حیرت ہوتی ہے۔ میں اس کا حال مختصر طور پر آپ سے بیان کروں گا۔ جہاں تک تجارت کا تعلق ہے وہ آنحضرت ﷺ کی ولادت سے بہت پہلے نسل ہا نسل کے انتظامات کا نتیجہ تھی قرآن مجید کی "سورۂ قریش" (106) سے آپ واقف ہیں جس میں مکے والوں کو یاد دلایا گیا ہے کہ اللہ ہی نے تمہیں سردی اور گرمی کے سفر کے ذریعے مال بھی دیا اور خوف سے بھی تم کو بچا لیا لہٰذا اس اللہ کا تمہیں شکر گزار ہونا چاہیے۔

جغرافیائی نقطہ نگاہ سے مکہ ایک اہم مقام تھا کہ عرب کے شمال اور جنوب کے لوگ جب تجارت کے لیے جاتے تھے تو انہیں مکہ سے گزرنا پڑتا تھا۔ کہتے ہیں کہ یورپ کی تجارت ہندوستان سے مکہ کے راستے ہوا کرتی تھی۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ مکہ کی

جغرافیائی اہمیت کیا تھی۔ اس زمانے میں تجارتی قافلوں اور کاروانوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ غذا، پانی اور ٹھہرنے کی جگہ کا بندوبست کریں۔ مکہ میں جو زمزم کا چشمہ یا کنواں تھا وہ ایسی چیز تھی کہ اسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا تمام قافلے وہاں سے گزرا کرتے تھے۔ مکے کی اس تجارتی حیثیت کو اور بھی مستحکم کرنے کے لیے آنحضرت ﷺ کے ایک جد امجد عبد مناف قصی نے ایک مرتبہ اپنے بیٹوں میں سے ایک کو قیصر کے پاس بھیجا، دوسرے کو کسریٰ کے پاس بھیجا، تیسرے کو نجاشی کے پاس اور چوتھے کو یمن کے حکمرانوں کے پاس بھیجا اور ان سے ایلاف یعنی معاہدہ یہ کیا کہ ہمیں اس بات کی اجازت ہو کہ ہم تجارتی قافلے تمہارے ملک میں لائیں، اپنا مال وہاں فروخت کریں اور تمہارے ملک کی پیداوار خرید کر اپنے ملک کو لے جائیں۔ اس تجارتی معاہدے کو ان حکمرانوں نے بھی پسند کیا اور قبول کر لیا۔ اس کے متعلق ہمارے پاس تفصیلی معلومات ہیں اس وقت میں ان کو بیان نہیں کروں گا کہ اس پر میرا ایک مضمون البلاغ کراچی (جون 1968ء) میں چھپ چکا ہے۔

مکے والوں نے یہ سوچا کہ ممکن ہے لٹیرے بدوؤں کے قبیلے تجارتی قافلوں کو اپنے علاقوں سے گزرتے دیکھ کر چھاپہ ماریں اور انہیں لوٹ لیں، اس لیے مکے کی زیارت گاہ اور مال تجارت کی حفاظت کا کچھ نہ کچھ انتظام کیا جائے۔ چنانچہ مکے کے افسروں نے ان تمام قبائل کے سرداروں سے جو کاروان تجارت کے راستوں میں پڑتے تھے، گفتگو کی اور ان سے کہا کہ ان تجارتی قافلوں سے ہمیں جو منفعت ہوگی اس میں سے کچھ حصہ تمہیں بھی دیا جائے گا۔ اس لالچ میں انہوں نے قبول کیا کہ ہم تمہارے کاروانوں پر حملہ نہیں کریں گے۔ اس سلسلے میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مکی سرداروں نے کہا کہ اگر تمہارے پاس کچھ فروخت کرنے کا سامان ہو، مثلاً بھیڑ، بکریوں کے چمڑے یا زیتون کا تیل وغیرہ، تو وہ ہمیں دے دو، ہم اسے فروخت کریں اور قیمت اور پورا منافع غیر کسی معاوضے کے تمہیں پہنچا دیا کریں گے۔ غرض ان قبائلی سرداروں سے معاشی معاہدوں اور ہر طرف سے انتظامات کے باعث مکہ معظمہ عرب کا سب سے بڑا تجارتی مرکز اور انتہائی مال دار شہر بن گیا تھا۔ اس کی دولت مندی کا اس سے اندازہ لگائیے کہ ہجرت مدینہ کے بعد کے ابتدائی زمانے میں ایک اسلامی دستے نے ایک بار مشرکین کے ایک کارواں پر چھاپہ مارا تھا اور اس میں جو مال غنیمت ملا، اس کی مالیت ایک لاکھ درہم تھی۔ اس زمانے میں ایک لاکھ درہم کی قیمت کل کروڑوں کے برابر تھی۔ یہ صرف ایک کارواں کا سرمایہ تھا، اس سے ہم قریش کی دولت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ چونکہ قریش کاروانی راستوں کے قبیلوں سے دوستی اور حلیفی کر چکے تھے، اس سے وہ مزید فائدہ یوں اٹھانے لگے کہ اگر کسی اور قبیلے کا کارواں سفر پر جانا چاہتا تو ایک قریشی شخص، معاوضہ لے کر، اس میں شریک ہو جاتا۔ اس سے نفارہ یا بدرقہ کہتے اور اس کی وجہ سے قریش کا کوئی حلیف قبیلہ اس کارواں کو بھی نہ چھیڑتا۔

جہاں تک سیاسی نظم و نسق کا تعلق ہے، شہر مکہ میں ایک شہری مملکت تھی، جس کا رقبہ (حدود حرم کی اساس پر) تقریباً ایک سو تیس مربع میل تھا۔ وہاں بادشاہت کی جگہ ایک طرح کی جماعتی گورنمنٹ تھی۔ یعنی ایک مجلس وزراء اس کے انتظام کی ذمہ دار تھی۔ اس کی تفصیلیں بھی ہمیں ملتی ہیں۔ نہایت ہی مختصراً ذکر کروں گا کہ اس میں دیوانی مقدمات اور فوجداری مقدمات کے لیے الگ الگ وزیر تھے، کعبہ کے انتظام کے لیے، یعنی دروازہ کھولنے اور بند کرنے کے لیے ایک وزیر تھا، اس طرح وہاں غیب دانی کے لیے یعنی یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کوئی کام ہمیں کرنا چاہیے یا نہیں کرنا چاہیے، ان کے پاس تیر ہوا کرتے تھے جن سے وہ فال نکالا کرتے تھے۔ ان تیروں کی نگرانی کرنے والا ایک وزیر ہوا کرتا تھا۔ اسی طرح کعبے میں باہر سے آنے والے زائرین چڑھاوے چڑھایا کرتے تھے، ان چڑھاووں کی حفاظت کے لیے ایک اور وزیر مقرر تھا۔ اسی طرح ٹیکسیشن کے لیے بھی ایک وزیر تھا۔ یعنی شہر مکہ کے باشندے ہر سال اپنے افسر متعلقہ کو کچھ رقم بطور ٹیکس دیتے تھے جس کا اولاً مقصد یہ بیان کیا گیا تھا کہ اگر کوئی حاجی کسی وجہ سے مکہ میں اپنے آپ کو بے بس پائے یا اس کے پاس پیسے بالکل نہ رہیں، یا اس کی سواری کا اونٹ مر جائے تو ایسے مجبور لوگوں کی مدد کے لیے اور حج کے زمانے میں باہر سے آنے والوں کی ضیافت اور مہمانداری پر خرچ کرنے کی غرض سے ایک ٹیکس لیا جاتا تھا جس کا انتظام، ظاہر ہے کہ ایک خصوصی وزیر کے سپرد ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اور وزارتیں بھی تھیں۔

چنانچہ ایک اور ادارہ دار الندوہ تھا یعنی پارلیمنٹ۔ جب کبھی کوئی مشکل مسئلہ پیدا ہوتا تھا، مثلاً کسی دشمن کے حملے کا خطرہ یا کوئی اور معاملہ در پیش ہوتا تو سارے معمر باشندوں سے گفتگو ہوتی تھی۔ لکھا ہے کہ ہر شخص، جس کی عمر چالیس سال ہوتی، وہ خود بخود اس مجلس مشاورت یا اس پارلیمنٹ کا رکن بن جاتا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ دو آدمیوں کو اس سے مستثنٰی کر دیا گیا تھا یعنی ان کو چالیس کی عمر کی حد تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کا رکن بنالیا گیا تھا۔ ان میں ایک ہمارے "دوست" ابو جہل صاحب بھی تھے۔ ان کی فراست اور عقلمندی کا بڑا چرچا تھا۔ چنانچہ ان کو نوجوانی میں ہی اس کا رکن بنا دیا گیا تھا۔ اسی طرح ایک اور شخص کا بھی ذکر آتا ہے۔ سب سے عجیب و غریب جو بات ہمیں نظر آتی ہے، وہ وزارت خارجہ کا عہدہ ہے۔ وزارت خارجہ کا دائرہ کار یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب کبھی کسی بیرونی قبیلے سے گفتگو کی ضرورت پیش آتی، کسی جھگڑے کا تصفیہ اور مصالحت کرانی ہوتی یا دشمن کے مطالبات کو نہ ماننے کی صورت میں اعلان جنگ کرنا پڑتا یا کوئی قبیلہ قریش کی برتری اور فضیلت پر اعتراض کرتا تو اس کو جواب دینے اور قریش کی خوبیاں، اور اعتراض کرنے والے قبیلے کی برائیاں بیان کرنا ہوتا، تو ایسے تمام خارجہ معاملات کے انتظام و انصرام کے لیے بھی ایک عہدہ دار پایا جاتا تھا۔ یہ تمام وزراء عہد نبوی تک پائے جاتے تھے، ان میں سے اکثر نام بہت مشہور و معروف ہیں مثلاً دیوانی مقدمات حضرت ابو بکرؓ کے سپرد تھے، وزارت خارجہ کا

منصب حضرت عمرؓ کے سپرد تھا۔ اسی طرح فوج میں دو جھنڈے ہوتے تھے، ایک کو لواء اور دوسرے کو رایہ کہتے تھے۔ ان کے فرق سے میں یہاں بحث نہ کروں گا۔ ایسا ایک جھنڈا حضرت مصعب بن عمیر العبدری کے پاس رہتا تھا اور دوسرا جھنڈا حضرت ابوسفیان کے سپرد تھا۔ یہ تمام نام سیرت النبی اور تاریخ اسلام میں آتے ہیں۔ یہ اسلام سے پہلے کی مشہور شخصیتیں تھیں اور مکے کی حکومت میں ان کو خاصا مقام حاصل تھا۔ دوسرے لفظوں میں شہر مکہ میں ایک مملکت پائی جاتی تھی اور یہ مملکت ایک شہری مملکت تھی۔ اس کا انتظام بجائے ایک فرد کے ہاتھ میں ہونے کے ایک نمائندہ جماعت کے سپرد کیا گیا تھا۔ جس کا ہر فرد وراثتی اصول پر ہمیشہ ایک ہی قبیلے سے ہوا کرتا تھا۔ یہ ہے مختصر خلاصہ اس سیاسی نظام کا جو پیغمبر اسلام ﷺ کی ولادت کے وقت شہر مکہ میں پایا جاتا تھا۔

حضور ﷺ کی ولادت سن 569 عیسوی میں ہوتی ہے۔ ابتدائی چالیس سال تک وہ اس شہر کے معمولی باشندے رہے۔ کوئی ایسی بات ہمیں نظر نہیں آتی جو قابل ذکر ہو، بجز اس کے کہ اور قبیلوں کی طرح رسول اکرم ﷺ کے خاندان بنو ہاشم کا بھی ایک فرد اس نظام حکومت میں شامل تھا یعنی ایک وزارت اس خاندان کے سپرد تھی۔ وہ وزارت زمزم کے کنویں کے انتظام کے متعلق تھی۔ اس میں منفعت بھی تھی۔ اگرچہ ہمیں صراحت سے معلوم نہیں لیکن اور مقاموں، مثلاً شام وغیرہ میں، اس کا پتہ چلتا ہے کہ عبادت گاہ کے کنویں کا پانی حاجیوں کو دیا جائے تو انعام یا ٹیکس کے طور پر اس پانی دینے والے کو لوگ اپنی طرف سے رقم دیا کرتے تھے۔ اگر مکے میں بھی ایسا ہوتا تو ظاہر ہے کہ اس سے کافی منفعت ہوتی ہوگی۔ یہ قدیم کنواں چونکہ بڑی مدت غائب رہنے کے بعد عبد المطلب نے دریافت کیا تھا، اس لیے انہیں کی نگرانی میں رہا اور غالباً ان کی خاطر شہری مملکت کے نظام میں ایک نئی وزارت کا اضافہ کر دیا گیا۔ عبد المطلب کی وفات کے بعد یہ انتظام ان کے بیٹے ابو طالب نے سنبھالا۔ ابو طالب بہت فراخ دل تھے لیکن ان کی مالی حالت خراب تھی اور اکثر قرض لینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ اپنے بھائی حضرت عباسؓ سے کچھ رقم قرض لی اور کہا کہ ایک سال بعد ادا کر دوں گا۔ ایک سال بعد آپ رقم ادا نہ کر سکے تو حضرت عباسؓ نے کہا اگر تم مزید مہلت چاہتے ہو تو میں اس شرط پر آمادہ ہوں کہ زمزم کی نگرانی مجھے دے دی جائے۔ اس طرح چاہ زمزم ابو طالب کی جگہ حضرت عباسؓ کے قبضے میں آیا اور رسول اللہ ﷺ کے عہد میں فتح مکہ کے وقت بھی وہی اس کے مالک تھے اور اس کی رسول اللہ ﷺ نے توثیق بھی کی۔ غرض یہ کہ بنی ہاشم کو بھی مکہ شہر کے انتظام میں دستوری طور پر ایک مقام حاصل تھا۔ بعد کے زمانے میں جب اسلام کا آغاز ہوا تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے نظم و نسق میں کیا حصہ لیا اور مکہ شہر میں ان کی حیثیت کیا تھی؟ اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ شہر مکہ میں جو لوگ مسلمان ہوتے رہے ان کی تعداد بھی آہستہ آہستہ بڑھی، لیکن وہ تھے سارے ہی قبیلوں کے، اور انہوں نے مملکت کے اندر مملکت بنالی۔ وہ مکہ شہر میں

رہتے تھے لیکن اگر انہیں عدالتی مسئلے کی ضرورت پیش آتی تھی تو وہ شہر کے ان مشرک افسروں کے پاس نہیں جاتے تھے جس کے پاس عدل گستری کا کام تھا۔ اگر انہیں فوجی دفاع کے سلسلے میں ضرورت پیش آتی تو ان کو مکہ والوں سے امداد کی توقع نہ تھی۔ غرض وہ ہر کام میں رسول اللہ ﷺ سے رجوع کرتے جو ان کے قانون ساز بھی تھے، حاکم عدالت بھی، کمانڈر انچیف بھی تھے اور بادشاہ بھی۔ جلدی ہی مسلمانوں کو مکہ کو خیر باد کہنا پڑا۔ رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کے وقت مکہ کے اکثر مسلمان بھی ہجرت کرکے مدینے جا بسے۔

جیسا کہ اپنے گزشتہ لیکچر میں اشارۃً عرض کر چکا ہوں کہ مدینے میں رسول اکرم ﷺ نے سب سے پہلے مہاجرین کے معاشی مسائل حل کرنے کے لیے مواخات کا انتظام کیا۔ اس کے بعد جو کام ہوا، اس کا تعلق ہمارے موضوع سے ہے یعنی مملکت کا قیام۔ مدینے میں کسی مملکت کا وجود نہیں تھا۔ شہری مملکت کا نہ کسی اور قسم کی مملکت کا۔ یہاں اسلام سے پہلے کئی رشتہ دار قبیلے آباد تھے مگر ان قبیلوں میں ہمیشہ آپس میں خانہ جنگی ہوتی رہتی تھی چنانچہ آخری جنگ ہجرت نبوی سے پانچ سال پہلے ہوئی تھی جس میں بہت ہی خون ریزی ہوئی اور اس کے اثرات خود اسلامی معاشرے پر بھی پڑے۔ اشارۃً میں دو چیزوں کا ذکر کرتا ہوں۔ لکھا ہے کہ ہجرت سے پہلے جب مدینے کے کچھ لوگ "اوس" قبیلے میں سے اور کچھ لوگ "خزرج" قبیلے میں سے مسلمان ہوئے تو چونکہ ان دونوں قبیلوں میں جھگڑا تھا، اگر امام "خزرجی" ہوا تو "اوسی" مسلمان اس کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کرتے اور اگر "اوسی" امام ہوتا تو "خزرجی" لوگ اس کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کرتے۔ اس لیے ضرورت پیش آئی کہ مکے سے ایک امام بھیجا جائے تاکہ اس کے پیچھے "اوسی اور خزرجی" دونوں نماز پڑھ سکیں۔ ایک اور واقعہ جس کو ہم اس سے بھی زیادہ افسوسناک کہہ سکتے ہیں، یہ نظر آتا ہے کہ مدینہ کے مسلمانوں میں نقیب النقباء اسعد بن زرارہؓ ایک بہت اچھے، راسخ العقیدہ اور اسلام کے لیے سرگرم کار مسلمان تھے۔ وہ "خزرج" قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے قبا پہنچے، تو ایسے بہت سے لوگ جو آپ ﷺ کو پہلے دیکھ چکے تھے یا آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے، آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، سلام عرض کرتے ہیں اور مہمان نوازی کے فرائض انجام دیتے ہیں لیکن ان میں اسعد بن زرارہؓ نظر نہیں آتے۔ آخر رسول اللہ ﷺ نے خود پوچھا کہ اسعد بن زرارہ کہاں ہیں؟ تو قبا کے باشندوں "اوسیوں" نے شرمندگی کے انداز میں کہا کہ گزشتہ جنگ بعاث میں انہوں نے ہمارے بعض سرداروں کو قتل کیا تھا، اس لیے انہیں جرات نہیں ہو سکتی کہ وہ ہمارے علاقے میں آئیں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ رسول اللہ ﷺ کو مدینہ منورہ میں حکومت کرنے کے لیے کن دشواریوں کا سامنا تھا۔ بہر حال اسی رات کا کافی حصہ گزرنے پر ایک شخص رسول ﷺ سے ملنے کے لیے بھیس بدلے ہوئے، چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے آتا ہے۔ جب حضور ﷺ کے پاس پہنچتا ہے تو نقاب اٹھاتا ہے۔ یہ تھے اسعد بن زرارہ۔ رسول اللہ ﷺ

حیرت سے پوچھتے ہیں کہ تم کیسے آئے ؟ انہوں نے کہا کہ آپ ﷺ تشریف لائیں اور میں نہ آؤں، یہ ناممکن تھا، جان پر کھیل کر حاضر ہوا ہوں۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ کوشش کرتے ہیں کہ قبیلہ "اوس" ان کو باقاعدہ طور پر پناہ دینے کا اعلان کرے تا کہ اگر وہ آئیں تو کھلم کھلا آ سکیں اور انہیں کوئی "اوسی" شخص نہ ستائے، مگر وہ ہچکچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یا رسول اللہ (ﷺ) آپ حکم دیں گے تو ہم تعمیل کریں گے لیکن ہم خود پناہ دینا نہیں چاہتے۔ بالآخر ایک "اوسی" سردار نے اسے قبول کیا چنانچہ وہ اسعد بن زرارہ کے مکان پر گئے۔ ان کو ساتھ لے کر ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر رسول اللہ ﷺ کے سامنے آتے ہیں اور "اوسی" قبیلے کے لوگ دیکھتے ہیں کہ ان کے سردار نے اسعد بن زرارہ کو پناہ دی ہے۔ پھر اس کے بعد امن قائم ہوتا ہے۔ تو اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مدینہ میں حکومت کرنا کتنا مشکل تھا اور کن تدبیروں سے رسول اللہ ﷺ نے آہستہ آہستہ ان مشکلوں کو دور کیا۔

اس ابتدائی کام سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ایک تجویز پیش کی کہ مدینہ میں ایک چھوٹی سی مملکت قائم کی جائے۔ لیکن ابتداء ہی میں کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جنگ بعاث کے بعد مدینے والوں نے یہ سوچا تھا کہ آئے دن کی جنگ ہم سب کے لیے نقصان کا باعث ہے، اس کو ختم کرنا چاہیے لیکن کسی کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح ختم کریں؟ اگر کوئی بادشاہ بنایا جائے تو وہ کس قبیلے کا ہو جس کی اطاعت "خزرجیوں" اور "اوسیوں" میں سبھی کو قبول ہو۔ خزرجی قبیلے کا ایک سردار عبد اللہ بن ابی بن سلول بہت مالدار اور صاحب اقتدار تھا۔ خزرجیوں کو توقع تھی کہ "اوسی" بھی اس کی مخالفت نہ کریں گے، چنانچہ اس کے لیے تاج شہریاری تیار ہونے لگا۔ اس اثناء میں رسول اللہ ﷺ تشریف لاتے ہیں تو ظاہر ہے کہ اوسی اور خزرجی مسلمانوں کو اب عبد اللہ بن ابی بن سلول سے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ اس کا نتیجہ بھی آپ سمجھ سکتے ہیں کہ عبد اللہ بن ابی بن سلول کو آنحضرت ﷺ سے نفرت پیدا ہو گئی کہ نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ غاصب ہیں، میرے اقتدار اور میری بادشاہت میں حارج ہو رہے ہیں۔ چنانچہ یہ شخص ساری عمر منافق رہا اور آئے دن اسلام کے لیے دشواریاں پیدا کرتا رہا۔ "واقعہ افک" میں حضرت عائشہؓ پر جو الزام لگایا گیا، وہ بھی انہی صاحب کی کارگزاری تھی۔ جنگ تبوک کے زمانے میں رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کی ایک سازش ہوئی تھی، اس میں بھی اس کا دخل تھا۔ بہر حال ایک طرف عبد اللہ بن ابی بن سلول کی وجہ سے مسلمانوں کو سیاسی نظم و نسق میں دشواریاں پیش آ رہی تھیں۔ علاوہ ازیں اوس قبیلے کے ایک عیسائی ابو عامر راہب نے دوسرا فتنہ کھڑا کیا۔ اس کو بائبل کے مطالعے سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ نبی آخر الزماں ﷺ کے آنے کا امکان ہے، چنانچہ اس نے سوچا کہ خود نبوت کا دعویٰ کرے۔ جب رسول اللہ ﷺ آئے، وہ جا کر رسول اللہ ﷺ سے جھگڑتا ہے،

کہتا ہے کہ تم جھوٹے نبی ہو (نعوذ باللہ) نبی موعود تو میں ہوں۔ غرض یہ کہ مسلمانوں کو شروع ہی سے بہت سی دشواریاں پیش آتی رہیں۔

اب رسول اکرم ﷺ نے قبا کے بجائے اس مقام پر رہنا پسند کیا جو "اوسیوں" کے نہیں "خزرجیوں" کے علاقے میں تھا۔ اس کی وجہ امام بخاری نے یہ بیان کی ہے کہ وہ آپ ﷺ کے قریبی رشتہ دار تھے۔ عبد المطلب کی ماں قبیلہ خزرج سے تھیں۔ چنانچہ قبا سے نکل کر، اس مقام پر قیام کیا جہاں بنو نجار کا قبیلہ رہتا تھا اور جلد ہی وہاں ایک جلسہ طلب کیا گیا۔ شہر مدینہ کی آبادی کے جو مختلف عناصر تھے، ان سب کے نمائندوں کو بلایا اور ان کے سامنے حکومت قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ اس تجویز کو اکثریت نے قبول کیا۔ لکھا ہے کہ صرف "اوسی" کنبوں نے انکار کیا۔ اس طرح ایک مملکت قائم ہوئی جو ایک شہر پر بھی نہیں بلکہ ایک شہر کے کچھ حصے پر مشتمل ہونے کے باوجود علمی اور تاریخی نقطہ نظر سے ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ یوں کہ ایک مملکت میں حکمران اور رعایا کے جو حقوق و فرائض ہوں گے، ان کو تحریری طور پر مرتب کیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں اس مملکت کا دستور مرتب کر کے سب کے سامنے پیش کیا گیا اور سب کے مشورے سے اسے لکھا گیا۔ اس تاریخی دستاویز کی خاص قابل ذکر اہمیت یہ ہے کہ دنیا کا پہلا تحریری دستور "اُمّی" شخص کے ہاتھوں وجود میں آیا۔

اس دستور کی ساری دفعات کی تشریح شروع کر دوں تو اس کے لیے کم از کم مجھے ایک پورا دن درکار ہو گا۔ مختصراً یہ عرض کرنا ہے کہ ایک طرف تو یہ اعلان کیا گیا ہے کہ یہ مملکت ایک مستقل اور خود مختار مملکت ہو گی اور یہ بھی صراحت ہے کہ غیر مسلموں کو ان کے دین کی پوری آزادی ہو گی۔ چنانچہ ایک دفعہ کے الفاظ یہ ہیں "للمسلمین دینھم و للیھود دینھم" یعنی مسلمانوں کے لیے مسلمانوں کا دین ہے اور یہودیوں کے لیے ان کا دین ہے۔ یعنی وہاں جتنے بھی لوگ بستے تھے ان کو دینی، عدالتی اور قانونی آزادی کا اطمینان دلایا گیا تھا۔ اسی طرح دفاع کے سلسلے میں جو انتظام کیا گیا وہ بھی اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن اس پہلو پر کچھ عرض کرنے سے پہلے میں یہ کہوں گا کہ آنحضور ﷺ کو اس حکومت کا صدر تسلیم کیا گیا، اگر خالص دنیوی نقطہ نظر سے ہم اس پر غور کریں تو وجہ یہ نظر آتی ہے کہ "اوسیوں" کا کوئی بادشاہ مقرر کیا جاتا تو "خزرجی" اسے قبول نہ کرتے اور اگر "خزرجیوں" میں سے منتخب کرتے تو "اوسی" اس کو قبول نہ کرتے۔ چنانچہ سوائے اس کے کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ آپس میں لڑنے والے قبائل آپ ﷺ پر اعتماد رکھتے اور آپ کو نبی مانتے تھے۔ آپ کی غیر جانبداری، آپ کی عدل گستری، آپ کا تحمل و تدبر اور آپ کی فیاضی کا چند مہینوں کے عرصے میں سب لوگوں کو تجربہ ہو چکا تھا۔

دفاع کے سلسلے میں، اس دستور میں، صراحتیں ہیں، ان میں سب سے پہلے یہ بات قابل ذکر ہے کہ امن اور جنگ ناقابل تقسیم چیز ہو گی، یعنی اگر امن ہو تو سلطنت کے سارے باشندوں کے لیے ہو گا اور جنگ ہو تو سارے باشندوں کے لیے۔ صلح و جنگ کی مرکزیت اور ان کا ناقابل تقسیم ہونا ایک اہم بات تھی۔ پھر اس میں یہ بھی صراحت ہے کہ اگر جنگ کے لیے جانے کی ضرورت پیش آئے تو اس کا فیصلہ رسول اللہ ﷺ کے اختیار میں ہو گا کہ کون شخص فوج میں شریک رہے اور کون فوج میں نہ رہے۔ گویا آپ کو کمانڈر انچیف سے بھی زیادہ اختیارات حاصل تھے۔ آپ کو اختیار تھا کہ اپنی فوج سے ان تمام لوگوں کو خارج کر دیں جو مشتبہ ہوں اور جو فوج کے اندر رہ کر مسلمانوں کو نقصان پہنچانا چاہیں۔ گویا آپ نہ صرف جنگی انتظامات کے مالک تھے بلکہ جنگ کے سیاسی پہلوؤں پر بھی آپ ہی کا دخل تسلیم کیا گیا۔ البتہ یہ صراحت ہے کہ اگر باہر سے کوئی دشمن حملہ آور ہو تو ہر محلہ اپنے رقبے کی براہ راست مدافعت کرے گا اور لوگ ایک دوسرے کی مدد کریں گے، اور یہ بھی کہ فوج میں جو اخراجات ہوں وہ ہر محلہ یعنی ہر قبیلہ خود برداشت کرے گا۔ اس زمانے میں مرکزی حکومت کے پاس کوئی خزانہ نہیں تھا۔ لہذا مجبوراً یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ لوگ رضاکارانہ اور بلا تنخواہ فوج میں داخل ہوں لیکن فوج کی باگ ڈور رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور فوجی انتظامات خود رسول کریم ﷺ ہی فرماتے ہیں۔ اسی طرح دستور میں عدل گستری کا بھی ذکر ہے کہ ابتدائی عدالت تو قبیلہ وار ہو گی یعنی قبیلے کے دو افراد میں جھگڑا ہو تو لوگ اپنے قبیلے کے سردار سے رجوع کریں گے لیکن اگر فریقین دو مختلف قبیلوں کے ہوں تو اس صورت میں ظاہر ہے کہ انہیں رسول اکرم ﷺ کے پاس آنا پڑے گا۔ اگرچہ انہیں اختیار تھا کہ کسی اور شخص کو بھی اپنا حکم بنالیں لیکن آخری حاکم عدالت بالفاظ دیگر عدالت اپیل رسول اللہ ﷺ کی ذات ہو گی۔ مسلمانوں کے لیے صراحت ہے کہ قانون سازی رسول اکرم ﷺ فرمائیں گے۔ دیگر تفصیلیں جو اس دستور میں آئی ہیں ان کے سلسلے میں یہ بھی نظر آتا ہے کہ حکمران کو کیا اختیارات حاصل ہیں۔ اس دستور میں ایک چیز جو غیر معمولی اور غیر متوقع کہی جا سکتی ہے وہ بیمے کا انتظام ہے۔ اس کی تفصیل پہلے کسی جگہ آچکی ہے۔ یہاں اشارۃً ذکر کیا جاتا ہے کہ اگر فدیہ یا خون بہا کی گراں قدر رقم کوئی شخص ادا کرنے سے معذور ہو تو اس کے قبیلے کی انجمن یا ہمسایہ قبیلے کی انجمن ورنہ بالآخر مرکزی انجمن اس رقم کی ادائیگی کا انتظام کرے گی۔ اسی طرح یہودیوں کے متعلق بھی تفصیل ہے کہ ان پر کیا واجبات و فرائض ہوں گے۔ اس کا بھی ذکر ہے کہ جو مشترکہ دشمن ہیں یعنی قریش مکہ وغیرہ ان کے ساتھ اس مملکت کے باشندوں کا کیا طرز عمل ہو گا۔

یہ تھا وہ نظام جو عہد نبویؐ میں شروع ہوا، اور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ یہ مملکت ابتداء میں ایک شہری مملکت تو تھی لیکن کامل شہر میں نہیں تھی بلکہ شہر کے ایک حصے میں قائم کی گئی تھی، لیکن اس کی توسیع بڑی تیزی سے ہوتی ہے۔ اس توسیع کا آپ اس سے

اندازہ لگائیے کہ صرف دس سال بعد جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی، اس وقت مدینہ ایک شہری مملکت نہیں بلکہ ایک وسیع مملکت کا دارالسلطنت تھا۔ اس وسیع سلطنت کا رقبہ تاریخی شواہد کی رو سے تین ملین یعنی تیس لاکھ مربع کلومیٹر پر مشتمل تھا۔ دوسرے الفاظ میں دس سال تک اوسطاً روزانہ کوئی آٹھ سو پینتالیس مربع کلومیٹر علاقے کا ملک کے رقبے میں اضافہ ہوتا رہا۔ سلطنت کی یہ توسیع کچھ تو پرامن ذرائع سے ہوئی اور کچھ جنگوں کے نتیجے میں۔ آنحضرت ﷺ کے غزوات و سرایا کے متعلق دیگر تفصیلات کے علاوہ مقتولین اور شہداء کے اعداد و شمار بھی ہمارے سامنے موجود ہیں۔ تین ملین کلومیٹر رقبہ فتح کرنے کے لیے دشمن کے جتنے لوگ مرے ہیں، ان کی تعداد مہینے میں دو بھی نہیں ہے، دس سال میں ایک سو بیس مہینے ہوتے ہیں تو ایک سو بیس کے دوگنے دو سو چالیس آدمی بھی ان لڑائیوں میں نہیں مرے، دشمن کے مقتولین کی تعداد اس سے کم تھی، مسلمانوں کے شہداء کی تعداد دشمن کے مقتولین سے بھی کم ہے۔ مسلمانوں کا سب سے زیادہ نقصان جنگ احد میں ہوا کہ ستر آدمی شہید ہوئے اور یہ نقصان بھی مسلمانوں کی اپنی غلطیوں کی وجہ سے ہوا۔ بہر حال بحیثیت مجموعی میدان جنگ میں قتل ہونے والے دشمنوں کی تعداد مہینے میں دو سے بھی کم ہے، جس سے ہمیں نظر آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کس طرح اسوۂ حسنہ بن کر دنیا بھر کے حکمرانوں اور فاتحوں کو بتاتے ہیں کہ دشمن کا مقابلہ اور ان کو شکست دینے کی کوشش ضرور کرو لیکن بے جا خون نہ بہاؤ۔ مقصد یہ کہ دشمن جو آج غیر مسلم ہے ممکن ہے کل وہ مسلمان ہو جائے یا اس کے بیوی بچے اور اس کی آئندہ نسلیں مسلمان ہو جائیں لہذا اس امکان کو زائل کرنے میں اپنی طرح سے کوئی ایسا کام نہ کرو جس سے پچھتانے کی ضرورت پیش آئے۔

ہمارے موضوع کا ایک پہلو تو حکومت کے قیام اور سلطنت کی توسیع سے متعلق تھا، دوسرے پہلو کا تعلق حکومت کے نظم و نسق سے ہے۔ ہم یہاں دیکھیں گے کہ نظم و نسق کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ نے کیا اقدامات کیے اور ان کے کیا نتائج نکلے۔ جیسا کہ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں کہ مدینہ میں کوئی مملکت پائی ہی نہیں جاتی تھی۔ رسول اکرم ﷺ نے پہلی مرتبہ قائم فرمائی لہذا آپ کو پرانے انتظامات وراثت میں بالکل نہیں ملے۔ فوج، خزانہ و تعلیم، عدلیہ اور انتظامیہ کے اداروں میں سے کوئی چیز وہاں نہیں تھی۔ ہر چیز رسول اللہ ﷺ کو خود ہی نقطہ صفر سے پیدا کرنی اور ترقی دینی تھی۔ اس زمانے میں اتنے دفتر اور اتنے محکمے نہیں ملیں گے جو آج بیسویں صدی میں ہمیں اپنے آس پاس نظر آتے ہیں مثلاً آج کل آپ کو سڑکیں بنانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ عرب میں کہیں سڑکیں نہ تھیں۔ سڑکوں اور شاہراہوں کی جگہ عام خود رو گزرگاہیں تھیں، سڑک کی تعمیر کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لہذا اس کے لیے نہ ناظم تھا، نہ محکمہ تعمیرات، البتہ اس کے باوجود کچھ ایسی چیزیں ملتی ہیں جو شہری منصوبہ بندی کے سلسلے میں کارآمد ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے

کہ شہر کے اندر گلیوں کو اتنا چوڑا رکھو کہ دو لدے ہوئے اونٹ با آسانی آمنے سامنے گزر سکیں، گویا آج کل کے الفاظ میں آسانی کے ساتھ دو موٹریں آ جا سکیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی قانون سازی صرف دینی معاملات تک کی محدود نہیں تھی، اس میں دنیوی مسائل پر بھی توجہ دی گئی ہے حتیٰ کہ اس میں مکانوں کے درمیان کا راستہ بھی شامل ہے۔ وقت کی کمی کے باعث تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ اہم ترین انتظامات میں سے چند کاتبوں پر مشتمل ایک دفتری نظام (سیکرٹریٹ) بھی تھا۔ چنانچہ مسعودی اور دیگر مؤلفوں نے بتایا ہے کہ ان کاتبوں کے فرائض مختلف تھے۔ کچھ لوگ نازل ہونے والی وحی کو لکھا کرتے تھے۔ کچھ لوگ زکوٰۃ کے اندراجات کرتے، یعنی رقم کس سے وصول ہوئی اور کس پر خرچ کی گئی۔ جنگوں میں جو مال غنیمت حاصل ہوتا، اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا حکم تھا کہ سب کو جمع کرکے، اس میں سے سارے فوجیوں کو برابر حصہ دیا جائے۔ نیز پانچواں حصہ حکومت کو ملے۔ لہٰذا ضروری تھا کہ مال غنیمت کی جمع و تقسیم کا حساب رکھا جائے۔ اس کے لیے خصوصی کاتب مقرر تھے۔ اسی طرح کوئی دس بارہ مدوں کی تفصیل دی گئی ہے کہ ان کے لیے الگ الگ کاتب مقرر کیے گئے تھے۔ ان میں محکمہ خارجہ بھی تھا کہ بیرونی حکمرانوں اور سرداروں سے تبلیغ وغیرہ کے لیے خط و کتابت ہوتی تھی۔

ایک چیز اور، جس کا تعلق فوجی نظام سے اور ساتھ ہی مالی نظام سے ہے، اس کا بھی میں ذکر کرتا چلو، اس پر آپ کو حیرت بھی ہوگی۔ عام طور پر مشہور ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں دیوان قائم ہوا اور دیوان کا منشا یہ بیان کیا جاتا ہے کہ سرکاری خزانے سے سپاہیوں کو پنشن دی جاتی تھی، اس شرط پر کہ وہ چوبیس گھنٹے تیار رہیں کہ جب حکومت انہیں بلائے تو وہ اسی وقت گھر بار اور کاروبار چھوڑ کر فوجی مہم پر روانہ ہو جائیں۔ یہ نظام حضرت عمرؓ کی طرف منسوب ہے اور اس کے لیے حضرت عمرؓ نے جو دیوان قائم کیا تھا اس کی بہت سی تفصیلیں ہمیں ملتی ہیں۔ لیکن ہمیں حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اس کا آغاز بھی عہد نبویؐ میں ہوتا ہے۔ چنانچہ امام محمد کی "السیر الکبیر" میں آیا ہے کہ عہد نبویؐ میں ایک کاتب کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ ان بالغ لوگوں کی فہرست مرتب کرے جو نہ صرف جنگ کے قابل ہیں بلکہ اس پر آمادہ ہیں کہ جب انہیں بلایا جائے، فوراً فوجی مہم پر روانہ ہو جائیں، ایسے لوگوں کو بیت المال سے مستقل وظیفہ ملتا رہتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ کے قائم کردہ نظام کو مزید ترقی دی۔ ان کے زمانے میں حکومت کی آمدنی میں بہت اضافہ ہو گیا تھا لہٰذا وظائف بھی دیے جانے لگے۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں غیر مسلموں کو بھی وظائف دیے جاتے تھے۔ غرض دیوان یا سیکرٹریٹ خود رسول اللہ ﷺ نے قائم فرمایا۔ بعض چیزوں کا انتظام حسب ضرورت رضاکارانہ ہوتا تھا مثلاً شروع میں اذان نہیں ہوتی تھی۔ جب نماز کے لیے لوگوں کو ایک مؤذن کی ضرورت محسوس ہوئی اور یہ طے پایا کہ اذان دی جائے تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت

بلالؓ کو اس کام کے لیے منتخب فرمایا، کیونکہ ان کی آواز سریلی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے انہیں اذان کا طریقہ سکھایا اور یہ بھی بتایا کہ کس لفظ کو کھینچو، کس کو مختصر کرو، گویا موسیقی کی سریں، رسول اللہ ﷺ نے انہیں سکھائیں۔ اسی طرح ایک اور نائب یا مددگار مؤذن بھی مقرر کیا گیا تاکہ ہمیشہ ایک ہی آدمی پر اس کی ذمہ داری یا بار نہ ہو۔ یہ اور اس طرح کی بہت سی چیزیں ہمیں مذہبی نظام کے سلسلے میں ملتی ہیں۔ مسجد نبوی کے اندر صفائی کی ضرورت تھی۔ ایک حبشی مسلمان عورت نے رضاکارانہ اپنی خدمات پیش کیں۔ وہ روزانہ مسجد میں جھاڑو دیتی تھی اور قندیل میں لگائے ہوئے چراغ کو جلاتی۔ اس طرح کے انتظامات کا بھی ہمیں پتہ چلتا ہے جو بالکل ابتدائی حالت میں تھے، اور رفتہ رفتہ اس میں ترقی ہوتی گئی۔ ان انتظامات میں سے ایک نظام فوج کا بھی تھا۔ دفاع کے لیے فوج کی ضرورت تھی۔ شروع میں اسلامی حکومت کے پاس کافی مال نہ تھا۔ اس کا حل خدائے حکیم نے یوں کر دیا کہ جہاد کو مسلمانوں کا فریضہ قرار دیا گیا۔ ہر شخص پر واجب تھا کہ اسلام کے دفاع کے لیے اپنی جان اور مال کو قربان کرے۔ یہ نہیں کہ سو فی صد مسلمان ساری جنگوں میں حصہ لیں، بلکہ بوقت ضرورت ہر شخص کا فرض ہے کہ اپنے آپ کو پیش کرے۔ رسول اللہ ﷺ مطلوبہ تعداد میں لوگوں کو چن لیتے تھے اور انہیں مہم پر روانہ کرتے تھے۔

اس سلسلے میں "صفہ" کا بھی ذکر کرنا چاہیے جس کا تعلق تعلیم و تربیت کے علاوہ فوج سے بھی ہے۔ بعض اوقات رسول اکرم ﷺ کو کوئی اطلاع آئی کہ فلاں قبیلے کے خلاف تدبیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے، یعنی دشمن کو سزا دی جائے یا اس کا تعاقب کیا جائے۔ مثلاً کسی نے مدینے کے ایک گھر پر چھاپہ مارا تو ضرورت تھی کہ فوراً اس کے تعاقب کے لیے فوج کا ایک دستہ روانہ کیا جائے۔ ایسی ہنگامی ضرورت کے لیے "صفہ" کارآمد ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے یہ اعلان ہوتے ہی کہ ایک مہم کے لیے اتنے آدمیوں کی ضرورت ہے، فوراً اصحاب صفہ کی ایک جماعت اس مہم پر روانہ ہو جاتی۔ ان کو دن یا رات میں کسی وقت بھی بلایا جا سکتا تھا لیکن اگر کوئی بڑی مہم بھیجنی ہوتی تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے تیاریاں کرنی ہوتیں۔ رسول اللہ ﷺ جمعہ کے خطبے میں یا کسی نماز کے بعد غیر معمولی اجتماع کر کے فرماتے کہ اتنے آدمیوں کی ضرورت ہے تو لوگ رضاکارانہ اپنے آپ کو پیش کر دیتے۔ اس سلسلے میں دلچسپ چیز یہ ہے کہ ان کے نام اور پتے نوٹ کیے جاتے تھے اور بعد میں اس کے مطابق انہیں اطلاع دی جاتی تھی کہ تم سب لوگ فلاں مقام پر فلاں وقت اپنے ہتھیار اور ضروری سامان کے ساتھ جمع ہو جاؤ۔ صرف یہی نہیں، فوجی نظام کے سلسلے میں اور بھی بے شمار باتیں ملتی ہیں۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ ہمیشہ لوگوں کو ورزش کی ترغیب دیتے تھے، نشانہ بازی کی مشق کی بھی ہمیشہ تشویق دلاتے۔ خود بھی وہاں جاتے اور اپنے سامنے گھڑ دوڑ کراتے، اونٹوں کی دوڑ کراتے، آدمیوں کی دوڑ کراتے، کشتی کے مقابلے کرواتے اور لوگوں کو انعامات دیتے تھے۔

چنانچہ مدینہ منورہ میں آج بھی شمالی دروازے کے پاس ایک مسجد ہے جس کا نام مسجد سبق ہے۔ سبق کے معنی مسابقت میں جیتنا ہے۔ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اس مقام پر جو ایک پہاڑی کے دامن میں ہے، بلندی پر کھڑے ہو جاتے تھے اور جب گھوڑے دوڑتے ہوئے آتے تو رسول اللہ ﷺ خود فیصلہ فرماتے کہ کون سا نمبر 1 ہے اور کون سا نمبر 2 اور 3 وغیرہ۔ مقریزی نے بیان کیا ہے کہ پانچ اول آنے والے گھوڑوں کو رسول اللہ ﷺ انعام دیا کرتے تھے اور یہ انعام کبھی کھجور کی صورت میں ہوتے تھے، کبھی کسی اور چیز کی صورت میں۔

غرض ایک تو فوجی خدمت کا لازمی قرار دیا جانا، دوسری فوج کی تربیت، یہ دو انتظامات تھے جو رسول اللہ ﷺ نے فرمائے۔ ساتھ ہی ساتھ حکومت کے زیر اہتمام فوجی سامان کا ذخیرہ بھی جمع کرنا شروع کیا، مثلاً ہتھیار خریدنا، گھوڑے اور اونٹ خریدنا، ان کو سرکاری چراگاہ میں رکھنا، تاکہ بوقت ضرورت اگر سپاہیوں کے پاس ان کی ضرورتوں کی چیزیں ناکافی ہوں تو سرکاری طور پر بھی ان کو مدد دی جائے تاکہ فوج کے انتظامات ناکافی ہونے کی وجہ سے فوج کو نقصان اور تکلیف نہ ہو۔ ایک اور چیز جس کا نظام قائم کیا اور جس کا تعلق سیکرٹریٹ سے ہے، وہ ہے بیرونی قبائل اور حکمرانوں کو خطوط لکھنا اور معاہدات کو لکھنا۔ چنانچہ بیرونی حکمرانوں کو جو خطوط لکھے جاتے تھے ان مکتوبات نبوی کا سب سے قدیم ذخیرہ یا مجموعہ، جو ایک صحابی حضرت عمرو بن حزامؓ کی طرف منسوب ہے اس کی روایت کر کے ابو جعفر دیبلی (ایک پاکستانی) نے ہم تک پہنچایا ہے۔ اس کے بعد اور لوگ بھی اس میں حصہ لیتے رہے اور انہوں نے مکتوبات نبوی کو جمع کرنے کی سعادت حاصل کی۔ بیرونی حکمرانوں سے مراسلت ہی نہیں، بلکہ ان کے پاس سفیروں کو بھیجنا ضروری تھا اور ہمیں ایسے متعدد لوگوں کے نام ملتے ہیں جو سفیر بنے۔ اس سلسلے میں ایک چیز جو دلچسپ اور قابل ذکر ہے وہ یہ کہ بعض مرتبہ غیر مسلموں کو بھی رسول اللہ ﷺ سفیر بنا کر بھیجتے تھے۔ غالباً غیر مسلموں سے قابل اعتماد شخصیتوں کو ان کی فطری صلاحیتوں کے پیش نظر سفیر بنایا گیا تھا چنانچہ لکھا ہے کہ حضرت عمرو بن امیہ الضمریؓ کو ان کے مسلمان ہونے سے قبل حبشہ کے نجاشی کے پاس پیام دے کر بھیجا تھا۔ شاید وہ سابق میں بھی نجی طور پر حبشہ جا چکے تھے اور وہاں کے حالات سے واقف تھے بلکہ خود نجاشی سے شخصی تعارف تھا کیونکہ لکھا ہے کہ باپ کے مرنے پر یہ نجاشی کمسنی میں بادشاہ بنا اور چچا نائب السلطنت تھا جس نے چپکے سے بھتیجے کو غلام کے طور پر بعض عربوں کو فروخت کر دیا جو علاقہ بدر میں رہتے تھے (قبیلہ ضمرہ بھی وہیں رہتا تھا)۔

سلطنت کے جو مختلف انتظامات رسول اکرم ﷺ نے فرمائے ان میں مالیے کے ذکر کی ضرورت ہے، تعلیم کے ذکر کی بھی ضرورت ہے اور عدل گستری کے انتظام کا ذکر بھی لازمی ہے اور بھی انتظامات تھے لیکن یہ تین چیزیں ایسی ہیں جن پر کچھ کہے بغیر یہ

تبصرہ بہت ہی نامکمل اور تشنہ رہے گا۔ جہاں تک مالیے یعنی حکومت کی آمدنی اور اس آمدنی کے خرچ کا تعلق ہے، یہ بہت ہی آہستہ آہستہ ترقی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ زکوٰۃ جو اسلامی آمدنی کا سب سے بڑا وسیلہ ہے، یہ 9ھ میں یعنی رسول اللہ ﷺ کی وفات سے کوئی دو تین سال پہلے فرض کی گئی۔ اس سے پہلے کیا ہوتا رہا، اس کا جواب مشکل ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ قرآن مجید کی مکی آیتوں میں بھی زکوٰۃ کا ذکر ہے، اس لیے تصور کیا جاتا ہے کہ شروع میں بھی مسلمان زکوٰۃ کا ٹیکس ادا ضرور کرتے تھے لیکن نہ تو اس کی مقدار معین تھی، نہ وقت مقرر تھا۔ ہر شخص خوشدلی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حتی الامکان کچھ نہ کچھ رقم یا کچھ اور چیزیں پیش کر دیا کرتا تھا۔ میں "بظاہر" کہتا ہوں، اس لیے کہ کوئی صراحت اس بارے میں ہمیں ابھی تک نہیں ملی۔ اسی طرح آمدنی کا ایک وسیلہ اور بھی تھا، جو مستقل نہیں وقتی تھا، یعنی مال غنیمت کا جو حصہ حکومت کو ملتا وہ حکومت کے خزانے میں محفوظ کیا جاتا اور رسول اللہ ﷺ مملکت اور ملت کی ضرورتوں پر اس کو خرچ کرتے۔ اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عرب میں یہ رواج تھا کہ مال غنیمت کو ہر جنگ میں حصہ لینے والا سپاہی، جتنا وہ لوٹتا اور حاصل کر سکتا تھا، خود لے لیتا تھا۔ یہ نہیں ہوتا تھا کہ اس کو جمع کر کے سارے سپاہیوں میں تقسیم کیا جائے۔ البتہ ایک پابندی تھی وہ یہ کہ سپہ سالار کو ہر سپاہی اپنے مال غنیمت کا چوتھائی حصہ دینے پر مجبور تھا، جسے ربع کا نام دیا گیا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے جو اصلاح فرمائی وہ سیاسی نقطہ نظر سے ایک غیر جانبدار ناظر کے لیے بھی دلچسپ ہے۔ آپؐ نے اولاً یہ فرمایا کہ حکومت کو چوتھائی نہیں پانچواں حصہ ملے۔ اس میں ایک ذیلی فائدہ یہ تھا کہ اگر غیر مسلم رضاکارانہ طور پر جنگ میں حصہ لینا چاہتے ہیں تو اگر ہمارے دشمن کی فوج میں شریک ہوں تو انہیں چوتھائی حصہ دشمن کے سردار کو دینا پڑے گا۔ اس طرح انہیں اسلامی فوج میں شریک ہونے کے لیے زیادہ سے زیادہ تشویق ہوگی۔ اس اصلاح کا دوسرا اہم مقصد یہ تھا کہ مال غنیمت انفرادی نہ سمجھا جائے بلکہ سارے لوگوں کا جمع کیا ہوا مال غنیمت سارے لوگوں کے لیے ہو، حتیٰ کہ ان لوگوں کے لیے بھی ہو جو کسی نہ کسی وجہ سے جنگ میں عملی حصہ نہیں لے سکے، مثلاً جنگ کے وقت ہمارے کیمپ کی حفاظت کی ضرورت ہے تاکہ دشمن وہاں کے مال واسباب، جانوروں، بچوں اور عورتوں کو نقصان نہ پہنچائیں اور اس پڑاؤ کی حفاظت کے لیے چند سپاہیوں کو متعین کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جو جنگ میں عملی حصہ نہیں لیتے۔ رسول اکرم ﷺ نے حکم دیا کہ مال غنیمت کو یکجا کیا جائے اور پھر سارے لوگوں کو اس میں برابر کا حصہ دیا جائے۔ سپہ سالار اور معمولی سپاہی میں کوئی فرق نہ ہونے پائے۔ چنانچہ سپہ سالار کو بھی اتنا ہی حصہ ملتا جتنا معمولی سپاہی کو۔ اگر فوج بڑی ہوتی تو اس کو ٹولیوں میں تقسیم کیا جاتا اور ہر ٹولی کے سردار نامزد ہوتے تھے لیکن ان کی حیثیت بھی مال غنیمت کی حد تک معمولی سپاہیوں سے زیادہ نہ تھی اور اگر فرق کیا جاتا تھا تو اس امر کا جس کے پاس گھوڑا ہوتا اس کو مال غنیمت میں سے پیادہ سے دگنا حصہ ملتا تھا۔ آمدنی کے ایک تیسرے وسیلے کا بھی امکان ہے اور وہ یہ کہ ملک میں جو زراعت ہوتی تھی، اس کی پیداوار کا ایک حصہ زمانہ قدیم

سے اہل عرب کسی نہ کسی کو دینے پر مجبور تھے، مثلاً مکہ میں بتوں کے اوپر چڑھاوے کے طور پر کچھ پیداوار دی جاتی تھی۔ غالباً مدینے میں بھی کبھی ایسا ہوا ہو گا کہ لوگ اپنی پیداوار کا کچھ حصہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کرتے ہوں گے تاکہ دینی خدمات کے لیے اس کو صرف کیا جائے۔ بعد میں زکوٰۃ بن گئی۔ یہ ابتدائی انتظامات تھے۔ ان انتظامات کے سلسلے میں ایک اور چیز کا ذکر بھی کروں گا۔ حکومت کی آمدنی کی نگہداشت کی بھی ضرورت تھی اور یہ کام حضرت بلالؓ کے سپرد تھا، جو مؤذن بھی تھے اور وزیر خزانہ بھی۔ لکھا ہے کہ مسجد نبوی کا ایک حجرہ اس کے لیے مخصوص تھا، جس میں تالا پڑا رہتا۔ یہ کمرہ حضرت بلالؓ کی نگرانی میں رہتا اور اس میں سرکاری رقم اور سرکاری ملکیت کی چیزیں رکھی جاتی تھیں۔ ہمارے مفسروں کے بیان کے مطابق ہجرت کے بہت عرصہ بعد 9ھ میں زکوٰۃ کی آیتیں نازل ہوئیں کہ زکوٰۃ ایک واجبی چیز ہے اور زکوٰۃ ہر اس شخص کو دینا پڑے گی جو نصاب کا مالک ہو۔ یہ رقم مختلف قسم کی ہو سکتی ہے مثلاً زراعتی ہو تو اس کے لیے پیداوار کا دسواں حصہ ادا کرنا ہو گا۔ اگر تاجر ہے تو اس کو اپنے سرمایہ تجارت پر ڈھائی فی صدر قم دینا ہو گی۔ کسی کے پاس لوہے، سونے، چاندی یا اس زمانے کے لحاظ سے کسی اور چیز کی کانیں ہیں تو اس کی ایک مقدار حکومت کو دینی ہوتی تھی۔ اس سلسلے میں شہر مدینہ سے باہر ساری مملکت کے لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرنے کی غرض سے تحصیل دار بھیجے جاتے تھے۔ بعد میں مقامی محصل متعین ہوئے۔ غرض یہ کہ حکومت کے مالیے کے سلسلے میں ایک طرف تو آمدنیاں تھیں اور دوسری طرف خرچ۔ قرآن مجید میں آمدنی کے متعلق بہت کم اشارے ملتے ہیں لیکن خرچ کے متعلق ایک صریح حکم موجود ہے: إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِنَ اللَّهِ (60:9) اس آیت کو ہم اسلامی بجٹ کے اخراجات کے قواعد کی اساس قرار دے سکتے ہیں۔ ان شاء اللہ کسی آئندہ لیکچر میں اس آیت کے ہر ہر لفظ پر تفصیل سے گفتگو کروں گا۔ غرض یہ کہ رسول اکرم ﷺ نے جو حکومت قائم کی تھی اس کے شعبہ مالیہ پر بھی توجہ کی ضرورت ہے۔ علاوہ ان مستقل ذرائع آمدنی کے ایک اور چیز بھی نظر آتی ہے۔ کسی خاص موقع پر ایک بڑی رقم کی ضرورت ہوتی تو رسول اللہ ﷺ خطبہ دیتے اور مسلمانوں کو شوق دلاتے کہ ملک کی فلاں ضرورت کے لیے دل کھول کر چندہ دیں۔ اس سے ایک بات یاد آئی جس کا ذکر کرتا چلوں تاکہ آپ کو اندازہ ہو کہ اس زمانے میں مسلمان کیسے تھے۔ جنگ تبوک کا ذکر ہے دنیا کی سب سے بڑی سلطنتوں میں سے ایک یعنی بیز نطینی سلطنت سے جنگ چھڑ گئی۔ عرب کے بے خانماں بدوی مسلمانوں کو دشمن سے مقابلے کے لیے ایک مہینے کی مسافت طے کر کے بیزنطینیوں کی سرحد تک پہنچنا ہے۔ شدید گرمی کا زمانہ ہے۔ وسائل نقل و حمل کی ضرورت ہے وغیرہ وغیرہ، تو اس وقت رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو ترغیب دلائی کہ اللہ کی راہ میں دل کھول کر حصہ لو، انہوں نے حصہ لیا اور جنگ کامیاب رہی۔ جن لوگوں نے چندہ دیا ان میں سے صرف تین مثالیں میں آپ کو دیتا ہوں۔ سب سے پہلے حضرت عثمانؓ آئے۔ یہ بہت

مال دار تاجر اور بہت ہی مخیر دین دار آدمی تھے۔ اسلام کی ہمیشہ دل کھول کر مالی خدمت کرتے تھے۔ انہوں نے، مجھے جہاں تک یاد ہے، اس وقت چالیس ہزار اشرفیاں پیش کیں۔ ظاہر ہے کہ اتنی بڑی رقم تھی کہ آج بھی ہم اسے بڑی رقم کہہ سکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ خوش ہوئے اور علاوہ اور باتوں کے دعا دینے کے بعد فرمایا کہ آج سے تم جو چاہو کرو، خدا نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ اس سے بڑھ کر انہیں کیا مسرت ہو سکتی تھی کہ اس تھوڑے سے مال کے عوض، جو ان کا سارا مال نہیں تھا بلکہ صرف ایک جز تھا، یہ عظیم بشارت آپؐ سے حاصل کی۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت عمرؓ آئے۔ انہوں نے دس ہزار درہم پیش کیے۔ رسول اللہ ﷺ کے اس سوال پر کہ اہل و عیال کے لیے بھی کچھ چھوڑا ہے؟ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ میری آدھی جائیداد ہے، آدھا حصہ عیال کے لیے چھوڑا ہے۔ رسول اللہ ﷺ خوش ہوئے، ان کو بھی دعا دی۔ اس کے بعد حضرت ابو بکرؓ آتے ہیں اور صرف پانچ سو درہم کی رقم پیش کرتے ہیں۔ زیادہ نہیں، نہ چالیس ہزار اشرفیاں جس کے معنی ہیں چار لاکھ درہم، نہ دس ہزار درہم بلکہ صرف پانچ سو درہم۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کے اس سوال پر کہ گھر میں کیا چھوڑ آئے؟ انہوں نے کہا کہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی محبت کے سوا کوئی چیز نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس شخصیت کا دنیا کے کسی انسان کے ساتھ ہم مقابلہ نہیں کر سکتے۔ نبی کے بعد مرتبے کا کوئی شخص ہوتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے جو اللہ کی راہ پر اپنی ہر چیز قربان کر دیتا ہے۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے اسلام کو پھیلایا۔

اس کے بعد میں آپ سے تعلیم کے متعلق ذکر کروں گا۔ ہمارے نبی رسول اکرم ﷺ پر سب سے پہلے جو وحی نازل ہوئی اس کا پہلا لفظ "اقراء" تھا یعنی پڑھو۔ اس کے بعد رسول اکرم ﷺ کی ساری عمر امت میں لکھنے پڑھنے اور دینی و اخلاقی تعلیم کو رائج کرنے کی سعی میں گزری۔ دو ایک مثالیں میں آپ کو دوں گا۔ مدینہ منورہ میں پہنچے تو سب سے پہلا کام مسجد کی تعمیر کا تھا اور اس مسجد کے اندر "صفہ" ایک حصہ تھا جو تعلیم کے لیے مخصوص تھا۔ "صفہ" چبوترے یا پلیٹ فارم کو کہتے ہیں۔ مسجد کے ایک حصے میں ڈائس کے طور پر ایک چبوترہ بنا دیا گیا تھا جو دن کے وقت تعلیم گاہ کا کام دیتا تھا اور رات کے وقت بے خانماں لوگوں کے لیے سونے کی جگہ بنتا۔ گستاخی معاف! گویا یہ پہلی اقامتی (Residential) یونیورسٹی تھی جو رسول اللہ ﷺ نے قائم فرمائی۔ پہلے ہی دن سے شہر کے باشندے بھی وہاں آنے لگے۔ بے خانماں لوگ حصول تعلیم کے لیے وہیں رہتے تھے۔ مختلف لوگوں کی ضرورتوں کے پیش نظر مختلف قسم کی تعلیم دی جاتی۔ جو لوگ بالکل ہی ان پڑھ تھے ان کو لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا۔ اس کا بھی وہاں انتظام تھا کہ جو لوگ لکھنا پڑھنا چاہتے تھے ان میں سے کسی کو قرآن مجید پڑھ کر اس کے معنی سمجھائے جاتے یعنی تفسیر کی تعلیم دی جاتی، کسی کو کچھ، کسی کو کچھ۔ بعض بڑی اثر انگیز مثالیں بھی ملتی ہیں۔ ایک صاحب کو اس بات پر مامور کیا گیا کہ وہ لوگوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں، کیونکہ وہ بہت خوش نویس تھے۔ ایک اور

صاحب کو قرآن کی تعلیم پر مامور کیا گیا۔ ایک دن وہ آکر کہنے لگے یا رسول اللہ ﷺ میں نے ایک شخص کو قرآن کی تعلیم دی اور اس نے اظہار تشکر کے طور پر مجھے ایک کمان دی ہے کہ اللہ کی راہ میں اس سے جہاد کروں، کیا میں اسے لے سکتا ہوں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دوزخ کی آگ کی کمان ہے۔ چنانچہ وہ دوڑے ہوئے گئے، اس شاگرد کو واپس کر دیا۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ سے انہوں نے وضاحت کر دی تھی کہ میرا شاگرد چاہتا ہے کہ میں اس سے جہاد فی سبیل اللہ کروں مگر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس میں ایک شائبہ یہ ہے کہ تم تعلیم کا معاوضہ لینا چاہتے ہو۔ ابتداء میں ہر چیز رضا کارانہ طور پر تھی۔ ممکن ہے بعد کے زمانے میں جب حکومت کی طرف سے، مدینے میں بھی اور مدینے سے باہر بھی، تعلیم دینے کے لیے اساتذہ مامور کیے گئے تو انہیں حکومت کی طرف سے تنخواہیں دی جاتی ہوں لیکن تعلیم کے سلسلے میں شاگردوں سے کچھ لینے کی صریحاً ممانعت کی گئی۔ تعلیم کے انتظام کے بارے میں ایک مثال دیتا ہوں۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن میں انسپکٹر جنرل آف ایجوکیشن کے طور پر بھیجا جاتا ہے۔ ان کا فریضہ حسب بیان طبری یہ تھا: کان ینتقل من عمالۃ عامل الی عمالۃ اخریٰ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں، ایک کمشنری کے یا ایک عہدیدار کے علاقے کے بعد دوسرے عہدیدار کے علاقے میں جاتے تھے اور وہاں تعلیم کا بندوبست اور انتظام کرتے تھے۔ جب یمن کے متعلق یہ صراحت ملتی ہے تو کوئی تعجب نہیں کہ دوسرے صوبوں میں بھی ایسا ہی انتظام کیا گیا ہو اور وہ اس نہج پر ہوا ہو گا کہ مقامی مدرس بھی مامور کیے جائیں۔ صدر مدرس بھی اور مدرسوں کے ناظرہ وغیرہ بھی مامور کر دیے ہوں گے تاکہ حکومت کی نگرانی بھی تعلیم پر رہے اور اگر کوئی شکایت یا خرابی نظر آئے تو اس کی اصلاح اور سدباب بھی کیا جاسکے۔

اب عدلیہ کے متعلق بھی کچھ عرض کروں گا۔ اس کی ضرورت تھی اور اس کا رسول اللہ ﷺ نے بندوبست بھی کیا۔ ابتداء میں مسلمانوں کی تقریباً ساری آبادی شہر مدینہ میں تھی ان کی تعداد چند سو سے زیادہ نہ تھی۔ مسلمانوں میں تو لڑائی جھگڑے کا سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہیے لیکن انسانی فطرت کے تقاضے سے اگر کبھی جھگڑا یا اختلاف ہو جاتا تو لوگ یا تو اپنے قبیلے کے سردار سے رجوع کرتے یا رسول اللہ ﷺ کے پاس آتے اور فی الفور وہ مقدمہ طے پا جاتا اور فیصلہ نافذ کیا جاتا۔ ہر شخص کو اجازت تھی کہ اعلیٰ ترین افسر عدالت، حکمران ملک یعنی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی شکایتیں پیش کرے اور فیصلہ پائے۔ رفتہ رفتہ جب سلطنت کی توسیع ہوئی تو مختلف مقامات پر عدالتی انتظامات کی ضرورت پیش آئی۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ چیز یہ دیکھنے میں آئی ہے کہ جب یمن کے علاقے نجران کے عیسائی مدینہ منورہ آئے تو انہوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا، لیکن اسلامی مملکت کے ماتحت رہنے کو قبول کر لیا۔ کچھ شرطیں بھی طے کیں کہ ہمارا گرجا برقرار رہے، اپنے گرجاؤں کے سردار کو ہم ہی متعین کریں گے وغیرہ وغیرہ۔ آخر

میں انہوں نے مسلمان حاکم عدالت کی غیر جانبداری پر اعتماد کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ انہیں ایک مسلمان جج مہیا کیا جائے۔ چنانچہ رسول اکرم ﷺ حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ کو روانہ کرتے ہیں کہ وہ "امین ھذا الامة" یعنی مسلمانوں میں قابل اعتماد شخص ہیں۔ انہوں نے وہاں اپنے فرائض اس خوبی سے انجام دیے کہ ملک میں جلد ہی اسلام پھیلنے لگا۔ بہت سے عیسائی مسلمان ہو گئے۔ مختلف مقامات کے قاضیوں کو مختلف ہدایات دی جاتی رہیں مثلاً ایک مرتبہ حضرت علیؓ کو ایک جگہ کا قاضی بنا کر بھیجا گیا۔ یہ بالکل نوجوان تھے۔ انہیں قاضی نامزد کیا گیا تو کہنے لگے کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں نے کبھی یہ کام کیا ہی نہیں، یہ خدمت کیسے انجام دوں گا؟ رسول اللہ ﷺ نے ان سے کہا کہ ایک بنیادی اصول میں تمہیں بتاتا ہوں۔ جب کوئی شخص تمہارے پاس آئے اور کوئی شکایت پیش کرے تو صرف اسی کی بات سن کر فیصلہ نہ کرو، جب تک مدعی علیہ یا فریق ثانی کو بھی بلا کر اس کا بیان نہ سن لو، پھر دونوں کے بیانات کی روشنی میں تم اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ کر سکتے ہو۔ حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں ساری عمر عدالتی فیصلے کرتا رہا ہوں، مجھے کبھی جھجک محسوس نہیں ہوئی، کیونکہ بنیادی اصول یہ تھا کہ دونوں آدمیوں کی باتیں سنوں اور اس کی روشنی میں صحیح نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کروں۔

یہ تمام امور تھے جن کی اساس پر اسلامی مملکت کے مختلف محکموں اور مختلف اداروں کا آغاز ہوا تھا۔ تعلیم کا بھی آغاز ہوا اور فوج کا بھی انتظام ہوا۔ مالیے کا بھی انتظام ہوا اور سرکاری سیکرٹریٹ کا بھی انتظام ہوا۔ غرض جن جن چیزوں کی اس وقت ضرورت تھی، ان میں ہر ایک کا حسب ضرورت انتظام کیا گیا۔ بعد کے زمانے میں جو ترقی یافتہ انتظامی ادارے نظر آتے ہیں، ان سب کی بنیاد عہد نبوی کی اس اسلامی مملکت کی ایک خصوصیت کی طرف اشارہ کیے بغیر اسے ختم نہ کروں گا۔ یہ وہ مشرکین قریش کے زیر تسلط شہری مملکت مکہ کے متعلق رسول اکرم ﷺ کا تصور یہ تھا کہ وہ لوگ واقعے کی حد تک (Defacto) تو بیشک اس کے مالک ہیں لیکن استحقاق کی حد تک (Dejure) وہ مسلمان اور رسول اکرم ﷺ کی چیز ہے۔ اس لیے جنگ بدر کے سلسلے میں ذکر آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب سنا کہ قریش کا جھنڈا خاندان عبد الدار کے ایک مشرک کے ہاتھ میں ہے تو فرمایا کہ حق رسانی اسلام کا فریضہ ہے اور یہ کہہ کر اپنا جھنڈا حضرت مصعب بن عمیر العبدری کے (جو اسی خاندان کے ایک مسلمان تھے) سپرد فرمایا۔ صلح حدیبیہ کے وقت مشرکین سے گفت وشنید کے لیے ایک شخص کو مکہ بھیجنے کی ضرورت تھی۔ اس پر حضرت عمرؓ کا انتخاب کیا گیا، وہ سابق میں مکہ میں موروثی وزیر خارجہ تھے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ کو اسلام لانے کے بعد اسلامی سوارہ فوج کا افسر بنا دیا گیا کہ مکہ میں وہی ان کا منصب تھا۔ حضرت ابو بکرؓ کو رسول اللہ ﷺ نے مدینے میں مفتی مقرر فرمایا۔ یہ مکہ میں بھی ان کا فریضہ رہا تھا۔ فتح مکہ پر حضور اکرم ﷺ کے چچا حضرت عباس

نے چاہا کہ خانہ کعبہ کی چابی انہیں دے دی جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے انکار کیا اور قدیم موروثی کلید بردار کو، جو مسلمان ہو گیا تھا، وہ چابی مکرر عطا فرمائی اور دیگر فرائض کے متعلق بھی موروثی لوگوں کی تلاش کا ذکر ملتا ہے۔ اس سے میری ناقص رائے میں یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ ہجرت کے بعد اولاً رسول اکرم ﷺ اپنے کو شہری مملکت مکہ کا بالاستحقاق (Dejure) حکمران سمجھتے رہے، چاہے مشرکین ہی واقعے کی حد تک (Defacto) اس پر مسلط رہیں۔ فتح مکہ کے بعد یہ دونوں امور رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں آ گئے اور اسی کی طرف قرآن مجید (8:30 تا 34) میں واضح ذکر ہے کہ:

وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۚ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ () وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا قَالُوا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هَٰذَا ۙ إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ () وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ () وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ () وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ وَهُمْ يَصُدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوا أَوْلِيَاءَهُ ۚ إِنْ أَوْلِيَاؤُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ()

ضمناً یہ بھی یاد دلا دوں کہ حکومت تو خدا کی ہے اور اسی نے زمین میں ہمیں نائب بنایا ہے، اسی لیے اسی کے احکام نافذ کرنا ہمارا فریضہ ہے۔

والسلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ

---

[1] اور (اے محمد ﷺ اس وقت کو یاد کرو) جب کافر لوگ تمہارے بارے میں چال چل رہے تھے کہ تم کو قید کر دیں یا جان سے مار ڈالیں یا (وطن سے) نکال دیں تو (ادھر تو) وہ چال چل رہے تھے اور (اُدھر) خدا چال چل رہا تھا۔ اور خدا سب سے بہتر چال چلنے والا ہے (30) اور جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کہتے ہیں (یہ کلام) ہم نے سن لیا ہے اگر ہم چاہیں تو اسی طرح کا (کلام) ہم بھی کہہ دیں اور یہ ہے ہی کیا صرف اگلے لوگوں کی حکایتیں ہیں (31) اور جب انہوں نے کہا کہ اے خدا اگر یہ (قرآن) تیری طرف سے برحق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا کوئی اور تکلیف دینے والا عذاب بھیج (32) اور خدا ایسا نہ تھا کہ جب تک تم ان میں سے تھے انہیں عذاب دیتا۔ اور ایسا نہ تھا کہ وہ بخششیں مانگیں اور انہیں عذاب دے (33) اور (اب) ان کے لیے کون سی وجہ ہے کہ وہ انہیں عذاب نہ دے جب کہ وہ مسجد محترم (میں نماز پڑھنے) سے روکتے ہیں اور وہ اس مسجد کے متولی بھی نہیں۔ اس کے متولی تو صرف پرہیز گار ہیں۔ لیکن ان میں اکثر نہیں جانتے (34) [سورہ انفال]

## سوالات و جوابات

برادران کرام! خواہران محترم! السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ!

کچھ سوالات آپ کی طرف سے آئے ہیں، اپنی بساط کے مطابق جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

**سوال 1:** آپ نے کہا کہ بیت المعمور سے اگر ایک پتھر پھینکیں تو کعبہ کی چھت پر گرے گا۔ جدید علم کی روشنی میں زمین متحرک ہے اس لحاظ سے کعبہ کا مقام بیت المعمور کے لحاظ سے (Relatively) تبدیل ہوتا رہے گا۔ وضاحت فرمائیں۔

**جواب:** غالباً آپ نے میرے اشارے کے چند الفاظ پر توجہ نہیں دی۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ ایک دوسرے عالم کی چیز ہونے کی وجہ سے ہماری دنیا کی چیزوں سے مختلف ہے۔ اسے ہم بطور رمز یا علامتی (Symbolic) انداز میں سمجھ سکتے ہیں۔ سمجھانے کا یہ انداز اس لیے اختیار کیا گیا کہ اہل زمین کو زمینی چیزوں کے مطابق سمجھایا جاسکے۔ دوسرے عالم کی چیزوں کو زمینی اساس پر ہم معلوم نہیں کرسکتے۔

دوسری چیز میں آپ سے مزاحاً پوچھوں گا کہ اگر زمین متحرک ہے تو آپ کیوں فرض کر لیتے ہیں کہ آسمان متحرک نہیں۔ اگر آسمان بھی اسی طرح گردش کرتا ہے تو اس کی جگہ میں کبھی فرق نہیں آتا۔ بہر حال اس کے متعلق سوائے اس کے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا کہ حدیث شریف میں اس کا ذکر آیا ہے۔ اس کو اگر رمز کے طور پر (Symbolic) لیں تو ہم اس سے استفادہ کرسکتے ہیں۔ آج کے علم میں ہو سوال کریں تو ہمیں کل کا کوئی علم اور چیز بیان کرے گا۔ اس لیے ہمیں اپنے اضافی (Relative) علوم کی اساس پر ان روحانی حقائق اور عالمِ بالا کی چیزوں کو نہیں جانچنا چاہیے۔

سوال2: آپ نے ابھی اپنے لیکچر میں بتایا ہے کہ حضور ﷺ حضرت بلالؓ کو اذان سکھائی اور یہ بتایا کہ کن لفظوں کو کھینچ کر ادا کرنا چاہیے اور کن لفظوں کو اختصار سے، اس طرح موسیقی کے سر بتائے۔ اس بیان کی روشنی میں وضاحت کریں کہ موسیقی کی اسلام میں کس حد تک گنجائش ہے؟

**جواب**: یہی نہیں اور بہت سی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیقی کی اسلام میں ممانعت بالکل نہیں ہے اگر ممانعت ہے تو اس بات کی کہ مثلاً نماز کے وقت موسیقی کا شغل جاری رکھا جائے یا اس کا منشا ایسی تفریح ہو جو اخلاقی نقطہ نظر سے بری سمجھی جاتی ہے۔ میں آپ کو کچھ مثالیں دیتا ہوں جن سے یہ ظاہر ہو گا کہ فی نفسہٖ موسیقی کی ممانعت نہیں ہے۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے ایک نکاح کی دعوت سے واپس آکر حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ اے عائشہ! آج میں تمہارے خاندان کے ایک فرد کی شادی میں گیا تھا، مگر وہاں کوئی موسیقی نہیں تھی، یہ کیسی بات ہے؟ یعنی رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ نکاح کے سلسلے میں موسیقی کی ضرورت ہے۔ ایک اور مثال دیتا ہوں، یہ حجۃ الوداع کے زمانے کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ "منیٰ" میں مقیم تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ وہاں میرے خیمے کے اندر جہاں رسول اللہ ﷺ لیٹے ہوئے تھے اور چہرے پر چادر ڈال کر آرام فرما رہے تھے، میرے پاس چند لڑکیاں دف بجا رہی تھیں۔ اتنے میں حضرت ابو بکرؓ رسول اللہ ﷺ سے ملنے کے لیے آئے اور ان لڑکیوں کو ڈانٹا، یہ کیا شیطانی کام ہے، جاؤ نکلو یہاں سے، رسول اللہ ﷺ جو سوئے ہوئے نہیں تھے، سر اٹھاتے ہیں اور کہتے ہیں اے ابو بکر! یہ عید کا دن ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کی کوئی ممانعت نہیں ہے بلکہ اس کے بر خلاف ہونا چاہیے۔ اسی طرح ایک اور عید کے سلسلے میں مدینہ منورہ کا واقعہ ہے۔ غالباً 2 یا 3ھ یعنی بہت ہی ابتدائی زمانے کا واقعہ ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں عید کے دن رسول اللہ ﷺ کے مکان کے سامنے کچھ شور سننے میں آیا۔ رسول اللہ ﷺ اٹھے، دیکھا کہ کیا ہے؟ میں بھی اٹھی تاکہ اس تماشے کو دیکھوں۔ مدینہ منورہ میں حبشیوں کی ایک آبادی تھی۔ عید کے دن یہ لوگ خصوصاً نوجوان حبشی مدینے کی گلیوں میں سے گزرتے اور اپنے نیزہ بازی کے کرتب ہر مکان کے سامنے دکھاتے اور مکان والا یقیناً انہیں ان کو کچھ نہ کچھ دیتا۔ آپ ﷺ نے ان حبشیوں کو روکا نہیں بلکہ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ مجھ کو دکھانے کے لیے بلا لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پوچھا عائشہ! بس دیکھ چکیں؟ میں نے کہا نہیں، ابھی اور دیکھوں گی، ٹھہر جایئے۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ بالآخر جب میں خود ہی تھک گئی تو میں اندر چلی گئی۔ ان حبشی بچوں کے بارے میں ایک اور بات یاد آگئی، عرض کیے دیتا ہوں۔ جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ پہنچے۔ لوگ "قبا" میں آپ ﷺ کا انتظار کرتے رہے۔ روایت ہے کہ مدینے کی ساری آبادی، کیا مسلمان، کیا غیر مسلم، اپنی مہمان نوازی کے اظہار کے لیے استقبال میں شریک تھی۔ یہ حبشی لڑکے بھی دوڑے ہوئے آئے اور اپنے

نیزہ بازی کے کرتب رسول اللہ ﷺ کے سامنے دکھانے لگے۔ اس سے ان کی فراخ دلی اور وسیع القلبی کا مظاہرہ ہوتا ہے چنانچہ رسول اللہ ﷺ بھی ان لوگوں کا تالیف قلبی کیا کرتے تھے اور ان سے محبت سے پیش آتے تھے اور غالباً ان کی مالی مدد بھی کیا کرتے تھے۔ اسی طرح موسیقی کے سلسلے میں آپ ایک اور چیز بھی دیکھئے۔ قرآن مجید کی تلاوت بھی موسیقی ہی کی ایک شاخ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے احکام ہیں کہ قرآن حکیم کو معمولی نثری عبارت کی طرح نہ پڑھو کہ ڈھول اڑانا سمجھا جائے بلکہ خوش الحانی سے پڑھو اور یہ بھی فرمایا کہ اللہ نے کسی غنا، کسی گانے کی اجازت اتنی نہیں دی ہے جتنی قرآن مجید کی اچھی آواز سے تلاوت کرنے کی اجازت دی ہے۔ ایک دوسری حدیث یہ ہے کہ خدا کسی گانے کی آواز پر اتنا کان نہیں دھرتا جتنا قرآن مجید کی اچھی تلاوت کرنے پر اپنے کان لگاتا ہے۔ غرض یہ کہ موسیقی کی کوئی اصولی ممانعت نہیں ہے، بشرطیکہ موسیقی کا مقصد اچھا ہو اور اس سے ہماری مذہبی عبادت میں کوئی حرج واقع نہ ہو۔ اگر مزید تفصیل درکار ہو تو امام غزالی کی کتاب "احیاء العلوم" کو دیکھئے۔ اس میں ایک پورا ضخیم باب اس موضوع پر ہے۔ وہ تفصیل سے بتاتے ہیں کہ اسلام میں موسیقی اور گانے کی کیا حیثیت ہے۔

**سوال 3:** مرحوم کی قل خوانی اور چہلم کے متعلق آپ کا نظریہ کیا ہے؟ یہ شرعی حکم ہے؟ آنحضور ﷺ اور خلفائے راشدین کے حوالے سے اس رسم کا کوئی ذکر آیا ہے؟

**جواب:** میں عرض کروں گا کہ اگر کسی کی وفات کے تیسرے دن، دسویں دن، چالیسویں دن ہم کچھ کرنا چاہیں تو وہ کام یہ ہونا چاہیے کہ قرآن مجید کی تلاوت کریں اور اس کا ثواب متوفی شخص کو پہنچانے کی اللہ سے دعا کریں۔ اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے، چاہے ہر روز کریں، چاہے ہر سال، چاہے ابتداءً متعدد بار کریں، کوئی امر مانع نہیں ہوتا اور میرے مرنے کے بعد اگر آپ میرے لیے بھی دعا کریں تو میں آپ کا ممنون ہوں گا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

# خطبہ ۸: عہدِ نبویؐ میں نظامِ دفاع اور غزوات

محترم صدر! محترم وائس چانسلر صاحب! محترم اساتذہ اور محترم بھائی بہنو!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

الحمد اللہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین وآلہ واصحابہ اجمعین

عہدِ نبویؐ کے مختلف شعبوں کے متعلق میں مختلف چیزیں اب تک عرض کر چکا ہوں کچھ اور بھی عرض کرنی ہیں۔ ان میں سب سے مشکل غالباً دفاع کا پہلو ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس فن کے الف ب سے بھی میں واقف نہیں۔ کبھی فوجی زندگی گزارنے یا فوجی تعلیم حاصل کرنے کا مجھے موقع نہیں ملا۔ بہر حال مطالعے میں مجھے جو جو چیزیں دفاع اور فوج سے متعلق نظر آئیں وہی آپ کی خدمت میں پیش کر سکوں گا۔

کسی ملک کے دفاع کے لیے نہ صرف فوجی تیاری درکار ہوتی ہے بلکہ غیر فوجی انتظامات بھی ضروری ہوتے ہیں۔ اولاً میں غیر فوجی امور کے متعلق ایک چھوٹی سی بات عرض کروں گا، جس سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ مسلمانوں کی سب سے پہلی، بہت ہی ننھی منی سلطنت جو مدینہ منورہ میں قائم ہوئی تھی، اس کو ابتداء میں مختلف قسم کی مشکلات سے بچانے کے لیے ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح اپنی تدبیروں کا آغاز کیا تھا۔ میں نے بیان کیا تھا کہ مکہ معظمہ سے مسلمان ہجرت کر کے مدینہ آنے پر مجبور ہوئے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہاں سے تشریف لائے، تو شاید عام حالات میں کسی سلطنت کے قیام کی ضرورت پیش نہ آتی۔ لیکن مشرکین نے وہاں بھی چین نہ لینے دیا۔ وطن سے نکالا، وطن میں انکی جائیدادوں کو ضبط کیا اور انھیں سالہا سال تک ہر طرح کی

اذیتیں دیتے رہے۔ جب مسلمان وہاں سے چلے گئے، تب بھی انہیں چین نہیں آیا اور مدینہ والوں کو لکھ بھیجا کہ ہمارے دشمن (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو یا تو جان سے مار ڈالو یا انھیں اپنے ملک سے نکال دو، ورنہ ہم کوئی مناسب تدبیر اختیار کریں گے۔ یہ فوجی حملے کی دھمکی ایسی تھی کہ کوئی شخص آسانی سے اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا، خاص کر وہ نبی جو دنیا کے سارے لوگوں کے لیے اسوہ حسنہ تھا۔ بادشاہوں کے لیے بھی، فقیروں کے لیے بھی، عالموں کے لیے بھی اور جاہلوں کے لیے بھی۔ آپ نے آنے والے مسلمان حکمرانوں اور سپہ سالاروں کے لیے ایک سبق آموز نمونہ چھوڑا ہے۔

اولین مسئلہ یہ تھا کہ مہاجرین کو کس طرح روزگار پر لگایا جائے اور کس طرح ان کی فوری ضرورتوں کو پورا کیا جائے؟ اس کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مواخات کا طریقہ اختیار فرمایا، جس نے طرفتہ العین میں ان کی ساری مشکلات کو ختم کر دیا۔ اس کے بعد دوسری تدبیر یہ فرمائی کہ چونکہ شہر مدینہ میں کوئی سلطنت نہیں پائی جاتی تھی، وہاں صرف قبیلے ہی قبیلے تھے اور یہ قبیلے نسل ہا نسل خانہ جنگیوں میں مشغول تھے۔ ان میں باہمی نفرت، حسد، جلن، اور دشمنی پائی جاتی تھی اور اگر ان قبیلوں میں سے کسی ایک پر ان کا دشمن حملہ کرتا تو دوسرے لوگ غیر جانب دار رہتے تھے۔ نتیجۃً اسے تنہا مقابلہ کرنا پڑتا۔ ان حالات میں انتہائی فراست سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر مدینہ کے لوگوں کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اپنے مذہبی اختلافات اور قبائلی انفرادیت کے باوجود یہ مناسب ہو گا کہ تم سب مل کر ایک چھوٹی سی مملکت قائم کر لو۔ آپس میں ایک مرکزیت پیدا کرو اور اپنے دشمن کے مقابلے کے لیے اپنی موجودہ قوت کو اس طرح مجتمع کر لو کہ اس کا کوئی جزء ضائع نہ ہونے پائے۔ اس تجویز کو قبو کر لیا گیا اور جیسا کہ کل بھی میں نے اشارتہً عرض کیا تھا، ایک مملکت قائم ہوئی جو شہر مدینہ کے بڑے حصے پر مشتمل تھی اور اس میں مسلمانوں کے علاوہ یہودی بھی شریک تھے اور جو مشرک قبیلے اسلام نہیں لائے تھے، وہ بھی اس میں داخل ہوئے۔ ان سبھوں نے بالاتفاق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا سردار تسلیم کیا۔ جو اختیارات مرکز کے لیے موزوں تھے وہ مرکز کے سپرد کئے گئے اور دیگر معاملات میں ہر قبیلے کی داخلی خود مختاری قائم رہی۔ جو چیزیں مرکز کے سپرد کی گئیں، ان میں سب سے اہم فوجی دفاع کا مسئلہ تھا۔ چنانچہ صراحت کے ساتھ اسے مملکت کے دستور میں تحریری طور پر لکھا گیا، اور یہ دستور ہم تک بھی پہنچا ہے، کہ جب کبھی دشمن سے مقابلہ ہو گا تو اس کا انتظام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کریں گے۔ اگر فوج باہر جا کر لڑنے پر مجبور ہو گئی تو اس کا اختیار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو گا کہ کس کو فوج میں رہنے کی اجازت دیں اور کس کو فوج میں داخل ہونے سے روک دیں تاکہ دشمن کے جاسوس یا منافق اور غدار لوگ شریک ہو کر اندرونی طور پر نقصان نہ پہنچا سکیں۔ یہ ابتدائی انتظامات تھے۔

میں نے ابھی عرض کیا کہ ہے کہ دفاع کے انتظامات میں بعض غیر فوجی کام بھی کرنے پڑتے تھے۔ اس کی طرف میں توجہ دلاتا ہوں۔ جیسے ہی یہ ابتدائی انتظامات مکمل ہوگئے۔ یعنی بے گھر مہاجرین کا مسئلہ ختم ہوگیا اور مملکت یعنی شہر مدینہ کے سارے قبائل کی ایک تنظیم عمل میں آگئی تو فوراً ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دورے کرنے کا آغاز فرمایا۔ پہلے شمال کی طرف گئے۔ مدینے سے شمال کی طرف تین چار دن کی مسافت پر قبیلہ جھینہ بستا تھا۔ اس کے معاہدہ کی جو تفصیلات موجود ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قبیلہ مسلمان نہیں تھا، اس کے باوجود وہ مسلمانوں کے ساتھ فوجی حلیفی پر تیار تھا۔ غالباً رسول اکرم صلی الہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے یہ تجویز پیش کی ہوگی کہ تم تنہا ہو، تمھارے دشمن موجود ہیں۔ اگر وہ تم حملہ کریں گے تو کوئی تمھیں مدد نہیں دے گا۔ کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ تم اور ہم آپس میں دوستی کرلیں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اگر تم پر کوئی حملہ کرے گا۔ ہم تمھاری مدد کو دوڑے آئیں گے اور اگر ہم پر کوئی حملہ کرے اور ہم تمھیں بلائیں تو تم بھی مدد کو آنا۔ بات معقول تھی۔ اس قبیلے نے قبول کرلیا۔ چنانچہ معاہدے میں صراحت ہے کہ یہ صرف فوجی معاہدہ ہے اس کا دینی معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس ابتدائی کامیابی کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینے کے جنوب کی طرف جاتے ہیں۔ وہاں کے قبائل سے بھی ایسی ہی مفاہمت کرتے ہیں۔ جنوب کے قبائل بھی مسلمان نہ ہونے کے باوجود جنگی حلیفی پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ پھر مشرق کی طرف جاتے ہیں۔ وہاں کے قبائل سے بھی دوستی کی کوشش کرتے ہیں۔ اس قسم کے پانچ سات معاہدے تاریخ میں اب تک محفوظ ہیں۔ ان پر غور کیجیۓ تو آپ کو نظر آۓ گا کہ مدینے کی بستی یا شہری ریاست کو محفوظ کرنے کی تدبیر اس انداز سے کی جارہی ہے کہ مدینے کے اطراف کے علاقوں کو دوست بنالیا جائے تاکہ اگر دشمن مدینے پر حملہ کرنا چاہے تو براہ راست مدینے تک نہ پہنچ سکے۔ بلکہ مدینے تک پہنچنے سے پہلے ہی درمیان کے علاقوں میں اس کو رکاوٹوں سے سابقہ پڑے، ہمارے دوست وہاں ہوں گے۔ وہ بروقت ہمیں اطلاع دیں گے۔ ہم ان کی مدد کو جائیں گے اور اپنے دوست قبائل کی مدد سے اس دشمن کو روکنے کی کوشش کریں گے، گویا ایک "منڈل" حلقہ Cordon قائم ہوگیا۔ وہ چنانچہ مدینے کے لیے مدینے کے اطراف دوستوں کی بستیاں قائم کرتے ہیں اور ان دوستوں کی مدد سے جنگی نقطہ نظر سے مدینے کی حفاظت عمل میں آتی ہے۔ یہ ایک پہلو تھا۔

اس قسم کی چیزیں ہمیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے ہر دور میں ملتی ہیں۔ مگر میں ان تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ صرف اشارۃً مثال کے طور پر عرض کرنا ہے کہ فوجی حفاظت کے لیے غیر فوجی اور سیاسی طریقے بھی استعمال کرنے پڑتے ہیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ایک نمونہ پیش کیا کہ کس طرح مسلمانوں کی اس ابھرنے والی، چھوٹی سی سلطنت کو، جس کے

بہت سے دشمن تھے، ان دشمنوں سے محفوظ رکھنے اور بچانے کا انتظام کیا جائے۔ ابتدائی معاہدہ جو مدینے کے اطراف کے قبیلوں سے کیا گیا تھا، وہ مکے کے لوگوں کی دشمنی اور انتقام سے بچاؤ کی ایک صورت تھی۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ مکے والوں نے مسلمانوں کو ستایا، کئی ایک کو قتل کیا اور جب مسلمان وہاں سے ہجرت کر کے مدینے آئے تو انکی جائیدادیں بھی ضبط کر لیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو قانونِ فطرت کے تحت یہ حق حاصل تھا کہ ان مکہ والوں سے جانی اور مالی دونوں طرح سے انتقام لیں۔ ابھی مسلمانوں کے پاس اتنی فوجی قوت نہیں تھی کہ دشمن کو جانی نقصان پہنچائیں لیکن مسلمانوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایماء سے ان پر معاشی دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔

مکہ کے قریش اپنی گزر اوقات کے لیے تجارت کے سوا اور کوئی وسیلہ نہیں رکھتے تھے۔ ان کے وہ کاروانِ تجارت جو مکہ کے جنوب میں یمن وغیرہ کی طرف جاتے تھے، ان کو مسلمانوں سے نقصان پہنچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن جب ان کے کاروان شمال میں عراق، شام یا مصر کی طرف جاتے تو مدینے کے قریب سے گزرنا ناگزیر تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ تم ہمارے علاقے سے نہیں گزر سکتے۔ ہمارے علاقے سے مراد مدینہ کا شہر ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے جو حلیف قبیلے تھے ان کے علاقے سے بھی ان کا گزرنا ممنوع کر دیا گیا۔ یہ قریش کے لیے سخت ناگوار بات تھی کہ ان کی تجارت میں رکاوٹ پڑے۔ انھوں نے نہ مانا بلکہ اصرار کیا کہ ہم ضرور گزریں گے۔ ظاہر ہے کہ اس ابتدائی زمانے میں مسلمان مٹھی بھر تھے اور ایک ایسے ملک میں تھے جہاں سوائے خودرو گزرگاہوں کے کوئی سڑک نہیں پائی جاتی۔ ایک جگہ آپ روکیں تو بہت سے راستے اور موجود تھے، جہاں سے آدمی گزر سکتے تھے۔ ان حالات میں قریشی کاروانوں کو روکنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس لیے بارہا ان کو روکنے کی کوششیں ناکام ہوئیں۔ چنانچہ جنگ بدر سے قبل تقریباً سات مرتبہ مسلمان فوجیں یہ اطلاع ملنے پر کہ قریشی قافلہ گزر رہا ہے، اس کو روکنے کے لیے گئیں لیکن وہ ان کے ہاتھ نہ آیا بلکہ کسی نہ کسی طرح بچ نکلا۔ مگر کوششیں جاری رہیں معلومات حاصل کرنے کے وسائل کو ترقی دی جانے لگی۔ دوستوں کی تعداد بڑھائی جانے لگی۔ غرض جو تدبیریں ممکن تھیں وہ اختیار کی جارہی ہیں۔ اس کے بعد جب قریش نے دیکھ لیا کہ مسلمان ان کو آسانی سے گزرنے نہیں دیں گے تو انھوں نے زبردستی گزرنے کی ٹھان لی۔

جنگِ بدر سے عین قبل کا واقعہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ دیکھا کہ قریش شمال کی طرف گئے ہیں تو آپ کے ذہین میں یہ بات آئی کہ دشمن کاروان اسی راستے سے واپس آئے گا، کسی اور راستے سے وہ نکل نہیں سکتا۔ لہٰذا دو جاسوس مقرر کئے کہ تم بھی شام کو جاؤ۔ اس کاروان کے قریب رہو۔ جیسے ہی وہ واپسی کا انتظام کر کے، واپسی کا ارادہ کرے، تیزی سے آکر ہمیں اطلاع دو کہ

دشمن اب آنے والا ہے۔ تجارتی کارواں اور جاسوس کی رفتار تقریباً یکساں ہی تھی کیونکہ اونٹوں کے سوا کوئی تیز رفتار سواری میسر نہیں تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب یہ دونوں جاسوس تیزی سے مدینے واپس آئے تو دیکھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کارواں کی آمد کی اطلاع دیگر وسائل سے ہو چکی ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے سے روانہ بھی ہو چکے ہیں۔ اس سے یہ استنباط کرنا پڑتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف وسائل اختیار فرماتے تھے تاکہ دشمن کی خبریں مسلمانوں تک پہنچتی رہیں اور اور اس کی بھی کوشش کرتے کہ ہماری خبریں دشمن تک نہ پہنچنے پائیں۔ غرض رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینے سے نکل چکے تھے اور فوجی فراست کی بدولت مدینے کے شمال کی طرف جانے کی بجائے مدینے کے جنوبی شہر مکہ کی طرف جاتے ہیں تاکہ دشمن سے پہلے کسی محفوظ مقام تک پہنچ جائیں جہاں دشمن کا روکنا ممکن ہو۔ اس کے لیے بدر کا مقام منتخب کیا گیا۔ مجھے وہاں جانے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ یہ مقام ایسا ہے جو بلند پہاڑیوں کے درمیان تنگ وادیوں میں سے گزرتا ہے۔ اس لیے نسبتاً آسانی کے ساتھ یہ ممکن تھا کہ مسلمان ایک ایسے مقام پر قیام کریں جہاں تنگ راستہ ہو۔ وہاں پہاڑیوں میں چھپے رہیں، دشمن بے خبری میں آئے اور وہ اس پر چھاپا مار سکیں۔ مختصر یہ کہ مختلف مقامات پر دریافت کرتے ہوئے جاتے ہیں کہ دشمن کی کوئی اطلاع ہے۔ لکھا ہے کہ بعض اوقات مسلمانوں کی فوج کے کچھ لوگ نکلتے ہیں اور سکاؤٹنگ کرتے اور بعض اوقات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے ساتھ ایک دو صحابہ کو لے کر نکلتے اور راستے میں کوئی بدوی ملتا تو اس سے پوچھتے کہ تمھیں اطلاع ہے کہ قریش کا کارواں اس وقت کہاں ہوگا؟ اس سے بھی آپ کو کچھ معلومات حاصل ہوتیں۔ اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بدر کے مقام پر پہنچے۔ وہاں معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک دشمن کا کارواں وہاں سے نہیں گزرا۔ مشورہ ہوتا ہے کہ کہاں ٹھہرنا چاہئے۔ ایک مقام کا انتخاب کیا جاتا ہے جو بدر کے شمال میں ہے اور بہت ہی تنگ درہ ہے۔ مسلمان وہاں قیام کرتے ہیں۔ دو ایک دن بعد دشمن کا کارواں وہاں پہنچ جاتا ہے۔ اس سے پہلے دشمن کو تجربہ ہو چکا تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کا تعاقب کرتے ہیں۔ جاتے وقت بھی پیچھا کیا تھا حتیٰ کہ لڑنا چاہا تھا۔ لہٰذا وہ اب چوکس اور چوکنے تھے۔ قافلے کو بدر کے درہ میں سے گزرنے سے پہلے ہی ایک مقام پر ٹھہرا دیا گیا اور قافلے کا سردار ابوسفیان تن تنہا بدر کے شہر میں آتا ہے جہاں سے وہ اکثر گزرا کرتا تھا۔ وہ وہاں کے لوگوں سے واقف تھا۔ اس لیے وہاں جا کر سب سے پہلے اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں لوگ مل سکتے ہیں۔ یہ مقام وہاں کا ایک طرح سے کلب تھا۔ وہاں لوگوں کے لیے ایک ہی کنواں تھا، کوئی نا کوئی آدمی ہر وقت وہاں مل سکتا تھا یا تھوڑی ہی دیر میں کوئی نہ کوئی شخص آجاتا تھا۔ ابوسفیان وہاں پہنچتا ہے اور بعض پانی بھرنے والے مردوں یا عورتوں سے معلوم کرتا ہے کہ قبیلے کا سردار اس وقت کہاں ہے۔ پھر اس سے جا کر ملتا ہے اور اس سے گفتگو کرتا ہے۔ وہ سردار ابوسفیان سے کہتا ہے کہ کوئی ایسی چیز میرے دیکھنے سننے میں نہیں آئی جس سے یہ گمان ہو کہ یہاں کوئی بڑی فوج تمھارے مقابلے کے لیے آئی ہوئی ہے۔ البتہ ابھی

تھوڑی دیر پہلے دو بدوی یہاں سے اونٹوں پر گزرے۔ انھوں نے اتر کر کنویں سے پانی پیا اور پھر چلے گئے۔ اس کے سوا کوئی نئی چیز میرے علاقے میں نہیں گزری۔ ابو سفیان احتیاط سے آگے بڑھتا ہے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر کچھ اونٹوں کی تازہ لید پڑی دیکھتا ہے۔ ایک لید کا گولا اٹھاتا ہے اس کو چیر کر دیکھتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کے اندر گھاس نہیں بلکہ کھجور کی گٹھلی ہے۔ وہ چلا اٹھتا ہے کہ یہ مقامی اونٹ سوار نہیں ہو سکتا بلکہ یہ تو مدینے کے اونٹ ہیں کیونکہ مدینے ہی میں کھجور کی گٹھلیاں مل سکتی ہیں۔ اس لید کے اندر چوں کہ کھجور کی گٹھلی پائی جاتی ہے لہٰذا یہ مدینے سے آئے ہوئے مسلمان ہی ہوں گے۔ پھر وہ پوری تیزی سے بھاگتا ہوا اپنے کارواں میں پہنچتا ہے اور اس کو بدر سے باہر سمندر کے کنارے ہی کنارے ایک منزل کی جگہ دو منزل کرتا ہوا، تھکے ہوئے قافلے کو آرام کا موقع نہ دے کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ اور بلا خر مسلمانوں کی دسترس سے بچ جاتا ہے۔ بچنے سے پہلے وہ ایک شخص کو اجرت دے کر یہ کہتا ہے کہ پوری تیزی کے ساتھ مکہ جاؤ اور مکے والوں کو اطلاع دو کہ دشمن (یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) ہم پر حملہ کر رہے ہیں۔ تمھارا مالِ تجارت لٹ جائے گا۔ لہٰذا ہماری مدد کو آؤ۔ وہ شخص مکہ پہنچتا ہے۔ اس احتیاطی تدبیر کے بعد جب ابو سفیان کا کارواں دو منزل سفر کے بعد اطمینان محسوس کرتا ہے تو پھر ایک نیا پیام رساں اہل مکہ کو روانہ کرتا ہے کہ اب تمھارے آنے کی ضرورت نہیں۔ میں بچ چکا ہوں۔ مگر جو فوج مکہ سے روانہ ہو چکی تھی اس کا سردار ابو جہل تھا، اس نے کہا کہ ایسے دشمن کا خاتمہ کر دینا چاہئے ورنہ آج نہیں کل، کل نہیں تو پرسوں ہمیں نقصان پہنچائے گا۔ ہم کافی جمعیت کے ساتھ نکلے ہیں اور ہم میں یہ قوت ہے کہ اس خطرے کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چھپے ہوئے مقام پر ایک دن، دو دن، تین دن انتظار کرتے رہے مگر ابو سفیان کے کارواں کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ گزر چکا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اب اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرتے ہیں کہ ہمیں کہاں ٹھہرنا چاہیے۔ کیا اسی مقام پر یا کسی اور مقام پر؟ صحابہ کے مشورے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم شہر کا اندرونی حصہ منتخب کرتے ہیں جہاں کنواں تھا۔ اس میں مصلحت یہ سوچی کہ مکہ والے بدر آئیں گے تو انھیں بھی پانی کی ضرورت ہو گی اور پانی کا صرف یہی ایک کنواں ہے۔ اگر وہ ہمارے قبضے میں رہے گا تو دشمن پیاسا مرے گا اور اسی طرح ہم دشمن پر جنگی نقطہ نظر سے فوقیت حاصل کریں گے۔ لہٰذا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مٹھی بھر ساتھیوں (312 آدمیوں) کے ساتھ اس شمالی درے سے نکل کر شہر کے بیچ میں آتے ہیں اور کنویں کے ایک طرف قیام کرتے ہیں۔ بعض صحابہ کے مشورے سے ایک بڑا گڑھا بھی کھودتے ہیں تاکہ اس کو پانی سے بھر دیں۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ جنگ کے دوران ہم سے اگر کسی کو پیاس لگے تو اس گہرے کنویں سے پانی نکالنے اور پینے میں وقت لگے گا، اور اس اثناء میں دشمن ہم پر حملہ کر کے مار بھی سکتا ہے۔ لہٰذا مناسبت ہو گا کہ ایک گڑھا ہو جس میں پانی بھر دیا جائے اور ہمارے سپاہی وہاں پہنچ کر فوراً ہی چلو سے پانی پی لیں۔ دشمن اگر یہاں آئے اور پانی پینا چاہے تو اس کی نگرانی کے لیے کچھ لوگ یہاں متعین رہیں۔ یہ تدبیریں آج

ہمیں معمولی محسوس ہوتی ہیں لیکن اس زمانے میں فوجی نقطہ نظر سے نہایت کارآمد ثابت ہوئیں، اسی اثناء میں دشمن کی مکہ سے آنے والی فوج ابو جہل کی سرداری میں وہاں پہنچ گئی۔ دشمن کی فوج کی تعداد معلوم کرنے کے لیے ایک نگران دستہ (پٹرول) بھیجا گیا۔ اس نے دو آدمیوں کو گرفتار کیا جو کنویں کی طرف پانی بھرنے کے لیے آرہے تھے انھیں پکڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے۔ سپاہیوں نے ان دونوں سے پوچھا، کہ تم کون ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہم مکہ سے آنے والی فوج کے لوگ ہیں۔ انھوں نے انھیں مار پیٹ کر کہا کہ تم حقیقت میں ابوسفیان کے کاروان کے آدمی ہو۔ تب انھوں نے کہا، ہاں ہم ابو سفیان کے لوگ ہیں۔ پھر ذرا ٹھہر کر دوبارہ پوچھا کہ تم کون ہو، تو کہتے ہیں کہ مکہ سے آنے والی فوج کے لوگ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپ فرماتے ہیں۔ جب وہ سچ کہتے ہیں تو تم انہیں مارتے ہو۔ اور جب جھوٹ کہتے ہیں تو انہیں چھوڑ دیتے ہو۔ پھر اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں سے سوال کرنے کے لیے متوجہ ہوتے ہیں۔ وہاں بھی ہمیں اسی چیزیں نظر آتی ہیں جو فوجی نقطہ نظر سے دلچسپ ہیں۔ ان سے پوچھا، تم کون ہو؟ کہا "ہم مکہ سے آنے والی فوج کے لوگ ہیں۔" بہت اچھا تم کتنے آدمی ہو؟ جواب دیا، "ہمیں معلوم نہیں"۔ واقعی ان کو معلوم نہیں تھا۔ پھر کیسے معلوم کریں؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے پوچھتے ہیں کہ یہ بتاؤ کہ روزانہ لوگوں کی غذا کے لیے کتنے اونٹ ذبح کرتے ہو؟ انھوں نے کہا "ایک دن نو، ایک دن دس۔" تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً استنباط کیا کہ ان کی تعداد نو سو اور ایک ہزار کے مابین ہوگی۔ کیونکہ ایک اونٹ ایک سو افراد کی ایک دن کی غذا کے لیے کافی ہوتا ہے۔ حقیقتاً ان کی تعداد 950 تھی۔ پھر ان سے پوچھا گیا کہ فوج میں کون کون بڑے موجود ہیں؟ فلاں فلاں سردار۔ غالباً اس سے اندازہ لگایا ہوگا کہ جنگ کے وقت فوج کی کمانداری کون کون کرے گا؟ میمنہ میں کون ہوگا؟ میسرہ میں کون ہوگا؟ مختلف مقامات پر کون کون مکہ والے ہوں گے؟ ان کے ناموں سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم واقف تھے۔ کیونکہ وہ ہم وطن تھے۔ اس طرح کچھ معلومات ان قیدیوں سے حاصل کی گئیں۔ اس کے بعد صبح جنگ شروع ہونے والی تھی۔ رات کو جو طرزِ عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رہا وہ یہ بتاتا ہے کہ پہلے تو کچھ دیر آرام فرمایا۔ پھر بہت سویرے اپنی چھوٹی سے فوج کی جس میں تین سو بارہ آدمی تھے، تقسیم کی اور کہا کہ یہ فوج کا مقدمہ ہے، یہ سامنے رہے گا۔ یہ دائیں ہاتھ پر میمنہ، یہ بائیں ہاتھ پر میسرہ اور یہ ساقہ۔ گویا فوج کو پانچوں حصوں میں تقسیم کیا۔ اس تقسیم کے بعد ہر ایک کے افسر مقرر کیے۔ اس کا سردار فلاں ہوگا، اس کا سردار فلاں ہوگا۔ یہ انصاری، یہ مہاجر وغیرہ۔ ان کے بعد کچھ تفصیلات اور ملتی ہیں جو فوجی نقطہ نظر سے آئندہ آنے والے سپہ سالاروں کے لیے نمونہ ہیں۔ نبی ہونے کے باوجود، خدا کی حفاظت کا یقین ہونے کے باوجود، انتظامی طور پر آپ یہ تدبیر اختیار کرتے ہیں۔ ایک چھوٹی سے پہاڑی پر ایک جھونپڑا تعمیر کیا جاتا ہے تاکہ جنگ کے وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس جھونپڑے کے اندر

رہ کر مشاہدہ کرتے رہیں اور حسبِ ضرورت فوج کو آگے بڑھائیں یا پیچھے ہٹائیں تاکہ دشمن کے کمزور حصہ کو دیکھ کر اس پر حملہ کیا جائے، جہاں مسلمانوں کی کمزوری ہو دیکھ کر کمک بھیجی جائے۔ یہ بھی خیال رکھا گیا کہ وہ مقام کھلا ہوا نہ ہو تاکہ دشمن کے تیر آپ کو نہ لگیں۔ ایک جھونپڑا سا تعمیر کیا جاتا ہے تاکہ اس کے اندر دشمن کے تیروں سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے فوجی قیادت کے فرائض آپ خود انجام دے سکیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہاں دو تیز رفتار اونٹنیاں بھی مامور کی جاتی ہیں۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر خدانخواستہ جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہو تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان تیز رفتار اونٹنیوں پر سوار ہو کر فوراً مدینہ منورہ چلے جائیں تاکہ (نعوذ باللہ) آپ کی شہادت کی نوبت نہ آئے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس قدر فراست سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم جنگ کا انتظام فرماتے تھے۔ مسلمانوں کے تین سو بارہ اور دشمن کے نو سو پچاس آدمی تھے۔ مسلمانوں کی پوری فوج میں شاید دو گھوڑے تھے اور دشمن کے پاس ایک سو سے زائد گھوڑے تھے۔ مسلمانوں کے پاس دس بارہ بکتر ہوں گے، دشمن کے پاس دو سو بکتر تھے۔ گویا ہر لحاظ سے دشمن مسلمان فوج سے طاقتور اور قوی تھا۔ اس انتظام کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس جھونپڑی ہی میں جو آپ کے لیے تعمیر کی گئی تھی خدا کے سامنے سجدے میں گر پڑے اور دعا کی۔ وہ دعا بھی نہایت اثر انگیز تھی۔ دعا یہ تھی کہ اللہ! اگر تو چاہتا ہے کہ دنیا میں آئندہ کوئی تیری عبادت نہ کرے، تو اس چھوٹے سے دستے کو شکست دیدے۔ اس کے بر خلاف اگر تو چاہتا ہے کہ تیری عبادت ہوتی رہے تو اس چھوٹے سے دستے کو بڑے دستے پر غلبہ عطا کر۔ اس کے بعد آپ باہر نکلتے ہیں۔ فوج سے مخاطب ہوتے ہیں کہ تم اس وقت ساری دنیا میں خدا کی خدائی کے واحد ذمہ دار ہو اس سے یہ ولولہ انگیز جذبہ ان کے دلوں میں پیدا ہوا ہو گا کہ ہم ہی وہ واحد جماعت ہیں جو اس وقت خدا کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ باقی سب خدا کے دشمن ہیں۔ اس جوش وولولہ کے باعث ایک ایک آدمی کو ہزار ہزار آدمی کی قوت حاصل ہو جاتی ہے۔ اب وہ جان پر کھیل جائے گا۔ آج کل کی فوجوں کی طرح نہیں جنھیں شراب پلا کر لڑائی کے لیے آمادہ کیا جاتا ہے۔ بلکہ اس جذبے کے ذریعے سے ان میں جوش بھر دیا جاتا ہے، کہ تم جس مقصد کے لیے جنگ کر رہے ہو، وہ دنیا کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ جنگ ہوتی ہے۔ نتیجے سے آپ سب اچھی طرح واقف ہیں۔ مٹھی بھر انسانوں نے کثیر دشمن کو شکست دی اور دشمن کے ستر آدمی قتل ہوئے ستر یا اس زیادہ آدمی کو گرفتار کیا گیا۔

میں اب ایک دوسرے پہلو کو لیتا ہوں۔ جنگ کے سلسلے میں دشمنوں سے چھینے ہوئے مالِ غنیمت کے بارے میں کیا قانون ہونا چاہیے۔ اور دشمن کے آدمیوں سے ہمارا کیا برتاؤ ہونا چاہیے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مشورہ یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہمارے ازلی وابدی دشمن ہیں۔ انھوں نے بلاوجہ گزشتہ پندرہ ایک سال سے ہر وقت ہمیں نقصان پہنچایا ہے۔ اس کی قطعاً کوئی توقع نہیں

کہ اب وہ مسلمان ہو جائیں گے۔ وہ ہمیں جانی نقصان پہنچا چکے ہیں۔ میری رائے میں ان کا سر قلم کر دینا چاہیے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اٹھ کر فرماتے ہیں کہ میری رائے میں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو قتل کرنے کی بجائے فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ ہمارے دشمن ہیں اور ممکن ہے کہ وہ اسلام نہ لائیں لیکن ہو سکتا ہے کہ ان کی آئندہ نسلیں مسلمان ہو جائیں۔ اس لیے ان کو نیست و نابود کرنے کی بجائے رہا کر دیا جائے۔ ہمیں مالی ضرورت بھی ہے۔ کیوں نہ ہم ان سے فدیہ لیں۔ جس سے ہماری مالی تقویت ہو گی اور دشمن کی مالی حالت خراب ہو گی۔ اس طرح ہم جنگ سے فائدہ اٹھائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے قبول فرماتے ہیں، لیکن یہ ایک ایسی چیز تھی جس پر مومنین کو عتاب کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے۔ "لو لا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم" (68:8) (اگر خدا نے پہلے ہی فیصلہ نہ کر رکھا ہوتا تو جو چیز تم لوگوں نے لی ہے اس بنا پر لوگوں کو سخت عذاب دیا جاتا) کیوں؟ اس عذاب کی وجہ جو میرے ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ جب تک پرانی شریعتوں میں ترمیم یا تنسیخ کی کوئی وحی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ آئے، وہ ان پر عمل کرنے پر مامور تھے۔ اب تک مسلمانوں کی کوئی جنگ نہیں ہوئی تھی، اس لیے قانونِ جنگ کے متعلق کوئی احکام بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچے تھے۔ لٰہذا اس سے پہلے کے نبیوں کے احکام مثلاً توریت پر عمل کرنا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضہ تھا۔ توریت میں صراحت سے ایک سے زیادہ مرتبہ آیا ہے کہ اگر کوئی دشمن تمھارا مقابلہ کرے، تم سے جنگ کرے اور تمھیں اس پر غلبہ حاصل ہو تو دشمن کے مردوں، عورتوں، بچوں، بوڑھوں، جانوروں غرض ہر متنفس کو قتل کر ڈالو۔ ان کا جو مال ہے وہ بھی تم لے لو اور مال کے سلسلے میں کئی مقامات پر مذکور ہے کہ وہ خدا کی چیز ہے۔ لٰہذا اس کو جلا دو۔ اس سے تم استفادہ نہ کرو۔ اگرچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی فطری رافت و رحمت کے باعث بظاہر اس حکم پر عمل نہیں کیا اور خود اللہ نے بھی اپنے رسول کو "رحمتہ اللعالمین" کے لقب سے پکارا ہے۔ لیکن خدا کے نزدیک یہ بات نامناسب تھی کہ جب تک قانون میں تبدیلی نہ ہو اس کا بندہ اس کے احکام کی خلاف ورزی کرے۔ لٰہذا تنبیہ کی جاتی ہے۔ لو لا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم لیکن خدا نے سزا نہیں دی۔ چونکہ خدا ہی کہتا ہے "میں پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ پرانے قانون کو بدل دوں گا۔" چنانچہ مسلمانوں نے اس جنگ سے فائدہ اُٹھایا وہ یہ تھا کہ لاکھوں روپے مسلمانوں کو مل گئے۔ دشمن کے لاکھوں روپے خرچ ہو گئے۔ کیونکہ فدیہ اس زمانے میں بہت گراں چیز تھی، یعنی ایک سو اونٹ۔ ایک اونٹ کی قیمت ہم چالیس درہم ہی قرار دیں تو جو انتہائی کم قیمت تھی اور ہر شخص کے عوض ایک سو اونٹ فدیہ میں لیے گئے، اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ کس قدر رقم ان ستر قیدیوں سے مسلمانوں کو حاصل ہوئی ہو گی۔ بعض لوگوں کے پاس روپیہ تھا، انھوں نے روپے دے دیے۔ بعض لوگ تاجر تھے مثلاً ایک شخص اسلحہ بیچنے والا تھا، اس نے کہا میں اس رقم کے برابر اسلحہ تمھیں دیتا ہوں، اسے قبول کیا گیا۔ بعض لوگ خود غریب تھے لیکن ان کے

دوستوں نے ان کی مدد کی اور چندہ کرکے ان کی رہائی کا انتظام کیا۔ بالآخر کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو بالکل غریب تھے ان کے دوست احباب بھی مالدار نہیں تھے کہ مدد کریں۔ لیکن ان میں ایک خاص خوبی یہ تھی کہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ ان کو آپ حکم دیتے ہیں کہ ایک ایک سو اونٹ دینے کی بجائے تم دس دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھاؤ۔ یہی تمھارے لیے فدیہ ہوگا۔ تم کو مفت رہا کر دیا جائے گا۔ اس بات سے علم کی ترقی کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمناؤں اور کوششوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھیں نہ لکھنا پڑھنا آتا تھا، نہ مال دار تھے اور نہ ہی ان کے مالدار دوست تھے۔ بلاخر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم طے فرماتے ہیں کہ ان سے صرف وعدہ لیا جائے کہ آئندہ مسلمانوں سے جنگ نہ کریں گے اور اس وعدے پر ہی اعتماد کرکے انھیں مفت رہا کر دیا گیا۔ ایسی بھی صورتیں پیش آئیں کہ کچھ مسلمان کسی قبیلے میں قیدی تھے۔ ان کو رہائی دلانے کے لیے اس قبیلے کے آدمیوں کو رہا کر دیا گیا۔ غرض قانون جنگ کی بے شمار مثالیں اس پہلی جنگ کے دوران ہمیں نظر آتی ہیں۔ اس پر مسلمانوں کا بین المالک قانون International law مبنی ہو جاتا ہے۔ میں اس پر جنگ بدر کا بیان ختم کرتا ہوں۔

مکہ والوں کو شکست ہوئی تھی۔ وہ مکہ واپس آگئے تھے لیکن مطمئن نہیں ہوئے۔ انھوں نے خیال کیا کہ ہمیں اتفاقاً شکست ہوئی۔ لہٰذا ہمیں انتقام لینے کی تیاری کرنی چاہیے۔ اس لیے تقریباً ایک سال تک، وہ مزید کئی لاکھ روپیہ خرچ کرکے ایسے سپاہیوں کو فراہم کرتے ہیں جو اجرت پر لڑتے ہیں۔ اس غرض سے وہ مختلف قبائل میں گئے اور کہا کہ ہر شخص کو اتنی رقم دی جائے گی، جو ہماری فوج میں بھرتی ہو اور جنگ کرے۔ اسے مالِ غنیمت بھی ملے گا۔ سال بھر کی تیاری کے بعد کفار کی فوج مکہ سے مدینہ کی طرف آتی ہے۔ اس وقت ان کی تعداد پہلے سی تگنی ہے۔ پہلی جنگ میں اگر 950 آدمی تھے تو اب تین ہزار آدمی ان کی فوج میں پائے گئے۔ مسلمانوں کے پاس ایسے لوگ جو ہتھیار اٹھا سکتے تھے زیادہ سے زیادہ ایک ہزار تھے۔ اور ان میں سے تین سو آدمی آخری وقت میں دغا دے کر میدان چھوڑ گئے۔ مدینہ منورہ میں اسلام سے پہلے ایک شخص عبداللہ بن ابی بن سلول تھا جس کو مدینہ والے بادشاہ بنانا چاہتے تھے۔ کم از کم ایک قبیلہ کے لوگ اس کے لیے سناروں سے تاجِ شہریاری تیار کرنے کے لیے فرمائش بھی کر چکے تھے۔ اتنے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ آتے ہیں اور اسکی بادشاہی کا مسئلہ داخل دفتر کرکے ختم کر دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے اسے دکھ ہوا ہوگا۔ وہ خوش دلی اور اخلاص کے ساتھ ہر گز مسلمان نہیں ہو سکا ہوگا۔ چنانچہ اس شخص نے جنگ احد کے موقع پر، جس کا میں اب ذکر کر رہا ہوں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ مدینے کے اندر رہ کر مقابلہ کرنا چاہیے، مدینے سے باہر جا کر کھلے میدان میں دشمن کا مقابلہ نہیں کرنا چاہیے۔ ابتداء میں رسول اللہ صلی اللہ وسلم کی بھی یہی رائے تھی۔ آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ بالآخر اکثریت کی رائے سے اور

نوجوانوں کے اصرار پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طے فرمایا کہ ہم باہر نکل کر ہی مقابلہ کریں گے۔ اس وقت عبد اللہ بن ابی بن سلول کہتا ہے کہ یہ شخص بچوں کی بات تو مانتا ہے لیکن مجھ جیسے عقل مند اور پرانے تجربہ کار کی بات نہیں مانتا۔ اس کا ساتھ دینا ہمارے لیے مصیبت کا باعث بنے گا۔ لہٰذا وہ اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر مدینے واپس ہو جاتا ہے۔

غرض سات سو آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتے ہیں اور دشمن کی فوج تین ہزار ہے۔ میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ عین موقعے پر جو مختلف حل طلب مسئلے پیدا ہوتے ہیں کہ مسلمانوں کی فوج کہاں ہو، کس پہاڑی کو، کس چشمے کو کس کس طرح استعمال کیا جائے، سب کی تفصیل بیان کروں۔ اس میں وقت لگے گا۔ میں مختصراً یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جس مقام پر مسلمان مقیم ہوئے، وہ ایک محفوظ مقام تھا، یعنی جبل احد نامی پہاڑی کے دامن میں۔ یہ پہاڑ ایک کمان کی طرح ہے جس کے اندر دو دائرے سے بھی ہیں اور بہت ہی تنگ راستے سے گزر کر اندرونی دائرے کے اندر داخل ہو سکتے ہیں۔ اس اندرونی وسیع میدان میں مسلمان قیام اور جنگ کے لیے بیرونی دائرے کے اندر اور اس سے بھی نیچے کھلے میدان میں آتے ہیں۔ دشمن ایک اور مقام پر ٹھہرا ہوا تھا۔ مسلمان جس مقام پر لڑنے کے لیے صف بندی کرتے ہیں وہاں ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جس کو جبل الرماۃ کہتے ہیں یعنی تیر اندازوں کی پہاڑی۔ فوجی نقطہ نظر سے وہ اہم سمجھی گئی، کہ اس پر ہمارے آدمی مامور ہوں تاکہ دشمن ہمارے پیچھے سے حملہ نہ کرے۔ اس کے لیے پچاس تیر انداز مامور کیے گئے۔ صرف دو سوار مسلمانوں کی فوج میں تھے۔ ایک حضرت ابو ہریرہ اور دوسرے عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ ان کو مامور کیا گیا کہ تم یہیں جبل الرماۃ کے پاس رہو کہ اگر دشمن کی سوار فوج اس طرف سے آئے تو سب مل کر اس کا مقابلہ کرنا۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اندازے کے مطابق واقعی دشمن نے اپنی پیدل فوج کو احد کے سامنے کے میدان میں آگے بڑھایا اور اپنے سواروں کو خالد بن ولید اور ان کے قریبی رشتہ دار عکرمہ بن ابی جہل کی سرداری میں جبل احد کی پیچھے سے تقریباً دس بارہ میل کا چکر کاٹ کر مسلمانوں کے پیچھے آ کر ان پر حملہ کرنے کے لیے مامور کیا۔ جنگ شروع ہو گئی۔ پہلے دھاوے میں مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ دشمن بھاگنے لگا اور ان کی عورتیں بھی بھاگنے لگیں۔ عین اس وقت دشمن کی سوار فوج پیچھے سے پہنچ گئی۔ اس نے حملہ کیا اور تیر اندازوں اور مسلمانوں کی فوج کے دونوں سواروں نے ان کا مقابلہ کیا اور انھیں پسپا بھی کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک تنگ مقام تھا۔ خالد بن ولید پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر حملہ کرتے ہیں۔ دوسری مرتبہ پسپا ہوتے ہیں اور اس اثنا میں جیسا کہ ابھی میں نے کہا، دشمن کو شکست ہو چکی تھی۔ وہ بھاگ رہا تھا اور مسلمان سپاہی دشمن کو لوٹنے میں مصروف تھے۔ اس وقت اس پہاڑی پر متعین تیر انداز سوچنے لگے کہ ہمیں اس وقت یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ دشمن کو شکست ہو چکی ہے۔ اب کوئی ضرورت نہیں کہ ہم یہاں

رہیں۔ لہٰذا ہم بھی جائیں اور لوٹنے میں مصروف ہوں۔ حالانکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی صریح اور سخت الفاظ میں تاکید کی تھی کہ اگر تم ہماری لاشوں پر گِدھوں کو بھی منڈلاتے ہوئے دیکھو تب بھی اس مقام سے نہ ہٹنا۔ مگر ان کی سمجھ میں بات نہ آئی۔ ان کے سردار نے تو انھیں روکا مگر بہت سے سپاہی نافرمانی کرکے پہاڑی سے چلے گئے۔ پہاڑی خالی دیکھ کر خالد بن ولید کے سوار سہ بارہ حملہ کرتے ہیں۔ مسلمان تیر اندازوں کا سردار اور اسکے ساتھ باقی رہنے والے آٹھ دس آدمی شہید ہو جاتے ہیں اور دشمن سوار اس چھوٹے سے تنگ مقام سے گزر کر مسلمانوں پر ان کے پیچھے سے حملہ کر دیتے ہیں۔ جب مسلمان لوٹ رہے تھے تو سامنے دشمن کی فوج بھاگ رہی تھی۔ دشمن کو حیرت ہوئی کہ کیا بات ہے کہ ہمارا تعاقب کرنے کی بجائے وہ مڑ کر پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ اب وہ بھگوڑے دشمن بھی مڑ کر حملہ کرتے ہیں اور مسلمان دو طرف سے دشمن فوج میں گھر جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ستر مسلمان شہید ہوتے ہیں اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی زخمی ہو جاتے ہیں۔ بہت سے مسلمان بھاگتے ہیں۔ کوئی تو تین تین دن کے فاصلے پر جا رکتا ہے۔ کچھ لوگ پہاڑوں پر چڑھ گئے۔ غرض یہ کہ مسلمانوں کو صاف الفاظ میں شکست ہوگئی۔ اس وقت کچھ خدائی تقدیر سے سابقہ پڑتا ہے۔ قریش کی فوج کے لیے فتح مکہ کے بعد مناسب یہ تھا کہ وہ فوراً مدینہ جاتی۔ وہاں کوئی حفاظتی فوج تو تھی نہیں۔ وہ شہر مدینہ کو لوٹ لیتے اور عورتوں بچوں کو گرفتار کر لیتے۔ اس طرح اپنی اس فتح کو مکمل کرتے مگر انھوں نے یہ نہیں کیا۔ شاید یہی خدا کی مشیت تھی۔ اس کے علاوہ کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ دشمن فوج کا سردار یعنی ابوسفیان انتہائی فراست مند تھا۔ جس نے بدر کی جنگ میں محض اونٹ کی لید سے معلوم کر لیا تھا کہ مدینے کے مسلمان آئے ہیں۔ وہ احد میں میدان جنگ کا دورہ کرتا ہے۔ مسلمانوں کی لاشوں کو بھی دیکھتا ہے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا بھی شہید ہو گئے تھے ان کا سینہ چیر کر ان کے کلیجے یا جگر کو ابوسفیان کی بیوی نے چباڈالا تھا، اس کو بھی وہ دیکھتا ہے۔ کہتا ہے میں نے اس کا حکم نہیں دیا تھا، گو دل میں خوش ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسا بہادر شخص اب ختم ہو چکا ہے۔ پھر وہ ایک مقام پر، جہاں دو چار مسلمان ایک پہاڑی کی چوٹی پر موجود ہیں، یہ آواز دے کر چلاتا ہے "تعریف ہو ہبل بت کی جسے فتح ہوئی اور تمھیں شکست ہوئی۔" اس طرح وہ شیخی کے نعرہ لگاتا ہے۔ شروع میں جب یہ آواز آئی تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ وہ یہ کہہ رہا ہے۔ آپ نے فرمایا جواب مت دو۔ ابوسفیان چلایا۔ کیا ابوبکر زندہ ہے؟ کیا عمر زندہ ہے؟ جب کوئی جواب نہیں ملا تو کہا۔ الحمدللہ سب مر چکے ہیں۔ اس کے بعد وہ پھر کہتا ہے: تعریف ہو ہبل کی، اس وقت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نہ رہا گیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھے بغیر جواب دیتے ہیں۔ " اے اللہ کے دشمن ہم سب زندہ ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی زندہ ہیں، ابوبکر بھی زندہ ہیں۔ عمر بھی زندہ ہیں۔ اس وقت ابوسفیان کو کیا کرنا چاہیے تھا؟ اس پہاڑی کے چھوٹے سے دستے کو جس میں مشکل سے آٹھ دس آدمی ہوں گے، اوپر چڑھ کر قتل کر دینا

چاہیے تھا کیونکہ ابوسفیان کے ساتھ فوج تھی، لیکن وہ کچھ نہیں کرتا۔ صرف یہ کہتا ہے کہ جنگ ایک ایسی چیز ہے کہ کل تم کو، آج ہم کو فتح ہوئی ہے۔ مجھے جو بدر میں شکست ہوئی تھی، آج میں نے اس کا بدلہ لے لیا۔ میرا بیٹا حنظلہ مارا گیا تھا، آج دوسرے حنظلہ جو بہت بڑے مسلمان مجاہد تھے، ابو عامر راہب کے بیٹے تھے۔ نہایت راسخ العقیدہ مسلمان تھے، شہید ہو گئے۔ میں حنظلہ کے بدلے میں حنظلہ کو قتل کر چکا ہوں۔ آئندہ سال پھر تم سے اسی زمانے میں جنگ ہو گی۔ غرض یہ کہ ابوسفیان نے نہ جانے کس بنا پر فتح سے فائدہ نہیں اُٹھانا چاہا، سوائے اس کے کہ اس کی عقل ماری گئی ہو۔ اس نے کچھ نہیں کیا اور واپس ہو گیا۔ جب واپس ہونے لگا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عسکری فراست سے سوچتے ہیں کہ شاید مدینہ کو لوٹنے جا رہے ہیں۔ اب کیا کرنا چاہیے۔ کس طرح شہر کی حفاظت کی جائے؟ اولاً ایک دو سپاہیوں کو معلوم کرنے کے لیے بھیجتے ہیں کہ یہ مکہ جا رہے ہیں یا مدینہ جا رہے ہیں۔ یہ تمھیں کس طرح معلوم ہو گا؟ یہ دیکھو کہ وہ گھوڑوں پر سوار ہیں یا گھوڑوں کو کوتل میں لے کر اونٹوں پر سوار ہیں۔ گھوڑوں پر سوار ہوں، تو معلوم ہو گا کہ کسی قریبی مسافت پر جا رہے ہیں۔ ان سپاہیوں نے واپس آ کر بتایا کہ وہ اونٹوں پر جا رہے ہیں اور گھوڑے کوتل میں ساتھ ہیں، تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان ہوا۔ پھر شہیدوں کو دفن کرنے، زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد آپ مدینہ تشریف لاتے ہیں۔ لیکن عسکری فراست سے آپ پھر سوچتے ہیں کہ شاید دشمن آگے جا کر پشیمان ہو اور پلٹ آئے۔ اس کے دفاع کے لیے انتظام ضروری ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اعلان فرماتے ہیں کہ جو لوگ احد کی جنگ میں شریک تھے، صرف وہی شہر سے نکلیں۔ کسی اور شخص کو فوج میں داخلے کی اجازت نہیں۔ یہ حکم کس بنا پر دیا گیا، ہمارے فوجی تجربہ کار افسر بیان کریں گے۔ شاید اس بناء پر کہ انہی لوگوں کو انتقام کا جذبہ زیادہ ہو گا۔ بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سپاہیوں کو لے کر جن میں سے بہت سے زخمی بھی تھے، مدینہ کے جنوب میں تقریباً تین دن کی مسافت تک دشمن کے پیچھے پیچھے جاتے ہیں، پھر قیام کرتے ہیں۔ ابوسفیان نے اب سوچا کہ ہم نے غلطی کی کہ اپنی فتح سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم مدینہ کی طرف واپس جائیں۔ واپس آنے لگا تو اسے بھی پتہ چل گیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینے سے نئی فوج لے کر ہمارے مقابلے کے لیے آ چکے ہیں۔ اسے ڈر ہوا کہ پہلے بھی لڑائی میں ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے تو اب کیا کریں گے۔ لہٰذا ابوسفیان کو ہمت نہیں ہوئی کہ دوبارہ مدینے کی طرف آئے۔ وہ مکہ واپس جاتا ہے۔ یہ دوسری لڑائی تھی۔ اس لڑائی میں دشمن کو نہ فتح ہوئی نہ شکست۔ لیکن دو پہلو قابل ذکر ہیں۔ پہلا پہلو یہ ہے کہ مسلمانوں کو جو شکست ہوئی تھی۔ اس کو بہتر بنانے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ رسول اکرم صلی اللہ وسلم کو یہ فکر تھی کہ مسلمانوں کی فوج پست ہمت ہو چکی ہے، اس میں دوبارہ خود اعتمادی کیسے پیدا کی جائے اور کیسے مسلمانوں کی حالت کو سدھارا اور بہتر بنایا جائے۔ دوسری طرف دشمن کی اس واپسی سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں ان پر غور کر کے مناسب انتظامات کیے جائیں۔ وقت کی کمی کی وجہ سے میں ان تفصیلات میں نہیں

جاتا۔ صرف یہ عرض کروں گا، کہ کوئی دو سال کے بعد مکہ والے دوبارہ مسلمانوں سے جنگ کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس کی وجہ سے انھیں ہمت ہوئی کہ مدینے پر حملہ کریں۔ وہ یہ کہ مکہ والوں کی بدر سے واپسی کے بعد مدینہ کے اندر مسلمانوں کی ایک یہودی قبیلے سے، اور احد کی جنگ کے بعد ایک اور یہودی قبیلے سے جنگیں ہوئیں۔ ان میں سے پہلے بنو قینقاع اور دوسرے بنو النضیر تھے۔ بنو النضیر والے بہت مالدار تھے۔ جب انھیں مدینہ سے نکلنا پڑا تو خیبر جا کر بسے یہ مدینہ کے شمال میں کوئی پانچ دن کی مسافت پر تھا۔ اپنی دولت کے بل بوتے پر انھوں نے مسلمانوں سے انتقام لینا چاہا۔ خود مقابلہ کرنے کی بجائے کرائے کے ٹٹو جمع کر لیے۔ چنانچہ یہودیوں نے مکہ والوں سے کہا کہ تم اگر مدینہ پر حملہ کرو تو ہم تمھیں پوری مدد دیں گے۔ اسی طرح مکہ کے حلیف قبائل کو کہا کہ اگر تم آئندہ جنگ میں بھی مکہ والوں کا ساتھ دے کر جنگ کے لیے نکلو تو ہم بھی تمھاری مدد کریں گے۔ آس پاس یہودیوں کے حلیف قبائل تھے ان کو بھی دولت کا لالچ دیا اور کہا کہ خیبر کی کھجوروں کی جو پیداوار ہو گی وہ پوری تمھیں دے دی جائے گی۔ بشرطیکہ تم مدینے پر حملہ کرنے میں مکہ والوں کا ساتھ دو۔ غرض یہ کہ بارہ ہزار کی فوج مدینے پر حملہ کے لیے نکلتی ہے۔ مختلف وسائل سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہو گئی۔ میں پوری تفصیلات میں جا نہیں سکتا۔ بہر حال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اب شہر کے اندر رہ کر مقابلہ کرنا طے فرماتے ہیں۔ مدینے والے بھی اس بار اصرار نہیں کرتے کہ باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ لیکن روزانہ سخت سے سخت اور خطرناک سے خطرناک خبریں آ رہی تھیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ فلاں فلاں دشمن قبائل بھی جنگ کے لیے آ رہے ہیں۔ بارہ ہزار کے مقابلے میں مسلمانوں کی فوج کی تعداد اس وقت پندرہ سو سے زیادہ نہیں تھی۔ دشمن کے پاس کثیر فوج کے علاوہ مالی وسائل بھی تھے۔ ان کی پشت پر خیبر کا بہت مالدار علاقہ بھی تھا۔ اس وقت مشورۃً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ معلوم کیا، اور یہ کہتے ہیں کہ سلمان فارسی کا مشورہ تھا، کہ جب دشمن طاقتور ہو تو ایران والے اپنے پڑاؤ کے اطراف خندق کھود لیتے ہیں تاکہ غفلت کی حالت میں دشمن اس کو عبور کر کے دن یا رات یا کسی وقت بھی ان پر چھاپہ نہ مارے۔ کہاں خندق کھودنی چاہیے۔ واقدی وغیرہ نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں۔ مدینے کے دو چار لوگوں کو ساتھ لیتے ہیں اور شہر کے اطراف کا چکر لگاتے ہیں۔ معلوم کیا کہ کس مقام پر شہر کا دفاع کمزور ہے۔ کس مقام پر ان کو قدرتی سہولتیں حاصل ہیں اور طے کیا کہ کس مقام سے کس مقام تک خندق کھودنی چاہیے۔ اور پھر پوری تندہی سے سارے مسلمان سپاہی اس کام میں لگ جاتے ہیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انجینئر بن کر بتاتے ہیں کہ کس جگہ خندق کھودنی چاہیے۔ اور واقعتاً اتنی بہتر جگہ ہے کہ آج بھی کوئی بڑے سے بڑا جنرل مدینے میں اس مقام سے بہتر کسی جگہ کا انتخاب نہیں کر سکے گا۔ وقت بہت کم ملا، اس کے باوجود دشمن کے آنے تک خندق کھود لی گئی۔ یہ خندق کیسی تھی۔ کچھ تفصیلیں مجھے ملی ہیں۔ لکھا ہے کہ اتنی چوڑی تھی کہ تیزی سے دوڑنے والا گھوڑا بھی اس کو پھلانگ کر عبور نہ

کر سکے اور گہرائی اس قدر تھی کہ اندر کوئی آدمی ہو تو اپنے آپ باہر نہ آسکے۔ یعنی تین چار گز گہرائی ہو گی۔ اس انتظام سے فارغ ہوئے تھے کہ دشمن آپہنچا۔ اس کے لیے یہ نئی چیز تھی۔ مکہ والوں اور انکے ہمراہی بدوؤں کو کبھی خندق کی جنگ کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ اب وہ اس مقابلے کے لیے مجبور ہوئے تھے تو اس کے سوا کہ دور سے تیر چلائیں، ان کے لیے کوئی چارہ نہیں تھا۔ یہ خندق جس مقام پر تھی وہاں درمیان میں کچھ پہاڑوں کی چھوٹی چھوٹی چوٹیاں بھی ہیں جو خندق تک آتی ہیں۔ پھر تھوڑا سا حصہ خالی رہ جاتا ہے۔ پھر دوبارہ خندق شروع ہو جاتی ہے۔ اس طرح دو مقامات پر ایسا نظر آیا ہے اور وہاں خندق نہیں کھودی گئی ان کی چوٹیوں پر مسلمان سپاہی متعین رہتے تھے۔ وہ دشمنوں کو دیکھتے تھے۔ ایک دن دشمن کا ایک شہسوار بڑی تیزی سے آیا اور خندق کو عبور کر کے مسلمانوں کے کیمپ میں آگیا۔ غالباً وہ کوئی ایسا ہی مقام ہو گا جہاں پہاڑ کی چوٹی اور خندق کے درمیان کا حصہ خالی تھا۔ اس کا گھوڑا پہاڑ کی چوٹی پر چڑھتا ہوا چھلانگ مار کر اندر آگیا۔ مگر وہ تن تنہا تھا۔ مسلمانوں نے اس کا تعاقب کیا اور اس کو بھاگ جانے پر مجبور کیا۔ اس نے کوشش کی کہ اس کا گھوڑا چھلانگ کر عبور کرے مگر کامیاب نہ ہوا۔ گھوڑا بھی اور وہ بھی خندق میں گر گئے۔ مسلمانوں نے اسے خندق میں ہی مار ڈالا۔ اس وقت ہمیں قانونِ جنگ کی ایک شق، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انسانیت پروری کی ایک نئی مثال ملتی ہے وہ مقتول دشمن کی فوج کا بہت ہی ممتاز افسر تھا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیام آیا کہ اس کی لاش ہمیں واپس دے دو تو ہم تم کو خون بہا ایک سو اونٹ اونٹ دینے کو تیار ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مفت لے جاؤ مجھے اس مال کی ضرورت نہیں۔ یقیناً اس سے دشمن کے دل پر اچھا اثر پڑا ہو گا اور ہم دیکھیں گے کہ بعد میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دشمن کو نیست و نابود کرنے کی بجائے ایسی ہی تدبیروں سے اس کو مسلمان ہونے پر آمادہ کرتے رہے۔ غرض یہ کہ خندق کی جنگ کا سلسلہ کئی ہفتوں تک جاری رہا۔ قریش کے پاس زادِ راہ ختم ہو گیا۔ انھوں نے خیبر سے کچھ چیزیں منگوائیں جو ان تک پہنچیں۔ مسلمان کے دستے ہر وقت چوکس رہتے تھے۔ انھوں نے ایک مرتبہ اس آنے والی مدد کو روک کر چھین لیا اور قریش کو اس آخری مدد سے جو مل رہی تھی محروم کر دیا۔ قریش دل برداشتہ ہو جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس لڑائی کو ختم کر کے واپس چلے جائیں۔

ہمارے مؤرخ عام طور پر اس واپسی کی وجہ موسم کی خرابی بیان کرتے ہیں، کیونکہ بہت شدید سردی تھی اور ہوا اتنی تیز چل رہی تھی کہ قریشی فوج کے ڈیرے گر پڑے تھے۔ ان حالات میں ابوسفیان نے طے کیا کہ واپس ہونا چاہیے۔ لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ واپسی محض موسم کی خرابی کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ ایک اور وجہ سے بھی تھی۔ یہ جنگ شوال میں ہوئی ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ عرب میں اسلام سے پہلے حرام مہینوں (اشہر حرم) کا تصور تھا جن میں وہ جنگ کو ناجائز سمجھتے تھے۔ ان میں پہلا مہینہ ہے ذی

قعدہ، دوسرا ذی الحجہ، تیسرا محرم اور چوتھا رجب۔ اب حرام مہینوں کا آغاز ہو رہا تھا۔ شوال کی آخری تاریخ تھی۔ اب اگر ابوسفیان اور اس کی فوج وہیں رکتی توحج کے زمانے میں مکہ آنے والے مسافروں سے جو منفعت مقامی لوگوں کو حاصل ہوتی تھی (جو آج بھی ہوتی ہے) وہ لوگ اس سے محروم ہو جاتے۔ دوسرے یہ توہمات (superstitions) بھی تھے کہ حرام مہینوں میں جنگ نہیں ہونی چاہیے۔ موسم کی خرابی کے علاوہ یہ دونوں وجوہ زیادہ مؤثر رہے ہوں گے، بہر حال آخری دنوں میں قریشیوں نے ایک تدبیر اور سوچی اور اس کا غالباً انہیں خیبر کے یہودیوں سے مشورہ ملا۔ جب خیبر کے یہودیوں کو معلوم ہوا کہ بارہ ہزار کی فوج کے باوجود ایک مہینے میں قریش کامیاب نہیں ہورہے ہیں تو ان کا سردار مدینہ آیا، چھپ کر صورتِ حال معلوم کی اور دیکھا کہ ایک صورت مسلمانوں کو شکست دینے کی ممکن ہے، وہ یہ کہ مدینے کے اندر بھی یہودیوں کا ایک قبیلہ بنو قریظہ رہتا تھا اور مسلمان ان کی طرف سے مطمئن تھے۔ یہ لوگ مسلمانوں پر پیچھے سے حملہ کریں اور عین اس وقت ایسا ہو کہ سامنے سے قریش اور انکے ساتھی جنگ کر رہے ہوں۔ اس طرح مسلمان دو دشمنوں میں گھر جائیں گے اور انھیں شکست ہو جائے گی۔ بنو نضیر کا یہ سردار بنو قریظہ کے پاس جاکر ان کو آمدہ کرتا ہے کہ تم جنگ کرو۔ اس کی اطلاع رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوگئی۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عسکری ذہانت اور سیاسی فراست سے اس سازش کو توڑنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ایک شخص کا انتخاب کیا گیا، جو اب تک غیر مسلم جانا جاتا تھا۔ سب لوگ جانتے تھے کہ وہ مشرکین عرب میں سے ہے۔ وہ نیا نیا مسلمان ہوا تھا اور ابھی اس کے ایمان لانے کی خبر نہیں پھیلی تھی۔ اس کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سیاسی مشن پر مامور کیا، چنانچہ وہ پہلے بنو قریظہ کے ہاں جاتا ہے اور ان سے کہتا ہے اگر قریش کے لوگ تم سے مطالبہ کریں کہ تم حملہ کرو تو اس کا اطمینان کر لو کہ اس لڑائی کے بعد قریش تمھیں چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ کیونکہ اگر مکہ والے واپس ہو گئے تو تم تنہارہ جاؤ گے۔ پھر تم تنہارہ کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مقابلہ نہیں کر سکتے اور یہ اطمینان حاصل کرنے کے لیے کہ قریش نہیں جائیں گے تم ان سے یرغمال کا مطالبہ کرو، کہ چند آدمی اپنے سرداروں میں سے ہمارے سپرد کر دیں تاکہ ہمیں اطمینان رہے کہ تم آخری وقت ہمیں دغا دے کر نہیں چلے جاؤ گے۔ انھوں نے کہا: بات تو تم ٹھیک کہتے ہو۔ پھر وہ شخص قریش کے کیمپ میں جاتا ہے اور کہتا ہے تمھیں معلوم ہے کہ میں تمھارا دوست ہوں۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ بنو قریظہ کے یہودیوں میں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ساز باز ہوگئی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ قریش کے چند سرداروں کو اپنے قبضے میں لائیں اور پھر ان کو محمد (صلی اللی علیہ وسلم) کے سپرد کر دیں۔ ایک شخص دوڑتا ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا ہے کہ فلاں شخص یہ کہہ رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت ہی ذو معنی انداز میں جواب دیا۔ "لعلنا امرنا هم بذالك" شاید ہم ہی نے انھیں ایسا حکم دیا ہو۔ دشمن کا وہاں ایک جاسوس موجود تھا وہ دوڑا دوڑا ہوا جاتا ہے اور ابوسفیان کو اطلاع دیتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ابھی ابھی کہا کہ شاید ہم ہی نے بنو قریظہ کو ایسا

حکم دیا ہو۔ جب قریش کا وفد بنو قریظہ کے پاس پہنچا تو اس نے دو مطالبہ کیے ایک تو یہ کہ اپنے یرغمال ہمیں دے دو، دوسرا مطالبہ یہ کہ سنیچر کے دن جنگ نہ ہو، کیونکہ سنیچر کے دن یہودی مذہب میں جنگ کرنا حرام ہے۔ غرض یہ کہ قریش اور بنی قریظہ میں پھوٹ پڑ گئی۔ اور اس طرح سیاسی ذرائع سے اس حملہ کا سدباب کر لیا گیا جو مسلمانوں پر آخری دن مدینہ کے جنوب سے بھی اور شمال سے بھی ہونے والا تھا۔ اس طرح قریش کی فوج اور ان کے ساتھی ناکام ہو کر مدینے سے واپس جاتے ہیں۔ اس وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ یہ قریش کی آخری کوشش تھی۔ اب آئندہ ابتداء initiative ہمارے ہاتھ میں رہے گی ہم فیصلہ کیا کریں گے کہ کب جنگ شروع ہو اور کس سے ہو۔

مکہ والے ابتدائی دو شکستوں کے بعد یہودیوں اور دیگر لوگوں کی ترغیب پر تیسری بار مدینہ پر حملہ آوار ہوئے تھے۔ جنگِ خندق میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی وہ محاصرہ اٹھا کر واپس آ گئے۔ اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش بینی فرمائی جیسا کہ حدیث میں صراحت سے ذکر ہے کہ اب دشمن ابتداء initiative نہیں لے گا بلکہ initiative ہم لیں گے۔ اس کے کیا معنی تھے؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیال فرمایا کہ اب مکہ والوں کو جرات نہیں ہوگی کہ پھر مدینہ پر حملہ آور ہوں۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اس وقت جو سکون کا وقفہ ملا ہے اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس وقت وہ تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں، جن کا تعلق براہ راست فوج اور جنگ سے نہیں ہے لیکن انکا اثر فوجی کاروائیوں پر پڑتا ہے۔ اسی زمانے میں یک قحط عرب میں نمودار ہوا جس سے مکہ والے بے انتہا متاثر ہوئے۔ مکہ میں چونکہ زراعت نہیں ہوتی، انھیں غلہ باہر سے درآمد کرنا پڑتا ہے۔ جن مقامات سے غلہ درآمد ہوتا تھا، وہاں بھی قحط کے آثار نمایاں تھے اور وہ بھی ان کو غلہ مہیا نہیں کر سکتے تھے۔ اس زمانے میں ایک چھوٹا سا واقعہ پیش آیا۔ جس کا اثر فوجی نقطہ نظر سے پڑتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس زمانے میں نجد ایک واحد علاقہ تھا جہاں کی پیداوار قحط سالی سے بچ گئی تھی، اور وہاں سے غلہ مکہ کو برآمد ہو سکتا تھا۔ ایک دن مسلمانوں کا ایک فوجی دستہ کسی مقام پر تھا۔ اس نے ایک شخص کو مشتبہ حالت میں دیکھ کر گرفتار کر لیا اور اسے مدینہ لے آئے۔ اس کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شخصاً پہچانتے تھے۔ وہ نجد کا ایک بہت بڑا سردار ثمامہ بن اثال تھا۔ اور ایک مرتبہ ہجرت سے قبل مکہ بھی آیا تھا۔ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے حسبِ عادت اس کو بھی تبلیغ اسلام کی تھی، تو اس نے دھمکی دی تھی کہ اے محمدؐ! چپ رہ، ورنہ میں تجھے جان سے مار ڈالوں گا۔ اب وہی شخص گرفتار ہو کر مدینہ لایا گیا۔ رسول اکرم صلی علیہ وسلم اس سے کہتے ہیں کہ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ تو اپنی بے دینی اور بت پرستی چھوڑ کر، اپنے بنانے والے اللہ کہ عبادت کرے۔ اس نے کہا" اے محمدؐ، اگر تجھے فدیہ کے مال کی ضرورت ہے تو جتنا مال کہو، مین دینے کو تیار ہوں۔ میں مالدار ہوں۔ اگر تو مجھے قتل کرنا چاہتا ہے تو میں

ذودم ہوں (یہ ایک عربی کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں خون والا) بظاہر اس کے معنی یہی معلوم ہوتے ہیں کہ میں قتل کیے جانے کا مستحق ہوں۔ میں خون بہا چکا ہوں۔ غالباً اس نے کسی مسلمان کا قتل کیا تھا۔ بہر حال اس کا جواب یہی تھا کہ جتنا فدیہ مانگتے ہو میں دینے کو تیار ہوں۔ اس پر گفتگو ختم ہو جاتی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیتے ہیں کہ اس شخص کو مسجد میں ایک ستون کے ساتھ باندھ دو تا کہ یہ دن بھر ہماری عام زندگی کو دیکھے اور ہماری نمازوں کا مشاہدہ کرے۔ اسے کھلایا پلایا بھی جاتا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ وہ ایک آدمی دس آدمیوں کے برابر کی خوراک کھاتا تھا اور اسے پورا کھانا دیا جاتا تھا۔ اسے انسانی ضرورتوں کے لیے یقیناً کھولا جاتا ہو گا۔ پھر واپس لا کر اسے باندھ دیتے ہوں گے۔ پھر ہر نماز کے وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس سے گزرتے اور اسے کہتے کہ اسلام لاؤ وہ ہمیشہ یہی جواب دیتا۔ اگر فدیہ مانگتے ہو تو مانگو۔ جتنا کہتا کہو میں دینے کو تیار ہوں۔ مجھے قتل کرنا چاہتے ہو تو میں خون والا شخص ہوں، کئی دن اس طرح گزر گئے آخر اس طرح کے جواب کو بیسیوں بار سن کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے فرماتے ہیں۔ "جاؤ میں تمھیں مفت چھوڑ دیتا ہوں۔" یہ اس کے لیے غیر متوقع چیز تھی۔ اس لطف اور مہربانی سے بے حد متاثر ہوا۔ وہ مسجد سے نکلتا ہے، قریب ہی ایک کنویں پر جا کر غسل کرتا ہے اور واپس مسجد میں آکر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کہتا ہے۔ اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمداً رسول اللہ اور اس جملے کا بھی اضافہ کرتا ہے کہ اب سے چند منٹ پہلے تک دنیا کا وہ شخص جس سے میں سب سے زیادہ نفرت کرتا تھا، تم تھے۔ لیکن اب دنیا کا وہ شخص جس سے میں سب سے زیادہ محبت کرتا ہوں وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس کے بعد اس نے فوجی نقطہ نظر سے جو بات کہی، وہ یہ تھی کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری ملک سے مکہ والوں کو غلہ فراہم کیا جاتا ہے۔ خدا کی قسم اب جب تک آپ مجھے اس کا حکم نہیں دیں گے اس وقت تک ایک دانہ بھی غلہ کا نجد سے مکہ نہیں بھیجا جائے گا۔ نجد کے غلہ کی بندش سے مکہ کی غذائی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ آخر مکہ والے مجبور ہو گئے۔ ذلت کا احساس لیے ادب کے ساتھ مدینہ کو ایک وفد بھیجتے ہیں اور التجا کرتے ہیں کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم ہمیشہ نیکی، مہربانی اور محبت کی تعلیم دیتے رہے ہو۔ اب اپنے ہم شہریوں اور ہم وطنوں پر رحم کرو۔ ہم بھوک سے مرے جا رہے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فوراً ثمامہ بن اثال کو ایک خط بجھواتے ہیں کہ غلہ بھیجنے کی بندش اٹھالی جائے۔ اس کا مکہ والوں کے دل پر اثر ہونا چاہیے تھا اور یہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد تھا، کہ ان کو اسلام کی طرف مائل کریں۔ اس کے بعد صرف اس پر ہی اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ مدینہ سے پانچ سو اشرفیاں جو اس زمانے میں ایک بڑی رقم تھی مکہ کے فقراء غرباء کی امداد کے لیے بھیجتے ہیں۔ قحط کے زمانے میں ہر شے کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ غریب لوگوں کے بس میں نہیں ہوتا کہ کسی چیز کو خرید سکیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پانچ سو اشرفیاں مکہ کے سردار ابوسفیان کو بھیجتے ہیں کہ یہ غرباء کی امداد کے لیے بھیج رہا ہوں۔ وہ بھناتا ہے۔ اس کے الفاظ جو تاریخ میں مرقوم ہیں یہ ہیں "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) چاہتا ہے کہ

ہمارے نوجوانوں کو ورغلائے۔" بہر حال اس کو حالات اجازت نہیں دیتے کہ رقم کو واپس کرے۔اس کے بعد اور بھی ایسے واقعات پیش آتے ہیں جن کا مجموعی اثر مکہ والوں پر پڑا کہ وہ اسلام کے پیغمبر اور اسلام کو دشمن سمجھنے کی بجائے دل ہی دل میں اس پر فخر کرنے لگے کہ ان کے ہی شہر کا آدمی اب بادشاہ بن رہا ہے اور طاقت ور ہوتا جارہا ہے مگر اس کے اظہار کی ان میں جرت نہیں تھی۔اس طرح اب اگر مکہ والوں پر مسلمان حملہ کریں تو بھرپور مقابلے کا کوئی امکان نہ تھا۔مکہ والے کیوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کریں، جب کہ وہ مصیبت کے وقت ان کی مدد کررہا ہے؟ ان حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عادت کے برخلاف کہ جب کبھی کسی مقام پر جنگ کے لیے جاتے تو اسے مخفی رکھتے کہ دشمن کو پتہ نہ چلے، لیکن اب کھلم کھلا اعلان فرماتے ہیں اور اس کی اطلاع بھجواتے ہیں کہ میں مکہ جارہاہوں البتہ حج کو نہیں عمرے کے لیے کہ حج سے ایک مہینہ پہلے اشہر حرم میں وہاں جاؤں گا، تاکہ کوئی اور دشواریاں وہاں پیدا نہ ہوں۔راستہ میں اطلاع ملی کہ قریش کا ایک حلیف قبیلہ احابیش جنگ کی تیاری کررہا ہے اور چاہتا ہے کہ مکے جاکر مکہ والوں کا ساتھ دے اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکے پر حملہ کریں تو وہ اپنے حلیفوں کی مدد کرے۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فوجی مشاورتی مجلس طلب فرماتے ہیں کہ اس کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم پہلے اس قبیلے پر حملہ کریں، اسے لوٹیں اور اسے شکست دے کر نیست ونابود کردیں تاکہ دشمن اس کی مدد حاصل نہ کرسکے؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ہم ھض کا اعلان کرچکے ہیں لہٰذا ہمیں چاہیے کہ جنگ نہ کریں۔خدا ہماری مدد کرے گا۔اس رائے کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قبول فرماتے ہیں اور مکہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔مکہ کی جغرافیائی صورتحال یہ ہے کہ جدہ سے تھوڑی دور تک کھلے میدان ہیں اس کے بعد آگے مکہ تک بلند پہاڑ، تنگ درے اور پہاڑوں کے درمیان راستے پائے جاتے ہیں۔جس مقام پر اہم قدرتی دشواریاں شروع ہورہی تھیں، اس مقام کا نام حدیبیہ ہے۔اسے آج کل "شمیسی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔مسلمان حدیبیہ پہنچتے ہیں۔ایک چھوٹی سی چیز یاد آئی جو فوجی نقطہ نظر سے دلچسپ ہے۔جب مدینہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نکلے تو عمرہ کرنے کا مقصد واضح تھا، سپاہیوں سے کہا کہ ساتھ ہتھیار نہ لیں سوائے اس ہتھیار کے جسے حالت امن میں ہر شخص اپنے ساتھ رکھتا ہے، یعنی ایک تلوار۔وہ جنگ کے لیے نہیں ہوتی بلکہ وہ صرف حفاظتی تدبیر کے طور پر رکھی جاتی ہے۔لیکن تھوڑی دور پہنچنے کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ فرمایا کہ ہم دشمن کے ملک جارہے ہیں۔ہم جنگ کا آغاز نہیں کریں گے لیکن اگر دشمن آغاز کرے تو کیا ہوگا؟ آخر مشورے کے بعد طے پایا کہ مدینے سے فوجی ساز وسامان کا ذخیرہ منگوالیا جائے جو بند فوج کے ہمراہ رہے۔ضرورت پر اس سے کام لیا جائے گا۔ورنہ وہ بند رہے گا۔بہر حال حدیبیہ پہنچتے ہیں اور اپنا ایک سفیر مکہ بھیجتے ہیں تاکہ مکہ والوں کو اطمینان دلائے کہ ہم جنگ کرنے نہیں آئے بلکہ صرف عمرہ کے لیے، تمھاری عبادت گاہ کی زیارت کرنے کے لیے آئے ہیں۔اس وقت تک کعبہ پر مسلمانوں کا قبضہ نہیں تھا۔بلکہ بت

پرستی کا مرکز تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس مقصد کے لیے بھیجے گئے ایک چھوٹی سی چیز اور عرض کرتا چلوں اولاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجنا چاہا۔ جیسا کہ میں اس سے پہلے لیکچر میں کہا تھا کہ مکہ کہ شہری مملکت کا دستور تھا کہ ہر کام کے لیے ایک وزیر یا عہدیدار تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ میں سفارت کے کام انجام دینے والے یعنی وزیرِ خارجہ تھے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے تھے کہ وزیر خارجہ کو بطور سفیر کے مکہ سے گفت وشنید کے لیے بھیجا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ عرض کرتے ہیں کہ مکہ والے میری جان کے دشمن ہیں اور اس بات کا امکان موجود ہے کہ میرے جاتے ہی وہ مجھے جان سے مار دیں۔ میں جب سے مسلمان ہوا ہوں ان کا سب سے سخت دشمن رہا ہوں۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجا جائے کیونکہ بنی امیہ کے لوگ اب تک مکہ میں ہی ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ بنی امیہ کے آدمی ہیں۔ غالباً ان کے ساتھ وہ نسبتاً نرم سلوک کریں گے۔ یہ رائے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند آتی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجتے ہیں لیکن انھیں وہیں قید کر دیا جاتا ہے۔ اور خبر پھیلتی ہے کہ انھیں قتل کر دیا گیا ہے۔ یہ اطلاع مسلمانوں کے کیمپ میں آتی ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مجبور ہو کر جنگ کا انتظام فرماتے ہیں اور سارے مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ آئے تو ہم عمرہ کے لیے تھے، لیکن دشمن نے ہمارے سفیر کو قتل کر دیا ہے۔ اس کا انتقام لینے کے لیے ہمیں جنگ کرنی پڑے گی۔ لہٰذا بیعت کرو کہ جان نکلنے اور آخری قطرہ خون جسم میں رہنے تک ہم دشمن سے جنگ کریں گے۔ یہ "بیعت رضوان" ہے۔ جس درخت کے نیچے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب لوگوں سے بیعت لی تھی، وہ درخت اتنا مقدس ہوگیا کہ قرآن میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ اذیبا یعونک تحت الشجرہ۔۔۔(18:48) یہاں ایک بات ضمناً عرض کرتا ہوں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں میں وہ درخت بے حد مقدس بن گیا۔ لوگ بیمار ہوتے تو اکثر وہاں جاتے، اس درخت کے سائے میں بیٹھے اور تندرست ہو جاتے، کم از کم مشہور یہی ہوا۔ نتیجہ یہ تھا کہ بے شمار لوگ تقریباً اس درخت کی پوجا کرنے لگے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ آتا ہے تو وہ درخت کٹوا کر غائب کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے۔ نہ کہ اس کی بنائی ہوئی مخلوق، ایک درخت سے، چاہے وہ کتنا ہی مقدس کیوں نہ ہو۔ یہ تھی اسلامی توحید پرستی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار مبارکہ سے بھی اگر اسلام کے اس بنیادی عقیدے کی خلاف ورزی ہونے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے تو اسے دور کر دیا جاتا ہے۔ بہر حال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سارے مسلمانوں سے، جو فوج میں تھے بیعت لیتے ہیں کہ ہم دشمن سے جنگ کریں گے۔ اس کی اطلاع اہل مکہ کو ہوتی ہے تو وہ گھبراتے ہیں۔ پہلے ایک شخص کو بھیجتے ہیں جو مکہ کا نہیں تھا بلکہ اس قبیلے کا آدمی تھا جو کہ مکہ والوں کا حلیف تھا۔ وہ مکہ والوں کی طرف سے بطور سفیر کے مسلمانوں کے کیمپ میں آیا۔ ایک اجڈ بدوی ہونے کے باوجود وہ عقل مند تھا۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی فوج کے

لوگوں کو حکم دیا کہ اس شخص کو وہ جانور دکھاؤ جو ہم قربانی کے لیے ساتھ لائے ہیں تاکہ اسے یقین ہو جائے کہ ہم جنگ کے لیے نہیں آئے بلکہ ایک پر امن مقصد یعنی عمرہ ادا کرنے کے لیے آئے شاید آپ کو معلوم ہو گا اس زمانے میں قربانی کے جانوروں کو مختلف ذرائع سے نمایاں کیا جاتا تھا۔ مثلاً ان کے گلے میں جوتیوں وغیرہ کا ہار ڈالتے تھے۔ ان کے کانوں کو کچھ زخمی کر دیتے تھے۔ جس سے خون بہتا تھا۔ اس وقت تک یہ رواج مسلمانوں میں بھی تھا۔ ایسے جانور جب اس سفیر نے دیکھے تو بغیر کسی مزید گفتگو کے واپس جاتا ہے اور مکہ والوں سے کہتا ہے کہ مسلمانوں سے جنگ نہ کرو، ورنہ میں تمھیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا، کیونکہ وہ صرف عمرہ کے لیے آئے ہیں۔ اس دھمکی کا بھی اثر پڑا۔ بلاخر مکہ والے ایک اور شخص کو روانہ کرتے ہیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا برادر نسبتی ہے۔ یہ سہیل بن عمرو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا چچازاد بھائی تھا، وہ ایک عقل مند اور سنجیدہ شخص تھا، وہ گفت وشنید کرتا ہے۔ بلاخر صلح کی شرطیں طے ہو جاتی ہیں۔ وہ شرطیں مسلمانوں کے بظاہر خلاف تھیں مثلاً یہ کہا گیا تھا کہ آئندہ دس سال تک صلح کی حالت رہے گی۔ لیکن اس اثناء میں اگر کوئی مدینے کا مسلمان اپنا شہر چھوڑ کر مکہ واپس آئے تو ہم اسے واپس نہیں کریں گے۔ اس کے بر خلاف اگر کوئی مکی شخص رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جائے اور ہم مطالبہ کریں تو مسلمانوں کو چاہیے کہ اسے واپس کریں۔ اس طرح کی کچھ شرائط تھیں جو بظاہر مسلمانوں کے لیے توہین آمیز اور انکی کمزوری دکھانے والی تھیں۔ اس کے باوجود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانے میں فرمایا تھا کہ میں اس وقت صلح کی غرض سے آیا ہوں، اس لیے مکہ والے مجھ سے جو بھی مانگیں گے وہ دینے کے لیے تیار ہوں۔ ہمارے مشہور فقیہی شمس الائمہ سرخسی اپنی دو کتابوں میں ایک اہم چیز کا ذکر کرتے ہیں جو میں نے سیرت النبی کی کتابوں میں بھی نہیں پڑھی تھی، وہ لکھتے ہیں کہ جغرافیہ پر نظر ڈالو خیبر مدینے کے شمال میں ہے، مکہ مدینے کے جنوب میں، مدینہ دو دشمنوں کے درمیان میں ہے۔ خیبر سے بھی مسلمانوں کی جنگ ہے۔ مکہ سے بھی مسلمانوں کی جنگ ہے اور خیبر وہ مکہ میں معاہدہ ہے کہ اگر مسلمان ایک فریق کی طرف بڑھیں تو دوسرا فریق مدینہ پر حملہ کرے۔ اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کو جاتے ہیں تو اہل مکہ مدینے پر چڑھ دوڑیں اور اسے لوٹ لیں گے۔ اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ مکہ کی طرف جاتے ہیں تو خیبر والے مدینہ کو کھلا پا کر اس پر حملہ کریں گے، ان حالات مُن ایک ذہین سیاستادن اور ایک صاحب فراست کمانڈر کی حیثیت سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طے فرمایا کہ دونوں میں سے ایک فریق سے صلح کر لی جائے اور اس کو اپنے ساتھی سے الگ کر لیا جائے۔ جب ایک فریق تنہا ہو جائے گا تو زیادہ آسانی سے ہم اس سے نپٹ سکیں گے، ان حالات میں آپ یہ طے کر کے تشریف لاتے ہیں کہ فریق مخالف جو شرائط بھی کہتا ہے ہم منظور کریں گے۔ یہاں انتخاب کا سوال ہے۔ کیا خیبر والوں سے صلح یا مکہ والوں سے؟ خیبر والوں سے صلح کا کوئی امکان نہیں تھا۔ بنی النضیر کے یہودیوں کو مدینے سے نکالا گیا تھا۔ ان کی اولین شرط یہ ہوتی کہ انھیں واپس مدینے آنے دیا جائے۔ وہ

مالدار تھے۔ انھیں کچھ رقم پیش کی جاتی تو ان کے لیے اس میں کوئی کشش نہیں تھی۔ اس کے بر خلاف مکہ والے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین کے قریبی رشتہ دار تھے۔ کوئی کسی کا بھائی کوئی بھتیجا، کوئی چچا، غرض یہ کہ سب انکے رشتہ دار تھے۔ لہٰذا ان رشتہ داروں کو بچانا زیادہ مناسب تھا، بہ نسبت اس کے کہ یہود کو بچا کر مکہ والوں پر حملہ کریں اور انھیں ختم کریں۔ علاوہ ازیں مکہ والے پہلے کی تین جنگوں بدر، احد، اور خندق میں شکست کھا کر مجبور ہو چکے تھے۔ ان کی مالی حالت خراب ہو چکی تھی۔ تجارت کی کساد بازاری تھی۔ لہٰذا وہ زیادہ آسانی کے ساتھ مسلمانوں سے صلح کرنے پر آمادہ ہو سکتے تھے۔ میں انکی تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ بہر حال مختلف وجوہ سے مکہ والے مسلمانوں سے صلح کرنے کے لیے دل سے آمادہ تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بھی کوشش رہی تھی کہ قحط کے زمانے میں مکہ والوں کا دل موہ لیا جائے۔ ان سب وجوہ سے انھوں نے ایک شرط تو اپنی بڑائی دکھانے کے لیے لگائی تھی تاکہ دنیا سے کہہ سکیں کہ ہم نے دب کر صلح نہیں کی، باقی سب شرطیں قبول کر لیں۔ ان شرائط کا مطالعہ کریں تو ان میں ایک شرط نظر آتی ہے جو آدھی سطر میں لا اسلال ولا اغلال اس کے کیا معنی ہیں۔ لفظی معنی یہ ہیں کہ نہ ہتھیار کو اس کے میان سے نکالا جائے گا، نہ دھوکے بازی کی جائے گی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اہل مکہ اور مسلمان اب وعدہ کرتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے حملہ اور جنگ نہیں کریں گے اور چھپ کر بھی دغا بازی سے اس معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ دوسرے الفاظ میں مکہ والوں کا یہ وعدہ تھا کہ اگر مسلمان کی جنگ کسی تیسرے فریق سے ہو تو وہ غیر جانبدار رہیں گے۔ مسلمانوں کے خلاف غداری اور دغا بازی نہیں کریں گے۔ اپنی اس واحد شرط پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دشمن کی ساری شرائط کو قبول کرتے ہیں۔ یہ بھی کہ دس سال تک ان میں صلح رہے گی، یہ بھی کہ مکہ کے تجارتی قافلے مدینے سے گزر سکیں گے۔ ان کی ساری شرائط قبول کی جاتی ہیں، صرف اس شرط پر کہ وہ آئندہ مسلمانوں کی جنگ میں غیر جانبدار رہیں گے۔ یہ شرطیں طے ہو گئیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے مکہ جانے کے دل شکستہ مسلمانوں کو حکم دیا کہ ہم حدیبیہ میں ہی اپنا عمرہ کر لیں۔ وہ روئے دھوئے مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا۔ بہر حال وہ اس کو انجام دیتے ہیں اور پھر مدینہ واپس ہو جاتے ہیں۔ مدینہ پہنچنے کے دو ہفتے بعد خیبر پر حمل کیا جاتا ہے اور خیبر پر قبضہ کر لیا جاتا ہے۔ گویا دو دشمنوں میں سے ایک مغلوب ہو جاتا ہے۔ فتح خیبر کے سلسلے میں وقت کی کمی کی وجہ سے زیادہ تفصیلات نہیں بتا سکوں گا۔ صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کی فوج میں چودہ سو سپاہی تھے اور ہمارے مؤرخوں کے بیان کے مطابق خیبر میں بیس ہزار سپاہی موجود تھے۔ چودہ سو نے بیس ہزار سے مقابلہ کیا اور ان کے علاقے پر چار دن میں قبضہ کر لیا۔ اس طرح اس خطرے کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا۔ مکہ والوں سے حدیبیہ میں یہ معاہدہ ہوا تھا کہ ان دو فریقوں کے علاوہ جو قبیلہ چاہے معاہدے میں ذیلی طور پر شریک ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جس احابیش نامی قبیلے کا ابھی تھوڑی دیر پہلے ذکر کیا گیا وہ مکہ والوں کا حلیف تھا۔ اس نے کہا کہ ہم مکہ والوں کی طرف سے انہی شرائط پر اس معاہدے میں شریک

ہوتے ہیں۔ ایک اور قبیلہ خزاعہ تھا، اس نے کہا ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس معاہدہ صلح میں شریک ہوتے ہیں۔ ان دونوں قبیلوں کی آپس میں لڑائی تھی۔ شروع میں کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ لیکن ایک دن کہتے ہیں کہ قبیلہ خزاعہ اور احابیش یعنی بنو کنانہ میں ایک بات پر جھگڑا ہو گیا۔ کسی شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دی، اس قبیلہ خزاء کے لوگ برداشت نہ کر سکے اور اس شخص کو قتل کر دیا۔ اس قتل کے جواب میں ان لوگوں پر حملہ کیا گیا اور ان کے دو چار آدمی قتل ہو گئے۔ یہ واقعہ مقامی واقعہ بن کر رہ جاتا، اگر ایک دوسرا واقعہ پیش نہ آتا، مکہ والوں کو اطلاع ملی کہ بنو کنانہ جو انکے حلیف ہیں، ان میں اور خزاعہ میں، جو مسلمانوں کے حلیف ہیں جنگ چھڑ گئی ہے، تو وہ چھپ کر، بھیس بدل کر اور نقاب ڈال کر آتے ہیں۔ اور خزاعہ والوں پر حملہ کر کے قتل وغارت گری کرتے ہیں۔ اس کی جو اطلاع خزاعہ والے مدینہ پہنچاتے ہیں اس کا ایک لفظ دلچسپ ہے کہ "جس وقت ہم سجدہ اور رکوع کی حالت میں تھے ان لوگوں نے ہم پر حملہ کیا۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خزاعہ میں بہت سارے مسلمان تھے۔ مسلمانوں کا ہاتھ کھل گیا تھا۔ اب وہ مکہ والوں پر حملہ کر سکتے تھے۔ لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی نہیں چاہتے تھے کہ پھر جنگ کریں۔ خزاعہ کے وفد سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ دیکھو یہ سامنے بادل جارہا ہے اس کی گڑ گڑاہٹ تم نے ابھی سنی وہ تمھاری فتح کی خبر سنا رہا ہے۔ ایک بہت ہی خاص انداز میں ان کی دل جوئی بھی کرتے ہیں کہ تمھیں فتح ہو گی اور کوئی چیز نہیں بتاتے کہ کیا ہو گا۔ وفد خوش اور مطمئن ہو کر واپس جاتا ہے۔ وہ توقع کرتے ہیں کہ جلدی ہی مسلمان مکہ والوں پر حملہ کریں گے۔ مدینہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان سارے مقامات پر جو گویا شہر کے دروازے تھے۔ جہاں سے لوگ گزرتے تھے وہاں ناکہ بندی کے لیے چوکیاں قائم کرتے ہیں تاکہ کوئی شخص باہر کا نہ اندر آئے اور نہ اندر کا باہر جائے۔ ورنہ ان سے یہ قطرہ ہو سکتا تھا کہ مدینہ کی تیاریوں کی اطلاع مکہ والوں تک نہ پہنچا دیں۔ دوسری چیز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے میں یہ کی کہ لوگوں سے کہا کہ ایک بڑی مہم درپیش ہے۔ اس کے لیے تیاریاں کرو۔ کسی کو نہیں بتا کہ کہاں کا ارادہ تھا۔ اس رازداری کی حد یہ ہے کہ ایک دن حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر آتے ہیں اور اپنی بیٹی حضرت عائشہ سے پوچھتے ہیں کہ بیٹی، تیاری تو بڑی جنگ کی ہو رہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہاں جانے والے ہیں؟ وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی تھیں۔ کہتی ہیں، ابا جان مجھے معلوم نہیں۔ ممکن ہے شام کو جا رہے ہوں۔ ممکن ہے کہیں اور جا رہے ہوں، کچھ معلوم نہیں مگر حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اعتماد تھا۔ اتنے میں آپ تشریف لاتے ہیں اور گفتگو کے الفاظ سن کر کہتے ہیں مکہ جانا چاہتا ہوں۔ لیکن اسے راز میں رکھنا اس کے بعد ایک تدبیر اختیار کرتے ہیں، جس کے بارے میں فوجی ماہرین ہی بتائیں گے کہ وہ کتنی مؤثر اور کتنی اہم تدبیر تھی۔

مسلمانوں کے بہت سے حلیف تھے۔ جنگ کے موقع پر ہر حلیف ایک جماعت جو رضاکاروں پر مشتمل ہوتی تھی، بھیجتا تھا۔ عام طور پر وہ لوگ مدینہ آتے اور مدینے سے ساری اسلامی فوج، مدینے کے سپاہی بھی اور باہر سے آئے ہوئے قبائل کے سپاہی بھی، منزل مقصود کو روانہ ہوتے تھے۔ اس دفعہ یہ نہیں کیا گیا۔ رازداری سے حلیف قبائل کو ایک اطلاع بھیجی گئی کہ تمھارا سردار مدینے آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ وہ لوگ آتے ہیں۔ ہر ایک سے فرداً فرداً علیحدہ رازداری سے یہ کہا جاتا ہے کہ ایک بڑی مہم درپیش ہے انہیں یہ نہیں بتاتے کہ کہاں کے کہاں کے لیے تیار ہونا ہے۔ بس اس طرح تیار رہنے کا حکم دیتے ہیں کہ ایک منٹ کے نوٹس پر تم ہمارے ساتھ چل پڑو۔ مدینہ نہ آنا۔ ہم تمھارے علاقے سے گزریں گے تو تمھاری فوج کو اپنے ساتھ لے لیں گے۔

بہت سے لوگ تیار ہوئے تھے مگر کسی کو کچھ پتہ نہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کہاں جا رہے ہیں۔ ایک بہت بڑے صحابی شاید حذیفہ بن یمان ہیں۔ ان کی حدیث بخاری میں ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے سے نکلتے ہیں۔ تو مکہ جو جنوب میں ہے۔ اس طرف نہیں جاتے بلکہ شمال کی طرف جاتے ہیں۔ گمان ہوتا ہے کہ شاید بیز نطینوں سے جنگ کرنے کے لیے جا رہے ہیں۔ وہاں کے قبیلے کے لوگوں کو لے کر شمال مشرق کو جاتے ہیں۔ پھر جنوب مشرق کو۔ اس طرح zig zag رخ بدل بدل کر سفر کرتے ہیں کہ کسی کو پتہ نہیں چلتا کہ کہاں جا رہے ہیں۔ وہ صحابی کہتے ہیں کہ مکہ کی پہاڑیوں کے دامن میں جو آخری قیام تھا وہاں پہنچنے تک ہمیں معلوم نہیں تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔

مسلمانوں کی دس ہزار فوج اس زمانے کے لحاظ سے ایک عظیم الشان تعداد تھی جو چھپ کر نہیں رہ سکتی تھی۔ لیکن اس کی اطلاع مکہ والوں کو نہیں ہوتی۔ جب عام طور پر مسلمان سفر کرتے تو کئی کئی سپاہی مشترکہ طور پر پکوان کرتے۔ مگر اس دن حکم دیا جاتا ہے کہ مشترکہ چولہے نہ جلائیں۔ چار چار پانچ پانچ سپاہی مل کر غذا تیار کرنے کی بجائے ہر شخص الگ الگ آگ جلائے۔ اس طرح دس ہزار فوج میں دو ہزار چولھے کی بجائے دس ہزار چولھے جلتے ہیں۔ ابو سفیان مکہ کا سردار ہے۔ وہ توقع کر رہا ہے کہ مسلمان حملہ کریں گے۔ اس کے دل میں چور ہے کیونکہ وہ عہد شکنی کر چکا ہے۔ وہ روزانہ رات کو شہر مکہ کی پہاڑی پر چڑھ کر ادھر اُدھر نگاہ ڈالتا ہے کہ دشمن اگر آرہا ہو تو دور ہی سے اس کی اطلاع ہو جائے۔ اس نے دیکھا کہ دس ہزار چولھے جل رہے ہیں یعنی لگ بھگ پچاس ہزار فوج آئی ہوئی ہے۔ وہ پہاڑی سے کیمپ کی طرف اترتا ہے۔ چوری سے آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتا ہے، تاکہ اتفاقاً کوئی شخص مل جائے تو پتہ چلے کہ یہ کون ہیں؟ مسلمانوں کی فوج کا قاعدہ تھا کہ قیام کرنے کے بعد کچھ سپاہی گشت کرتے تھے کہ اگر کوئی دشمن چھپ کر حملہ کر رہا ہو تو اس کا سدباب کیا جا سکے۔ ایسے ایک دستے کے ہاتھ ابوسفیان گرفتار ہوتا ہے وہ شہر مکہ کا بادشاہ اور سپہ سالار ہے۔ مکہ والوں کو کوئی

اطلاع نہیں ہے کہ دشمن آیا ہے۔ اسے گرفتار کرے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لاتے ہیں۔ تفصیلات میں گئے بغیر میں یہ کہوں گا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا کہ اس کو بہت اچھے برتاؤ کے ساتھ اپنے پاس رکھو۔ لیکن جانے نہ دو۔ بلکہ اس کی حفاظت کرو۔ صبح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیتے ہیں کہ فوج شہر میں داخل ہو جائے۔ آپ خیال فرمائیں کہ شہر مکہ کو مسلمانوں کے حملے کی اطلاع نہیں، شہر مکہ کا سردار بھی موجود نہیں۔ سردار اگر ہوتا تو وہی حکم دے سکتا کہ مکہ والے فوری طور پر کیا انتظامات کریں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی فوج کے ایک سپاہی کو حکم دیتے ہیں کہ ابوسفیان کو فلاں مقام پر اپنے سامنے لیے کھڑے رہو، تاکہ وہ دیکھے کہ مسلمانوں کی فوج کتنی بڑی ہے۔ دس ہزار کی فوج گزرتی ہے۔ ہر گروہ کے گزرنے پر اسے بتایا جاتا ہے کہ یہ فلاں قبیلہ ہے۔ بلاخر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی سواری وہاں پہنچتی ہے۔ اسے بتایا جاتا ہے، اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ اسے کہتے ہیں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ وہ کہتا ہے، تیرا بھتیجا تو واقعی بادشاہ بن گیا۔ اس کی اتنی بڑی قوت ہے کہ قیصر روم بھی اس سے ڈرنے لگا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب گزرتے ہیں تو حکم دیتے ہیں کہ ابوسفیان کو چھوڑ دو۔ یہ بھی ایک عجیب وغریب بات تھی۔ ابوسفیان ان حالات میں فیصلہ کرتا ہے کہ جنگ بے کار ہے کیونکہ مسلمانوں کی فوج شہر میں داخل ہو چکی ہے۔ اگر میں حکم بھی دوں کہ مسلمانوں سے جنگ کی جائے تو اس کا نتیجہ نہیں نکلے گا اور پھر جو فوج شہر میں داخل ہو رہی تھی اس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر چلا چلا کر گلی گلی میں یہ کہنا شروع کیا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے وہ امن میں رہے گا۔ جو اپنے گھر کے اندر رہے، گلیوں میں نہ آئے، امن میں رہے گا۔ جو شخص خانہ کعبہ کے صحن میں چال جائے گا۔ وہ امن میں رہے گا، اور جو شخص ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے گا۔ وہ امن میں رہے گا۔ اس سے لوگوں کو خیال ہوا ہو گا کہ شاید ابوسفیان بھی مسلمان ہو گیا ہے۔ ان حالات میں ابوسفیان اپنے گھر میں آتا ہے۔ اس کی بیوی جو ارت بھر سے انتظار میں رہی تھی، اس کو وہ بتاتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دس ہزار فوج کے ساتھ آیا ہے، ہم مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ اس کی داڑھی پکڑ کر طمانچہ مارتی ہے کہ یہ تیری بزدلی ہے۔ کچھ اس طرح کے واقعات وہاں پیش آئے۔ شہر میں داخلے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کو ڈھنڈورا پیٹنے کے لیے بھیجتے ہیں، وہ اعلان کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم لوگوں سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ مکہ والوں کو چاہیے کہ خانہ کعبہ کے صحن کے اندر جمع ہو جائیں۔ لوگ آئے۔ دلوں میں دہشت تھی کہ معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے۔ غالباً ظہر کی نماز کا وقت تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بلال کو حکم دیتے ہیں کہ اذان دو۔ اس دن وہ خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان شروع کرتے ہیں اور کڑک کر اشھد ان محمداً رسول اللہ کا نعرہ لگاتے ہیں۔ حاضرین میں بہت سے مکہ کے غیر مسلم مشرکین موجود ہیں۔ ایک شخص جس کا نام عتاب بن اسید ہے اور جو بڑا سخت اسلام دشمن ہے وہاں موجود ہے۔ یہ آواز سن کر اپنے دوست سے جو پاس بیٹھا ہوا ہے ہے کانا پھوسی کر کے کہتا ہے۔ "شکر ہے کہ میرا باپ مر چکا ہے

ورنہ وہ برداشت نہیں کر سکتا کہ ایک کالا گدھا خانہ کعبہ پر چڑھ کر اللہ تعالیٰ کے گھر پر ہینگے۔" اذان کے بعد نماز ہوتی ہے۔ نماز کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ والوں سے مخاطب ہو کر پوچھتے ہیں کہ تم مجھ سے کیا توقع کرتے ہو؟ انھیں بیس سالہ ظلم، فتنہ انگیزی اور فساد یاد آتے ہیں اور وہ شرم سے سر جھکا لیتے ہیں اور سوائے اس کے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ آپ شریف ہیں، شریف زادہ ہیں۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کو تارک عالم میں لافانی ولاثانی کہنا چاہیے، ان کی طرف مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔ "تم پر اب کوئی مواخذہ کوئی ذمہ داری نہیں، جاؤ تم سب کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔" قبل اس کے کہ میں آگے بڑھوں اس کے فوری اثرات بتا دوں۔ ایک چھوٹی سی چیز کی طرف اشارہ کرتا ہوں اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو حکم دے سکتے تھے کہ سارے مکہ والوں کا قتلِ عام کیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس کے وسائل موجود تھے۔ شہر پر قبضہ ہو چکا تھا۔ فوج موجود تھی۔ اس حکم کی فوراً تعمیل کی جا سکتی تھی اور یہ لوگ اس کے مستحق بھی تھے۔ یہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم بجا طور پر کر سکتے تھے کہ سب کو غلام بنا لینے کا حکم دیتے یا کم از کم یہ حکم دیتے کہ ان کا سارا مال لوٹ لیا جائے۔ کہا تو یہ کہا کہ جاؤ! تم پر کوئی ذمہ داری نہیں، تم سب آزاد ہو۔ عتاب بن اسید ابھی دو منٹ پہلے کہہ رہا تھا کہ کالا گدھا خانہ کعبہ پر ہینگ رہا ہے وہ خود کو تحمل کرنے کے قابل نہیں پاتا یکایک اچھل پڑتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ وعلیہ وسلم کے سامنے آکر کہتا ہے۔ میں عتاب بن اسید ہوں۔ اشھد ان لا الہ الااللہ واشھد ان محمداً رسول اللہ عتاب کے اسلام کو سنتے ہی رسول اکرم نے فرمایا، اے عتاب میں تمھیں مکہ کا گورنر مقرر کرتا ہوں۔ ایک منٹ پہلے کے جانی دشمن کو مختار کل گورنر بناتے ہیں اور نو مفتوحہ مکہ میں ایک مدنی سپاہی چھوڑے بغیر رسول اللہ صلی علیہ وسلم مدینہ واپس ہو جاتے ہیں اور اس پر پچتانا نہیں پڑتا۔ یہ واحد مثال نہیں تھی۔ راتوں رات شہر مکہ کی کایا پلٹ جاتی ہے اور سارا مکہ مسلمان ہو جاتا ہے، اور مسلمان بھی ایسا راسخ العقیدہ کہ دو سال بعد جب ملک کے بعض قبائل میں ارتداد کی کیفیت ہوئی تو سب سے مستحکم ایمان رکھنے والے لوگوں میں مکے والے بھی تھے۔

ایک چھوٹی سی چیز پر اس قصہ کو ختم کرتا ہوں اور وہ مکہ کی فتح کے بعد ابوسفیان کی بیوی کا ایمان لانا ہے۔ اس کا نام ہند تھا۔ ہند وہ عورت تھی جس کا بیٹا، بھائی اور چچا جنگ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے چنانچہ جنگ احد میں اس نے اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے لیے حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا پیٹ چیر کر، کلیجہ نکال کر چبایا تھا۔ جب مسلمانوں کا مکہ پر قبضہ ہو گیا تو اس کے گھر میں ایک عجیب سین نظر آتا ہے۔ وہ ایک لٹ لے کر گھر میں جو مختلف بت تھے ان کو مار مار کر پاش پاش کرنے لگتی ہے۔ اور کہنے لگی کہ اب تک تم ہمیں دھوکہ دیتے رہے، اب معلوم ہوا کہ تمھارے پاس کوئی قوت نہیں۔ چنانچہ سارے بت اس نے توڑ دیے۔ اس کے بعد

اسے خوف تھا کہ شاید حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی لاش کی بے حرمتی کرنے کی وجہ سے جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مجھے دیکھیں گے تو مجھے سزا دیں گے۔ اس لیے چہرے پر نقاب ڈال کر، چھپ کر، عورتوں کے ایک گروہ کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پہنچتی ہے اور وہاں اپنے اسلام لانے کا اعلان کرتی ہے جس طرح اور عورتیں کر رہی تھیں، عورتوں سے اجتماعی طور پر جو بیعت کی گئی اس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ وعدہ کرو کہ تم ایک اللہ کو مانو گی، بت پرستی اور شرک نہیں کرو گی۔ ہند نے با آوازِ بلند کہا ہم اب تک دھوکے میں تھے۔ اب ہمیں یقین ہو چکا ہے کہ ان بتوں میں کوئی طاقت و قوت نہیں ہے۔ ہم ایک اللہ کو مانتے ہیں۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ عورتوں کو چاہیے کہ بدکاری نہ کریں۔ وہ بڑے فخر و غرور کے ساتھ کہتی ہیں کہ کیا کوئی شریف عورت ایسا بھی کر سکتی ہیں؟ اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان عورتوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تم آئندہ اپنے نوزائیدہ بچوں کو زندہ دفن کر کے قتل نہ کرو گی۔ اس وقت ہند کے منہ سے جو الفاظ نکلے وہ دلچسپ ہیں۔ اس نے کہا "یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جن بچوں کو ہم نے پرورش کر کے بڑھایا جوان کیا آپ ہی نے ان کو قتل کر دیا۔" رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسکراتے ہیں۔ پوچھتے ہیں کون عورت ہے؟ کہا جاتا ہے کہ ہند ہے۔ اس طرح یہ سین ختم ہو جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسانی نفسیات کو سمجھ کر صحیح وقت پر ضرب لگانے میں جو فائدہ ہے، وہ بے وقت نرمی یا سختی دکھانے سے حاصل نہیں ہوتا۔ یہ وہ حالات تھے جن میں شہر مکہ کی فتح عمل میں آئی اور ہم نے دیکھا کہ فوج کو دشمن کے ملک کی طرف اس طرح بڑھایا گیا کہ اس کی خبر دشمن کو آخری لحہ تک نہ ہو سکی اور ایک بڑے شہر پر اس طرح قبضہ کیا کہ ایک قطرہ خون بھی نہ بہا۔

ایک اور پہلو پر مجھے کچھ روشنی ڈالنی چاہیے۔ فوجی تیاریوں کے سلسلے میں کیا انتظامات ہوتے ہیں۔ کس طرح سے مختلف کام انجام پاتے ہیں؟ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر جنگ میں نرسنگ کے لیے۔ کھانہ پکانے کے لیے، قبریں کھود کر مردوں کو دفن کرنے کے لیے، غرض ایسے بہت سے کاموں کے لیے ابتدا ہی سے مسلمانوں کی فوج میں عورتیں ہی ہوتی ہیں۔ بعض اوقات نو عمر لڑکیاں اور نابالغ لڑکیاں بھی اس میں حصہ لیتی ہیں۔ تفصیلات کا وقت نہیں۔ دو ایک چیزیں آپ سے بیان کروں گا، وہ یہ کہ مسلمانوں کی ایک مستقل فوج (standing Army) رکھنے کا شروع میں کوئی خیال نہیں تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ جہاد کرنا مسلمانوں کا فریضہ ہے۔ جس طرح نماز پڑھنا ایک فریضہ ہے، اسی طرح جنگ میں حصہ لینا مسلمانوں کا ایک فریضہ ہے۔ جو لوگ مسلمان تھے وہ اس پر ایمان رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ سارا ملک اور ملک کے سارے بالغ مرد Potential Army تھے۔ جس وقت، جتنے آدمیوں کی ضرورت ہو، ان میں سے لے لیتے۔ اس طرح مسلمانوں کو مستقل فوج تیار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بہر حال لوگوں کو فوجی

تربیت کے لیے مختلف انتظامات کیے جاتے تھے۔ تفصیلات میں جا نہیں سکتا۔ صرف یہ عرض کروں گا کہ فوج کو حالت امن میں جنگی کاموں کے لیے تیار کیا جاتا۔ گھڑ دوڑائی کرائی جاتی، اونٹوں کی دوڑ ہوتی تھی، گدھوں کی دوڑ ہوتی تھی، آدمیوں کی دوڑ ہوتی تھی، کشتیوں کے مقابلے کرائے جاتے تھے۔ اسی طرح تیر اندازی کی بہت ترغیب دی جاتی تھی۔ اس پر انعامات دیے جاتے تھے۔ گھڑ دوڑ میں جیتنے والوں کو انعام دیا جاتا۔ غرض فوج حالت امن میں بھی تن دھن قربان کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتی تھی۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ مسلمانوں کی فوجی تیاریاں ان کے جذبہ ایمانی پر مبنی تھیں۔ اس لیے مٹھی بھر آدمی ہمیشہ تگنے، چوگنے، دس گنے دشمن سے بھی مقابلہ کرتے تھے اور کبھی یہ نہیں سوچتے تھے کہ دشمن کی اتنی تعداد ہے، ہم کیا کریں گے۔ وہ جان پر کھیل جاتے تھے اور خدا انھیں فتح دیتا تھا۔

ایک اور آخری چیز پر اسے ختم کرتا ہوں جو میرے ذہن میں آئی ہے۔ جنگ کے دوران سپہ سالار کو مختلف صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک چھوٹا سا واقعہ لکھا ہے۔ جب کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی مقام پر حملہ کرتے اور علی الصبح طلوع آفتاب کے وقت جنگ کا آغاز ہوتا تو اس کا ہمیشہ لحاظ رکھتے کہ آفتاب ہماری آنکھوں کے سامنے نہ ہو۔ دشمن تمازت آفتاب سے متاثر ہو اور آفتاب ہمارے پیچھے ہو تاکہ جنگ کے وقت آفتاب کی روشنی سے چندھیا کر دشمن سے مقابلہ کرنے میں دشواری پیش نہ آئے۔ ایک دوسری چیز یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو موسمیات (Meteorology) سے بھی دلچسپی تھی۔ ہواؤں کے رخ کا خاص لحاظ فرماتے تھے کہ دشمن سے جنگ ہو تو ایسے مقام پر ہو کہ ہمارے پیچھے سے چل رہی ہو، نہ کہ ہمارے سامنے سے آئے اور ہماری رفتار میں رکاوٹ پیدا کرے۔ اس طرح کی بے شمار چیزیں حدیث وسیرت کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حدیث جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انا نبی الرحمتہ وانا نبی الملحمتہ یعنی میں رحمت کا بھی نبی ہوں اور جنگ کا بھی نبی ہوں۔ جس کا بعد میں دنیا کے بہترین سپہ سالار کی حیثیت سے مظاہرہ بھی ہوتا ہے اور اس طرح بہترین سیاستدان اور بہترین مدبر کی حیثیت سے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سامنے آتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مقصد کا حصول چاہتے تھے۔ آدمی کا خون بہانا یا دشمن کا خاتمہ کرنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر نہیں تھا۔ السلام وعلیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## سوالات وجوابات

بردران کرام، خواہران محترم، السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

کچھ سوالات جو آپ کی طرف سے آئے ہیں، ان کے جوابات دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

**سوال 1:** موجودہ دور کے ترقی پسند مسلمانوں کے نقطہ نظر سے جس موسیقی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے، کیا یہ موسیقی اسلام میں جائز ہے؟

**جواب:** میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اُس لیکچر میں وضاحت کردی تھی کہ جس موسیقی سے فحش کاری کی طرف میلان نہیں ہوتا، جس موسیقی سے ہمارے مذہبی فرائض میں خلل پیدا نہیں ہوتا، اس سے منع نہیں کیا جائے گا۔ موسیقی بطور موسیقی کے ایک علم ہے، اس سے استفادہ کرسکتے ہیں۔ اس کی جنگ میں بھی ضرورت پیش آتی ہے۔ ان حالتوں میں اس سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

**سوال 2:** محقق اور مفتی کا کیا مقام ہے؟

**جواب:** معلوم نہیں آپ کا کیا منشا ہے؟ محقق کے معنی ہیں جو شخص علمی تحقیق کرے اور مختلف مقاموں پر تلاش کرکے معلومات جمع کرے۔ مفتی کے معنی ہیں کسی سائل کو یہ بتائے کہ اس کے دریافت کردہ امر میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ ایسا شرعی حکم معلوم کرنا بھی بعض وقت تلاش کا محتاج ہوتا ہے، چنانچہ اگر قرآن وحدیث میں وضاحت نہ ہو تو پرانے ائمہ کی آرائ میں دیکھنا ہوتا ہے، اور بدرجہ اخیر خود یہ مفتی قیاس اور اجتہاد سے استنباط کرتا ہے۔ اگر آپ مفتی سے پوچھیں کہ اسلام میں بادشاہت اور جمہوریت کا کیا حکم ہے تو دیکھے گا کہ دونوں جائز ہیں بشرطیکہ شرعی قانون کا نفاذ ہو لیکن اگر آپ پوچھیں کہ ان میں سے کونسا طرزِ حکومت بہتر ہے تو وہ کوئی شرعی حکم بتا نہ سکے گا اور جو بھی بیان کرے گا وہ اس کی انفرادی رائے ہوگی اور ملک کے ارباب حل وعقد اس کے پابند نہ ہوں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ کیا دریافت کررہے ہیں وہ واضح نہیں ہے کہ مطلوبہ جواب دے سکوں۔

سوال 3: "مارمیت اذ رمیت" کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ خندق کے موقع پر کفار کی طرف مٹی کی مٹھی پھینکی تھی؟

جواب: جہاں تک مجھے یاد ہے یہ واقعہ جنگ بدر میں پیش آیا تھا۔

**سوال 4:** آپ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کی لڑائی میں ایک پہاڑی پر جھونپڑی قائم کی اور دو تیز رفتار اونٹنیاں رکھی تھیں تاکہ شکست کی صورت میں مدینہ بھاگ جائیں۔

**جواب:** یہ لفظ میں نے استعمال نہیں کیا تھا۔ بہر حال لکھا ہے کہ صحابہ نے عرض کیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک سپہ سالار کی حیثیت سے اپنی جان بچانے کی ضرورت ہے۔ باقی غزوات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا اقدام کبھی نہیں کیا۔ یہ بات کہ اگر شکست ہو بھی جاتی تو اس صورت میں زخمی صحابہ کو چھوڑ کر مدینہ کیوں بھاگ جاتے؟ اس کا جواب میں نے شروع میں ہی دیا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک اسوہ حسنہ قائم کرنا تھا۔ اور یہ بتانا چاہتے تھے کہ بعد میں آنے والے بادشاہ اور کمانڈر کس طرح اپنے متعلق انتظامات کریں۔ اگر فوج میں موجود بادشاہ یا کمانڈر انچیف مر جائے تو صرف فوج کے باقی رہنے سے ہمارا کام نہیں بنے گا۔ اس لیے اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ بادشاہ اور کمانڈر کی جان بچائی جائے۔ غرض یہ کہ یہ انتظام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے مشورے سے کیا تھا۔ اس کا منشا یہ دکھانا تھا کہ آئندہ مسلمان حکمران کس طرح اس صورتحال میں کام انجام دیں۔ یہ سوال کہ بعد کے غزوات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا اقدام کیوں نہیں کیا تو میں سمجھتا ہوں کہ جس مقام پر جنگ ہوئی اس کے لحاظ سے ایسا کیا گیا۔ لیکن جب مسلمان مکہ جاتے ہیں تو جیسا کہ ابھی آپ نے دیکھا کہ بغیر لڑائی کے قبضہ ہو گیا۔ ان حالات میں وہاں جھونپڑی بنا کر دور سے دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غرض یہ ایک ٹیکنکل چیز تھی کہ کس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح اپنا کام سرانجام دیا۔ اس پر میں اسے ختم کرتا ہوں۔

آپ کا شکریہ۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

# خطبہ۹: عہدِ نبویؐ میں نظامِ تعلیم

محترم صدر، محترم وائس چانسلر صاحب! محترم اساتذہ!خواتین وحضرات!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

آج کا موضوع یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں نظامِ تعلیم اور علوم کی سرپرستی یہ بہت اہم موضوع ہے۔ مسلمانوں نے بعد کے زمانے میں جو علمی ترقیاں کیں اور جس کے باعث وہ ساری دنیا کے معلم بنے اور ساری دنیا کے لوگ عربی کتب کو پڑھ کر جدید ترین تحقیقات سے آگاہ ہوئے، اس کی اساس، ظاہر ہے عہدِ نبوی کی تیار کردہ بنیاد ہی ہو سکتی تھی۔

مواد بہت ہے۔ اس کی ترتیب و تدوین کا کام بھی آسان نہیں اور مجھے دعویٰ نہیں کہ مجھے ان ساری چیزوں کا علم ہو چکا ہے۔ ایک چیز سے میں ہمیشہ متاثر ہوا ہوں اور یہ ایک نہایت ولولہ انگیز چیز ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلے جو خدائی حکم ملتا ہے وہ یہ کہ اقرا باسم ربک الذی خلق خلق الانسان من علق – اقرا و ربک الاکرم – الذی علم بالقلم – علم الانسان مالم یعلم – (96:1-5)اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ پہلے جملے میں اللہ کی طرف سے ایک حکم آتا ہے اور پھر پڑھنے کی اہمیت بھی اسی وحی میں بیان کر دی جاتی ہے یعنی یہ کہ قلم ہی وہ واسطہ ہے جو انسانی تہذیب و تمدن کا ضامن و محافظ ہے۔ اسی ذریعہ سے انسان وہ چیزیں سیکھتا ہے جو اسے معلوم نہیں ہوتیں۔ انسانی علوم اور دیگر مخلوقات خاص کر جانوروں کے علم میں سب سے نمایاں فرق یہی ہے کہ حیوانات کا علم محض جبلی علم ہوتا ہے اسی لیے اس میں اضافہ نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف انسانی علم صرف جبلی ہی نہیں ہوتا بلکہ کسی بھی اور اس میں روزانہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے آباءواجداد کے تجربوں

سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنے ذاتی تجربوں سے بھی اپنے علم میں اضافہ کرتے رہتے ہیں اور یہ سارا علم اپنی آئندہ نسلوں کو منتقل کر دیتے ہیں۔

پہلی ہی وحی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھانے کے بارے میں حکم دینا ایسی بات ہے، جو ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی ہے نبی امی کو کیوں پہلے ہی حکم میں اس کی طرف متوجہ کیا گیا اور اس کے بعد جو تیئس سالہ عرصہ گزرا، اس میں کچھ نہیں تو بیسیوں آیتیں ایسی ملتی ہیں جن میں علم کی تعریف اور اہمیت سمجھائی گئی ہے اور اس میں عجیب وغریب چیزیں بھی نظر آتی ہیں۔ مثلاً ایک طرف یہ کہا جائے گا۔ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا (85:17) (اور تمھیں علم نا دیا گیا ہے مگر تھوڑا) دوسری طرف یہ بھی کہا گیا۔ 'قل رب زدنی علما' (114:20) (اور عرض کرو کہ اے میرے رب مجھے علم میں بڑھا) اسی طرح کی شاید ایک ضرب المثل بھی مشہور ہے۔ اطلبوا العلم من المھد الی اللحد (گھوارے سے قبر تک یعنی پیدا ہونے سے موت آنے تک علم سیکھتے رہو) ایک اور چیز ہے جس کی صحت کے متعلق ہمارے محدثین ٹیکنیکل نقطہ نظر سے اعتراض کریں گے، لیکن بہر حال وہ بھی اثر انگیز چیز ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ "علم سیکھو چاہے وہ چین ہی میں کیوں نہ ہو" عقلی اور تاریخی نقطۂ نظر سے مجھے اس پر اعتراض کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ بہر حال اس سلسلے میں پہلا سوال ہو گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو چین کا علم کیسے ہوا؟ جب کہ عرب، ایشیا کے انتہائی مغرب میں ہے اور چین، ایشیا کے انتہائی مشرق میں ہے اور ان دونوں ممالک میں کسی طرح کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ ان حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے علم ہوا کہ چین میں علوم وفنون پائے جاتے ہیں؟ سوال معقول ہے لیکن اگر ہمارا مطالعہ ذرا وسیع ہو اور ہمیں اپنی علمی میراث سے ذرا زیادہ واقفیت ہو تو پھر یہ سوال باقی نہیں رہتا بلکہ خود بخود حل ہو جاتا ہے مثلاً 'مسعودی' کی کتاب 'مروج الذھب' کے نام سے ہمارا پڑھا لکھا شخص واقف ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ اسلام سے پہلے چینی تاجر عمان تک آتے تھے۔ بلکہ عمان سے آگے 'ابلہ' یعنی بصرہ تک بھی پہنچتے تھے اور یوں یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ اس زمانے میں عربوں کے لیے چین اور چینی اجنبی نہیں تھے۔ اس سے بھی زیادہ قابلِ غور واقعہ ایک اور ہے کہ محمد بن حبیب البغدادی نے، جو ابنِ قتیبہ کا بھی استاد ہے' اپنی کتاب المحبر میں لکھا ہے کہ ہر سال فلاں مہینے میں 'دبا' نامی مقام پر ایک میلہ لگتا تھا' جس میں شرکت کے لیے سمندر پار سے بھی لوگ آیا کرتے تھے ان لوگوں میں ایرانی بھی ہوتے تھے، چینی بھی ہوتے تھے، ہندی اور سندھی بھی ہوتے تھے، مشرقی لوگ بھی ہوتے تھے، مغربی بھی ہوتے تھے وغیرہ وغیرہ۔ دبا کی اہمیت کے سلسلے میں ایک چھوٹا سا واقعہ آپ کو یاد دلاؤں۔ جب عمان کا علاقہ اسلام قبول کرتا ہے تو عمان میں ایک گورنر ہوتا ہے، اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک اور گورنر کا تقرر صرف بندرگاہ دبا کے امور کے لیے فرماتے ہیں۔ اس سے

اس مقام کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ غالباً اس انٹر نیشنل میلے کی وجہ سے بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہوں گے، تجارتی جھگڑے، کاروباری معاملات وغیرہ، اس لیے عہدِ نبوی میں خصوصی افسر کی ضرورت محسوس کی گئی۔ ان دو واقعات کے بعد مسند احمد بن حنبل پر نظر ڈالیے۔ جس کے بعد ہمیں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان چینیوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں ذکر کر چکا ہوں کہ مسعودی کے بیان کے مطابق چینی تاجر اپنے جہازوں میں سمندری راستے عمان کے علاوہ ابلہ یعنی بصرہ تک جاتے تھے اس دوسری روایت میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ دبا نامی بندر گاہ میں، جو جزیرہ نمائے عرب کی دو سب سے بڑی بندر گاہوں میں سے ایک بندر گاہ تھی، ہر سال میلا لگتا تھا، وہاں ہر سال چینی لوگ آتے تھے۔ ان دو چیزوں کو ذہن میں رکھ کر مسند احمد بن حنبل کو پڑھیں۔ اس میں لکھا ہے کہ قبیلہ عبد القیس کے لوگ، جو عمان وہ بحرین میں رہتے تھے، مدینہ آئے اور اسلام قبول کیا۔ ایک چھوٹی سی چیز پر آپ کی توجہ منعطف کراتا ہوں وہ یہ کہ اس میں جو بحرین کا لفظ آیا ہے، اس روایت میں اس سے مراد وہ جزیرہ نہیں ہے جسے ہم آج کل بحرین کہتے ہیں اور جو جزیرہ نمائے عرب میں خلیج فارس کے اندر واقع ہے۔ اس زمانے میں اس جزیرہ کا نام 'اوال' تھا اور بحرین کا لفظ اُس علاقے کو ظاہر کرتا ہے جسے آج کل ہم الاحساء اور القطیف کا نام دیتے ہیں۔ بہر حال اس میں لکھا ہے کہ بحرین کے لوگ جن کا نام قبیلہ عبد القیس ہے ،اسلام لانے کے لیے مدینہ آتے ہیں۔ اس روایت میں اس بات کی بھی تفصیل ملتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں سے کچھ سوالات کیے۔ مثلاً فلاں شخص ابھی زندہ ہے؟ کیا فلاں سردار زندہ ہے؟ فلاں مقام کا کیا حال ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان سوالات کو سن کر وہ لوگ حیرت سے پوچھتے ہیں۔ یا رسول اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو ہم سے بھی زیادہ ہمارے ملک کے شہروں اور باشندوں سے واقف ہیں۔ یہ کیسے ہوا؟ ان لوگوں کے اس سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ "میرے پاؤں تمہارے ملک کو بہت عرصے تک روندتے رہے ہیں۔" دوسرے لفظوں میں میں وہاں بہت دنوں تک مقیم رہا ہوں۔ اس صراحت کے بعد ہمیں شبہ نہیں رہتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غالباً شادی کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مال تجارت لے کر نا صرف شام جاتے ہیں، جس کی صراحتیں موجود ہیں بلکہ مشرقِ عرب کو بھی جاتے ہیں تا کہ دبا کے میلے میں شرکت کر سکیں اور کوئی تعجب نہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہیں پر چینی تاجروں کو بھی دیکھا ہو اور ممکن ہے اُن سے کچھ گفتگو کی ہو۔ اگر چینی وہاں آیا کرتے تھے تو اُنھیں کچھ ٹوٹی پھوٹی عربی آجانی چاہئے۔ اس کے علاوہ وہاں پر یقیناً ایسے مترجم ہوتے ہوں گے جو چینی اور عربی دونوں زبانیں جانتے ہوں۔ بہر حال اس کا امکان ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چینیوں سے ملاقات کی اور میرا گمان ہے کہ ان کے ریشمی سامان پر خاص کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ ہوئی ہو گی، کیونکہ چین کا ریشم نہایت ہی مشہور چیز تھی، ممکن ہے کہ ان کی صنعت و حرفت کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت ہی اچھا تاثر لیا ہو اور ان سے پوچھا ہو کہ تمھارے ملک سے یہاں تک آنے میں کتنے دن لگتے ہیں۔ اور مثلاً

انھوں نے کہا ہو کہ چھ مہینے لگتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک اندازہ قائم کرنے کے لیے یہ کافی تھا اور اس کی روشنی میں اب اس حدیث کو پڑھئے "علم سیکھو چاہے چین ہی جانا پڑے" (جو تمھارے لیے دنیا کا بعید ترین ملک ہے) کیونکہ علم کا سیکھنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔" غرض ان ابتدائی چیزوں کے عرض کرنے کا منشا یہ تھا کہ قرآن مجید و حدیث شریف میں علم حاصل کرنے کی بڑی تاکید آئی ہے کیونکہ یہ انسانوں کے لیے نہایت مفید چیز ہے اور اسلام سے زیادہ فطری مذہب کون سا ہو سکتا ہے جو انسانوں کو ان کے فائدے کی چیز بتائے۔

یہ کہنا دشوار ہے کہ مکہ معظمہ میں ہجرت سے قبل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کے متعلق کیا کام کیا؟ کوئی مدرسہ قائم کیا یا مدرس مامور کیے؟ اس کا پتہ چلنا آسان نہیں ہے۔ غالباً ایسا ہوا بھی نہیں بجز قرآن کو مستند استاد سے پڑھنے کے۔ لیکن ایک چیز قابل ذکر ہے وہ یہ کہ ہمارے مورخین کے مطابق عربی زبان طویل عرصے تک بولی جانے والی زبان رہی تھی، تحریری زبان نہیں تھی۔ لکھنے کا رواج مکہ معظمہ میں، حرب کے زمانے میں ہوا۔ یہ ابوسفیان کا باپ تھا۔ یعنی یہ دور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نوجوانی کا دور ہے۔ جو لوگ آپ سے معمر تر تھے، شہر مکہ میں ان کے زمانے میں پہلی مرتبہ عربی زبان کی تحریر و کتابت ہونے لگی۔ اس کی وجہ بھی یہ بیان کی گئی ہے کہ ایک شخص عراق کے علاقے سے حیرہ سے وہاں آیا تھا۔ اُس نے مکہ معظمہ میں حرب کی بیٹی سے شادی کی اور اظہار شکر گزاری کے لیے حرب کو یہ راز بتلایا کہ ایسی کام کی باتیں، جنھیں تم بھول جاتے ہو اور جنھیں یاد رکھنے کی ضرورت ہے، اُنھیں لکھ لیا کرو۔ یہ روایت ہمیں مختلف کتابوں میں ملتی ہے، مثلاً قدامہ بن جعفر کی کتاب الخراج اور اس کے استاد بلاذری کی فتح البلدان وغیرہ میں۔ دوسرے الفاظ میں مکہ میں لکھنے پڑھنے کا رواج عہدِ نبوی سے کچھ پہلے ہی شروع ہوا تھا اور بلاذری کو تو اصرار ہے کہ عہدِ نبوی کے آغاز پر وہاں سترہ سے زیادہ آدمی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ ممکن ہے کہ مبالغہ ہو یا کسی خاص عہد کا ذکر ہو اور بعد میں اس صورت میں ترقی ہوئی ہو اور زیادہ لوگ لکھنا پڑھنا جان گئے ہوں لیکن اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ البتہ یہ امر ضرور قابلِ ذکر ہے قبلِ اسلام مکے میں عورتیں بھی لکھنا پڑھنا جانتی تھیں چنانچہ شفاد بنت عبداللہ کو جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رشتہ دار تھی، لکھنا پڑھنا آتا تھا اور اسی واقفیت کے سبب سے بعد میں، جب وہ ہجرت کر کے مدینہ آئیں، تو ابن حجر کے بیان کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مدینہ کے ایک بازار میں ایک عہدہ پر مامور کیا۔ چونکہ انہیں لکھنا پڑھنا آتا تھا، اس لیے کوئی ایسا ہی کام ان کے سپرد کیا گیا ہو گا جس کا تعلق لکھنے پڑھنے سے ہو۔ ایک امکان میرے ذہن میں آتا ہے کہ اس بازار میں عورتیں بھی سامانِ تجارت لاتی ہوں گی لہٰذا ان کی نگرانی ان کی مدد اور ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کسی عورت ہی کو مامور کیا جاسکتا تھا۔ بہر حال لکھنے پڑھنے کا رواج عہدِ نبوی

کے آغاز کے زمانے میں ایک بالکل نئی چیز تھی اور اسکا نتیجہ یہ تھا کہ اس نے ابھی زیادہ ترقی نہیں کی تھی۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیائے عرب کی سب سے پہلی تحریر میں لائی ہوئی کتاب قرآنِ مجید ہے۔ اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ صرف چند ایک چیزیں مثلاً سبعہ معلقات، جن کو لکھ کر کہتے ہیں کہ بطور اعزاز و احترام کعبہ میں لٹکا دیا گیا تھا۔ اسی طرح بعض معاہدے بھی لکھے گئے ہوں گے۔ 'الفرست' میں ابن ندیم نے لکھا ہے کہ خلیفہ مامون کے خزانے میں ایک مخطوطہ یا ایک کاغذ کا پرچہ تھا جس میں ذرا بھدے خط کی کچھ عبارت تھی۔ لکھا ہے کہ عورتوں کے خط کے مشابہ تھا اور کہا کہ وہ عبد المطلب کا خط تھا وغیرہ۔

ان چیزوں سے معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں لکھنے پڑھنے کا آغاز ہو رہا تھا اور ابھی زیادہ ترقی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو۔ کہ حیرہ سے آنے والا شخص وہی خط سکھائے گا جو حیرہ میں رائج ہے۔ وہاں کی زبان میں کل چوبیس حرف ہیں جب کہ عربی میں حروف کی تعداد اٹھائیس ہے۔ ظاہر ہے حیرہ میں رائج خط اس زبان کے لیے ناکافی ہو گا۔ اسی لیے حیرہ میں رائج خط کی مدد سے عربی زبان کے حروف میں امتیاز کرنا بھی دشوار تھا۔ عربی زبان کے حروف میں امتیاز قائم کرنے کی ایک ہی صورت تھی کہ مختلف حروف کے سلسلہ میں ایک نقطہ نیچے لگا کر 'ب' بنائیں اور اسی حروف پر ایک نقطہ اوپر لگا کر 'ن' بنائیں وغیرہ وغیرہ۔ اس سلسلے میں خطب البغدادی وغیرہ وغیرہ متعدد لوگوں کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ غالباً اس کوتاہی کو دور کرنے کا کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی فرمایا تھا۔ روایت ہے کہ ایک دن خلیفہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عبید غسانی نامی کاتب کو بلایا اور فرمایا کہ "میں تمھیں کچھ لکھواتا ہوں اسے لکھو اور رقش کرو۔" غسان کہتا ہے "رقش 'کیا چیز ہے؟" وہ تبسم کر کے کہتے ہیں کہ میں ایک دن مدینہ منورہ میں تھا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کاتب کی حثیت سے مجھے یاد فرمایا اور حکم دیا لکھو اور رقش کرو میں نے بھی پوچھا تھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رقش کیا چیز ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یہ تھے کہ "حروف پر جہاں ضرورت ہو نقطے لگاؤ۔" اس چھوٹی سی روایت سے جو ہمیں کئی کتابوں میں ملتی ہے، گمان ہوتا ہے کہ نقطے لگا کر حروف میں امتیاز پیدا کرنا بہت بعد کی چیز نہیں ہے بلکہ عہدِ نبوی میں اس کا آغاز ہو گیا تھا لیکن کتب رسم المصاحف (یعنی قرآنی املاء) کے مؤلفوں یا خط عربی کے عام مورخوں کے ہاں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا البتہ اس کی تائید میں اب کچھ چیزیں بھی ہمیں مل گئی ہیں۔ پہلی چیز یہ ہے کہ طائف کے مضافات میں ایک کتبہ ملا ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں انہی کے حکم سے طائف کے گورنر نے ایک تالاب تعمیر کرایا تھا، اس پر ایک کتبہ لگایا گیا۔ اس کتبے کے کئی حروف پر نقطے ہیں۔ یہ سن 50ھ کا واقعہ ہے۔ ظاہر ہے بعد کی جعل سازی نہیں ہو سکتی۔ اس کتبے کے سب حروف پر نقطے نہیں بلکہ صرف چند حروف پر ہیں۔ یہ ذرا پرانی دریافت تھی، اب ایک نئی چیز ہمارے سامنے آئی ہے۔ جو اس سے بھی زیادہ موثر ہے۔ مصر میں

کچھ جھلیاں (پارچمنٹ) دریافت ہوئی ہیں جن پر کچھ تحریریں لکھی ہوئی ہیں۔ ان میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت بائیس ہجری کے زمانے کے دو خطوط ہیں۔ ان میں بھی نقطوں کا اہتمام نظر آتا ہے۔ یعنی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں بھی ایک حد تک نقطے لگانے کا رواج تھا۔ اسے حجاج بن یوسف یا اس کے بعد کی چیز قرار دینا درست نہیں۔

بہر حال خط کے سلسلے میں ایک طرف تو یہ بنیادی اصلاح ملتی ہے کہ حروف پر نقطے لگا کر ان میں امتیاز پیدا کرو۔ دوسری طرف کچھ اور حدیثیں بھی ملتی ہیں جو اگرچہ مسلم و بخاری جیسی کتب حدیث میں تو نہیں آئیں لیکن لائق توجہ ہیں مثلاً ایک حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب ہے جس میں آیا ہے کہ جب تم کوئی خط لکھو تو اسے فوراً تہہ نہ کرو بلکہ اس پر ریگ ڈال کر پہلے اسے خشک کیا کرو۔ اس کے بعد اسے بند کرو۔ یہ ایک عقل مندی کی بات ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدے کی دلیل ہے۔ کیونکہ بعض وقت جلدی جلدی میں خط بند کر دیتے ہیں اور روشنائی گیلی رہتی ہے، جس کے باعث تحریر پر نشان پڑ جاتے ہیں اور وہ پڑھنے کے قابل نہیں رہتی۔ اس سے بھی زیادہ ایک اور چیز دلچسپ ہے جو ابن اثیر نے لکھی ہے۔ وہ حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم لکھو تو 'س' کو ایک لمبے خط کی طرح نا لکھو بلکہ اس میں شوشہ کا اہتمام کرو ورنہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ 'بم' "ب' اور 'م' کا مجموعہ ہے یا 'ب'، 'س' اور 'م' کا؟ خط کے سلسلے میں اور اس طرح دوسری حدیثیں بھی ہمیں ملتی ہیں۔ ایک ترکی فاضل نے تحریر کے متعلق ایک چہل حدیث ہی لکھ ڈالی ہے۔ ایک آخری بات پر اس بحث کو ختم کرتا ہوں کہ جب ہجرت کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لاتے ہیں تو 'صفہ' کا مدرسہ تعمیر کیا جاتا ہے۔ وہاں کے اور مدرسوں میں ایک مدرس لکھنا پڑھنا سکھانے پر مامور ہوئے تھے۔ ان کا کام طالبِ علموں کو خطاطی کی مشق کرانا تھا۔

ہجرت سے پہلے مکہ میں قیام کے دوران میں لکھنے پڑھنے کی دو تین اور مثالیں بھی ہمیں ملتی ہیں۔ ایک تو وہ مشہور صحیفہ ہے جس کے مطابق مکہ والوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان والوں کا بائیکاٹ کیا تھا کہ کوئی شخص نہ اپنی بیٹی نکاح کے لیے دے اور نہ کوئی ان سے ان کی بیٹی لے، نہ ان کے ہاتھ کچھ بیچے نہ ان سے خریدے حتٰی کہ ان سے بات چیت تک نہ کرے۔ اس معاہدے کو لکھ کر کعبہ کے اندر لٹکایا گیا تھا تاکہ اس پر ایک مقدس فریضے کے طور پر سنجیدگی اور کامل طور سے عمل کیا جائے۔ مزید صراحت یہ بھی ہوتی ہے کہ اس معاہدے میں جو صرف مکے والوں نے کیا تھا، ایک مزید حصہ دار کے طور پر بنو کنانہ کے لوگ بھی شامل ہوئے تھے۔ اس معاہدے کی طرف اشارہ کرنے والی، بخاری وغیرہ میں ایک حدیث بھی ملتی ہے، غزوہ حنین کے وقت (جو فتح مکہ کے زمانے میں ہی ہوا تھا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کل ہم ایک ایسے مقام سے گزریں گے جہاں ایک زمانے میں ظلم کی

اعانت کی گئی تھی۔ اس سے مراد یہی تھا کہ بنو کنانہ کے لوگ اس مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کے خلاف کیے جانے والے معاہدے میں اہلِ مکہ کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔ میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کیوں کہ آپ اس سے واقف ہیں کہ کس طرح، اس تحریر کے باوجود، دیمک چاٹنے کی وجہ سے یہ معاہدہ بعد میں منسوخ ہو گیا تھا۔ ایک دوسرا واقعہ حضرت تمیم الداری کے متعلق ہے۔ وہ ایک فلسطینی تھے اور ہجرت سے پہلے مکہ آکر مسلمان ہوئے اور اپنی بہت سی داستانیں بھی سنائیں جن کا صحیح مسلم میں ذکر ہے، جن میں جہازرانی وغیرہ کی کہانیوں کا ذکر ہے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ میں نے سیاحت کے دروان میں فلاں فلاں مقامات اور چیزیں وغیرہ دیکھی ہیں۔ بہر حال انھوں نے مسلمان ہوتے ہوئے کہا کہ جب مسلم سپاہ شام فتح کر لیں، اس وقت شام کے فلاں فلاں گاؤں جاگیر کے طور مجھے دیے جائیں اور اس کے لیے آپ مجھے ابھی سے ایک پروانہ دی دیجیے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ خط ملتا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ اگر بہت مرطوم، حبرون، اور فلاں فلاں مقام فتح ہوں تو وہ تمیم الداری کو دے دیئے جائیں۔ یہ خط اصل ہے یا بعد میں تمیم الداری کی اولاد کی جعل سازی کا نتیجہ ہے، اس سلسلے میں کچھ کہنا آسان نہیں۔ کیوں کہ ماخذوں میں پروانہ مبارک کی عبارت کے دو بالکل مختلف متن ملتے ہیں۔ بہر حال امام ابو یوسف کی کتاب 'کتاب الخراج' میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے، اور یوں یہ تحریر و کتابت کی دوسری قدیم ترین مثال ہمارے سامنے آتی ہے۔

ایک اور چیز کا ذکر کر کے میں اس بحث کو ختم کروں گا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہجرت کے لیے روانہ ہوتے ہیں تو سراقہ بن مالک کا واقعہ پیش آتا ہے، جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گرفتار کر کے اہلِ مکہ کے سپرد کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن بعض معجزات پیش آئے جن کے باعث سراقہ بن مالک (یہ بعد میں مسلمان ہو گئے تھے) نے معافی مانگی۔ معافی ملی تو اپنے علاقے سے گزر سکنے کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو احسان مندانہ کچھ سہولتوں کی پیشکش کے بعد سراقہ بن مالک نے کہا کہ "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے ایک پروانہ امن دیجیے" رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہمراہیوں میں سے حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے غلام عامر بن فہیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیتے ہیں کہ ایک پروانہ امن لکھو، گویا سفر میں آپ کے ہمراہ اور چیزوں کے علاوہ قلم، دوات اور کاغذ بھی موجود ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مکہ میں لکھنے پڑھنے کا رواج ترقی کرنے لگا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اہمیت سے خاص کر واقف تھے۔ مدینہ آنے کے بعد آپ نے سب سے پہلا کام عبادت گاہ کی تعمیر کے سلسلے میں کیا۔ چنانچہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم، اوس کے علاقہ 'قباء' میں پہنچے تو یہاں پر ایک مسجد بنائی گئی۔ جب قباء سے نکل کر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) بنی خزرج کی شاخ بنو نجار کے علاقے میں آئے تو وہاں کی پرانی مسجد کی توسیع کر کے مسجد

نبوی کی تعمیر ہونے لگی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہائش گاہ کے کمرے بھی تھے۔ اس بڑی مسجد کی تعمیر میں کچھ عرصہ لگا۔ لیکن کچھ ایسے تھے جن کا کوئی گھر نہیں تھا اور وہ رات بھی وہیں گزارتے تھے۔ ان کی تعداد ظاہر ہے گھٹتی بڑھتی رہی ہوگی۔ ان طالب علموں میں ہمیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی نظر آتے ہیں۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہوگا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے صفہ میں کیوں رہتے تھے؟ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے مواخاتی بھائی کے ہاں قیام کیا ہوگا اور ان کے ہاں اتنی جگہ نہ ہوگی کہ ان مواخاتی بھائی اور ان کے خاندان کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی بیوی کے علاوہ اپنے جوان اور بالغ بیٹے کو بھی جگہ دلا سکیں۔ اس کی ایک دوسری توجیہ یہ ہو سکتی ہے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود علم کے شوق کے باعث نہیں چاہتے تھے کہ قباء میں رہیں جو مدینہ سے کئی میل کے فاصلے پر ہے۔ آنے جانے میں کافی وقت لگتا ہے۔ سارا وقت وہ مدینہ میں گزارنا چاہتے ہوں گے تاکہ ہر وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مواعظ سے استفادہ کر سکیں۔ بہر حال وہاں کچھ لوگ ایسے تھے۔ جو صرف دن کو تعلیم پاتے تھے اور کچھ ایسے تھے جو تعلیم بھی پاتے تھے اور رات کو رہتے بھی تھے۔ اس سلسلے میں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ کچھ تو ان چیزوں پر بسر اوقات کرتے تھے، جو انھیں بطور تحفہ دی جاتی تھیں، کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان سے، کبھی مختلف صحابہ کی فیاضیوں کے باعث۔ مثلاً ایک بار کا ذکر ہے کہ اہل صفہ کے اسی آدمیوں کو حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک دن اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی۔ اس سے دو چیزیں ہمیں معلوم ہوتی ہیں ایک تو وہ تعداد جو کم و بیش صفہ میں موجود ہوتی تھی، دوسری یہ کہ ان کے گزر بسر کا کیا انتظام تھا اور وہ کس طرح کھاتے پیتے تھے۔ ان دونوں باتوں کے علاوہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لیے سرکاری خزانے سے امداد فرماتے اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فیاضی کے سبب ان کو مختلف اشیاء ملتی، ایک اور چیز کا بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ دوسروں پر بوجھ بننے کی بجائے خود محنت کرتے تھے۔ یہ محنت اس لیے نہیں ہوتی تھی کہ پیسے جمع کر سکیں یا مالدار بنیں بلکہ صرف اس لیے کہ اپنا سدرمق حاصل کریں اور باقی پورا وقت علم کے حصول میں صرف کریں۔ ایک واقعہ کا ذکر ملتا ہے اور وہ یہ کہ ایک مرتبہ صفہ میں رہنے والے ایک طالب علم کی وفات ہوئی۔ جب اسے غسل دیا گیا تو پتہ چلا کہ اس کے پاس دو دینار ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس پر ناراض ہوئے کہ ایسے شخص کو، جس کے پاس دو دینار جیسی خطیر رقم تھی، خیرات پر پرورش پانے کا کوئی حق نہ تھا۔ بہر حال انسانی فطرت کی ایسی مثالیں بھی ہمیں ملتی ہیں۔ صفہ میں جو تعلیم ہوتی تھی وہ اسلام کی ابتدائی تعلیم تھی، جس کے لیے میں پرائمری کا لفظ استعمال کر سکتا ہوں۔ مدرسہ میں جن چیزوں کی تعلیم ہوتی تھی، اس میں متعدد شعبے، متعدد لوگوں کے سپرد تھے۔ کسی کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ لکھنا پڑھنا سکھائے، کسی کے سپرد یہ کام تھا کہ جو لکھنا پڑھنا سیکھ چکے ہیں، اُنھیں اُس وقت تک کی نازل شدہ قرآنی سورتیں سکھائیں۔ شاید کسی شخص کا یہ کام بھی ہو کہ وہ فقہی احکام، سنت

رسول صلی اللہ وعلیہ وسلم اور نماز عبادات وغیرہ کا درس دے۔ یہ اہتمام خاص طور پر ان نو مسلم لوگوں کے لیے کیا جاتا ہوگا جو وقتاً فوقتاً کچھ عرصے کے لیے مدینے آتے ہوں گے تاکہ اپنے نئے دین کے متعلق کچھ معلومات حاصل کر سکیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے ایک حدیث کا ذکر کیا جو عبدالقیس کے لوگوں کی مدینہ آمد سے متعلق تھی۔ جب یہ لوگ مدینہ آئے تو آپ صلی اللہ وعلیہ وسلم نے اُنھیں انصار کے سپرد کر دیا کہ تم ان لوگوں کی مہمان نوازی کرو۔ صبح کو اُن لوگوں سے پوچھا کہ تمھارے ساتھ تمھارے میزبانوں نے کیسا سلوک کیا؟ انھوں نے جواب دیا کہ اُن لوگوں نے ہمیں کھانے کے لیے نرم روٹی اور سونے کے لیے نرم بستر دیے اور صبح کو اُنھوں نے عبادت کے طریقے، قرآن شریف کی سورتیں اور سنت رسول صلی اللہ وعلیہ وسلم سے متعلق چیزیں سکھائیں یہ اسی بنا پر تھا جو میں نے آپ سے عرض کیا کہ صفہ میں تعلیم کے مختلف شعبے تھے۔ ایک چیز کا امکان ہے اور یقیناً ایسا ہی ہوگا کہ وقتاً فوقتاً خود رسول اللہ صلی اللہ وعلیہ وسلم بھی ان کو درس دیتے ہوں گے۔ اگرچہ آپ صلی اللہ وعلیہ وسلم کی مصروفیات بہت زیادہ تھیں۔ اس کے باوجود آپ صلی اللہ وعلیہ وسلم کو جب بھی فرصت ملتی، آپ صلی اللہ وعلیہ وسلم وہاں درس دیا کرتے تھے اور بہت سے لوگ جنھیں فرصت ہوتی، اس درس میں شریک ہو جاتے۔ ایک دلچسپ حدیث ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ وعلیہ وسلم اپنے حجرہ مبارک سے نکل کر مسجد کے اندر آئے اور دیکھا کہ وہاں دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ تسبیح پڑھنے اور ذکر اذکار کرنے میں مشغول تھا۔ دوسرا گروہ علم حاصل کر رہا تھا۔ حضور صلی اللہ وعلیہ وسلم نے فرمایا اگرچہ دونوں گروہ اچھا کام کر رہے ہیں۔ لیکن وہ گروہ بہتر ہے جو تعلیم کا کام کر رہا ہے۔ پھر آپ بھی اس گروہ میں شامل ہو گئے۔ اس طرح یہ بھی روایت ملتی ہے کہ صفہ کے بعد جلد ہی اور مدرسے قائم ہوئے۔ بلاذری نے لکھا ہے کہ مدینے میں عہد نبوی میں نو مساجد تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ وعلیہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا کہ اپنے محلے کی مسجد میں اپنے ہمسایوں سے تعلیم حاصل کرو۔ سب کے سب مرکزی مسجد میں نہ آیا کریں کیونکہ اس طرح طالب علموں کی تعداد بڑھ جانے کا اندیشہ تھا، جس سے سب کی تعلیم متاثر ہوتی اور ناکافی اساتذہ کے باعث بچوں کی تعلیم پانے کا موقع نا مل سکتا تھا شاید مسافت اور حمل و نقل کا بھی مسئلہ تھا، اسی طرح ہمیں اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ تعلیم دینے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو باہر بھی بھیجا کرتے تھے۔ غالباً ایسا ان علاقوں کے لیے ہوتا ہوگا جہاں کے باشندے رفتہ رفتہ مسلمان ہوتے گئے اور مسلمان ہونے کے بعد مطالبہ کرتے کہ ہماری تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔ غالباً کا لفظ میں اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ ایسا ہی ایک واقعہ ہجرت سے قبل بھی پیش آیا تھا۔ جب خود مدینہ والوں نے بیعت عقبہ میں اسلام قبول کیا تو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی تھی کہ ہمیں ایک معلم دیا جائے تو معصب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجا گیا اور وہ اہلِ مدینہ کو اسلام کی تعلیمات سے روشناس کراتے رہے۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی بات مجھے یاد آتی ہے۔ لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت عقبہ میں مسلمان ہونے والے اہلِ مدینہ کو اس وقت تک

نازل شدہ قرآن شریف کا ایک تحریری نسخہ بھی دیا تھا جسے وہ اپنے محلے کی مسجد میں بآوازِ بلند پڑھا کرتے تھے۔ ہمارے مؤرخ اس میں ایہ اضافہ بھی کرتے ہیں کہ مسجد میں بآوازِ بلند قرآن مجید کی تلاوت کرنے کا آغاز پہلی مرتبہ مدینہ منورہ میں بنی زریق کے ان انصار سے ہوا تھا۔

غرض ایک طرف ہمیں ایسی چیزیں ملتی ہیں جن میں علم کی اہمیت بتانے کے ساتھ ساتھ اس کو حاصل کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ دوسری طرف ایسے انتظامات بھی نظر آتے ہیں جن کے باعث علم کا حصول آسان تر ہو جائے۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹے سے واقعہ کی جانب آپ کی طوجہ منعطف کراؤں گا جس کا میں نے گزشتہ روز بھی ذکر کیا تھا۔ جنگ بدر میں بہت سے کافر قید ہوئے۔ ان قیدیوں میں سے جن کو لکھنا پڑھنا آتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے مالی فدیہ طلب کرنے کی بجائے، یہ فرمایا کہ ان میں سے ہر شخص دس دس مسلمانوں بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھادے۔ تعلیم کے انتظامات کے سلسلے میں یہ واقعہ ولولہ انگیز ہے۔ اسی طرح ایک اور بات پر غور کرنے اور اس سے نتائج استنباط کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ طبری کے بیان کے مطابق جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن بھیجا تو ان کا فریضہ یہ تھا کہ ایک ضلع سے دوسرے ضلع میں اور ایک کمشنری سے دوسری کمشنری میں جائیں اور وہاں تعلیم کا انتظام کریں۔ اس کے علاوہ یمن کے گورنر عمرو بن حزم کی تقرری کے وقت، ان کو جو ہدایت نامہ دیا گیا، اسے بھی تاریخ نے محفوظ کر لیا۔ اس میں ہمیں ٹیکس، انتظامی معاملات اور عدل و انصاف وغیرہ کے متعلق ہدایت کے علاوہ یہ الفاظ بھی ملتے ہیں کہ لوگوں کی تعلیم کا بندوبست کرو۔ گویا گورنر کے فرائض میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ اپنے دائرہ عمل (Jurisdiction) کے اندر رہنے والے لوگوں کی تعلیم کا انتظام کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلیم اسلامی تعلیم ہی ہو گی اور اس کا انتظام صرف مسلمانوں کے لیے ہی کیا جاتا ہو گا، کیوں کہ غیر مسلموں کی تعلیم کی بوجوہ ضرورت ہی نہیں تھی۔ قرآن مجید کے احکام کے مطابق تمام مذہبی گروہوں کو کامل داخلی خود مختاری عطا کی گئی تھی۔ جس طرح غیر مسلم اس خود مختاری کی بنا پر اپنے دیگر معاملات میں آزاد تھے اسی طرح تعلیم کی صورت بھی رہی ہو گی۔ ان حالات میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ غیر مسلموں کی تعلیم کا انتظام اسلامی حکومت کرتی تھی یا نہیں۔ اگر وہ کرتی ہو اس میں کوئی امر مانع بھی نہیں تھا لیکن چونکہ عہدِ نبوی میں ایک خصوصی نظام کے تحت ہر اقلیت کو کامل داخلی خود مختاری عطا کی گئی تھی، اس لیے انھیں اپنی تعلیم کی بھی آزادی تھی اور وہ خود اسے بہتر طور سے انجام بھی دے سکتے تھے۔ مثلاً ایک عیسائی بچے کو اسلامی مدرسہ میں قرآن کی تعلیم دینے والا عالم تو مل جائے گا لیکن انجیل پڑھانے والا استاد میسر نہیں

آ سکے گا۔ اس لیے ان کے حق میں یہی بات زیادہ سود مند تھی کہ ان کا مدرسہ ہی الگ ہو اور وہ خود اپنے مذہب کی تعلیم اپنے ہی اساتذہ کی مدد سے حاصل کریں۔

اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ کبھی کبھی یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کسی علمی مسئلے کے سلسلے میں بھی جھگڑا کرتے۔ اس سے جو بعض نہایت کار آمد نتائج نکلتے ہیں میں ان کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ مثلاً ایک مرتبہ یہودی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک نوجوان جوڑے کو لائے اور کہا کہ ہم نے ان لوگوں کو بدکاری کرتے پایا ہے، آپ کے پاس لائے ہیں تاکہ آپ انہیں سزا دیں۔ اس سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، بجائے اپنی صوابدید سے فیصلہ کرنے کے یا اسلامی قانون نافذ کرنے کے خود ان سے پوچھتے ہیں کہ تمہاری دینی کتاب توریت میں اس کے متعلق کیا احکام ہیں؟ انھوں نے جھوٹ بات بیان کی اور کہا کہ توریت کا حکم یہ ہے کہ ایسے لوگوں کا منہ کالا کر کے انھیں اس طرح گدھے پر بٹھایا جائے کہ ان کے منہ گدھے کی دم کی طرف ہوں، پھر سارے شہر میں ان کی تشہیر کرائی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایسا نہیں ہے۔ توریت کا حکم اس سے مختلف ہے۔ توریت لاؤ۔ چنانچہ توریت لائی گئی۔ اس میں رجم کی سزا نکلی اور اس کے مطابق مجرموں کو رجم کرایا گیا۔ اس کے متعلق مزید لکھا ہے کہ توریت کو پہلے ایک یہودی نے پڑھا اور اس آیت کو چھوڑ دیا جس میں رجم کا ذکر تھا۔ اس پر حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے، جو ایک نو مسلم یہودی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ اس امر پر منعطف کرائی کہ یہاں یہاں کچھ اور آیات بھی ہیں جنھیں یہ چھپا رہا ہے۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ رسول اکرم صلی اللہ وعلیہ وسلم نے اپنے خاص کاتب وحی، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ تم عبرانی رسم الخط سیکھو کیونکہ مجھے آئے دن یہودیوں سے خط وکتابت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اگر ایسی تحریروں کو میں یہودیوں سے پڑھوا کر سنوں تو مجھے ان پر اعتبار نہیں، اس لیے تم خود سیکھ لو۔ دوسرے لفظوں میں اجنبی زبانوں کو سیکھنے اور سکھانے کی طرف رسول اللہ صلی اللہ وعلیہ وسلم نے توجہ فرمائی۔ دوسری زبانوں کے سیکھنے سے سیاسی فوائد بھی حاصل ہو سکتے ہیں اور علمی فوائد بھی۔ علمی فائدے کے متعلق ایک واقعہ ذہن میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما، جو اپنے باپ سے بھی پہلے مسلمان ہوئے۔ نہایت ذہین، دیندار اور متقی نوجوان تھے۔ ساری ساری رات نفل نمازیں پڑھتے۔ انھوں نے روزانہ روضے رکھنے کا عہد کر رکھا تھا۔ ایک مرتبہ یہ آکر رسول اللہ صلی اللہ وعلیہ وسلم سے کہنے لگے میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنی دو انگلیاں چوس رہا ہوں۔ ایک پر شہد اور دوسری پر گھی لگا ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ وعلیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن مجید اور توریت دونوں سے استفادہ کر سکو گے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ بعد کے زمانے میں انھوں نے سریانی زبان کی بھی تعلیم پائی اور بائبل کا ترجمہ سریانی زبان میں

پڑھتے۔ اسی طرح ایک دن وہ قرآن کی تلاوت کیا کرتے اور دوسرے دن توریت کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ غرض اجنبی زبانیں سیکھنے کا کچھ نہ کچھ انتظام ہو چلا تھا۔ لکھا ہے کہ زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو چار پانچ زبانیں آتیں تھیں۔ عربی تو ان کی مادری زبان تھی ہی، اس کے علاوہ انھیں عبرانی، قبطی اور فارسی زبانیں آتی تھی۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ جمل لکھا ہے کہ انھوں نے فارسی زبان بہت جلد اس وقت سیکھ لی جب ایک ایرانی وفد رسول اللہ صلی اللہ وعلیہ وسلم کے پاس یمن سے آیا۔ یہ وفد کچھ دن مدینہ میں مقیم رہا۔ ان لوگوں سے قریبی روابط کے باعث زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اتنی فارسی سیکھ لی کہ اس زبان میں روزمرہ کی گفتگو کر سکیں، ان کی ضرورتیں معلوم کر سکیں اور ان کے مختلف سوالوں کے جواب دے سکیں۔ بہر حال تعلیم کے متعلق ایک طرف ان انتظامات کا پتہ چلتا ہے جو دار السلطنت مدینے منورہ میں کئے گئے، دوسرے دو انتظامات ہیں جو ان علاقوں کے لوگوں کو دین سے واقف کرانے کے لیے کئے گئے جو بہت تیزی سے اسلامی سلطنت میں شامل ہو رہے تھے۔

تعلیم کے متعلق ایک اور پہلو کی جانب آپ کی توجہ منعطف کراؤں گا۔ ویسے یہ میرا استنباط ہے، اس کے لیے میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ وہ امر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ وعلیہ وسلم مختلف علوم کی اہمیت سے واقف تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمان ان علوم کو سیکھیں۔ ان کے لیے الگ الگ درسی کتابوں کی بجائے ایک ہی درسی کتاب دینا پسند فرماتے اور چاہتے ہیں کہ ہر شخص اس درسی کتاب کو ہمیشہ پڑھتا رہے، چاہے اس فن کی چیزوں سے اس کو دلچسپی ہو یا نہیں۔ چنانچہ اگر کوئی شخص قرآن مجید کو بار بار پڑھے تو وہ اپنے فن کی چیزوں کو بھی پڑھے گا اور مجبور ہو گا کہ غیر فن کی چیزوں کو بھی، خواہ سرسری نظر سے ہی سہی، پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کرے اور اس کے لیے ایسی معلومات، جو اگرچہ اس کے لیے اپنے اختصاصی فن سے متعلق نہیں ہیں، کسی بھی وقت سودمند ثابت ہو سکتی ہیں۔ قرآن مجید میں صرف دین و عقائد، عبادات اور متعلقہ اخلاقی چیزوں ہی کا ذکر نہیں ہے بلکہ اس میں بہ کثرت اور علوم بھی نظر آتے ہیں۔ اگر میں توریت کو بنی اسرائیل کی تاریخ کہوں تو اس میں پہلے تمہیدی باب کے بعد، جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے موسیٰ علیہ السلام تک کے حالات بیان کئے گئے ہیں، باقی سب چیز صرف بنی اسرائیل کی تاریخ سے متعلق ہے۔ اسی طرح آپ انجیل کو پڑھیں تو وہ ایک ہی شخص یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمری ہے۔ اس کے بر خلاف قرآن مجید نہ صرف تو عرب کی تاریخ ہے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ وعلیہ وسلم کی سوانح عمری، بلکہ سارے بنی آدم کی تاریخ ہے۔ قرآن مجید میں بے شمار بادشاہوں، نبیوں اور قوموں کے قصے بیان کئے گئے ہیں۔ ان کے ذریعے مسلمانوں کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ وہ ان گزشتہ لوگوں کے اچھے یا برے انجام کو سامنے رکھ کر ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ اپنی زندگی گزاریں۔ ایک مرتبہ میں نے کوشش کی کہ ان مقامات کا شمار کروں جن کا ذکر قرآن

مجید میں آیا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس میں مصر، بابل اور یمن وغیرہ کے علاوہ بہت سے ملکوں کا ذکر ہے۔ اس میں ایک ایسے پیغمبر کا بھی ذکر آیا ہے جسے ہم ہندوستان سے متعلق کہہ سکتے ہیں۔ یہ پیغمبر حضرت ذوالکفل ہیں۔ ان کے متعلق قرآن وحدیث میں تفصیلی صراحت موجود نہیں ہے بعض محدثین ومفسرین نے اس سلسلہ میں اگرچہ لکھا ہے، لیکن وہ قابل اعتماد نہیں۔ ہم میں سے بہت سے لوگوں کے استاد مولانا مناظر احسن گیلانی کہتے تھے کہ غالباً اس سے مراد گوتم بدھ ہے۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے تھے کہ ذوالکفل کے لفظی معنی کفل والے کے ہیں۔ اور کفل 'کپل وستو' کی معرب شکل ہے۔ یہ بنارس کے قریب ایک شہر ہے جس میں گوتم بدھ پیدا ہوئے تھے اس کی مزید تائید کے لیے وہ سورہ "والتین" (95 :1 تا 3) کی طرف اشارہ فرماتے تھے کہ والتین والزیتونین وطور سینین وہذاالبلدالامین میں تمام مفسرین کا کے خیال میں چار پیغمبروں کا ذکر آیا ہے۔ زیتون سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جانب اشارہ کیا گیا ہے جن کو جبل زیتون سے بہت قریبی تعلق رہا اور سینا سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جہاں خدا نے انہیں توریت عطا کی۔ ہذالبلد الامین یعنی محفوظ شہر سے مراد مکہ معظمہ ہے۔ لیکن پہلا لفظ 'والتین' کیا ہے؟ اس مین مفسرین خیال آرائی کرتے رہے۔ بعض لوگوں نے کہا، اس امر سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ بعض نے اس سے کسی اور نبی کی جانب اشارہ مراد لیا۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے نبیوں کی زندگی میں انجیز کی کوئی اہمیت حاصل نہیں رہی۔ جب کہ مولانا مناظر احسن گیلانی فرماتے تھے کہ گوتم بدھ کے ماننے والوں کا متفقہ بیان ہے کہ گوتم بدھ کو جنگلی انجیر کے نیچے نروان حاصل ہوا تھا۔ اس سے وہ استنباط کرتے تھے کہ قرآن مجید میں جہاں دنیا کے تمام بڑے مذاہب کا ذکر ہے۔ وہاں بدھ مت کا بھی ذکر ایک بہت ہی لطیف انداز میں کر دیا گیا ہے۔ گوتم بدھ کے حالات چونکہ عربوں کو تفصیل سے معلوم نہیں تھے لہٰذا اس پر زور نہیں دیا گیا۔

بہر حال ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ قرآن مجید میں مختلف علوم ہیں۔ اس میں تاریخ کا بھی ذکر ہے۔ اس میں ان علوم کا بھی ذکر ملتا ہے جنھیں ہم سائنس کا نام دیتے ہیں۔ مثلاً علمِ نباتات، علم حیوانیات، علم حجر، علم بحر، علم ہئیت یہاں تک کہ علم جنین کا بھی ذکر ملتا ہے۔ قرآن شریف میں علم جنین کی اتنی مفصل تشریحات آئی ہیں کہ ان کا جدید ترین دور تک بھی اثر ہو رہا ہے۔ میں نے کسی وقت آپ سے بیان کیا تھا کہ دو سال قبل پیرس میں ایک کتاب Bible Quran and Science چھپی ہے جو ایک مشہور سرجن بوکائی کی تصنیف ہے۔ بوکائی کو بچوں کی ولادت کے علم سے دلچسپی ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ علم جنین کے متعلق جو تفصیلات قرآن مجید نے دی ہیں، ان کا علم نہ یونان کے مشہور قدیم اطباء کو تھا اور نہ زمانہ حال کے یورپی لوگوں کو ہے، جنھوں نے سالہاسال تک اس موضوع پر ریسرچ کی۔ لیکن اب سے چودہ سو سال قبل، ایک بدوی صلی اللہ وعلیہ وسلم اس کا ذکر کرتا ہے تو یقیناً یہ انسان کا کلام نہیں ہونا چاہئے۔

قرآن کی اسی بات سے متاثر ہو کر اب سے کوئی دو ماہ پہلے بو کائی نے اپنے مسلمان ہونے کا بھی اعلان کر دیا ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں ہمیں سمندری طوفان کا ذکر بھی ملتا ہے، جہاز زانی، موتی اور مرجان کا بھی خاصا ذکر ملتا ہے۔

غرض میرا گمان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ وعلیہ وسلم چاہتے تھے کہ ہر مسلمان کو کچھ تو تعلیم بنیادی دی جائے جو لازمی ہو اور دیگر علوم کے بارے میں بھی اس کے پاس کچھ نہ کچھ معلومات ہوں جو کسی بھی وقت اس کے کام آسکتی ہیں۔ اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ قرآن مجید کو پڑھو، کیونکہ اس میں تقریباً تمام علوم کا ذکر کیا گیا ہے۔ مجھے اپنے اس لیکچر کو اب یہیں روکنا پڑے گا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس قدر معلومات عہدِ نبوی کے تعلیمی انتظامات کے متعلق کافی ہیں۔ اب صرف ایک چھوٹا سا جُز باقی ہے اور عہدِ نبوی میں علوم کی سرپرستی سے متعلق ہے، جس کے بارے میں کچھ زیادہ آپ سے عرض نہیں کر سکوں گا، صرف چند باتوں پر اکتفا کروں گا۔ اس کے بعد آپ کے سوالات ہوں گے تو ان کے ذریعہ اپنے بیان کی کوتاہیوں کی تلافی کی کوشش کروں گا۔

عہدِ نبویؐ میں علوم وفنون زیادہ نہیں تھے لیکن جو فنون تھے، ترقی پزیر تھے اور ان کی ضرورت بھی تھی۔ ان میں سے ایک چیز طبابت ہے۔ اس کے متعلق ہمیں بہت سی معلومات ملتی ہیں۔ عہدِ نبوی میں طبیبوں کی حالت اور جراحی کرنے والے سرجنوں کے حالات پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اسی طرح ایک حدیث میں ذکر ہے کہ ایک مرتبہ ایک صحابی بیمار ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کو جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ تمھارے محلے یا قبیلے میں کوئی طبیب ہے؟ جواب میں دو نام بتائے جاتے ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ وعلیہ وسلم فرماتے ہیں ان میں سے جو ماہر تر ہو اسے بلاؤ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس بات کا بھی خیال رکھا کہ علم میں Specialization تخصص پیدا کریں اور ماہروں سے علاج کرائیں۔ اس لوگوں کو ماہر بننے کی ترغیب بھی ملتی ہے۔ اسی طرح اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ وعلیہ وسلم طبابت سے ناواقف شخص کو اس کی اجازت دینا نہیں چاہتے کہ وہ طبیب بن جائے۔ ایک حدیث کے الفاظ ہیں کہ جس شخص کو علم طب سے کوئی واقفیت نہیں، اگر وہ علاج کرے تو اسے سزا دی جائے گی کیونکہ اس کے اناڑی پن سے لوگوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس طرح کی اور مثالیں بھی ملتی ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ نبوی میں علم طب کی کافی اہمیت سمجھی جاتی تھی اور علاج سادہ مفرودات کے ذریعے ہوتا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بے شمار نسخے منسوب ہیں۔ لوگ آکر آپ سے کہتے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے یہ تکلیف ہے تو آپ اس کے لیے تجویز فرماتے کے فلاں چیز استعمال کرو وغیرہ۔ اب طبِ نبوی کا پورے کا پورا انتظام اس طرح کی احادیث پر مشتمل ہو کر بن چکا ہے۔ زیادہ نہیں تو اس موضوع پر پندرہ بیس پرانی کتابیں میں دیکھ چکا ہوں۔

دوسرا علم جس کی بڑی اہمیت سمجھی جاتی تھی اور جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی تفصیل سے ہے، وہ علم ہئیت ہے۔ اس کے فوائد خود قرآن حکیم میں بھی بتائے گئے ہیں۔ اس علم کے ذریعے رات کے وقت مسافر اپنا راستہ معلوم کر سکتا ہے۔ اس کے ذریعے سے اوقات کا اور حج کے زمانے کا تعین ہو گا۔ علم ہئیت کی طرف بڑی توجہ کی جاتی تھی اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے بڑی اچھی واقفیت تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ مدینہ میں ہجرت کے بعد جب مسجد نبوی کی تعمیر ہوئی یا مسجد قباء تعمیر کی گئی تو قبلہ کے رخ کے تعین کا سوال تھا۔ محض اندازے کی بنا پر قبلے کا تعین نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی علم ہئیت سے واقفیت کی بنا پر کوئی دشواری پیدا نہیں ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس سے کئی بار گزر چکے تھے۔ تجارت کے لیے جب آپ بصریٰ (دمشق) تشریف لے گئے تھے تو بیت المقدس سے بھی آگے تک گئے تھے۔ یہ سارا سفر اونٹوں پر ہوتا تھا اور زیادہ تر رات کے وقت ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ اپنے تجربات کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ بیت المقدس کی جانب جانے والوں کو کس ستارے کی مدد سے آگے بڑھنا چاہئے۔ اور اسی طرح آپ کو بھی یہ معلوم تھا کہ کس ستارے کی مدد سے رات کے وقت بیت المقدس سے مکے اور مدینے جانے والوں کا اپنا سفر کرنا پڑتا ہے۔ اس علم کی بنا پر آپ نے بغیر کسی خاص دشواری کے قبلہ کے رخ کا تعین فرمالیا۔ اس طرح کی اور چیزیں بھی ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو علم سیکھنے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ اس کا احادیث میں بھی ذکر ملتا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ لوگوں کو اپنے انساب سیکھنے چاہئیں۔ یعنی اپنے شجرہائے نسب معلوم کرنے چاہئیں۔ ان کی ایک عملی اہمیت بھی ہے کہ کوئی محرم سے نکاح نہ کرے۔ عرب کے قبائلی نظام میں جس میں فلاں بن فلاں کا بہت خیال رکھا جاتا تھا، اس بات کی خاص اہمیت تھی۔ اس طرح کی چیزیں صرف تاریخی معلومات ہی کے لیے نہیں بلکہ دیگر امور کے لیے بھی کارآمد ہو سکتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عہدِ نبوی میں کچھ علوم پائے جاتے تھے جن کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سرپرستی فرماتے تھے اور کچھ چیزیں مثلاً عسکریات وغیرہ کے سلسلے میں لوگوں کو ترغیب و تشویق دلاتے تھے۔ اسی پر آج کا موضوع ختم کرتا ہوں۔

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

## سوالات و جوابات

برادران کرام! خواہران محترم! السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

آج بہت سے سوالات آئے ہیں، میں کوشش کروں گا کہ ہر سوال کا مختصراً جواب دوں لیکن اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی تقریر کا کچھ حصہ مکمل کرلوں۔ دو نکتوں کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جو ممکن ہے، آپ کے لیے دلچسپی کا باعث ہوں۔ اوالاً میں نے آپ سے جو قصہ بیان کیا کہ جنگ بدر کے قیدیوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کا کام لیا تھا۔ اس واقعے کو ایک محدث نے اس عنوان کے تحت درج کیا ہے کہ کسی مشرک کو مسلمانوں کی تعلیم کے لیے استاد بنانے کا جواز (جواز المعلم المشرك) کیونکہ مکہ والے مشرک اور کافر تھے، اور مسلمان بچوں کی تعلیم کے لیے ان کا انتخاب کیا گیا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلموں سے بھی علم سیکھنا جائز ہے اور اس میں شرعاً کوئی امر مانع نہیں ہے۔

دوسرا نکتہ معمولی ہے، میں آپ سے ذکر کر رہا تھا کہ قرآن مجید میں بہت سے علوم ہیں۔ اگر قرآن کو اس کی تفسیر کے ساتھ پڑھیں تو انسان کو بہت سے علوم میں شدبد حاصل ہو جاتی ہے مثلاً قرآن مجید میں مختلف مذاہب کے تقابلی مطالعے کے سلسلے میں بہت سے عقائد کا ذکر آیا ہے خواہ یہ ذکر ان کی تردید کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو لہٰذا قرآن مجید پڑھنے والے کا فریضہ یہ بھی ہوگا کہ تفسیر یا دوسرے وسائل کے ذریعہ سے ان مختلف ادیان کے متعلق اپنی معلومات میں اضافہ کرے ایسی معلومات اس کے لیے تبلیغ دین کے سلسلے میں بھی کارآمد ہو سکتی ہیں اور دوسرے مذاہب کے لوگوں سے مناظرے کے وقت بھی۔ مثلاً دوسرے مذاہب کے لوگ سوال یا اعتراض کریں تو ان کے مذاہب سے واقفیت بعض اوقات بڑی کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ لطیفے کے طور پر عرض کروں گا کہ ایک مرتبہ ایک فرانسیسی نن نے جو الحمدللہ اب حاجی طاہرہ کے نام سے مسلمان ہو چکی ہیں، تعداد ازدواج کے متعلق اعتراض کیا میں اسے جواب دیا کہ "اگر اور لوگ مجھ پر یہ اعتراض کریں تو قبول، لیکن مجھے تم سے اس اعتراض کی توقع نہیں تھی کیوں کہ تمھارے اپنے عیسائی مذہب

کے مطابق نن خدا کی بیوی کہلاتی ہے۔ اس طرح تمھارے شوہر کی تو لاکھوں بیویاں ہیں جب کہ تم صرف چار بیویوں کے باعث مجھ پر معترض ہو۔" اس بات کا اس کے دل پر اتنا اثر ہوا کہ دو سال کی خط و کتابت کے بعد اس نے اپنا کانونٹ چھوڑ دیا اور مسلمان ہو گئی۔ بہر حال دوسرے مذاہب سے واقفیت کے باعث بعض اوقات بہت فائدہ ہوتا ہے۔ اب میں آپ کے جانب سے کئے ہوئے سوالات کا جواب دوں گا۔

**سوال 1:** حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو توریت پڑھتے دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ متغیر ہو گیا تھا لیکن عبد اللہ بن عمرو بن العاص کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اس کی اجازت دی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

**جواب:** اس سے پہلے کہ میں سوال سے متعلق اپنے خیالات ظاہر کروں، میں اس میں کچھ اضافہ کروں گا اور بھی لوگوں کو توریت پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی مثلاً حضرت عبد اللہ بن سلام کو، جو پہلے یہودی تھے، پھر مسلمان ہوئے۔ ان کے متعلق صراحت سے مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اجازت دی کہ ایک دن توریت پڑھو اور ایک دن قرآن مجید تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کیوں روکا یہ بتانا قدرے مشکل ہے۔ اس سلسلے میں دو باتیں ذہن میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ توریت پڑھنے کی اجازت خصوصی ہو سکتی ہے جو صرف ان لوگوں کو دی جاسکتی ہے جن کی معلومات اسلام کے متعلق کافی ہوں، جن کا ایمان راسخ ہو۔ اور جن کو غیر مذاہب کی کتابیں پڑھنے سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو ان حالات میں آپ پوچھیں گے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کیوں منع کیا گیا۔ اس سلسلسے میں عرض کروں گا کہ ایک تو ممانعت کا یہ واقعہ اسلام کے ابتدائی زمانے سے تعلق رکھتا ہے، جبکہ عبد اللہ بن عمرو کو اجازت دی گئی ہے وہ ذرا بعد کی چیز ہے۔ ان کے زمانے تک قرآن کا بڑا حصہ نازل ہو چکا تھا وہ بڑے قابل نوجوان تھے۔ ان کے متعلق یہ اطمینان تھا کہ وہ اسلام پر مستحکم ہیں۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے توریت پڑھنے پر اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہتے تو باقی لوگ اسے اپنے لیے جواز بنا لیتے اور لوگ اسے اپنے لیے اجازت تصور کرتے حالانکہ یہ اجازت سب لوگوں کو نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس سوال کے سلسلے میں ایک جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عہدِ نبوی میں بعض ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ شروع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک چیز سے منع فرماتے ہیں لیکن کچھ عرصے بعد اس کی اجازت دے دیتے ہیں۔ مثلاً ایک مشہور حدیث ہے کہ "میں نے تم کو قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا' اب تم زیارت کے لیے جاسکتے ہو" اس کے سوا میں کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے کوئی وجہ آپ کے ذہن میں آئی ہو۔

**سوال2:** بیعت عقبہ میں دیا جانے والا قرآن مجید کا نسخہ مدینے کی مسجد میں رکھا گیا تھا، کیا مدینے میں مسجدِ نبوی کے علاوہ بھی مساجد تھیں؟

**جواب:** جی ہاں، مسجدیں تھیں اور بہت سی تھیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیعت عقبہ میں کوئی بارہ قبائل کے لوگ مسلمان ہوئے تھے۔ جن میں سے تین شاید اوس کے اور نو خزرج کے تھے چونکہ اوس اور خزرج میں جھگڑے تھے اس لیے کوئی توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ ان کی مسجد ایک ہی ہو شہر بڑا تھا اور اس کا پتہ بھی چلتا ہے کہ بہت سی مساجد تھیں لیکن ان کی صحیح تعداد بتانا دشوار ہے۔ ہمیں مسعودی کی تاریخ مدینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس مقام پر مسجد بنائی گئی تو وہاں دراصل ایک نئی مسجد بنانے کی بجائے حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کی پرانی مسجد ہی میں توسیع کی گئی تھی اور اس پرانی مسجد میں صرف قبلہ بنو نجار کے مسلمان نماز پڑھتے تھے۔[2] ممکن ہے ان کی تعداد پندرہ بیس رہی ہو لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد اس قبیلے کے علاوہ اور لوگ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے آنے لگے تو وہ چھوٹی مسجد ناکافی ہوگئی، چنانچہ اس کی توسیع کی گئی۔ یہی مسجد نبوی کے نام سے مشہور ہے۔ بیعت عقبہ کے وقت کا قرآن مجید مسجد بنی زریق میں رہا۔

**سوال3:** پچھلے کسی لیکچر میں آپ نے موسیقی کے بارے میں فرمایا کہ اسلام میں اس کی اجازت ہے۔ کیا ساز کی بھی اجازت ہے، جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں آلاتِ مزامیر کو توڑنے کے لیے آیا ہوں۔

**جواب:** آپ مجھے اس حدیث کا حوالہ دیں اگر حدیث صحیح ہوئی تو میں قبول کرنے کے لیے پوری طرح آمادہ ہوں۔ باقی رہے ساز، تو میری موسیقی دانی کا یہ عالم ہے کہ مجھے علم نہیں کہ ساز کسے کہتے ہیں؟

**سوال4:** دوسرے علوم کی طرح علم نجوم بھی ایک علم ہے اس علم کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر واضح کریں۔ فال نکالنے اور ہاتھ دکھانے وغیرہ کو بھی مدنظر رکھیں؟

---

2 ممکن ہے کہ یہ کوئی عمارت نہیں محض ایک احاطہ ہو۔ خود مسجد نبوی میں شروع میں چھت نہ تھی۔ جب جمعہ اور ظہر کے وقت نمازیوں کو دھوپ سے تکلیف ہونے لگی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھت ڈلوائی۔

**جواب:** جس علم نجوم کا حدیث میں ذکر ہے اسے ہم Astronomy کہہ سکتے ہیں۔ یہ وہ نہیں ہے جسے Astrology کہتے ہیں۔ اس کے متعلق صراحت کے ساتھ بعض حدیثوں میں ذکر آتا ہے جو لوگ علم نجوم کی اساس پر کچھ بیان کرتے ہیں وہ ایک سچی بات اور ہزار جھوٹی باتیں کرتے ہیں۔ اس کی توجیہ یوں کی جاتی ہے کہ بعض جن آکر انھیں معلومات فراہم کرتے ہیں لیکن یہ 'جن' خود کس طرح علم حاصل کرتے ہیں؟ وہ آسمان کی طرف جاتے ہیں اور وہاں سے کبھی کبھی آسمان کی کوئی چیز ان کے کان میں پڑ جاتی ہے اور وہ زمین پر آکر اپنے معتقدین کو ایک سچ میں ہزار جھوٹ ملا کر بیان کرتے ہیں۔ غرض وجہ جو بھی ہو اس بیان کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ علم نجوم کو Astrology کے معنی میں اسلام میں کوئی مقبولیت حاصل نہیں ہے۔ فال نکال کر حوصلہ افزائی کرنا بارہا خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے خاص کر قبائل کے ناموں کی اساس پر یعنی دو راستے ہوں، ایک پر پڑنے والے قبیلے کا نام اچھے معنی رکھتا تو ادھر جاتے، برا ہو تو اسے ترک فرمادیتے ہاتھ دکھانے (chiromancy Palmistry) میں ہتھیلی کی لکیروں کی اساس پر رائے زنی کی جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی دو آدمیوں کی ہتھیلیوں کی لکیریں یکساں نہیں ہوتیں۔ انگھوٹے کے نشان کا بھی یہی حال ہے اور اسے مغربی ممالک میں توشناخت کے لیے قانونی قبولیت بھی حاصل ہے۔ ہاتھ بتانا دل بہلائی کی حد تک ہو تو میری دانست میں اس کی کوئی شرعی ممانعت نہ ہوگی، ایک لطیفہ عرض کرتا چلوں۔ ایک مرتبہ پیرس میں میرا ہاتھ دیکھ کر کسی نے کہا تمھیں دو بیویاں ہونی چاہیں ۔ دوسرے نے کہا تم وزیر اعظم بنوگے۔ ان میں سے کوئی ایک بات بھی اب تک تحقیق پزیر نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ مجھے اس علم پر اعتقاد نہیں۔ یہ کم و بیش خواب کی تعبیروں کی طرح کی چیز ہے۔

**سوال 5:** کیا وجہ ہے کہ دورِ نبوی اور اس کے بعد کے مدارس زیادہ تر دنیوی تعلیم کے لیے وقف تھے؟

**جواب:** مجھے اس کا ثبوت چاہئے۔ میں نہیں جانتا کہ ایسا ہی تھا۔ اس کے بر خلاف جتنے بھی مدارس تھے ان میں دینی تعلیم ہی ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر بغداد کا مدرسہ نظامیہ جس کی غزالی نے بھی صدارت کی تھی، وہاں دنیوی تعلیم و علوم کا کوئی ذکر نہیں ملتا، دینی علوم ہی ملتے ہیں۔ دنیوی علوم کو چھوڑ دیا گیا تھا۔ مثلاً میں نانبائی ہوں یا لوہار اور سنار وغیرہ ہوں تو میں ہی اپنے بچے کو اس فن کی تعلیم دے دیتا ہوں۔ آج بھی رواج ہے کہ اگر کوئی اجنبی میرے پاس آئے تو میں اپنے فن کی ساری باتیں شائد اسے نہیں بتاؤں گا، لیکن اپنے بچے سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ اسی لیے پرانے زمانے میں حکومت نے اس میں دلچسپی لینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ایسا کرنے کی کوئی ممانعت تھی۔ اگر آج کوئی اسلامی حکومت پیشہ وارانہ تعلیم کے مدارس اپنی نگرانی میں قائم کرنا چاہے تو اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے، بلکہ ایک لحاظ سے بہتر ہے کہ یہ تعلیم بھی بغیر کسی دشواری کے سارے بچوں کو حاصل ہوگی اور طالب علموں کو

ایسے نامعقول اساتذہ سے نجات ملے گی جو کام کی باتیں اجنبی طالبِ علموں سے چھپاتے ہیں۔ ایسے اساتذہ کے بارے میں مجھے ایک حدیث یاد آرہی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص علم کو چھپائے، قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی لگام دی جائے گی۔" لیکن ظاہر ہے کہ آخرت کے خیال کو بعض لوگ طاق میں رکھنے کے قابل سمجھتے ہیں، عمل کرنے کے قابل نہیں۔

**سوال6:** آپ نے ابھی فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مریض آتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے حالات سن کر مرض کے مطابق کوئی دوا یا غذا علاج کے طور پر تجویز فرمادیتے۔ ایسی دوائیں یا غذائیں چند صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنھم نے بھی نوٹ کیں؟

**جواب:** یہ آخری جُز میں نے نہیں کہا۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنھم نے اس کی روایت کی تاکہ اس کے ذریعے سے حدیث کی کتابوں میں اس کا ذکر آئے۔ لیکن صحابہ نے اس پر کتابیں نہیں لکھیں البتہ بعد کے زمانے میں بعض لوگوں نے طب نبوی کے نام سے حدیث سے حاصل ہونے والی ایسی معلومات کو جمع کر کے کتابی صورت دیدی۔ ان کتابوں کے نام آپ کو "کشف الظنون" میں مل جائیں گے اور ایسے مؤلفوں کی تعداد دس بارہ تک ہے۔ لیکن چونکہ یہ میرے فن کی چیز نہیں اس لیے میں نے یہ نام یاد نہیں رکھے۔ ایک مرتبہ جمع کیے، اور پھر بھول گیا۔ معذرت چاہتا ہوں۔

**سوال7:** کیا اسلام میں مخلوط تعلیم کی اجازت ہے اور اگر ہے تو اسلام کہاں تک اس کی اجازت دیتا ہے؟

**جواب:** اسلام کے ابتدائی زمانے میں مسجد نبوی میں مرد بھی ہوتے تھے اور عورتیں بھی۔ ممکن ہے ان کے بیٹھنے کی جگہ الگ الگ ہو لیکن اس مقام پر، جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تقریر فرماتے، دونوں کے لیے بیک وقت استفادہ کرنے کا امکان تھا۔ اس سے استنباط کیا جاسکتا ہے کہ اسکول و کالج میں اس طرح کا انتظام کیا جاسکے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی نشستیں جدا جدا ہوں تو میرے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔ خاص طور پر اگر کسی فن کا ماہر صرف ایک عورت ہو یا صرف ایک مرد ہو تو اس سے دونوں کو استفادہ کرنا چاہئیے، لڑکوں کو بھی لڑکیوں کو بھی۔ اس کے سوا کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ دونوں کی تعلیم کا بیک وقت انتظام ہوسکے۔ مثلاً غور کیجئے کہ "کتاب الاموال" علم فینانس جیز ٹیکنکل چیز کی ایک پرانی کتاب ابوعبید قاسم کی ہے۔ اس کی روایت کرنے والوں کی فہرست میں سب سے نمایاں نام ایک عورت کا ہے۔ وہ اپنے گھر میں اس کا درس دیا کرتی اور اس درس کو سننے کے لیے مرد بھی آیا کرتے تھے۔ اس کا انتظام کہ مرد اور عورتیں اکھٹے درس میں شریک ہوں، کیسے ہوتا تھا مجھے معلوم نہیں۔ لیکن اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک ہی استاد سے مرد اور

عورت دونوں استفادہ کرسکتے ہیں۔ اس طرح قرآن مجید (33:55) کا یہ فرمان کہ جب تم ازدواج مطہرات سے کوئی چیز پوچھنا چاہو تو پردے کے پیچھے سے پوچھو۔ ظاہر ہے کہ پردے کے پیچھے سے سوال کرنے کی ضرورت صرف مردوں کو ہی پیش آسکتی تھی، خواتین کے لیے اس کی ضرورت نہیں۔ ان مختلف پہلوؤں کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ ضرورت اور حالات پر منحصر ہے کہ اگر دونوں کے لیے الگ الگ مدرسے اور کالج بن سکتے ہیں تو بہت بہتر ورنہ پھر تعلیم کا انتظام ایک ہی جگہ بھی ہو سکتا ہے۔

**سوال8:** ہمارے ملکی وسائل کے مطابق عورتوں کی اتنی یونیورسٹیاں قائم نہیں کی جاسکتیں جتنی مردوں کی ہیں۔ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے علم کا حصول فرض ہے ان حالات میں اسلامی نقطہ نظر سے ان مسائل کا کیا حل ہو گا؟

**جواب:** میرا تاثر یہ ہے کہ لڑکیوں کی بڑی اکثریت اس قدر تعلیم پانے کی خواہشمند نہیں ہوتی جس طرح لڑکا تعلیم حاصل کرنا چاہے گا۔ اس لیے لڑکیوں کو عام طور پر مڈل اسکول یا ہائی اسکول تک تعلیم، ان کی ضروریات کے مطابق دی جائے کیونکہ اس کے بعد ان کی شادی ہو جاتی ہے اور انھیں اپنے گھریلو کام کاج میں مشغول ہو جانا پڑتا ہے جن لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم پانے کی ضرورت ہے، تو میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ انتظام کو ترقی دی جاسکتی ہے۔ اور خالص زنانہ یونیورسٹیاں نہ بھی بن سکیں تو بھی ان کی تعلیم کا ایسا بندوبست کیا جاسکتا ہے کہ وہ قباحتیں پیدا نہ ہوں جو اب پیش آتی رہتی ہیں۔

**سوال9:** علمِ فلکیات والے کہتے ہیں کہ ستاروں کا اثر انسان کی عملی زندگی پر بہت گہرا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں مسلمان ہوتے ہوئے ہمیں نجومیوں کی باتوں پر کہاں تک یقین کرنا چاہیئے؟ اور اس طرح ہاتھوں اور زیورات میں استعمال ہونے پتھروں کے بارے میں بھی مہربانی فرما کر وضاحت کر دیں۔

**جواب:** فلکیات کے دو پہلو ابھی ایک دوسرے سوال کے سلسلے میں عرض کر چکا ہوں، اسٹرانومی اور اسٹرالوجی میں فرق کیجئے۔ اسٹرانومی بہت اچھی چیز ہے۔ اس کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے اور اسٹرالوجی کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ اعتماد کرنے کی چیز نہیں ہے۔ کبھی کبھی اسٹرالوجی کے ماہر سچی بات ضرور کہہ دیتے ہیں لیکن وہ عام طور پر ایک من گھڑت چیز ہوتی ہے۔ خیال فرمایئے کہ یہ نجومی مجھ سے میری مستقبل کی زندگی ضرور بیان کرتے ہے لیکن خود اپنی زندگی کے متعلق کبھی نہیں سوچتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ بیچارے تمام عمر مفلس ہی رہتے ہیں اور بھیک کی طرح لوگوں سے کچھ پیسے مانگتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے ایک سبق

ہے کہ ان کی ان باتوں پر یقین نہ کریں۔ جو ہمارے سامنے ہمارے متعلق بیان کرتے ہیں، یہ بات کہ ستاروں کا اثر انسانی زندگی پر ہوتا ہے، ممکن ہے ایسا ہوتا ہو کیونکہ ہمیں بعض اوقات مجبور ہو جانا پڑتا ہے کہ ایسی نظر نہ آنے والی چیزوں پر ایمان لائیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سب سمجھ میں نہ آنے والی باتیں ستاروں کے اثرات ہوتے ہیں بلکہ یہ کہ بعض اوقات غیر مرئی اشیاء کو ماننے پر مجبور ہو جانا پڑتا ہے۔ ایک مثال دیتا ہوں کہ میرا منشاء واضح ہو۔ چند مہینے کی بات ہے کہ ایک عیسائی انجمن نے پیرس میں مجھے ایک جلسے میں شرکت کی دعوت دی اور وہاں ایک فرانسیسی عیسائی عورت نے مجھ سے سوال کیا کہ آج کل مسلمانوں کے ہاں دینی عبادات کا کیا حال ہے؟ میں نے کہا کچھ عرصہ پہلے پیرس کے مسلمان نماز روزے پر کم توجہ دیتے تھے اب ان میں روز افزوں شوق نظر آتا ہے۔ اس نے کہا کہ ہمارے یہاں بھی یہی حال ہے۔ پہلے گرجے گھر خالی رہتے تھے، اب گرجہ میں جگہ نہیں ملتی۔ اس کی کیا توجیہ کریں گے؟ اسے سوائے ستاروں کی گردش کے اثر کے اور کیا کہا جاسکتا ہے؟ اس کے سوا اور کوئی جواب میری سمجھ میں نہیں آتا۔ ہاں اسے اللہ کا فضل قرار دیا جاسکتا ہے اور اگر ہم اپنے فرائض و واجبات سے غافل ہوں تو اسے اللہ کا غضب کہا جاسکتا ہے۔

ستاروں کے اثرات کے سلسلے میں بچہ بچہ جانتا دیکھتا ہے کہ سورج کی گردش کے مطابق گرمی، سردی، بارش، خزاں، بہار کے موسم آتے ہیں؛ چاند کی گردش سے سمندر میں مدوجذر (جوار بھاٹا) آتا ہے۔ میں نے کہیں پڑھا ہے کہ بعض بیماریوں جنون وغیرہ کے جوش میں اس سے شدت یا خفت بھی مشاہدے میں آتی ہے۔ دیگر کروڑوں ستاروں کے مجموعی اثرات اور ان ستاروں کے قران یعنی اجتماع کے مخلوط اثرات کیا پڑتے ہیں، اس بارے میں ابھی ہماری معلومات صفر سے بھی کم ہیں۔ لیکن جیسا کہ حدیث شریف میں صراحت ہے "جو کہے گا کہ فلاں ستارے نے اپنے طلوع (نوء) کے باعث یہ اثر ڈالا ہے تو وہ کفر ہے' کہنا یہ چاہیے کہ اللہ نے اس میں تاثیر پیدا کی ہے"۔ ہیرے جواہرات کے متعلق اسلام میں کوئی ممانعت نہیں، اور ان "پتھروں" پر زکات بھی نہیں ہے، ممکن ہے کہ ان پتھروں کے پہننے والے (یا والی) پر بھی ان پتھروں کے اثرات ہوتے ہوں۔

**سوال 10:** آپ نے پہلے بھی فرمایا تھا اور آج بھی ذکر کیا ہے کہ مہاتما بدھ غالباً نبی تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ نبی بھیجے ہیں۔ یہی سوال سری کشن کے بارے میں بھی کیا جاسکتا ہے۔ ہندوؤں نے انھیں جس رنگ میں پیش کیا ہے وہ ایک الگ بات ہے۔ مگر در حقیقت سری کشن ایک اوتار تھے اور وحدانیت پر یقین رکھتے تھے۔ کسی جگہ پڑھا ہے کہ کورو و پانڈوؤں کی لڑائی سے پہلے سری کشن نے خدا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واسطہ دے کر پانڈوؤں کے لیے دعا مانگی تھی۔ بعد میں پانڈوؤں کو فتح بھی ہوئی۔ ایسی دعا جس میں بہت بعد کے نبی اور ان کے صحابی کا ذکر موجود ہو کوئی نبی ہی مانگ سکتا ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

**جواب:** میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واسطہ دے کر سری کشن جی نے دعا کی ہو۔ ویسے یہ بات میرے علم میں ہو بھی تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ میں نے گوتم بدھ کے نبی ہونے سے متعلق کچھ اشارے کیے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں کسی اور کی نبوت سے انکار کرتا ہوں۔ سری کشن جی بھی نبی ہو سکتے ہیں۔ زردشت بھی نبی ہو سکتے ہیں، اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ لیکن ایسی تمام صورتوں میں جب تک قرآن و حدیث میں انکا نام نہ آیا ہو تو ہم یقین نہیں کر سکتے۔

**سوال 11:** جب تک عقائد صحیح نہ ہوں احکام شریعت سے آگاہی فائدہ مند نہیں۔ جب تک یہ دونوں نہ ہو تب تک قلب کی صفائی ممکن نہیں ہے۔ ہمارا اللہ ایک، رسول ایک، قرآن ایک اور دین ایک۔ مگر ہمارے علمائے اکرام نے متعدد فرقے بنائے ہوئے ہیں مثلاً بریلوی، دیوبندی وغیرہ۔ ہر عالم ہم ان پڑھوں کو "واعتصموا بحبل الله جمعیا ولا تفرقوا (قرآن 3:103)" کی ترغیب و تبلیغ بھی کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ فرقے بھی خود عالموں نے بنائے ہیں۔ کیا اس آیت کا ان علماء پر اطلاق نہیں ہوتا؟ میرا ایک دوست ان فرقوں سے تنگ آکر طنزیہ یہ کہا کرتا ہے کہ میں عیسائی بننا چاہتا ہوں کیونکہ عیسائیت میں کوئی فرقہ نہیں آپ یہ فرمائیں کہ فرقہ پرستی کا یہ مرض علمائے کرام کے اندر کیوں پھیل رہا ہے؟

**جواب:** سوال کے دوسرے جُز کا میں پہلے جواب دوں گا کہ عیسائیت میں کوئی فرقہ نہیں ہے۔ میں نے جرمن زبان میں لکھی گئی ایک کتاب دیکھی ہے جس میں بارہ سو عیسائی فرقوں کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے یہ دوست عیسائی بن کر مایوس ہی ہوں گے کہ اسلام ہی بہتر تھا کہ وہاں شاید صرف بارہ ہی فرقے ہیں۔ ویسے فرقہ بندی کا حل میرے نزدیک ایک ہی ہے کہ آپ دوسروں پر نہ جائیں اور اپنے پر توجہ دیں۔ آپ خود فرقہ پرستی کے مرض میں مبتلا نہ ہوں، اپنے آپ کو صد فی صد درست اور دوسروں کو بلکل غلط نہ کہیں۔ دوسروں کو ان کے خدا لے سپرد کر دیجئے۔ وہ اپنے اعمال اور عقائد کے بارے میں براہ راست خود جواب دے لیں گے۔ فرقہ بندی اسی طرح ختم ہو سکتی ہے۔ جن لوگوں کو لکھنا پڑھنا آتا ہے ان کے لیے اپنے فرائض معلوم کرنے کے لیے آج بہت آسانی سے وسائل مہیا ہو جاتے ہیں۔ اسلام کی بنیادی چیزوں کے متعلق بے شمار کتابیں ہیں۔ قرآن مجید کے تراجم موجود ہیں۔ حدیثون کے مجموعے موجود ہیں۔ میرے خیال میں یہ کام اب تو بہت آسانی سے ہو سکتا ہے کہ ہم فرقہ بندی میں مبتلا نہ ہوں اور آپس کی لڑائی سے محفوظ رہیں۔

**سوال12:** کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد کسی انسان کی نجات کلمہ طیبہ پڑھے بغیر ممکن ہے؟ اگر کوئی شخص لوگوں کے ساتھ بہت زیادہ بھلائی کے ساتھ پیش آنے والا ہو تو کیا حکم ہے؟

**جواب:** اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید کی (150:4) ایک آیت ہے، جس میں صراحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول میں تفریق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ایک پر ایمان لاتے ہیں، دوسرے پر نہیں لاتے تو وہ مسلمان نہیں کافر ہیں۔ ان حالات میں ہم آپ کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ جو شخص صرف اخلاق حسنہ پر عامل ہے اس کی نجات ہو جائے اس کے بر خلاف۔ اللہ کا، جو نجات عطا کرنے والا ہے، حکم ہے کہ تم میرے بھیجے ہوئے نبی پر ایمان لاؤ۔ اس حکم کی تعمیل ضروری ہے ایک آدھ استثناء کی صورت موجود ہے۔ مثلاً کسی شخص کو نبی کی بعثت کی اطلاع نہ ہوئی ہو۔ اس کا امکان آج بھی ہے۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی اطلاع قطبِ شمالی و جنوبی کے لوگوں تک ہمارے مبلغین کی کوشش کے باوجود نہیں پہنچی۔ ایسے لوگوں کی حد تک یہ کہنا کہ ان پر اسلام لانا واجب ہے یا نہیں؟ یہ سوال حل طلب ہو جاتا ہے۔ میں یہ کہوں گا کہ اگر وہ ایسی باتوں پر یقین رکھتا ہے جنھیں عقل بھی تسلیم کرتی ہے مثلاً اللہ کا ایک ماننا وغیرہ تو شاید خدا جو رحیم و کریم اور غفار ہے ایسے لوگوں کو معاف کر دے اور انھیں دوزخ میں نہ بھیجے لیکن جن لوگوں تک اسلام کی تبلیغ پہنچ چکی ہے اور وہ ضد یا کسی اور وجہ سے اسے قبول نہیں کرنا چاہتے تو محض اخلاق حسنہ کے باعث، خدا ہی کے فرمان کے مطابق، ان کی نجات نہ ممکن ہے۔ ایسے لوگوں کا معاملہ ہمیں خدا پر ہی چھوڑ دینا چاہئیے۔ اگر بخش دے گا تو اس سے ہمیں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

**سوال13:** نماز پڑھتے وقت سر پر کپڑا لینا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر نماز سر ڈھانپے بغیر پڑھی جائے، جب کہ کپڑا موجود ہو تو کیا حکم ہے؟ دلیل دیں۔

**جواب:** اس سوال کے دو جواب ہیں، ایک عورتوں کے متعلق اور دوسرا مردوں کے متعلق ہے۔ عورتوں کے لیے صراحت سے ذکر ملتا ہے کہ وہ اپنے سر کو ڈھانپیں اور بالوں کو بھی چھپائیں۔ لہٰذا ان کی حد تک ننگے سر نماز پڑھنا عام حالات میں مناسب نہیں ہو گا۔ بجز اس کے کہ کوئی خاص حالت پیش آئے، مثلاً عورت کے پاس کپڑے نہیں اور وہ تنہا ہے تو یہ اس کی مجبوری ہے خدا اسے معاف کرے گا۔ مرد کے متعلق سر ڈھانپنا ضروری نہیں ہے۔ میں ضروری نہیں کا لفظ استعمال کر رہا ہوں۔ ٹوپی پگڑی پہنے تو بہت اچھا ہے، نہ پہنے تو کسی کو کافر کہنے کا حق نہیں۔ چنانچہ اس قسم کا ایک واقعہ صحیح بخاری کی کتاب الصلاۃ میں آیا ہے۔ ایک صحابی تھے حضرت جابر۔ ان کا ذکر

ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت بعد، خلافت کے زمانے میں ایک دن ان کو کچھ لوگوں نے بہت ادب سے اپنے یہاں کھانے کی دعوت دی۔ کھانے کے بعد لوگوں نے درخواست کی کہ آپ ہی نماز پڑھائیے ہم آپ کے پیچھے نماز پڑھنے کا شرف حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ غالباً اس سے کچھ پہلے آپ کے سوال ہی کی قسم کی گفتگو ہوئی تھی۔ بہر حال ان صحابی نے نماز پڑھانا قبول کیا۔ نماز سے قبل انھوں نے سجادہ کی طرف جاتے ہوئے پہلے عمامہ اتارا پھر جبہ اتار پھینکا اور پھر قمیص اتار دی۔ صرف تہمد (لنگی) کے ساتھ آگے آئے اور آگے بڑھ کر نماز شروع کی۔ لوگ حیران ہوئے۔ اس پر انھوں نے جو کچھ فرمایا وہ بخاری میں ان الفاظ میں آیا ہے، کہ "تم جیسے جاہلوں کو بتانے کے لیے میں عمداً ایسا کیا ہے۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تمھارے خیال میں ہمارے پاس دو دو کپڑے ہوتے تھے؟ اس وقت ہم ننگے سر ہی نماز پڑھتے تھے۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سر کا ڈھانپنا بے شک اچھا ہے، ادب کا تقاضہ ہے اور اس آیت شریف (31:7) کے مطابق ہے کہ جب نماز کے لیے جاؤ تو زینت کے ساتھ جاؤ۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ یہ واجب ہے۔ اگر بغیر سر ڈھانپے نماز پڑھنا چاہیں تو اس میں کوئی امر مانع نہیں۔ اصل چیز دل کا خشوع و خضوع نہ کہ ظاہری ہئیت۔

**سوال 14:** آپ نے فرمایا مسجد نبوی کے لیے پہلے والی مسجد کی توسیع ہوئی۔ پھر آپ نے فرمایا مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت تعین قبلہ کا مسئلہ پیدا ہوا۔ جب مسجد موجود تھی تو قبلہ کا تعین بھی پہلے سے موجود ہونا چاہئیے۔

**جواب:** قبلہ کا تعین پہلے سے موجود ہوگا اور مدینے والوں نے بھی قبلہ (بیت المقدس) کی جہت اسی طریقے سے معین کی ہوگی جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لیکن مجھے معلوم نہیں کہ پرانی مسجد کا رخ سوفی صد اتنا ہی درست تھا جس قدر آج کل کی مسجد کا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ آج کل مسجد جو عہدِ نبوی کے قبلہ دوم یعنی کعبتہ اللہ کی سمت میں بنائی گئی ہے وہ اتنا صحیح ہے کہ قطب نما اور جدید ترین آلات کے ذریعہ سے بنائے جانے والے رخ سے بھی زیادہ صحیح ہے یہ بات میں مذاق میں کے طور پر نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یہ امر واقعہ ہے۔ پہلی جنگ عظیم سے کچھ پہلے ترکوں نے حجاز ریلوے کے نام سے ایک ریل بنائی جو شام اور اردن سے گزرتے ہوئے مدینے تک آچکی تھی۔ مدینہ کا سٹیشن اب تک موجود ہے۔ اس کے سامنے ایک مسجد بھی ہے جو ریلوے کے نمازیوں کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس مسجد کے رخ کا تعین جرمن انجنئیر نے کیا تھا۔ اس کے اندر آپ جا کر دیکھئے، چونکہ قبلہ کا رُخ غلط ہے اس لیے جائے نمازوں کو ترچھا کر کے بچھایا جاتا ہے۔

**سوال 15:** کیا اسلامی معاشرہ کی تعمیر کے لیے اسلامی تعلیمات کا عام ہونا لازمی ہے؟

**جواب:** میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلہ میں دو جواب نہیں ہو سکتے، ایک ہی جواب ہو گا کہ اسلامی تعلیمات کے بغیر کوئی معاشرہ مسلمان نہیں کہلا سکتا۔

**سوال16:** کیا تغیر شدہ معاشرہ میں اسلام کو سمجھنے کے لیے مادری زبان کا عام ہونا ضروری ہے؟

**جواب:** اگر اس کے بغیر آپ کوئی تعلیم پا سکتے ہیں تو اس میں کوئی امر مانع نہیں زبان مقصد نہیں بلکہ محض ایک وسیلہ ہے۔ ہم اسلامی معلومات جس ذریعے سے بھی حاصل کر سکیں، ہمیں حاصل کرنی چاہیئے۔ اس کے لیے زبانوں کی قید نہ صرف بے معنی ہے بلکہ ضرر رساں بھی۔

میں آپ کا مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ خاص طور پر محترم صدر کا جنھوں نے مہربانی فرما کر دیر تک اپنا وقت دیا اور یہاں موجود رہے۔ السلام وعلیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

# خطبہ ۱۰: عہدِ نبویؐ میں نظامِ تشریع وعدلیہ

محترم صدر! محترم وائس چانسلر! محترم سامعین!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ !

آج کا مضمون دو ایسے موضوعوں سے متعلق ہے، جن میں بے شمار باتیں تشریح طلب ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سب پر ایک مختصر تقریر میں جیسی روشنی چاہئیے، نہیں ڈالی جاسکتی۔ آج کے لیکچر میں دو مسئلوں پر خصوصی بحث کرنی ہے۔ ایک "قانون سازی" اور دوسرے "عدلیہ" جس کی غرض کے لیے قانون سازی ہوتی ہے۔ جہاں تک قانون سازی کا تعلق ہے، دو تمہیدی باتیں ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ اول یہ کہ قانون دو طرح سے بنتا ہے۔ ایک یہ کہ نامعلوم زمانے میں سے رسم ورواج کی صورت میں کوئی قاعدہ چلا آ رہا ہو، اور ہمیں بالکل معلوم نہ ہو کہ اس کا بنانے والا کون تھا؟ وہ کتنے عرصے سے چلا آرہا ہے؟ اور اس کی تاریخ کیا کہہ رہی ہے؟ دوسری قسم قانون کی وہ ہے، جسے معلوم المصنف کہہ لیں۔ یعنی اس کے بنانے والے کا ہمیں پتا ہوتا ہے، مثلاً کوئی بادشاہ، کوئی حکمران جو ایک قاعدہ اپنے ماتحت لوگوں کے لیے مقرر کرتا ہے اور وہ اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ کبھی اسے ایک معلوم انسان ہی پیش کرتا ہے، لیکن یہ کہتے ہوئے کہ یہ میرا بنایا ہوا قانون نہیں بلکہ خدا کے احکام ہیں۔ مگر ان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ رسم ورواج کے متعلق ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ وہ قانون کیسے بنا؟ ممکن ہے اس کا کوئی جزء تو ایسا ہو، جو خدائی احکام کے طور پر، کسی پیغمبر کے ذریعے ہم تک پہنچا ہو جیسے ہم فراموش کر گئے ہوں اور وہ عمل ہماری عادت بن گیا ہو اور بطور نتیجہ اس عمل کو ہم نے جاری رکھا ہو۔ قانون اصل میں دو طرح کے ہیں۔ ایک خالص انسانی قانون اور دوسرا خدائی قانون۔ ایک تمہیدی مگر اہم بات یہ کہ قانون بن جانے کے بعد اس کو ایک مماثل

درجے کا اقتدار رکھنے والی مماثل شخصیت ہی بدل سکتی ہے۔ اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ یونیورسٹی کا ایک پروفیسر اپنی جماعت کے اندر ایک حکم دے تو طالب علم یا دفتر کا ادنیٰ ملازم اس کو بدل نہیں سکتا۔ البتہ وائس چانسلر اسے بدل سکتا ہے یا وائس چانسلر سے بھی بڑی شخصیت وزیر تعلیم یا ملک کا حکمران اسے بدل سکتا ہے۔ لیکن بنانے والے سے کمتر مرتبے کا شخص نہیں بدل سکتا۔ اس قاعدے اور اصل کے اثرات بہت دوررس ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی قانون اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہو تو اس کو بدلنے والا اللہ ہی ہو سکتا ہے۔ خدا سے کم تر مرتبے کا کوئی فرد اس کو بدلنے کا اختیار نہیں رکھتا اور اگر بدلے تو وہ ملحد ہو گا اللہ کو نہ مانتا ہو گا۔ اللہ کے بعد پیغمبر اپنے ذاتی اجتہاد سے کوئی قانون بنا سکتا ہے جبکہ اسے وحی نہ آئی ہو اور وہ اپنی صوابدید اور ملکۂ استدلال سے حکم دیتا ہے تو اب اس قانون کو کوئی پیغمبر ہی بدل سکتا ہے۔ پیغمبر سے کم تر درجے کی کوئی شخصیت مثلاً کوئی بادشاہ کوئی مجتہد کوئی فقیہ اس کو بدلنے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ البتہ اللہ کی ذات پیغمبر کے حکم کو بدل یا منسوخ کر سکتی ہے۔ یعنی قانون قانون بدلنے کا بھی کا بھی ایک معیار ہے۔ مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ اگر توریت میں کوئی حکم ہو تو انجیل یا قرآن مجید اسے بدل سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی اللہ کے احکام کا مجموعہ ہیں اسی طرح حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے اقوال کو حضرت محمد ﷺ کے اقوال سے بدل سکتے ہیں۔ غرض پیغمبروں کے احکام کو یا تو اللہ کی ذات بدلے گی یا کوئی اور پیغمبر ہی وحی کے ذریعے سے بدل سکے گا۔

اس پس منظر میں اب ہم یہ دیکھیں گے کہ اسلامی قانون کس طرح بنتا ہے؟ جہاں تک اسلام کی تاریخ کا تعلق ہے تو ہم جانتے ہیں کہ عہدِ نبویؐ غارِ حرا میں پہلی وحی کہ تاریخ سے لے کر حضور ﷺ کی وفات تک تیئس سال کے عرصے پر مشتمل رہا اور یہ کہ اسلام کا اساسی ماخذ یعنی قرآن مجید ایک دم نازل نہیں ہوا۔ وہ کتابی صورت میں یا تختیوں پر لکھے ہوئے، حضرت موسیٰؑ کے قانون کی طرح ہم تک نہیں پہنچا بلکہ تیئس سال کے عرصے میں وقتاً فوقتاً نازل ہونے والی آیات کی صورت میں امت تک پہنچایا گیا۔ ان حالات میں بہت ہی سادہ اور بدیہی بات ہے کہ غارِ حرا میں جس وقت پہلی وحی یعنی سورۃ اقراء (96: 1 - 5) کی ابتدائی پانچ آیات نازل ہوئیں، اس وقت اسلامی قانون موجود نہیں تھا۔ قرآن مجید یا حدیث میں جو احکام آئے وہ رفتہ رفتہ بعد میں آئے۔ سوال یہ ہے کہ اسلام کی ابتداء میں اسلامی قانون کیا تھا؟ قرآنی اشارات کی بنا پر اور تاریخ عہدِ نبوت کی روشنی میں ہم پورے ادب کے ساتھ بیان کر سکتے ہیں کہ شہر مکہ کے جو بھی رسم و رواج تھے، وحی کی غیر موجودگی میں وہی مسلمانوں کا قانون تھا اور وہ اس پر عمل کرتے رہے۔ مثلاً شراب کی ممانعت ہجرت کے کئی سال بعد نازل ہوئی۔ ان آیات کا شانِ نزول یہ ہے کہ ایک دن ایک صحابی نے شراب پی لی تھی۔ وہ نشے کی حالت میں تھے کہ نماز پڑھائی تو سورہ: "قل یاایھاالکفرون" کی آیات اس طرح پڑھ ڈالیں، جس سے معنی الٹ گئے اور جو چیز ناگفتنی

تھی وہ ان کی زبان سے نکل گئی۔ تو اس سلسلے میں قرآن مجید کی وہ آیات نازل ہوئیں، جن میں شراب پینے کو حرام قرار دیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں یہ حکم آنے تک شراب کا پینا واجب تو نہیں جائز تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے خود تو کبھی شراب نہیں پی، لیکن کچھ صحابہ اس سے ضرور دل بہلائی کرتے رہے۔ یہی حال اور سارے احکام کا ہے۔ پہلی وحی میں اگرچہ بت پرستی کی ممانعت کی گئی تھی لیکن اور احکام و ممانعت کا اس میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض ممنوعات کی عقل بھی متقاضی ہے۔ مثلاً چوری نہیں کرنی چاہئیے، کسی بے قصور کو جان سے نہیں مارنا چاہئیے، کسی کو دھوکہ نہیں دینا چاہیئے۔ انسانی فطرت اور عقل بھی ان کو نامناسب سمجھتی ہے۔ ان کی ممانعت تو جاری رہ سکتی ہے لیکن جن چیزوں کے متعلق انسانی رائے میں اختلاف ہو سکتا ہے، مثلاً شراب پینا، سور کا گوشت کھانا، ان پر اگر اہل مکہ عمل کرتے رہے ہوں اور اس کی ممانعت ابھی تک نہ آئی ہو تو مسلمانوں کے لیے اس پر عمل کرنا، جائز قرار دیا جائے گا۔ وہ اسلامی قانون ہی ہو گا، اگرچہ عارضی اور قابلِ تبدیلی قانون ہو، لیکن بہر حال اسلامی قانون ہی ہو گا۔ وحی اور قرآن کی بحث کے ضمن میں ایک اور چیز کا ذکر کرنا ناگزیر ہے، جسے اصول فقہ کی کتابوں میں "شرائع من قبلنا" کا نام دیا گیا ہے، یعنی اسلام سے قبل کے صحف سماوی۔ ان کا ذکر قرآن مجید میں کئی بار آیا ہے۔ سب سے اہم صراحت سورہ انعام (٦: ٨٣ تا ٩٠) میں ہے جہاں کوئی بیس پیغمبروں کے نام لینے کے بعد آنحضرت ﷺ کو حکم دیا گیا ہے۔ "اولئک الذین ھدی اللہ فبھدا ھم اقتداہ" (یعنی مذکورہ بالا لوگ وہ ہیں جن کو خدا ہی نے صحیح راستہ بتایا ہے۔ اس لیے (اے محمدؐ) تو بھی انہی کے رستے کی اقتدا کر)۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگر پرانی خدائی کتاب ہم تک پہنچے، اور اس کی صحت کا اطمینان ہو، اور اس کتاب کے احکام کو قرآن نے یعنی خدا نے بعد میں منسوخ بھی نہ کیا ہو تو وہ پرانے نبی کی وحی مسلمانوں پر بھی واجب لاتعمیل رہے گی، کیونکہ وہ خدا ہی کے حکم پر مشتمل تھی۔ اور خدا کا حکم اگر خدا ہی نہ بدلے تو وہ برقرار رہے گا۔ ہمارے فقہاء نے ایسی بہت سی مثالیں دی ہیں۔ چند کا ذکر کرتا ہوں جن سے مفہوم آپ پر واضح ہو جائے گا۔ چنانچہ سورہ مائدہ (٥: ٤٥) میں خدا فرماتا ہے: "ہم نے یہودیوں کے لیے توریت میں حکم دیا ہے کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ۔۔۔" صراحت سے یہ توریت کا اور یہودیوں سے مختص قانون ہونے کے باوجود اسلامی قانون کا جزء بن جاتا ہے۔ ایک دوسری مثال سورہ نور (٢٤: ٢) ہے جہاں غیر شادی شدہ زناکار مرد اور عورت کو ایک سو درے یا کوڑے مارنے کا حکم ہے، لیکن شادی شدہ لوگوں کی سزا کا قرآن میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ایسے (شادی شدہ) لوگوں کی زناکاری پر توریت اور انجیل دونوں میں رجم کرنے کا حکم موجود ہے (اور صحیح بخاری وغیرہ کے مطابق رسول اکرم ﷺ نے اس کی صحت کی توثیق بھی فرمائی ہے)۔ لہذا جس توریتی اور انجیلی حکم سے قرآن نے سکوت کیا وہ برقرار رہے گا۔ چنانچہ اسلام میں بھی رجم کے حکم کو رسول

اکرم ﷺ اور بعد کے سارے خلفاء اور فقہاء نے برقرار سمجھا اور نافذ کیا۔ غرض "شرائع من قبلنا" بھی اسلامی قانون کا ایک ماخذ ہیں بشرطیکہ ان کی صحت کا ثبوت ملے اور قرآن وحدیث نے ان کو بدلنے کا حکم نہ دیا ہو۔

اسلامی قانون کا دوسرا ماخذ حدیث وسنت ہیں اور وہ قیامت تک برقرار تو رہتے ہیں لیکن ان کا بننا اور بدل سکنا ایک محدود زمانے یعنی رسول اکرم ﷺ کی زندگی میں وقوع میں آتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ان کے بننے اور بدلنے کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے۔ وہ ہمارے پاس محفوظ رہتے ہیں۔ اس کے بعد، ان میں تبدیلی غیر ممکن ہو جاتی ہے۔ اس مختصر صحبت میں یہ تو ممکن نہیں کہ تفصیل کے ساتھ بتاؤں کہ قرآن وسنت میں کون سا قانون پہلے آیا، پھر تیئس سال کے عرصے میں اس میں کیا تبدیلی اور اضافے ہوئے۔ لیکن مجموعی طور پر ہم یہ پیش نظر رکھیں گے کہ قرآن مجید کے ذریعے سے جو احکام آئے، وہ خدائی حکم کے طور پر ہمارے پاس آئے، اور اس میں تبدیلی اور تو اور خود پیغمبر بھی ذاتی رائے سے نہیں کر سکتا۔ اس طرح سنت کے ذریعے سے جو احکام ہم تک پہنچتے رہے، ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم یہ ہے کہ وحی والہام کے ذریعے سے رسول اللہ ﷺ تک پہنچے ہیں اور اس شرط یا اس صراحت کے ساتھ کہ انہیں قرآن میں داخل نہ کیا جائے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ ذکر ہے "وما ينطق عن الهوى ان هوا لاوحی یوحیٰ" (۵۳: ۳-۴) (پیغمبر جو چیز بھی بیان کرتا ہے۔ وہ اپنی ذاتی خواہش کی وجہ سے نہیں ہوتا ہے بلکہ خدا ہی کی وحی ہوتی ہے۔ جو اس تک پہنچائی جاتی ہے)۔ تو اگر پیغمبر کی بیان کردہ چیزیں قرآن میں داخل نہ کی گئی ہوں، تو مسلمانوں کا عقیدہ یہی ہوتا ہے کہ وہ الہام کے ذریعے پیغمبر تک پہنچی ہیں اور پیغمبر نے پوری دیانت داری سے ہم تک پہنچائی ہیں۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ کسی مسئلے میں احکام کی ضرورت ہو، قرآن میں وہ احکام ہمیں نہ ملتے ہوں، اور وحی کا انتظار ہو، مگر وحی آتی نہیں تو ان حالات میں اگر معاملہ ایسا ہے کہ جس میں انتظار کیا جا سکتا ہے تو رسول اللہ ﷺ انتظار کرتے ہیں۔ لیکن معاملہ فوری ہو تو وہ مجبور ہوتے ہیں کہ اجتہاد واستنباط کر کے، استدلال کر کے، اپنی صوابدید سے کوئی حکم دیں۔ ایسے حکم کی دو صورتیں ہوں گی۔ یا تو خدا اس کی توثیق کر دے گا یا خدا اس کو نامناسب سمجھے تو تبدیلی کا حکم دے گا۔ اس بارے میں ایک معقول تصور یہ بھی ہے کہ اگر خدا کو رسول کا استنباط نامناسب معلوم نہ ہو تو توثیق سکوت کے ذریعے سے بھی ہو سکتی ہے، اور وحی کے ذریعے صراحت کے ساتھ بھی۔ یہ فوری بھی ہو سکتا ہے اور اس میں دیر بھی ہو سکتی ہے۔ اگر خدا کی طرف سے ترمیم کا کوئی حکم نہ آئے تو چاہے کتنی ہی مدت گزر جائے، رسول اللہ ﷺ اس بات کے مجاز ہوں گے کہ اس پر عمل کرتے رہیں کیونکہ اس کی تبدیلی کا خدا نے حکم نہیں دیا۔ پیغمبر کے استدلال واستنباط میں تبدیلی کے لیے خدا کا حکم آنا ضروری ہے۔ چنانچہ ایسی مثالیں قرآن مجید میں ملتی ہیں مثلاً جنگ بدر کے قیدیوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے، اس بارے میں

کوئی صریحی حکم اس وقت تک نہیں آیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فدیہ لے کر ان کو رہا کرنے کا فیصلہ کیا تو فوراً ہی خدا کی طرف سے وہ مشہور آیت تنبیہ نازل ہوئی: " لَّوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّـهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ" (۸: ۶۸) ( اگر اللہ اس سے پہلے ہی فیصلے نہ کر چکا ہوتا تو اس چیز کی بنا پر جو تم نے حاصل کی ہے (یعنی مالِ فدیہ) تمہیں سخت عذاب دیا جاتا)۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ یہ بھی وضاحت کر دیتا ہے کہ رسول کا انسانی حیثیت میں استنباط اسے پسند نہیں آیا، البتہ اس خاص صورت میں، جو میں بیان کر رہا ہوں، اس کے متعلق خدا یہ وضاحت بھی کر دیتا ہے کہ "میں پہلے ہی سے طے کر چکا تھا کہ اپنے پرانے (توریت) کے قانون کو امتِ محمدیہ کے لیے بدل دوں۔ لہٰذا اب میں محمد رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کو قبول کرتا اور اس کی توثیق کرتا ہوں، تم اس پر عمل کر سکتے ہو۔" اس کے برعکس رسول کرم ﷺ کے استنباط کردہ حکم کی قرآن کے ذریعے سے یا وحی کے ذریعے سے فوراً تنسیخ ہو گئی تو ایسی تنسیخ کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کے حکم کا اطلاق نہیں کیا جائے گا۔ غرض جہاں تک اسلامی قانون کے بنیادی اساسی ماخذوں کا تعلق ہے، پہلی چیز ملک کا رسم و رواج ہے۔ جو معقولیت کے منافی نہ ہو اور جس میں اس وقت تک قرآن و سنت کے ذریعے سے تبدیلی نہ کی گئی ہو۔ دوسرا ماخذ قانون، وضع کردہ قانون یعنی صراحت کے ساتھ کسی قاعدے کا مقرر کرنا ہے، اور یہ قرآن کے ذریعے سے بھی ہو سکتا ہے، سنت کے ذریعے سے بھی۔ ان دونوں میں ایک اساسی فرق یہ ہے کہ قرآن اللہ کا حکم سمجھا جائے گا اور سنت کے سلسلے میں ہم مختلف وجوہ سے کوئی حکم سنیں تو اس کا درجہ بالکل قرآن کے برابر ہو گا۔ مثلاً اگر عہد، نبوی میں رسول اللہ ﷺ سے کوئی شخص یہ کہتا کہ یہ قرآن ہے، اللہ کا حکم، میں اس کی تعمیل کرتا ہوں۔ اور یہ آپ کا انسانی حکم ہے، میں اس کی تعمیل نہیں کرتا۔ ظاہر ہے ایسے شخص کو فوراً ملت سے خارج کر دیا جائے گا۔ جس وجہ سے حدیث کی حیثیت کچھ کم ہو جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ قرآن کی تدوین و تحفظ اور ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچانے کا انتظام رسول اللہ ﷺ نے خود اپنی نگرانی میں کرایا۔ اور اس کے ایک ایک حرف کو اپنے حکم کے ذریعے سے امت تک پہنچایا۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے، اس کا زیادہ حصہ ایسا ہے جو صحابہ نے اپنی صوابدید سے لکھا، یہ بھی ممکن ہے کہ صحابہ کی انفرادی قابلیتوں کے اختلاف کے باعث ایک صحابی رسول اللہ ﷺ کی بات کو اچھی طرح سمجھتا ہے اور دوسرا کسی نہ کسی وجہ سے، مثلاً یہ کہ وہ عالم و فاضل نہیں ہے یا یہ کہ وہ ان پڑھ ہے بدوی ہے یا عین اس وقت کسی کے چھینک سے اس نے کوئی لفظ نہیں سنا، اور کسی ایک بنیادی اہم لفظ کے نہ سننے کی وجہ سے اس حدیث کے صحیح مفہوم کو سمجھنے سے قاصر رہا۔ اگر بعد میں وہ کوئی روایت کرتا ہے تو وہ حدیث کی صحیح روایت نہ ہو گی چنانچہ قرآن جس کی تدوین رسول اللہ ﷺ نے اپنی نگرانی میں کرائی، اور حدیث، جو صحابہ نے ذاتی صلاحیتوں کے مطابق انفرادی طور پر مرتب کی، دونوں میں فرق ہو گا۔ اس لیے بعد کے زمانے میں کسی حدیث پر عمل کرنے کے متعلق بہت سے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ آیا یہ ابتدائی حکم ہے یا آخر تک یہی قانون رہا۔ شروع میں ایک حکم دینے کے بعد اسے منسوخ تو نہیں

کر دیا؟ آیا یہ حکم کسی مخصوص شخص کے لیے تھا یا وہ سارے لوگوں کے لیے ہے؟ اس حدیث کو صحابی نے صحیح طور پر سنا اور صحیح طور پر لکھا یا ان کی انفرادی صلاحیتوں کی وجہ سے اس میں کچھ فرق بھی پیدا ہو گیا ہے؟ صحابہ کے بعد تابعین کی روایات سے مختلف زمانوں میں صحت حدیث پر کوئی اثر تو نہیں پڑا؟ انہی وجوہ سے حدیث کا درجہ قرآن کریم سے کم تر ضرور ہے لیکن اس کا جو اصل اصول ہے وہ مین آپ سے بیان کر چکا ہوں، کہ رسول کے حکم کو صرف رسول ہی بدل سکتا ہے۔ رسول سے کمتر درجے کی شخصیت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کوئی تبدیلی کرے۔ ضمناً میں یہ بھی عرض کر دوں کہ حدیثوں کی صحت معلوم کرنے کے لیے بہت سے وسائل ہیں۔ ہمارے اسلاف نے بہت سے اصول مدون و مرتب کر کے، ہمیں حدیثوں کے جانچنے کا معیار دیا ہے کہ کون سی حدیث قابل اعتماد ہے؟ اگر دو حدیثوں میں اختلاف ہے تو کس کو ترجیح دی جائے؟ واضح رہے کہ میرا یہ منشاء ہر گز نہیں ہے حدیثوں پر اعتماد نہ کیا جائے۔ کیونکہ "صحاح ستہ" جیسی حدیث کی کتابوں کے متعلق ہمیں یہ اطمینان ہے کہ ان کی تدوین، انسانی حد تک، صحت کے تمام اصول و شرائط کے مطابق ہوئی ہے۔ لہٰذا احدیث کی کم ترین درجے کی کتاب کو بھی میں پورے اعتماد کے ساتھ دوسری قوموں کی مستند ترین کتابوں پر ترجیح دوں گا۔ مثال کے طور پر انجیل کو لیجئے۔ انجیل جو آج کل چار انجیلوں کی شکل میں ہم تک پہنچی ہے۔ اس کے متعلق خود عیسائی مؤرخ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے تین سو سال بعد پہلی مرتبہ اس کا ذکر ملتا ہے۔ ان تین صدیوں مین نسلاً بعد نسل اس کو کس طرح نقل کیا گیا اور ایک نسل سے دوسری نسل تک کس طرح پہنچایا گیا؟ اس کا قطعاً ہمیں کوئی علم نہیں ہے۔ اس کے بر خلاف حدیث کی ادنیٰ ترین کتاب میں ایک ایک سطر والی حدیث کے متعلق بھی پوری تفصیل سے حوالے (Refrences) ملتے ہیں: فلاں نے فلاں سے سنا، اس نے فلاں سے، اس نے فلاں سے، اس طرح حوالوں کا یہ سلسلہ بالآخر رسول اللہ ﷺ تک پہنچتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ لہٰذا اتنے حوالوں کی موجودگی میں حدیث کی ادنیٰ ترین کتاب بھی دوسری قوموں کی اعلیٰ ترین کتابوں کے مقابلے میں زیادہ بلند درجہ رکھتی ہے۔

احکام کے بارے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ سارے احکام یکساں درجے کا حکم نہیں رکھتے۔ بعض کی حیثیت فرض یا واجب کی ہوگی، بعض کا حکم سفارش اور مستحب کا ہوگا۔ بعض کی صورت حرام کی ہوگی، یعنی ہر گز نہیں کرنا چاہیئے۔ بعض کی ممانعت ایسی ہوگی کہ نہ کرو تو بہتر ہے، وہ مکروہ سمجھے جائیں گے۔ اور بہت سی چیزوں کے متعلق یہ حیثیت ہوگی کہ وہ ہماری صوابدید پر چھوڑی گئی ہیں یعنی مباح ہیں، چاہے تو کریں، چاہے نہ کریں۔ مگر یہ تصور کسی قدر دیر سے پیدا ہوا کہ علمی نقطہ نظر سے احکام کو پانچ قسموں میں تقسیم کیا جائے اور یہ تقسیم اخلاقی اساس پر ہوگی۔ جو چیز خیر ہے، اچھی ہے، بہتر ہے اسے ضرور کرنا چاہیئے۔ جو چیز شر ہے، بری ہے، اسے ہر گز نہیں کرنا

چاہئیے۔ جس چیز میں خیر غالب ہے لیکن اس میں شر کا بھی عنصر پایا جاتا ہے اس کا کرنا بہتر ہے لیکن واجب نہیں ہو گا، اس کے بر خلاف جس میں شر کا غلبہ ہے اگرچہ خیر کا بھی کچھ عنصر پایا جاتا ہے اس کا نہ کرنا بہتر ہے، اسے مکروہ کہا جائے گا۔ اور جن چیزوں میں یہ صورت نہیں ہے، اور نہ خیر ہے نہ شر ہے یا اس میں دونوں برابر ہیں، اس کو ہم مباح قرار دیں گے۔ یہ پنج گانہ تقسیم غالباً دوسری صدی ہجری میں شروع ہوئی اور جیسا کہ امام غزالیؒ نے بیان کیا ہے، یہ معتزلہ اصول فقہ کی کتابوں میں ہمیں پہلی مرتبہ ملتی ہے۔ اس سلسلے میں قطع کلام کے طور پر ایک چھوٹی بات عرض کرون گا کہ بھلائی اور برائی کے لیے قرآن میں دو اصطلاحیں آئی ہیں، جو دلچسپ ہیں اور شاید ضرورت ہے کہ اس کی تھوڑی سی تحلیل بھی کی جائے۔ اچھی چیز کو قرآن "معروف" کہتا ہے اور بری چیز کو "منکر" کہتا ہے، "امر بالمعروف، نہی عن المنکر"۔ کہیں کہیں خیر اور شر کا لفظ بھی آیا ہے۔ لیکن عام طور پر خیر کی جگہ "معروف" کا لفظ اور "شر" کی جگہ منکر کا لفظ مستعمل ہے۔ "معروف" کے لفظی معنی ہیں وہ چیز جو سب لوگ جانتے ہوں اور "منکر" وہ چیز جو بالکل نہیں جانی جاتی"۔ بہت دنوں تک میں سوچتا رہا کہ یہ اصطلاح اس معنی کے لیے کیوں استعمال ہوئی؟ ہر وہ چیز جو معقول ہے۔ جسے عقل انسانی قبول کرتی ہے اور ہر شخص اس کے بارے جانتا ہے کہ وہ اچھی ہے، اسی کا حکم دیا جائے گا، اور جس چیز کو ہر شخص جانتا ہے کہ وہ بری ہے، اسے ممنوع قرار دیا جائے گا۔ یہ ان دونوں اصطلاحوں (معروف و منکر) کی وجہ تسمیہ ہے۔ ویسے ہمارا خالق و مالک جو حکم چاہے دے سکتا ہے۔ البتہ وہ حکیم ہے، بری چیز کا کبھی حکم نہیں دیتا۔ اس کا ہر حکم حکیمانہ اور اچھا ہی ہو گا، چاہے انسان کسی حکم کی حکمت کو سمجھے یا نہ سمجھے۔

عہدِ نبویؐ میں کچھ اور بھی ماخذ قانون ملتے ہیں، ان کا ذکر کرنے سے پہلے میں عرض کروں گا کہ قرآن اور حدیث، ابدی ماخذِ قانون ہیں۔ چونکہ حضرت کاتم النبیین ﷺ کے بعد رسالت و نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے لہٰذا آپؐ کا لایا ہوا قانون یعنی قرآنی قانون قیامت تک نافذ رہے گا۔ اسی طرح پیغمبر کے حکم کو منسوخ کرنے کے لیے ایک نئے پیغمبر کی ضرورت ہو گی، اس کے نہ آسکنے کی بنا پر حدیث و سنت بھی ابدی بن جائیں گے اور قیامت تک ان پر عمل کرنا ہمارے لیے واجب ہو جائے گا۔ کتاب و سنت میں بعض چیزین مستحب ہیں، بعض حرام ہیں اور بعض مکروہ ہیں۔ محض امر کا صیغہ استعمال کرنے سے وہ ایک درجہ میں نہیں پہنچ جاتیں۔ مثلاً قرآن مجید میں زکوٰۃ دینے کا حکم ہے، جو فرض ہے۔ اور قرآن میں اسی صیغے کے ذریعے حکم آئے گا کہ خیرات کرو، ظاہر ہے کہ یہ فرض نہیں بلکہ اس کی ترغیب دلائی جاتی ہے۔

عہدِ نبویؐ میں بعض اور ماخذہائے قوانین بھی ہمیں ملتے ہیں جو مؤقتی اور عارضی ہیں۔ ان میں سے ایک چیز وہ ہے جس کو ہم "معاہدہ" کا نام دیتے ہیں۔ اور مسلمان اگر کسی معاہدے میں کچھ شرطیں قبول کرتے ہیں، تو وہ شرطیں مسلمانوں کے لیے واجب

التعمیل ہوں گی لیکن اس وقت تک جب تک کہ وہ معاہدہ بر قرار ہے۔ جیسے ہی وہ معاہدہ ختم ہو جائے یا وہ منسوخ کر دیا جائے تو وہ شرطیں بھی جو ہمارے قانون کا جزو بن چکی تھیں منسوخ ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح معاہدے کے ذریعے قبول کی ہوئی شرطوں کو اسلامی قانون کا عارضی اور مؤقتی جزء سمجھا جائے گا۔ اگرچہ اس کی تعمیل اتنی ہی ضروری ہے جتنی ان احکام کی، جو ابدی طور پر قیامت تک کے لیے قرآن و حدیث میں دیے گئے ہیں۔ اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ صلح حدیبیہ میں رسول اللہ ﷺ نے یہ شرط منظور فرمائی تھی کہ اگر کوئی مسلمان مشرکینِ مکہ کے ہاں پناہ گزیں ہو جائے تو اس کا مسلمانوں کے سپرد یا تحویل کیا جانا مشرکینِ مکہ کے لیے ضروری نہیں ہو گا۔ اس کے برخلاف اگر مشرکین کا کوئی شخص مسلمان ہو کر بھی رسول اکرم ﷺ کے پاس پناہ کے لیے آتا ہے تو اس معاہدے میں رسول اکرم ﷺ کا فریضہ قرار دیا گیا تھا کہ اس شخص کو مکے والوں کے مطالبے پر واپس کر دیں۔ اگرچہ یہ ایک یکطرفہ کاروائی تھی لیکن جب تک وہ معاہدہ برقرار رہا، وہ قاعدہ اسلامی قانون کا جزو رہا۔ جیسے ہی وہ معاہدہ دو سال بعد ختم ہوا، ان میں وہ قانون بھی، وہ شرطیں بھی خود بخود ختم ہو گئیں۔

ایک اور ماخذِ قانون یہ ہے کہ بعض وقت نیا قانون بنانے کی جگہ اسلامی حکومت اس چیز کو قبول کر لیتی ہے جو کسی اجنبی ملک میں رائج ہو۔ اس ضمن میں جو مثال اس وقت میرے ذہن میں ہے وہ حضرت عمرؓ کے خلافت کے زمانے کی ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بمشکل تین چار سال بعد کا واقعہ ہے۔ شام کی شمالی سرحد پر منبج نامی ایک مقام تھا۔ وہاں کے مسلمان والی نے حضرت عمرؓ کو لکھ بھیجا کہ سرحد پار کے لوگ ہمارے ہاں تجارت کے لیے آنا چاہتے ہیں ان کے ساتھ چنگی کے متعلق کیا برتاؤ کیا جائے؟ اور کس شرح اور کس مقدار سے ان سے چنگی لی جائے؟ حضرت عمرؓ نے جواب بھیجا کہ "ان تاجروں سے اسی شرح سے چنگی لو، جس شرح سے ان کے ملک میں مسلمان تاجروں سے لی جاتی ہے"۔ اس قاعدے کی مزید تشریح و توضیح امام محمد شیبانی، جو امام ابو حنیفہ کے شاگردِ رشید تھے، اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ اس قاعدے کا اطلاق مختلف طور پر ہو سکتا ہے۔ مثلاً کسی اجنبی ملک میں اگر مسلمان تاجروں سے کوئی چنگی نہیں لی جاتی تو ہم بھی اس ملک کے تاجروں سے کوئی چنگی نہیں لیں گے۔ مماثلت (Reciprocity) کا یہ قاعدہ اس وقت تک اپنی جگہ برقرار رہے گا، جب تک ہماری حکومت اس کے خلاف فیصلہ صادر نہ کرے۔

ان ماخذہائے قانون کے بعد قابلِ ذکر چیز وہ ہے جس کے باعث اسلامی قانون ساز کو ایسا وسیلہ حاصل ہو گیا جس سے اسلامی قانون قیامت تک زندہ رہ سکے، ہر آنے والی نئی ضرورت سے عہدہ برآ ہو سکے۔ یہ اجتہاد ہے۔ ہمارے فقہاء جو چار اصول بیان کرتے ہیں: قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس، ان میں اجماع عہدِ نبویؐ میں نہیں پایا جاتا تھا۔ قیاس جس کو ہم یہاں اجتہاد کا نام دے رہے ہیں،

وہ عہدِ نبویؐ میں ہی وجود میں آ چکا تھا، اور یہ عہدِ نبویؐ کے آخری زمانے کا واقعہ ہے۔ ۹ ہجری یعنی وفات سے ڈیڑھ سال پہلے رسول اللہ ﷺ نے وہ حکم دیا تھا اور جن حالات میں وہ حکم دیا تھا اس کی تفصیل یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے یمن کے علاقے میں ایک صحابی کو قاضی بنا کر روانہ کیا۔ ان کا نام معاذ بن جبلؓ تھا۔ اس زمانے کا قاعدہ تھا کہ اگر کوئی شخص کسی عہدے پر مامور کیا جاتا تو جانے سے پہلے وہ آخری باریابی، آخری ملاقات کے لیے حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوتا اور حضورؐ اسے ہدایات دیتے تھے۔ چنانچہ رسول اکرم ﷺ نے معاذ بن جبلؓ سے پوچھا: "بم تحکم؟" (تم حکم کس اساس پر دیا کرو گے؟) ان کا جواب تھا: "بکتاب اللہ" (اللہ کی کتاب یعنی قرآن کے مطابق)۔ قرآن میں جو احکام ہوں گے میں ان کا نفاذ کروں گا، ان کی تعمیل کراؤں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "فان لم تجد؟" (اگر اس میں نہ پاؤ تو کیا کرو گے؟) تو معاذ بن جبلؓ نے فوراً کہا: "فبسنۃ رسول اللہ" یعنی رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق، اس جواب کو بھی رسول اللہ ﷺ نے قبول کیا، لیکن پھر فرماتے ہیں کہ اگر تمہیں سنت میں بھی کوئی چیز نہ ملے تو کیا کرو گے؟ تو حضرت معاذؓ کے الفاظ یہ تھے: "اجتھد برای ولا آلو جھدا" میں اپنی رائے کے ذریعے سے (حل تلاش کرنے کی) کوشش کروں گا اور اس میں کوتاہی نہیں کروں گا۔ دوسرے الفاظ میں اپنی صوابدید سے غور کر کے، استدلال کر کے، استنباط کر کے، قیاس کر کے حکم دوں گا، اور ایسی چیز معلوم کرنے کی کوشش کروں گا، جو میری دانست مین اللہ کو پسند ہو، معقول ہو اور عدل و انصاف کے مطابق ہو۔ اس پر رسول اللہ ﷺ اس قدر خوش ہوئے کہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہتے ہیں: "اے اللہ تو نے اپنے رسولؐ کے رسول کو جس چیز کی توفیق دی ہے، اس پر تیرا رسولؐ خوش ہے"۔ چنانچہ قرآن و حدیث میں سکوت کی صورت میں یا اس میں قانون نہ ملنے کی صورت میں ہمیں اجتہاد کی اجازت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اختیار بہت ہی محدود ہے۔ اگر قرآن حدیث میں صراحت موجود ہے تو اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اسی وقت اجتہاد کر سکیں گے جب کہ قرآن و حدیث میں باوجود تلاش کے کوئی قاعدہ، کوئی حکم پیشِ نظر مسئلے سے متعلق نہ ملتا ہو۔

اجتہاد کے ذریعے قانون دریافت کرنے کی بھی مختلف صورتیں ہیں۔ کبھی یوں ہوتا ہے کہ خالص اس چیز کے لیے تو حکم نہیں ہے لیکن ایک مماثل چیز کے لیے حکم ملتا ہے۔ فرض کیجئے کہ چوری کا قانون موجود ہے لیکن کفن چوری کا ذکر قرآن میں نہیں ہے کہ کیا کریں؟ اب ہمارا مجتہد قیاس کرے گا چونکہ ایک قسم کی چوری کے لیے حکم ہے تو ایک دوسری قسم کی چوری میں بھی ہم اس قسم کا استدلال کر سکتے ہیں یا اس میں کسی قدر ترمیم کے ساتھ حکم دے سکتے ہیں۔ اسی طرح اور مسائل کے متعلق بھی بعض وقت مماثلتیں ڈھونڈی جاتی ہیں۔ ایک دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ بظاہر تو منطقی استدلال کے ذریعے ہم ایک چیز کا حکم دے سکتے ہیں لیکن اگر ذرا

غور کریں تو فوری طور پر ذہن میں آنے والا طریقہ مناسب نہیں ہوتا بلکہ ایک عمیق تروجہ سے کوئی دوسرا قانون ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس کو استحسان کہتے ہیں کیونکہ ایک عمیق تروجہ کے باعث ہم ایک دوسرے طریقے یا قانون بہتر اور مستحسن سمجھتے ہیں۔ کبھی ایک اور اصول پیشِ نظر ہوتا ہے: وہ یہ کہ امت کا فائدہ اس میں ہے۔ بہت ہی سخت قسم کی منطق سے تو یہ قاعدہ ہونا چاہئیے لیکن امت کی فلاح، امت کی بہبودی، اور آسانی کے لیے یہ دوسرا قاعدہ بہتر معلوم ہوتا ہے، اس لیے اسے استصلاح کا نام دیتے ہیں۔ اس طرح کے مختلف لطیف فروق کے ساتھ اجتہاد کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ اس کا رواج ہمیں عہدِ نبویؐ سے ملنے لگتا ہے۔ اس قاعدے کے اطلاق کے باعث، خاص طور پر قاضیوں کے فیصلوں کے سلسلے میں ہمیں ایک نئی چیز سے سابقہ پڑتا ہے، جو قانون سازی کا ایک جزء ہے۔ فرض کیجئے کہ قرآن وحدیث میں کوئی قاعدہ نہیں ملتا اور قاضی اجتہاد کر کے ایک حکم دیتا ہے۔ چونکہ وہ قاضی ہے، اس لیے وہ اپنے فیصلے کا نفاذ بھی کرا سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ لیکن ممکن ہے کہ نفاذ سے پہلے خود قاضی کو شبہ ہو۔ وہ مرکز سے دریافت کرے گا۔ مرکز سے جواب دیا جائے گا جو سنت ہونے کے باعث قانون کی صورت اختیار کرے گا۔ اس کا تعلق اجتہاد سے نہیں رہے گا۔ ایک اور صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ قاضی نے فیصلہ کر دیا اور اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے رجوع کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ لیکن اس فیصلے کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو کسی نہ کسی ذریعہ سے پہنچی یا یہ کہ فریقِ مقدمہ نے اپیل کی یا رسول اللہ ﷺ نے اپنے نامہ نگاروں کے ذریعہ سے اطلاع پائی۔ اگر رسول اللہ ﷺ اس فیصلے کو نامناسب سمجھتے ہیں تو نظم ونسق کے افسرِ اعلیٰ یا حکمران کی حیثیت سے نہیں بلکہ قانون ساز کی حیثیت سے: فوراً اس قاضی یا گورنر کو ہدایت دیں گے یوں نہیں یوں کرو۔ ایسی مثالیں متعدد ملتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مختلف گورنروں کو ایسی ہدایتیں بھیجیں۔ ایک مثال یہ ہے کہ ایک شخص کو قتل کر دیا گیا تھا۔ قتل خطا کے طور پر تھا اور اس کا خون بہا دلایا گیا۔ پرانے رواج کے مطابق خون بہا متوفی کے سب وارثوں کو نہیں بلکہ صرف مرد وارثوں کو دلایا گیا۔ اس کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو آپ ہدایت بھیجتے ہیں کہ فلاں شخص کے خون بہا میں سے اس کی بیوہ کو بھی حصہ دلایا جائے۔ خون بہا کو وراثت کا جزء قرار دیا گیا۔ وراثت کی صورمیں بیوی کے، بیٹے کے، بیٹی کے، ماں باپ وغیرہ ہر ایک وارث کے قرآن میں حصے مقرر کیے جا چکے ہیں۔ اسی لیے خون بہا میں بھی اسی قاعدے کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ قانون سازی کس طرح اس زمانے میں عمل میں آیا کرتی تھی۔

اجماع کا قاعدہ عہدِ نبویؐ میں ناممکن تھا، وہ بعد کی چیز ہے۔ اجماع کے معنی ہوتے ہیں کہ قرآن وحدیث میں اگر ہمیں کسی مسئلے کا حل نہیں ملتا تو ہم اس بارے میں قیاس واجتہاد سے کام لیتے ہیں اور اس اجتہاد پر اس زمانے کے سارے ہی علماء متفق ہو جاتے ہیں۔

ایسے قانون کو جس پر سب علماء متفق ہو جائیں، لازماً زیادہ قابلِ قبول قرار دینا پڑتا ہے۔ اجماع کو ہم ایک خاص اہمیت ضرور دیتے ہیں۔ لیکن کم از کم حنفی علماء کے نزدیک اجماع اٹل اور ناقابلِ تبدیل نہیں ہے، بلکہ ایک جدید تر اجماع کے ذریعے ایک قدیم تر اجماع کو منسوخ کیا جاسکتا ہے۔ جس طرح ایک نبی کے احکام کو دوسرا نبی منسوخ کر سکتا ہے۔ اسی طرح ایک فقیہ کی رائے کو دوسرا فقیہ رد کر کے اپنی علیحدہ رائے دے سکتا ہے۔ بنابریں اگر ایک قدیم اجماع کے بعد اس کی برعکس بات پر دوسرا جدید اجماع قائم ہو جائے تو وہ پہلے اجماع ہی کی طرح واجب التعمیل ہو جائے گا اور پرانا اجماع باقی نہیں رہے گا۔ یہ رائے ممتاز حنفی امام ابو الیسر البزدوی کی ہے۔ اصولِ فقہ پر ان کی مشہور کتاب میں ان کے الفاظ یہی ہیں کہ جدید تر اجماع کے ذریعے سے قدیم تر اجماع منسوخ کیا جاسکتا ہے۔ امام رازی کی بھی یہی رائے ہے۔ یہ اسلامی قانون کی ایک بہت بڑی خدمت تھی۔ چونکہ اجماع سے بنا ہوا قانون خدا اور رسول کی طرف سے آیا ہوا اٹل قانون نہیں، بلکہ انسانی رائے پر مبنی ہوتا ہے اس لیے اس کے ہمیشہ کے لیے پابند نہ ہو جائیں، بدلنے والے حالات کے تحت، بدلنے والی ضرورتوں کے تحت، ہم ایک انسان کے قانون کو دوسرے انسان کے قانون کے ذریعے بدل سکیں۔ ظاہر ہے کہ عام طور پر ہم یہی کہیں گے کہ اجماع کے خلاف زبان کھولنے کی جرات نہیں کی جاسکتی لیکن اس قاعدے کے تحت جو امام بزدوی نے بیان کیا ہے اولاً کسی نہ کسی کو پرانے اجماع کے خلاف زبان کھولنی اور پرانی رائے پر اعتراض کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ پھر بعد میں معاصر فقہا اس کی رائے کو قبول کرتے جائیں گے۔ جب سارے لوگ اس پر متفق ہو جائیں گے تو پرانا اجماع ختم ہو جائے گا۔

اب اپنے موضوع کے دوسرے جزء پر توجہ کرتا ہوں جو عدل گستری کے متعلق ہے۔ عہدِ نبویؐ کی عدل گستری کی اہمیت اور اس زمانے کی اصلاحات کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عدل گستری ک کیا نظام تھا؟ اس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ عہدِ نبویؐ میں کیا انقلاب آیا، کیا کایا پلٹ ہوگئی اور اس کی کتنی بڑی اہمیت ہے؟ زمانہ جاہلیت میں عرب کے بدوی قبائل میں کوئی حکمران، کوئی حکومت نہ تھی۔ کوئی عدالت بھی نہیں ہوا کرتی تھی۔ لہٰذا کسی شخص کو انصاف حاصل کرنے کے لیے کسی کے پاس جا کر شکایت کرنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ مظلوم کیا کرے؟ "دست خود دہان خود" ہر شخص اپنی بساط کے مطابق ظالم سے بدلہ لے گا۔ اگر ظالم کمزور ہو تو بدلہ آسان تھا لیکن اگر ظالم قوی ہو تو کمزور کے لیے کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ انصاف حاصل کر سکے۔ اس صورت حال میں کہیں کہیں ہمیں بہت ہی مدہم روشنی بھی نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ اگر ظالم منظور کرے تو کوئی خاطر مدار شخص ان دو آدمیوں کے جھگڑے کو چکائے گا۔ ایسی صورت میں اس پنچ یا ثالث کو ایک طرح کا عارضی حاکمِ عدالت بنالیا جاتا تھا۔ اور اس کے فیصلے پر فریقین عمل کرتے۔ اس کی کچھ مثالیں زمانہ جاہلیت میں ہمیں ملتی ہیں۔ طائف کے قریب عکاظ میں ایک میلہ لگا کرتا تھا، جس

میں بیرونی ممالک سے بھی لوگ آیا کرتے تھے۔ اس میلے کے لیے ایسے حکم مقرر کیے جاتے تھے جو دو تین دن کے لیے عارضی طور پر ہوتے تھے۔ جب تک میلہ لگا رہتا۔ اس وقت تک ان کی حیثیت حکم کی ہوتی۔ میلے میں جتنے تجارتی جھگڑے پیش آتے، ان کی طرف رجوع کیے جاتے اور وہ فیصلے دیتے تھے۔ ہر شخص جانتا تھا کہ کون حکم ہے، اس لیے لوگ اگر آپس میں طے کر چکے ہوں کہ اپنے مقدمے کا فیصلہ حکم سے کرائیں گے تو وہ میلے کا انتظار کرتے۔ میلے کے حکم کے پاس جاتے، اس کو اپنا قصہ سنا کر فیصلہ کراتے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ عرب میں، اس اندھیر نگری کے اندر بھی کہیں کہیں کچھ روشنی کی مثالیں ملتی ہیں۔ جہاں تک مکے کا تعلق ہے تو ہمیں وہاں شہر کے باشندوں کے جھگڑوں کو چکانے کے لیے تین چیزیں نظر آتی ہیں۔ ایک دیوانی عدالت جس کے حاکم عدالت خود حضرت ابو بکرؓ تھے۔ دوسری فوجداری عدالت، ان دونوں کے ایک علاوہ ایک اور ادارہ وہاں پایا جاتا تھا جسے حلف الفضول کا نام دیا گیا ہے Order of Chivalry کی صورت تھی۔ مکے والوں نے ایک زمانے میں یہ محسوس کیا تھا کہ ہمارے شہر میں بعض وقت اجنبیوں پر بے وجہ ظلم ہوتا ہے، جس سے شہر بھر کی بدنامی ہوتی ہے۔ چنانچہ واقعتہً ابو جہل کی وجہ سے ایک شخص نے ایک نظم کہی جس میں مکہ والوں کی ہجو کی۔ ابو جہل نے تو کوئی پرواہ نہ کی لیکن دوسرے اہلِ مکہ کو چوٹ لگی۔ ان حالات میں انہوں نے آپس میں جمع ہو کر معاہدہ کیا کہ ہم میں سے کم از کم چند لوگوں کو چاہیئے کہ رضاکارانہ طور پر اس بات کا اقرار کریں کہ جب بھی ہمارے شہر کے اندر کسی اہلِ مکہ یا کسی اجنبی پر اگر کوئی ظلم ہو تو ہم مظلوم کی مدد کریں گے اور اس وقت تک چین نہیں لیں گے جب تک کہ اسے اس کا حق نہ دلایا جائے۔

جہاں تک مدینہ کا تعلق ہے تو وہاں سوائے اس کے کوئی امکان نہ تھا کہ ہر شخص اپنی مدد آپ کرے۔ ان حالات میں رسول اللہ ﷺ کے مدینہ تشریف لانے کے بعد جب شہری مملکت قائم ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے اس کا دستور مدون فرمایا اور یہ دنیا کا پہلا دستور تحریری طور پر منضبط کر کے نافذ بھی کیا۔ اس میں ایک عجیب وغریب حکم دیا گیا جسے انقلابی نوعیت کا کہا جا سکتا ہے۔ وہ یہ کہ انصاف بجائے خود انفرادی کے مرکزی شئے ہوگی۔ یعنی اگر کسی کو نقصان پہنچا ہے تو وہ براہ راست مجرم کو سزا نہیں دے گا بلکہ مرکزی عدالت سے رجوع کرے گا۔ حاکمِ عدالت حالات سن کر بغیر رعایت کے پوری غیر جانبداری کے ساتھ مقدمے کا فیصلہ کرے گا۔ اور ظالم کو سزا دے کر مظلوم کو اس کا حق دلائے گا۔ اس کے بارے میں کچھ دفعات اور بھی ہیں۔ وہ یہ کہ کسی شخص کو ظالم کی حمایت کرنے کا حق نہیں ہوگا۔ چاہے اس کا اپنا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ فرض کیجئے کہ میرے بیٹے نے کسی کو قتل کر دیا ہو تو باوجود باپ ہونے کے مجھے یہ حق نہیں ہے کہ میں اپنے بیٹے کی حمایت کروں، اور پولیس کی طرف سے اس کی گرفتاری کے وقت مدافعت کروں۔ اس کے برخلاف یہ کہا

گیاہے کہ انصاف ایک خدائی حکم ہے۔ لہٰذا ہر شخص کو چاہئیے کہ انصاف کے لیے پورا تعاون کرے۔ اور کسی ظالم کو نہ بچائے، چاہے وہ اس کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

ان حالات میں ہم دیکھتے ہیں کہ مدینے کی حد تک ایک انقلابی حکم کر دیا گیا، اور انصاف جو وہاں انفرادی کام تھا اس کو ایک مرکزی اور حکومتی چیز قرار دیا گیا۔ اس کے بعد ہمیں مدینے میں دو نئے ادارے (انسٹی ٹیوشن) قائم ہوتے اور ترقی کرتے نظر آتے ہیں ، جو بعد میں سارے ملک میں پھیل جاتے ہیں۔ ایک مفتی کا انسٹی ٹیوشن ہے اور دوسرا قاضی کا۔ مفتی کا مطلب یہ ہے کہ وہ فتویٰ دے یعنی ہم اس سے قانون معلوم کریں۔ قانون کے نفاذ کی ذمہ داری اس کے فرائض میں داخل نہیں۔ دوسرا ادارہ قاضی کا ہے۔ عہدِ نبویؐ میں ہمیں قاضی بہت سے ملیں گے۔ لیکن شہر مدینہ میں مستقل قاضی کا پتا کم از کم مجھے نہیں ملتا۔ البتہ مثالیں متعدد ملتی ہیں کہ عارضی طور پر کسی ایک مقدمے کا فیصلہ کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کسی صحابی کو نامزد کرتے اور کہتے کہ فریقین کے بیانات کو سن کر یا بر سرِ موقع جا کر، حالات کو دیکھ کر فیصلہ کرو۔ گویا وہ رسول اللہ ﷺ کا ہی فیصلہ ہوتا تھا، کہ رسول اللہ ﷺ کے نمائندے اور مقرر کردہ نائب نے وہ فیصلہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹا سا دلچسپ واقعہ جو خاص اہمیت کا حامل ہے وہ حضرت عمرو بن العاصؓ کا ہے، جو مہاجرین میں بہت ذہین تھے اور قانونی نقطہ نظر سے ان کی مہارت بے انتہا تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے کہا کہ فلاں مقدمے میں تم فیصلہ کرو۔ وہ پوچھتے ہیں: "لیکن کس اساس پر؟" رسول اللہ ﷺ ان کے مفہوم کو سمجھ کر جواب دیتے ہیں کہ اگر تم صحیح نتیجے پر پہنچو گے تو تمہیں انصاف رسانی اور حق وعدل کی بنا پر دو ثواب ملیں گے۔ اس کے برخلاف اگر تم صحیح نتیجے پر نہ پہنچو تو اگر نا انصافی ارادۃً نہیں بلکہ اتفاقاً ہوئی ہو تو تمہاری حسنِ نیت کی وجہ سے تم کو ایک ثواب ضرور ملے گا کہ تم نے انصاف کرنا چاہا تھا، ان حالات میں ہم دیکھتے ہیں کہ قاضیوں کی آراء میں اختلاف ہوتا تھا۔ اس کا آغاز عہدِ نبویؐ ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ اور بعد کے زمانے میں بڑھتا جاتا ہے۔ چنانچہ امام ابو حنیفہؒ نے اپنے زمانے میں اسلامی قانون کو مدون کرنے کی جو کوشش کی تھی اور چالیس ممبروں کی ایک اکیڈمی بنائی تھی، جس نے اسلامی قانون کو مدون کیا، اس کی وجہ اور اس کا باعث یہی تھا کہ مختلف قاضیوں کے فیصلے میں تضاد ہوتا تھا۔ ایک ہی قسم کا مقدمہ ہو تو ایک قاضی "الف" فیصلہ کرتا ہے اور دوسرا قاضی اس کے بالکل برعکس "ب" فیصلہ کرتا ہے۔ چنانچہ ایک کتاب جس کا نام "رسالۃ الصحابہ" ہے، اور یہ ابن المقفع کا ایک خط ہے جو اس نے اپنے ہم عصر خلیفہ منصور کے نام لکھا تھا اور اس میں وہ تفصیل سے بیان کرتا ہے کہ امیر المومنین ہمارے زمانے میں قاضیوں کے فیصلوں میں اختلاف کے باعث بے انتہا دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ایک ہی مسئلے پر دو قاضی مختلف فیصلہ کرتے ہیں۔ ایک قاضی کے مطابق سزائے موت دینی چاہیئے دوسرے کے مطابق اس قسم کے مقدمے

میں سزائے موت نہیں دینی چاہئیے۔ اسی طرح ایک اور مقدمے میں، ایک قاضی کی رائے کے مطابق ایک خاص صورت میں طلاق پڑ چکی ہے۔ دوسرا قاضی کہتا ہے کہ طلاق نہیں ہوئی۔ غرض ہماری عزت و آبرو غیر محفوظ ہو چکی ہے۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ حق کیا ہے؟ ایسی مثالیں دے کر وہ ایک تجویز پیش کرتا ہے، جو میری دانست میں نامناسب تھی اور خلیفہ منصور نے بھی اسے رد کر دیا۔ اگرچہ بظاہر وہ معقول نظر آئے گی۔ اس نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ امیر المومنین سارے قاضیوں کے پاس احکام بھیجیں کہ اپنے فیصلوں کی نقلیں خلیفہ کے پاس اپنے اپنے دلائل کے ساتھ روانہ کیا کریں۔ اگر امیر المومنین کو اس میں کوئی نامناسب چیز نظر آئے تو وہ خود حکم دیں اور خلیفہ کا حکم بعد میں سارے قاضیوں کے لیے واجب التعمیل ہو جائے گا، اور ہمیں اختلافی نظائر سے نجات مل جائے گی۔ اور کسی مسئلے میں اختلافِ رائے ہو یا دو مختلف نظریے موجود ہوں اور قاضی کو معلوم نہ ہو سکے کہ کیا کرنا چاہئیے، تو صرف اپنی صوابدید کی بجائے امیر المومنین کے احکام کی تعمیل کر سکے گا۔ اور اس طرح سارے ملک میں قانون ہر وقت یکساں رہے گا۔ لیکن خلیفہ نے نہ صرف اس تجویز کو رد کر دیا بلکہ معلوم نہیں اس بناء پر یا کسی اور وجہ سے ابن المقفع کے قتل کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ اور اسے سزائے موت دے دی گئی۔ بہر حال میں نے آپ سے ایک قیاس ظاہر کیا تھا کہ اسلام میں ایک طرز، روش (Tradition) یہ رہی ہے کہ عہدِ نبویؐ سے لے کر آج تک عدالت کی طرح قانون سازی بھی حکومت اور سیاست کے تحت نہیں رہی۔ اگر خلیفہ منصور اس تجویز کو قبول کر لیتا تو اس کے بعد قانون سازی سیاست اور خلیفہ کے احکام کے تابع ہو جاتی۔ خلیفہ اچھے بھی آتے ہیں اور برے بھی۔ اس طرح آئے دن قانون بدلتے رہتے۔ ایک پرانے قانون کو نیا خلیفہ منسوخ کر دیتا۔ لیکن اگر اسلامی قانون حکومت اور سیاست کے عمل دخل سے آزاد رہے تو تمام فقہا مساوی درجہ رکھنے کے باعث ایک دوسرے پر اعتراض کر سکیں گے۔ اور اس طرح قانون صحیح تر بھی رہے گا اور ترقی پذیر بھی۔

یہ تھیں وہ چند باتیں، جن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ نبویؐ میں قانون سازی کا کیا طریقہ، اور عدل گستری کا کیا قاعدہ تھا؟ عہدِ نبویؐ میں صوبہ جات و اضلاع مثلاً یمن میں قاضی بھیجے جاتے اور ان کے متعلق بعض تفصیلیں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً ابو موسیٰ الاشعری کو جب قاضی بنایا گیا تھا تو ان کا تقرر نامہ ہم تک پہنچا ہے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کہتے ہیں میں تمہیں فلاں غرض کے لیے مامور کرتا ہوں۔ تم اس طرح سے اپنے فرائض انجام دیا کرنا۔ اسی طرح بعض اور قاضیوں کے متعلق بھی احکامات ملتے ہیں۔ یوں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس ابتدائی زمانے میں صفر سے شروع ہو کر اسلامی محکمہ قانون سازی اور اسلامی محکمہ عدل گستری کس طرح وجود میں آتے ہیں

اور کس طرح بعد کی ضرورتوں کو وہ پورا کرتے ہیں جب کہ اسلامی مملکت ایک شہر کے ایک جز میں پائی جانے والی مملکتِ مدینہ پر ہی نہیں بلکہ تین براعظموں میں پھیل جاتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## سوالات وجوابات

برادران کرام! خواہران محترم! السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ!

متعدد سوالات آپ کی طرف سے آئے ہیں، اپنی بساط کے مطابق جوابات دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

**سوال ۱:** اگر قانون سازی ایک نجی مسئلہ ہے تو پھر اسلامی مملکت میں قانون سازی کا کیا طریقہ کار ہو، وضاحت فرمائیے، اور قانون سازی کون لوگ کریں گے؟ اور اجماع کے بعد اس کے نفاذ کا کیا طریقہ ہو گا؟

**جواب:** ہماری روایت یہ رہی ہے کہ قانون سازی سرکاری مسئلہ نہ ہو، حکومت یا پارلیمنٹ کا مسئلہ نہ ہو، بلکہ ہر فقیہ کو کسی مسئلے کے متعلق اپنی رائے پیش کرنے کی آزادی رہے۔ حکمران سے یہ حق سلب کرنے کے باوجود کبھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ بہت ہی نادر صورتوں میں ہمارے خلفاء نے بعض احکام دیے۔ مثلاً حضرت عمرؓ نے احکام صادر کیے کہ مفتوحہ ممالک کو صرف فاتح فوج کے لیے مال غنیمت نہ سمجھا جائے بلکہ پوری امت کے لیے اور ہمیشہ کے لیے وقف قرار دیا جائے۔ اس طرح کے شاذ و نادر احکام حکومت کی طرف سے بے شک صادر و نافذ ہوتے رہے۔ لیکن عام قانون سازی کا کام ہمارے فقہا انفرادی طور پر کرتے رہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ مساوی مرتبے کا کوئی فرد رائے دیتا ہے تو میرے لیے یہ جسارت اور جرات کرنا ممکن ہے، کہ اس پر تنقید کروں اور اس کے خلاف رائے دوں۔ اس کے برخلاف اگر حکومت کا فیصلہ ہو تو ظاہر ہے کہ مجھے تذبذب ہو گا اور بعض اوقات یہ مشکل ہو گا کہ کسی جابر حاکم کے زمانے میں اس کے فیصلے کے خلاف زبان کھولوں۔ طریقہ کیا ہو؟ وہ میں بیان کر چکا ہوں۔ ہر فقیہ اپنی رائے بتاتا ہے۔ ابتدائی زمانے میں ہمارے قاضیوں کو آزادی ہوتی تھی کہ قرآن وحدیث کے مطابق جو چاہیں فیصلہ کریں۔ اگر قرآن وحدیث میں کوئی چیز نہ ملے تو فقہا کی رائے میں سے کسی رائے کا انتخاب کریں۔ اگر ان کے سامنے ایسی کوئی چیز نہ ہو تو بطور خود اجتہاد کریں اور فیصلے صادر کریں۔ اس طرح عملاً کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ قانون کے نفاذ کا کیا طریقہ ہو گا؟ ہمارے حکام عدالت اپنی صوابدید پر فیصلہ کیا کرتے اور پولیس کی مدد

سے اس کی تعمیل کرایا کرتے تھے۔ آیا اب بھی یہ مناسب ہے یا نہ مناسب؟ اس کے بارے میں صرف یہ کہوں گا کہ ہمارا قانون اس زمانے کے مقابلے میں جب امام ابو حنیفہ نے ایک اکیڈمی بنا کر اسلامی قانون کو مدون کرنے کی کوشش کی تھی، فقہی مذاہب کے ذریعے بہت زیادہ مفصل اور معین ہو چکا ہے۔ اور کم ہی ضرورت ہو گی کہ نئی قانون سازی کی جائے (قواعد کو دفعہ وار مدون البتہ کرائیں) مثلاً حنفی قانون کیا ہے؟ "ہدایہ"، "قدروی"، "مبسوط" نامی کتابوں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ دوسرے مذہبوں میں کہیں کہیں جزئی طور پر اختلاف ہے۔ یہ بھی ممکن ہے اور اس کی روایتیں بھی ملتی ہیں کہ جس ملک کا حاکم جس مذہب کا ہو، حنفی، شافعی یا مالکی، وہ اس کے مطابق حکم دے سکتا ہے کہ اس ملک کے سارے قاضی مثلاً حنفی قانون کے مطابق عمل کریں گے، چاہے ان کا اپنا مذہب کوئی دوسرا ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ ابو یوسف کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے عباسی خلافت کے قاضیوں کے پاس یہ احکام بھیجے تھے کہ وہ حنفی مذہب کے مطابق فیصلے کیا کریں۔ اور یاقوت لکھتا ہے کہ بعض قاضی جو معتزلی یا غیر حنفی تھے، وہ بھی مذہب سلطانی یعنی حنفی فقہ کے مطابق فیصلے کیا کرتے تھے۔

**سوال نمبر ۲:** اسلامی ملک میں غیر مسلم پر اسلامی قانون نافذ ہوتا ہے تو کیا ایک غیر اسلامی مملکت میں، غیر اسلامی قانون کی پابندی ایک مسلمان پر لازم ہے؟

**جواب:** سوال کا پہلا جزء غلط ہے کیونکہ اسلامی مملکت میں غیر مسلموں پر اسلامی قانون نافذ نہیں کیا جاتا۔ عہدِ نبویؐ میں قرآن مجید کے احکام کے تحت ہر مذہبی جماعت کو (عیسائیوں، یہودیوں وغیرہ) کو داخلی خود مختاری حاصل تھی، عقائد اور عبادات ہی کے متعلق نہیں بلکہ قانون و عدلیہ کے متعلق بھی۔ غیر اسلامی ممالک میں ایک مسلمان پر ایک غیر اسلامی قانون نافذ ہو گا۔ یہ نہیں ہونا چاہیے، لیکن چونکہ غیر اسلامی ممالک اس رواداری اور فراخ دلی کا اب تک مظاہرہ نہیں کر سکے جو اسلام میں ہے کہ ہر قوم کو داخلی خود مختاری دی جائے، لہٰذا اگر ہم غیر مسلم علاقے میں رہنا چاہتے ہیں تو یہ سوچ اور سمجھ کر، معلومات حاصل کر کے رہیں، کہ ہم پر وہاں یہ پابندیاں عائد ہوں گی۔ لیکن ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ مثلاً ایک فرانسیسی، ایک جرمن آج مسلمان ہو جائے تو کیا کرے؟ ظاہر ہے اگر اسے آپ ہجرت کرا کے اپنے ملک میں بلانا چاہیں تو دنیا کے کتنے ملک ہیں جو آج اس پر آمادہ ہوں کہ غیر ملک کے لوگ جب بھی چاہیں، یہاں پر بس جائیں۔ ان دشواریوں کا سوائے اس کے کیا جواب دیا جائے، "لا یکلف الله نفسا الا وسعھا۔۔۔" (۲: ۲۸۶) (اللہ کسی شخص کو اس بات پر مجبور نہیں کرتا جو اس کی استطاعت سے باہر ہو)۔ جس حد تک ممکن ہو وہ اسلام پر عمل کرے اور جس حد تک ممکن نہیں ہے اس پر اللہ اسے معاف کرے گا۔ لیکن یہ کوشش کرتا رہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے اسلامی قانون پر عمل کرے۔ مثلاً ایک

فرانسیسی کے لیے، فرانس کے قانونِ وراثت پر عمل کرنا لازم ہے جو حکومت کا معین کردہ ہے۔ جو نہ انجیل کا پابند ہے نہ توریت کا قانون ہے، نہ قرآن کا قانون، بلکہ انسانوں کا بنایا ہوا قانون ہے اور کوئی شخص اس سے مستثنیٰ نہیں۔ چاہے عیسائی ہو یا بے دین کمیونسٹ، یہودی ہو یا مسلمان، جو شخص بھی فرانسیسی قومیت اختیار کرتا ہے یا پیدائشی طور پر فرانسیسی ہوتا ہے، اس کے لیے قانون کی پابندی لازمی ہے۔ اس کا حل مل سکتا ہے۔ مثلاً فرانس میں وصیت اور ہبہ کی اجازت ہے۔ اگر میں یہ معلوم کرلوں کہ میرے جو قریبی رشتہ دار ہیں، بیوی، بیٹا، بھائی وغیرہ، قرآن نے ان کے کیا احکام معین کیے ہیں اور اس کے مطابق میں وصیت یا ہبہ کردوں تو ان کے ذریعے میں اسلامی قانون پر عمل کرسکتا ہوں، اگر عمل کرنا چاہوں۔

**سوال نمبر ۳:** آپ نے مماثلت کے ضمن میں چنگی کا ذکر فرمایا ہے۔ براہ کرم وضاحت کیجیے کہ کیا اسلامی مملکت میں مسلمانوں سے چنگی وصول کرنا درست ہے جب کہ اکثر علماء اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں؟

**جواب:** اس بارے میں مجھے زیادہ واقفیت نہیں کہ کس بنا پر اسے ناجائز قرار دیا جاتا ہے۔ کیونکہ میرا موضوع خصوصی انٹرنیشنل لاء رہا ہے۔ چنگی کے متعلق میں نہیں جانتا کہ وہ اسلام میں ممنوع ہے۔ اس بارے میں ممکن ہے صدر محترم آپ کی تشفی کرسکیں۔ البتہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ چنگی عہدِ نبویؐ میں بھی تھی، خلافتِ عمرؓ میں بھی تھی۔ یہ یاد رہے کہ اور ذرائع سے مسلمانوں سے رقم حاصل کرنا، ضرورت کے وقت جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً اگر ضرورتِ زمانہ سے زکوٰۃ کی آمدنی ہمارے لیے کافی نہ ہو، تو ہمیں بھی وسائل اختیار کرنے ہوں گے، اور ہماری رعیت کو ان حالات میں اپنی طرف سے کچھ زائد ٹیکس دینے پڑیں گے۔ آج کل ایک ایک ہوائی جہاز کی قیمت کروڑوں روپے ہونے لگی ہے۔ اب اگر ہم ہوائی جہاز رقم فراہم نہ کریں، کیونکہ زکوٰۃ کی رقم ناکافی ہے، تو ہماری زندگی ہی خطرے میں پڑ جائے گی۔ لہٰذا ہم خوش دلی کے ساتھ اپنی مدد اور حفاظت کے لیے کچھ زائد ٹیکس دینے کے لیے تیار ہوجائیں گے۔ ان حالات میں میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کوئی عملی دشواری نہیں رہتی۔

**سوال ۴:** وکیل کی اسلامی نقطہ نظر سے وضاحت کیجیے۔

**جواب:** عہدِ نبویؐ میں آج کل کی طرح پیشہ ور وکیل نہیں پائے جاتے تھے لیکن مجھے قرآن مجید (۴: ۱۰۹) میں اس کی طرف کچھ اشارہ ملتا ہے۔ ایک آیت ہے کہ "قیامت کے دن کافروں کی طرف سے اللہ سے کون جھگڑا کرے گا؟" تو آج کل کے وکیل کو میں اصولاً اور اساساً ممنوع نہیں قرار دیتا۔ کیونکہ عام کلیہ و قاعدہ ہے جس کا ذیل آیت میں اشارہ ہے۔ احل لکم وراء ذلکم ---(۴: ۲۴) یعنی

پہلے چند چیزیں بتائی گئی ہیں کہ یہ حرام ہیں۔ پھر اس کے بعد ہے، "اس کے علاوہ جتنی چیزیں ہیں، وہ تمہارے لیے حلال ہیں۔" فرض کیجئے کہ وکیل کی ممانعت نہ ہو تو ہمارے لیے جائز ہو جائے گا، چاہے وہ عہدِ نبویؐ میں غیر موجود ہو۔

**سوال۵:** زکوٰۃ اور عشر کی موجودگی میں دیگر درجنوں ٹیکسوں کو بالخصوص دیہی علاقوں میں تھوپ دینا، کہاں تک اور کیونکر جائز ہے؟ مفصل وضاحت کریں۔

**جواب:** اگر ملک کی ضرورتیں زکوٰۃ اور عشر سے پوری نہیں ہوتیں تو اپنی مدد آپ کے تحت دین کی حفاظت کے لیے زائد رقم دینا پڑے گی۔ ورنہ وہ خودکشی ہوگی۔ اور اللہ فرماتا ہے "ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکہ" (۲: ۱۹۷) (اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو)۔ اس کا شانِ نزول ہمارے مفسر مالی بخل ہی بیان کرتے ہیں۔

**سوال۶:** عدلیہ میں وکیل کا کردار فوجداری اور دیوانی کہاں تک درست اور مفید ہے؟

**جواب:** اس کا ابھی ابھی اشارۃً جواب دے چکا ہوں۔ وکیل کا منشاء اصل میں یہ نہیں ہوتا کہ چوروں اور ڈاکوؤں کی مدد کرے۔ اس کے فرائض کی اساس یہ ہے کہ جس چیز سے اس کو خصوصی تعلق ہے، یعنی ملکی قوانین سے واقفیت، اس واقفیت سے وہ اپنے مؤکل (client) کو مدد پہنچائے اور اسے بتائے کہ قانون کی روشنی میں وہ کس حد تک اور کیا حق رکھتا ہے۔ قانونی نقطہ نظر، قانون کی ٹیکنکل باتوں کو عدالت کے سامنے واضح کرنے کے لیے وکیل کی ضرورت ہے۔ اس لیے ہم اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس کا کردار یہی ہونا چاہیئے کہ حق کی تائید کرے۔ یہ نہیں کہ حق کو چھپائے اور عمداً ظالموں اور مجرموں کی مدد کرے۔

**سوال۷:** کیا اسلام میں موجودہ دور کے الیکشن یعنی جمہوریت کا تصور موجود ہے جس میں انسانوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے؟

**جواب:** اس کا جواب میں یہ دوں گا کہ جس چیز کی ممانعت نہ ہو، وہ عام طور پر حلال اور جائز ہوتی ہے۔ عہدِ نبویؐ میں لوگوں کو گنا نہیں جاتا تھا۔ لیکن اگر ہم گنیں تو اس کی ممانعت بھی عہدِ نبویؐ میں نہیں ملتی۔ اچھے لوگوں کا انتخاب کرنا آپ کے بس میں ہے۔ محض لفاظی کرنے والے ایسے شخص کو، جس کا کردار ٹھیک نہیں ہے، اگر آپ پارلیمنٹ کا ممبر بنائیں تو اس شخص کا اتنا قصور نہیں ہوگا جتنا کہ آپ کا اپنا قصور ہوگا۔ لہٰذا آپ اپنے فرائض پر غور کریں اور ایسے لوگوں کو ووٹ دیں، جو آپ کی رائے میں اچھے کردار کے مالک ہوں۔ اس ملک کی صحیح خدمت کرسکتے ہوں۔ اور آپ کے جذبات کی بھی اچھی ترجمانی کرسکتے ہوں۔

**سوال ۸:** اسلامی ممالک میں، جہاں اسلامی قوانین نافذ ہیں، کیا ان ممالک کے سربراہ خلیفہ یا امیر المومنین کہلا سکتے ہیں؟ کیا ان کی اطاعت اس صورت میں بھی ضروری ہے، اگر ان میں مسلمان حکمرانوں کے اوصاف نہ پائے جاتے ہوں؟

**جواب:** میرے خیال میں زیادہ بہتر یہ ہو گا کہ ہم اپنی ذاتی چیزوں پر توجہ کریں۔ اور غیروں کے معاملات میں دخل نہ دیں، جب کہ وہ ہمارے امکان اور دسترس سے بھی باہر ہیں۔ اگر فلاں ملک کا حکمران فلاں کام کرتا ہے تو ہم اس معاملے میں کیا کر سکتے ہیں؟ اس لیے ہمیں اپنے فرائض پر توجہ کرنا زیادہ مناسب ہو گا۔ رہا یہ سوال کہ ان کو خلیفہ یا امیر المومنین کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟ اس کا حکم قرآن و حدیث میں نہیں ہے کہ کس کو خلیفہ کہنا چاہیئے، کس کو امیر المومنین کہنا چاہیئے۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ ساری مسلم قوم و ملت کا جو مشترکہ اور مسلمہ سردار ہوتا ہے اسی کو ہم خلیفہ اور امیر المومنین کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ جو علاقہ دار سردار ہوتے ہیں مثلاً شام، مصر، فلسطین وغیرہ چھوٹے چھوٹے علاقے خود مختار رہنا چاہتے ہیں تو روایت کے تحت ہم ان کو خلیفہ یعنی امیر المومنین نہیں کہتے لیکن اگر وہ کہلوانا چاہیں تو ممانعت بھی نہیں ہے۔ اور یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسے بہت سے مدعی پائے جاتے رہے ہیں۔ مثلاً ابھی دس سال پہلے کی بات ہے جب یمن میں جمہوریت قائم نہیں ہوئی تھی وہاں کا حکمران "امام" کے نام سے موسوم ہوتا تھا اور اہل ملک اسے امیر المومنین اور خلیفہ کہا کرتے تھے۔ اسی طرح مراکش کے حکمرانوں کو آج بھی خلیفہ یا امیر المومنین کا نام دیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ دعوے ان کی اپنی سلطنت کے حدود کے باہر تسلیم نہیں کیے جاتے۔

**سوال ۹:** کیا موجودہ دور کی جمہوریت اسلامی تقاضوں کو پورا کرتی ہے؟ اگر یہ جمہوریت اسلامی تصور کے عین مطابق نہیں تو اسلامی ممالک میں اس کے نفاذ سے کیا تبدیلیاں لانا ہوں گی؟ حالانکہ اسلام نے ایک جاہل آدمی اور صائب الرائے کو برابر قرار نہیں دیا۔

**جواب:** اسلام میں کوئی معین طرز حکومت نہیں پایا جاتا۔ رسول اکرم ﷺ نے میری دانست میں عملاً اس بارے میں کوئی صراحت نہیں کی کہ میرے بعد کون جانشین ہو گا۔ اس کا منشاء یہ تھا کہ ہر اسلامی جماعت، ہر اسلامی گروہ اور اسلامی مملکت، اپنے زمانے کی ضرورتوں کے لحاظ سے خود کوئی حکم دے، اس طرح وہ حکم ابدی نہیں ہو گا۔ جب تک ہم چاہیں گے، وہ طریقِ حکومت رائج رہے گا اور جب ہم اسے مضر پائیں گے، اسے تبدیل بھی کر سکیں گے۔ اس کے برخلاف اگر ہمیں رسول اللہ ﷺ خود ہی معین فرما دیتے کہ بادشاہت ہونی چاہیئے یا جمہوریت یا کوئی اور نظامِ حکومت، اس طرح ہمارے ہاتھ بندھ جاتے اور قیامت تک ہم اس کی خلاف ورزی نہ کر سکتے۔ غالباً رسول اللہ ﷺ نے امت کی بہتری اسی میں پائی کہ اس بارے میں ان پر پابندی عائد نہ کی جائے۔ ان حالات میں

جمہوریت بھی ہمارے لیے کارآمد ہو سکتی ہے اور بادشاہت بھی۔ کوئی تیسرا طریقِ حکومت بھی کارآمد ہو سکتا ہے۔ صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ افسرانِ حکومت اللہ سے ڈریں۔ یہ فریضہ صرف انہی کا نہیں ہے، ہمارا اپنا بھی ہے۔ ایک مرتبہ خلیفہ مامون سے ایک شخص نے اعتراض کے طور پر کہا تھا کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایسا ہوتا تھا، تم ایسا کرتے ہو۔ اس نے ایک میٹھا سا جواب دیا کہ اگر مجھے حضرت عمرؓ کے زمانے کے عوام مل جائیں تو میں بھی ویسا ہی کروں۔

**سوال۱۰:** کیا اسلامی نظامِ عدل میں اپیل کی گنجائش رکھی گئی ہے؟ مثالیں دے کر وضاحت فرمائیں۔

**جواب:** عہدِ نبویؐ میں خاص صراحت کے ساتھ کوئی مثال نہیں ملتی لیکن بعد کے زمانے میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ قاضی کے حکم کے خلاف یا والی کے حکم کے خلاف لوگ امیر المومنین یا خلیفہ کے پاس شکایت لے کر جاتے تھے اور بعض اوقات خلیفہ ان کی شکایت سن کر والی کے احکام یا قاضی کے احکام بدلا بھی کرتا تھا، خلیفہ کے پاس آتے ہیں اور شکایت کرتے ہیں یا امیر المومنین ہمارا گورنر یا والی بہت ظالم ہے۔ خلیفہ ظاہر داری کے طور پر خفا ہوتا ہے کہ کیسے؟ میں اس سے شخصاً واقف ہوں وہ عدل مجسم ہے تم کیسے اس کی شکایت کر سکتے ہو؟ اس پر ایک بوڑھا کسان ادب کے ساتھ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھ کر خلیفہ کے پاس جاتا ہے اور ہاتھ جوڑ کر عرض کرتا ہے کہ اگر وہ عدل مجسم ہے تو اس سے صرف ہمیں مستفید نہیں ہونا چاہیئے، ضرورت ہے کہ سارا ملک مستفید ہو۔ لہٰذا اس کے ٹکرے ٹکرے کرکے ہر علاقے میں ایک ایک ٹکڑا بھیج دیں۔ خلیفہ ہنس پڑا اور اسے معزول کر دیا۔

**سوال۱۱:** اجماعِ امت کے متعلق آپ نے فرمایا کہ جدید اجماع، قدیم اجماع کو ختم کر سکتا ہے، اور کوئی معین نظیر اب تک معلوم نہیں ہو سکی۔ غالباً یہ بہت ہی احتیاط کا مقام ہے۔ اجماع کا ٹوٹنا بہت سے نئے مسائل پیدا کر سکتا ہے۔ بتایئے جو لوگ اجماع کی تنسیخ کو نہیں مانتے کیا وہ درست ہیں؟

**جواب:** ممکن ہے آپ کی رائے صحیح ہو۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ ایسا کیجئے۔ میں نے کہا کہ ہمارے ایک نہایت مستند، ایک نہایت قدیم فقیہ نے جن کا حنفی مذہب میں بہت بڑا درجہ ہے، ایک اصولی قاعدہ بتایا ہے کہ اجماع بدل بھی سکتا ہے۔ قرآن و حدیث میں حکم نہ ملنے کے زمانے میں لوگوں نے اپنے اجتہاد سے، اپنی رائے سے ایک نئی بات معلوم کی، پھر دوسرے لوگ اس پر متفق ہو گئے تو وہ حکم واجب التعمیل ہو گیا۔ لیکن یہ انسانی قانون ہے۔ خدائی یا رسول اللہ ﷺ کا قانون نہیں ہے۔ لہٰذا بعد کے زمانے میں مساوی درجے کے انسانوں کو ہی حق ہو گا، کہ سوچیں اور بدلے ہوئے حالات کے پیشِ نظر کوئی نئی رائے دیں۔ اس رائے پر سب لوگ متفق ہو جائیں تو یہ

بھی اجماع ہی ہوگا۔ پرانے اجماع کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔ بلکہ یہی نیا اجماع ہوگا جس پر سب لوگ عمل کریں گے۔ اس سے کچھ دشواریاں پیش آئیں گی یا نہیں، یہ کہنا میرے لیے مشکل ہے۔ میری رائے میں اگر کوئی قانون سابقہ اجماع کی بناء پر بنا تھا اور وہ ناقابلِ عمل ہے تو اس کو نہ بدلنا میرے خیال میں زیادہ دشواریاں پیدا کردے گا۔ سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ہم اس قانون کو بدلیں، ایک نیا قانون بنائیں اور وہ بھی اجماع ہی کے ذریعے سے بنائیں۔ یہ بھی نہ بھلایئے کہ اجماع ہونے کا محض دعویٰ کافی نہیں، ثبوت بھی چاہیئے اور وہ آسان نہیں۔

**سوال ۱۲:**- معاذ بن جبلؓ کا حضورؐ کی زندگی میں قیاس کرنا جب کہ قرآن بھی نامکمل تھا اور دین بھی، کیا ایسا ہی اس زمانے میں بعد از تکمیلِ قرآن و دین، جائز ہے؟

**جواب:** چاہے قرآن ۹ ہجری میں جب معاذ بن جبلؓ کا واقعہ پیش آیا۔ سو فیصد مکمل نہ ہو چکا ہو بلکہ ۹۰ فیصد یا ۸۰ فیصد، اسی طرح حدیث کا ۱۰۰ فیصد نہیں بلکہ ۸۰ فیصد، ۹۰ فیصد، قرآن و حدیث کا جو کچھ حصہ مکمل ہو چکا تھا، دونوں میں کچھ نہ ہو تو اجتہاد کی اجازت تھی۔ اس کا اطلاق اس وقت بھی ہوگا جب قرآن کا سو فیصد حصہ اور حدیث کا سو فیصد حصہ مکمل ہو چکا ہو، اور اس میں کسی قاضی، کسی مفتی اور کسی عالمِ فقہ کو کوئی حکم نہ ملے تو اس کا حل رسول اللہ ﷺ نے بتا دیا ہے کہ اگر کوئی چیز قرآن و حدیث میں نہ ملے اور مشورہ کرنے کے بعد تمہارے فاضل دوست بھی نہ بتا سکیں کہ اللہ و رسول کا کیا حکم ہے تو ان حالات میں اجتہاد کرنا چاہیئے۔ اور اجتہاد کے ذریعے سے جو حکم دیا جائے اور وہ اللہ کی عنایت سے ہمارے ذہنوں میں آئے، تو اسے ہم اللہ کی مرضی کے مطابق ہی سمجھیں گے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے خود فرمایا کہ اے اللہ تیرے رسول کے رسول نے جو جواب دیا ہے اس سے تیرا رسول خوش ہے تو ہم اس اجازت کو رد نہ کریں بلکہ ہمیں اس پر خوش ہونا چاہیئے کہ خدا نے ہمیں یہ سہولت اپنے رسولؐ کے ذریعے عطا فرمائی۔ ظاہر ہے کہ قرآن یا حدیث میں کوئی حکم مل جائے تو پھر اجتہاد کی اجازت نہیں رہتی لیکن مفسروں کی فہم کے اختلاف کے باعث مختلف معنی لیے جا سکتے ہیں۔ اسی لیے حضرت عمرو بن العاصؓ کے سوال پر رسول اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ مجتہد سے ناخواستہ یا نادانستہ خطا ہو تو بھی اللہ اس کو اجر دیتا ہے۔

**سوال ۱۳:** کیا اسلامی قانون کو موجودہ حالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش ہو رہی ہے یا نہیں؟ اگر ایسا نہیں ہو رہا تو آخر ملتِ اسلامیہ کس وقت کا انتظار کر رہی ہے؟ اور آپ جیسے قابل لوگ حکومتوں کو اس قسم کے مشورے دے کر، قانون کو موجودہ حالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے، جب کہ قوم یا ملت کے ہزاروں نوجوان اس کی وجہ سے اسلام سے دور جا رہے ہیں۔

**جواب:** غالباً آپ کو علم ہو گا کہ دنیا میں کہیں بھی اجنبیوں کو کسی ملک کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کی اجازت نہیں ہوتی۔ میں بطور مسلمان آپ کا بھائی ضرور ہوں لیکن آپ کی حکومت کی رعیت نہیں ہوں۔ مجھ سے آپ بطور طالب علم کے پوچھیں، حکومت بطور مشیر پوچھے، میں اپنی رائے دوں گا۔ اس سے زیادہ نہ میرے فرائض ہیں نہ میرے امکانات۔ باقی یہ کہنا کہ آج کل اسلامی قانون کے نفاذ کی کوشش نہیں ہو رہی، میری رائے میں درست نہیں۔ جہاں تک میری معلومات ہیں، کوشش ہو رہی ہے۔ کچھ چیزیں ہو چکی ہیں اور کچھ زیرِ تکمیل ہیں۔ اور بہت خوشی کی بات ہے کہ یہاں رعیت بھی وہی چیز چاہتی ہے جو حکمران چاہتا ہے۔ اور ممالک میں آپ دیکھیں گے کہ رعیت تو چاہتی ہے مگر حکمران نہیں چاہتا۔ ان کے مقابلے میں آپ کو شکر ادا کرنا چاہئیے کہ آپ کو ایسا حکمران ملا ہے جس کی یہ تمنا ہے کہ اسلامی قانون نافذ کرے۔ دوسرے ممالک میں تو لوگ علی الاعلان کہتے ہیں کہ اسلامی قانون ایک پرانا قانون ہے۔ ہمیں جدید زمانے میں، جدید چیزوں پر عمل کرنے کی ضرورت ہے، چودہ سو سال پہلے کے قانون پر عمل نہیں کرنا چاہئیے۔ ان کے مقابلے میں، میری رائے کے مطابق، آپ خوش قسمت ہیں۔

**سوال ۱۴:** آپ نے فرمایا کہ قانون سازی کو پرائیویٹ رہنا چاہئیے۔ اس صورت میں شوریٰ کے قانون کی کیا حیثیت ہو گی؟ جب کہ شوریٰ نظام مملکت چلا رہی ہو۔ نیز اس صورت میں قوانین کے عوامی اختلاف کا کیا حل ہو سکتا ہے؟

**جواب:** میں صورتحال آپ کو بتا چکا ہوں کہ اس کی دو نوعیتیں ہیں۔ حکومت (حکمرانِ ملک) وزیر یا کوئی قاضی بھی کسی صحیح نتیجے پر پہنچنا چاہتا ہو اور خواہش مند ہو کہ اور لوگ بھی اسے مدد دیں تو وہ لوگوں سے مشورہ کرتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے قاضیوں کو مشورہ دیا ہے کہ فیصلہ کرنے سے پہلے اہلِ علم سے مشورہ کرو۔ میں سمجھ نہ سکا کہ شوریٰ کے کس معنی کے متعلق آپ مجھ سے سوال کر رہے ہیں؟ اور ان دونوں میں مجھے کوئی تضاد نظر نہیں آتا۔ حکومت بھی مشورہ کرے گی مثلاً اپنے وزیروں سے، اپنے پارلیمنٹ سے، اسی طرح حاکمِ عدالت بھی مشورہ کرے گا۔ اسی طرح ہم آپ اپنے پرائیویٹ معاملات میں بھی مشورہ کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ خود رسولِ خدا ﷺ بھی ایسا کیا کرتے تھے۔

**سوال ۱۵:** ایسی صورت میں قانون دانوں کی آراء میں اختلاف کا کیا حل ہو سکتا ہے؟

**جواب:** میں آپ پر واضح کر چکا ہوں کہ ان دشواریوں کا اسلام کے ابتدائی زمانے میں کوئی حل نہ تھا۔ لیکن جب سے حنفی، شافعی، مالکی قانون وغیرہ پیدا ہو گئے یعنی معین ہو گئے تو اب نئے قوانین بننے کا امکان بہت کم رہ گیا ہے مثلاً قانونِ شہادت کے سلسلے میں یہ سوال

پیدا ہوتا ہے کہ صرف دعوے کی اساس پر حاکمِ عدالت کو فیصلہ کر دینا چاہئیے؟ اس بارے میں حدیث، مفتیوں اور مجتہدوں کی رائے کی بنا پر یہ کہہ دیا گیا کہ مدعی کو ثبوت پیش کرنا ہو گا۔ اور مدعا علیہ اس سے انکار کر سکتا ہے، جب تک اس کے خلاف دعویٰ ثابت نہ ہو جائے۔ اس کے بعد آپ نیا قاعدہ کیا بنائیں گے؟ "البینۃ علی المدعی" کا قاعدہ ہمارے پاس مثلاً امام ابو حنیفہ نے یا امام شافعی نے دیا اور وہ موجود ہے تو ہم اس موضوع پر کوئی نیا اجتہاد کر ہی نہیں سکتے۔ اگر کریں تو ہم بھی وہی رائے دیں گے۔ کسی فقیہ کی رائے سے اختلاف کرنے کی کوئی ممانعت نہیں۔ قابل قبول دلیل کے ساتھ نئی رائے دیجئے تو خود پر انا فقیہ بھی، اگر وہ زندہ ہو تو، اسے خوشی سے قبول کرلے گا۔ فرضی بحث سے فائدہ نہیں۔

**سوال ۱۶:-** سورۃ فاتحہ امام کے پیچھے جائز ہے یا نہیں؟ وضاحت سے بیان فرمایئے۔

**جواب:** غالباً آپ کو معلوم ہو گا کہ اس بارے میں آئمہ کی رائے میں اختلاف ہے، مثلاً امام شافعی کہتے ہیں کہ اس کو پڑھنا ضروری ہے۔ بعض دیگر امام مثلاً امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ اس کے پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ اور دونوں کے پاس دلیلیں ہیں۔ ایک چھوٹی سی چیز آپ میں سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ میں اس وقت جماعت میں شریک ہوتا ہوں جب کہ امام رکوع میں جا رہا ہو، اور میں بھی رکوع میں فوراً چلا جاتا ہوں۔ میری نماز پوری ہو جاتی ہے تو ان حالات میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا واجب نہ ہو گا۔ اگر میں انفرادی طور سے نماز پڑھوں تو بے شک واجب ہے لیکن جماعت کی نماز میں، میں کہہ سکتا ہوں کہ پڑھیں تو بہتر ہے، نہ پڑھیں تو بھی جائز ہے۔ حدیث میں آتا ہے: "لا صلوۃ الا بفاتحۃ الکتاب" کوئی نماز درست نہیں ہو گی جب تک اس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے۔ مگر اس کے معنی امام ابو حنیفہ یہ فرمائیں گے کہ اگر آدمی تنہا نہ پڑھ رہا ہو اور اس کا امام پڑھ لے تو وہ سب کی طرف سے پڑھنا ہو گا۔ چنانچہ ایسے واقعات پیش بھی آئے۔ بہت سے لوگ امام ابو حنیفہ کے مکان پر ہجوم کرتے اور ان کو مارنا چاہتے ہیں کہ تم اس حدیث کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔ امام ابو حنیفہ نے ان شورشیوں سے کہا کہ تم اپنا ایک نمائندہ منتخب کر لو تاکہ اس سے بات کر سکوں، سارے لوگوں سے گفتگو ممکن نہیں۔ بے سوچے سمجھے انہوں نے منظور کر لیا۔ اور ایک شخص کو نمائندہ بنا کر بھیج دیا۔ امام ابو حنیفہ نے کہا کہ تمہیں اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ جس طرح تم اپنی پوری جماعت کے نمائندے ہو، اسی طرح امام بھی سب مقتدیوں کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اس طرح سے وہ لوگ جو خارجی مذہب کے تھے، چپکے سے چلے گئے اور انہوں نے کوئی فساد نہیں کیا۔ بہر حال میں دہراتا ہوں کہ اس بارے میں فقہی مذاہب میں اختلاف ہے۔ لہٰذا ہر شخص کو اپنے مذہب کے مطابق ہی عمل کرنا چاہئیے تاکہ اسے اچھا مسلمان سمجھا جا سکے۔ آپس میں لڑائی جھگڑا نہیں کرنا چاہئیے۔

**سوال ۱۷:-** حضور پاک ﷺ غیب جانتے تھے یا نہیں؟

**جواب:-** مجھے شخصی طور پر تو اس کا علم نہیں لیکن مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ غیب کی جس چیز سے اللہ پیغمبر کو واقف کراتا ہے، وہ جانتے تھے۔ جو غیب کی چیز اللہ اپنے لیے مخصوص رکھتا ہے، اس کا جاننا پیغمبر کے لیے بھی ناممکن ہوتا ہے۔

**سوال ۱۸:-** حضور پاک ﷺ نور تھے یا بشر؟

جواب: اس کا جواب آسان ہے خود قرآن میں ذکر آیا ہے " اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ " (۴۱ :۶) (میں بھی تمہارے جیسا بشر ہوں) تو قرآن پاک کی صراحت کی موجودگی میں کوئی اور جواب نہیں دیا جا سکتا۔

**سوال ۱۹:-** انگوٹھا چومنا جائز ہے یا نہیں؟

**جواب:** غالباً یہ سوال اس سلسلے میں کیا گیا ہے کہ جب اذان ہو رہی ہو اور محمد رسول اللہ ﷺ کا لفظ مؤذن متواتر دہراتا ہے تو بعض لوگ اپنے انگوٹھے کا ناخن چوم کر آنکھوں پر ملتے ہیں۔ اس بارے میں شخصی طور پر ابھی مجھے کسی تلاش کا موقع ملا نہیں لیکن میرے اپنے ایک استاد نے جو بہت فاضل شخص تھے، ایک بار ہم سے کہا تھا کہ اس بارے میں حدیثیں ملتی ہیں، تو میں نے اس پر اکتفا کیا۔ اور اس میں مجھے کوئی حرج نظر نہیں آتا کیونکہ آدمی کو کسی سے عشق ہو تو اس کا کوئی قاعدہ نہیں ہوتا، وہ انفرادی قانون ہوتا ہے۔ کوئی شخص اپنی محبت کا اظہار کسی کے سر کو چومنے سے کرتا ہے، کوئی اس کے ہاتھ کو چومنے سے اور کوئی قدموں کو چومنے سے کرتا ہے۔ یہ ہر شخص کی انفرادی چیز ہے، اور میری رائے میں ان انفرادی معاملات میں ہمیں دخل نہیں دینا چاہیئے۔ ہاں ممنوع چیزیں مثلاً غیر اللہ کو سجدہ کریں، ایسا نہ ہونا چاہیئے۔

**سوال ۲۰:-** رفع الیدین جائز ہے یا نہیں؟

**جواب:** اس کا جواب بہت آسان ہے۔ اس بارے میں آئمہ میں اختلاف ہے، جس کی اساس یہ معلوم ہوتی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے کبھی یوں فرمایا اور کبھی یوں فرمایا، لہٰذا دونوں سنت نبوی ہیں۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا، اپنے بچپن کا ایک واقعہ، کہ میں چھ سات برس کا تھا، صدر مدرس ہماری کلاس میں آئے اور یہ معلوم کیا کہ یہ ہندو ہے یا مسلمان، شیعہ ہے یا سنی، حنفی ہے یا شافعی وغیرہ۔ پھر وہ ہم مسلمان طلبہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے، بچو! مذہب (مسلک) کے فرق کی بنا پر آپس میں کبھی نہ جھگڑو۔ ہر مذہب کا شخص اپنے امام

کے بتائے ہوئے احکام کے مطابق عمل کرتا ہے اور انہوں نے ایک جملہ کہا جو میں باوجود ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے اب تک نہیں بھول سکا۔ وہ جملہ یہ تھا کہ اللہ کو اپنے حبیب رسولِ اکرم ﷺ سے اتنی محبت تھی کہ ان کے ہر عمل، ان کی ہر حرکت کو قیامت تک باقی رکھوانا چاہتا تھا۔ اگر رسول اللہ ﷺ کی صرف ایک حرکت پر سب مسلمان عمل کریں تو اسی رسول کی ایک دوسری حرکت غائب ہو جائے گی۔ لہٰذا خدا نے اپنے حبیبؐ کی ہر ہر حرکت کو محفوظ رکھنے کے لیے مختلف آئمہ، مختلف مذاہب کے ذریعے اس کی بقا کا انتظام کیا۔ کبھی یہ نا سمجھنا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے احکام کے خلاف ہے۔ وہ بھی اللہ کے رسول ﷺ کا عمل ہے اور یہ بھی رسول اللہ ﷺ کا عمل ہے۔

# خطبہ ۱۱: عہدِ نبویؐ میں نظامِ مالیہ و تقویم

محترم صدر! محترم ڈین! محترم مہمانانِ گرامی!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

الحمدللہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علیٰ سید المرسلین و آلہ واصحابہ اجمعین!

آج کا موضوع مالیات سے متعلق ہے۔ یہ اس بناء پر ایک اہم موضوع ہے کہ قرآن مجید میں مال کو انسانیت کی بقاء اور انسانیت کے قیام کا وسیلہ قرار دیا گیاہے۔"أَمْوَٰلَكُمُ ٱلَّتِي جَعَلَ ٱللَّهُ لَكُمْ قِيَٰمًا" (۴:۵) اس لحاظ سے قرآن میں ہی اس چیز کا اب سے چودہ سو سال پہلے ذکر آچکا ہے کہ مال کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر زمانہ حال میں لوگوں کو یہ کہا جاتا ہے کہ مال کی بڑی اہمیت ہے اور دین اس سے غفلت برتتا ہے۔ لہذا کمیونسٹ بننا چاہیئے تو میں کہوں گا کہ اب سے چودہ سو سال پہلے مسلمانوں کو ان کے دین نے یہ بتادیا تھا کہ زندگی ایک دن بھی مال کے بغیر نہیں گزر سکتی۔ البتہ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ پرانے ادیان کی پالیسی اور اسلام کی پالیسی میں کیا فرق پایا جاتا ہے تاکہ ہمیں یہ معلوم ہو کہ آیا اسلامی احکام بہتر ہیں یا نہیں، اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی چیز کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراؤں گا اور وہ ایک طرح سے معذرت ہوگی۔ اسلامی مالیات پر ہمارے فقہا نے نہایت قدیم زمانے سے ہی بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ مثلاً امام ابو یوسف کی کتاب "الخراج" یحیٰی ابن آدم القریشی کی کتاب "الخراج" ابو عبید قاسم بن سلام کی کتاب "الاموال" اور اسی طرح کی اور کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ کئی ایک چھپ بھی چکی ہیں۔ میں ان ساری کتابوں کے مؤلفوں کا پورا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے عرض کروں گا کہ ان میں ایک کوتاہی نظر آتی ہے، وہ یہ کہ انہوں نے تاریخی نقطہ نظر کو ملحوظ نہیں رکھا۔ یعنی یہ کبھی نہیں بتایا کہ عہدِ نبویؐ میں مالیات کے متعلق ابتدائی صورت یا ہجرت سے پہلے مکہ میں کیا صورت تھی، مدینہ آنے کے بعد ابتداء کیا تھی، رفتہ رفتہ کیا تبدیلی ہوئی اور بالآخر

اس نے کیا صورت اختیار کی؟ ان باتوں کا وہ کہیں بھی ذکر نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات ہمارے دلوں میں خلش رہ جاتی ہے۔ مثلاً ہمارے مؤرخ اور فقہاء بھی کہتے ہیں کہ زکوٰۃ ۹ ہجری میں فرض ہوئی "آمنا و صدقنا" لیکن آپ قرآن مجید کی مکی سورتوں میں بھی لفظ زکوٰۃ کا استعمال پاتے ہیں تو مسئلہ الجھ جاتا ہے۔ میں اسی مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کروں گا کہ عہدِ نبویؐ میں مالیہ کا کس طرح آغاز ہوا۔ باقی تفصیلات پر ضخیم کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ اگر یہ سب تفصیلات بیان کرنا چاہوں تو کئی ہفتے درکار ہوں گے۔

جیسا کہ میں نے ابھی آپ سے عرض کیا کہ زکوٰۃ کا ذکر ہم کو مکی سورتوں میں بھی ملتا ہے۔ قبل اسلام کے قدیم مذہبی صحیفوں میں بھی ذکر موجود ہے۔ قرآن میں ابتداء زکوٰۃ کے بارے میں صرف اشارے ملتے ہیں مثلاً ایک آیت ہے: " وَءَاتُوا حَقَّهُۥ يَوْمَ حَصَادِهِۦ ۖ وَلَا تُسْرِفُوٓا ۚ إِنَّهُۥ لَا يُحِبُّ ٱلْمُسْرِفِينَ " (۶:۱۴۱) (جب تم زراعت کی فصل کاٹ لو تو اللہ کا حق اس میں سے ادا کرو)۔ یہاں "اللہ کا حق" سے مراد زکوٰۃ ہی ہے۔ اسی طرح اور بھی آیتیں ہمیں ملتی ہیں جن میں صرف ایک لفظ "زکوٰۃ" نہیں بلکہ کئی اور لفظ بھی اس کے مترادف کے طور پر قرآن میں استعمال ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک معروف ترین لفظ "صدقات" ہے۔ " إِنَّمَا ٱلصَّدَقَٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَٱلْمَسَٰكِينِ--- " (۹:۶۰) یہاں صدقہ و خیرات دینا بالکل مراد نہیں بلکہ زکوٰۃ کا ذکر ہے۔ اسی طرح: " خُذْ مِنْ أَمْوَٰلِهِمْ صَدَقَةً " (۹:۱۰۳) یہاں بھی "صدقہ" کا لفظ گویا زکوٰۃ کے ہم معنی ہے۔ اسی طرح لفظ "انفاق" نیز لفظ "نصیب" بھی ہمیں اسی معنی میں کئی جگہ ملتا ہے۔ غرض یہ کہ مکی دور میں اور مدنی دور میں کبھی ایک لفظ استعمال ہوتا ہے کبھی دوسرا، اور اس کو سمجھے بغیر ہمیں دشواریاں پیش آ سکتی ہیں۔ دوسری چیز جو اتنی ہی اہم ہے وہ یہ ہے کہ اگر مکہ ہی میں زکوٰۃ فرض ہوچکی تھی، جس معنی میں ہم فرض سمجھتے ہیں، تو اس کا ہمیں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ یعنی مکہ میں رسول اکرم ﷺ کی طرف سے اس کی وصولی اور خرچ کا انتظام کیا گیا ہو یا اس کی مقدار معین ہو، اس کی میعاد مقرر ہو، اس کا کوئی پتا نہیں چلتا۔ ان حالات میں مجبوراً اس نتیجے پر پہنچنا پڑتا ہے (اور یہ میری ذاتی رائے ہوگی، آپ پابند نہیں کہ اسے قبول بھی کریں) کہ زکوٰۃ کی ابتداء اور اس کا آغاز اخلاقی اور رضاکارانہ اساس پر ہوا۔ رسول اللہ ﷺ مسلمانوں سے کہتے تھے کہ اپنی تجارت، زراعت اور دیگر کمائیوں سے کچھ خدا کی راہ میں خرچ کرو، اور کوئی تعجب نہیں کہ وقتاً فوقتاً مسلمان خود رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مال پیش کرتے ہوں تاکہ اپنی صوابدید سے اس مال کو خرچ کریں اور کبھی مسلمان براہ راست خود ہی اپنی صوابدید سے خرچ کرتے ہوں۔ کن لوگوں میں زکوٰۃ تقسیم کرنی مناسب ہے، اس بارے میں کوئی صراحت نہیں ہوئی تھی۔ زمانہ جاہلیت

میں نیک دل، شریف اور مخیر لوگ جس طرح اپنا مال خرچ کیا کرتے تھے، اسی طرح خرچ کرتے رہےتو وہی اسلامی طریقہ بھی رہا۔کیونکہ زمانہ جاہلیت کی ہر اچھی چیز کو اسلام برقرار رکھتا بلکہ اس کی تاکید بھی کرتا ہے۔لفظ زکوٰۃ شروع میں ٹیکس کی بجائے ایسی چیزوں کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جس سے ہمارا تزکیہ نفس ہوسکے۔اس میں اخلاقی عنصر زیادہ ہے۔سرکاری و قانونی دباؤ اور جبر کا عنصر نہیں۔جب یہ چیز ذہنوں میں راسخ ہوجاتی ہے کہ دوسرے انسان کی مدد کرنا، غریبوں محتاجوں کا حتی الامکان ہاتھ بٹانا، یہ واجب امر ہے، تو پھر رفتہ رفتہ اس میں اور عناصر بڑھتے جائیں گے۔مثلاً یہ کہ اس کو کس زمانے میں دیا جائے؟ کس شرح سے دیا جائے؟ اس کے مستحق لوگ کون ہیں؟ یہ مسائل رفتہ رفتہ حل ہوتے جائیں گے۔چنانچہ میں کہہ سکتا ہوں کہ مکہ معظمہ میں زکوٰۃ ایک طرح سے رضاکارانہ چیز تھی اور کسی پر کوئی جبر نہیں تھا۔اس سلسلے میں آپ کو یہ یاد دلاؤں گا کہ زمانہ جاہلیت میں، مشرکوں کے ہاں بھی ایک طرح کی زکوٰۃ پائی جاتی تھی۔چنانچہ لکھا ہے کہ یہ لوگ اپنی پیداوار کا ایک حصہ اپنے بتوں کو دیتے تھے: کچھ اللہ کے لیے رکھتے تھے، کچھ حصہ بتوں کے لیے، اور پھر قرآن نے سورہ انعام (۶: ۱۳۶) میں طنز کیا ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے بتوں کا کچھ حصہ اللہ کے حصہ میں پڑ جاتا ہے تو اسے لے کر دوبارہ بت کو دے دیتے ہیں۔لیکن اگر مثلاً ہوا کے چلنے یا کسی اور وجہ سے اللہ کا کچھ حصہ بتوں کے پاس چلا گیا تو اللہ کو نہیں دلاتے، بتوں کے لیے ہی رہنے دیتے ہیں۔یہ صورت حال مکہ میں رہی۔ جب رسول اللہ ﷺ مکہ سے مدینہ منورہ تشریف لاتے ہیں تو حالات بدلتے ہیں۔ظاہر ہے کہ وہاں ایک تو مسلمانوں کی تعداد بڑھتی ہے دوسرے مسلمانوں کی ضروریات بڑھتی ہیں، تیسرے مسلمانوں کے دفاع وغیرہ کے لیے مال کی طلب پیدا ہوتی ہے، چوتھے یہ کہ مسلمانوں کے مالی وسائل بھی بڑھ جاتے ہیں۔مدینہ منورہ میں بہت سے مالدار مسلمان تھے جو زراعت پیشہ تھے، باغات اور زراعت سے انہیں کافی آمدنی ہوتی تھی اور وہ معین طور پر اس کا کچھ حصہ دے سکتے تھے۔پانچویں یہ کہ وہاں مسلمانوں کی ایک حکومت بھی قائم ہوجاتی ہے۔لیکن مدینہ منورہ میں بھی ابتداءً زکوٰۃ گویا ایک خیرات، ایک رضاکارانہ چیز اور ایک غیر معین فریضہ تھا۔کتنی مقدار میں دیں، کب دیں، کس کو دیں، رفتہ رفتہ ان باتوں کی اہمیت بڑھتی جائے گی، ان سوالوں کا جواب دیا جائے گا اور اس میں وہ عناصر آجائیں گے جن کی بناء پر ہم آخر میں زکوٰۃ کو آج کل کے ٹیکس سے الگ چیز نہیں سمجھ سکیں گے۔جس طرح آج کل اگر کوئی شخص ٹیکس دینے سے انکار کرے تو حکومت جبر کرکے اس سے وصول کرتی ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے ابتدائی زمانہ خلافت میں ہوا کہ انہوں نے منکرینِ زکوٰۃ کے خلاف جہاد کیا اور بالجبر زکوٰۃ وصول کی۔

ایک اور پہلو پر مجھے کچھ روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ جب مسلمان مکے سے ہجرت کرکے مدینہ پہنچے تو عام مہاجرین کی بے روزگاری اور ان کی مصیبت زدگی کا ازالہ کیا گیااور مواخات کے ذریعے سے مدنی مسلمانوں کے خاندانوں میں ان مکی مہاجرین کے خاندانوں کو ضم کرکے ان کے دو خاندانوں کو ایک خاندان بنایا گیا۔یہ خاندان مشترکہ طور پر کمائی کرتے تھےاور رہتے تھے۔اب یہ سوال ہمارے ذہن میں پیدا ہوگا کہ خود رسول اللہ ﷺ اپنی بسربرد کس طرح کیا کرتے تھےاور آپؐ کے وسائل آمدنی کیا تھے؟ شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک مستشرق جو سویڈن کا ہے لکھتا ہے کہ "ابتداءً مسلمانوں نہایت ہی غریب تھے، لہٰذا لوٹ مار کیا کرتے تھے وہ لکھتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ فوجیں بھیجتے تاکہ قافلوں کو لوٹ لیں کیونکہ وہ مجبور تھے اور ان کے پاس کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں تھی۔" ظاہر ہے کہ اخلاقی نقطہ نظر سے یہ بیان اسلام کے بارے میں بہت سخت اعتراض ہے کہ دوسروں سے تو وہ کہتا ہے کہ انصاف کرو اور اپنے آپ کو ہر چیز کا مجاز سمجھتا ہےلیکن اس اعتراض میں صداقت نہیں، مسلمان مدینہ کے سلسلہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان کے پاس گزر اوقات کے وسائل تھے۔ان کی زمینیں تھیں اور وہ زراعت اور باغبانی کرتے تھے۔مکی مہاجرین جو آئے تھے وہ بھی اس کام مشغول ہوگئے۔کچھ لوگ تجارت کرنے لگے، کچھ لوگ جو مثلاً حرفت پیشہ تھے ، جوتے وغیرہ بنانے لگے اور کچھ نجاری و صناعی وغیرہ کرنے لگے۔خود رسول اللہ ﷺ کے متعلق عام طور پر ہماری تاریخی کتابوں کم ذکر ملتا ہے، اس لیے ابتداء میں اس سلسلے میں کچھ عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ہم جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب مکہ سے مدینہ پہنچے تو ابتداء میں شہر کے جنوبی حصہ "قبا" میں قیام فرمایا۔بعض روایات کے مطابق وہ تین ہفتے وہاں مقیم رہے مگر میں ایک مؤرخ کی روایت کو شخصاً ترجیح دیتا ہوں۔وہ صرف چار دن کے قیام کا ذکر کرتا ہے۔دو شنبہ کے دن وہاں پہنچے اور جمعہ کے دن وہاں سے روانہ ہوگئے۔اکثر یہ ذکر آتا ہے کہ جب آپؐ مدینہ کی طرف روانہ ہوئے تو جمعہ کا دن تھا۔ظہر کے وقت رسول اللہ ﷺ نے قیام فرمایااور وہیں راستے میں لوگوں کو باجماعت نماز جمعہ پڑھائی۔اس کے بعد آپؐ آگے بڑھ کر بنو نجار کی بستی میں پہنچتے ہیں اور وہاں حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مکان میں قیام فرماتے ہیں۔وہ اونٹنی کا قصہ وغیرہ جو ذیلی تفصیلیں ہیں مجھے ان سے بحث نہیں ہے۔اس بارے میں یہ امر واضح ہے کہ جب آپ پہلے پہل "قبا" میں پہنچے اور چار دن یا دو تین ہفتے وہاں مقیم رہے تو مقامی لوگوں نے جو مسلمان تھے، نہایت ہی احترام کے ساتھ مہمان نوازی کے طور پر ، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں میں کھانے پینے کی چیزیں پیش کیں۔اس طرح اس مہمان نوازی کی وجہ سے وقت گزر گیا۔اس وقت یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ کس طرح

زندگی گزارتے تھے۔جب آگے بڑھ کر بنو نجار کی بستی میں بستے ہیں تو صحیح بخاری کے مطابق یہ آپؐ کے ننھیال کا گھرانا تھا۔آپ کو معلوم ہوگا کہ عبدالمطلب کی ماں ایک مدنی خاتون تھیں، اور اس طرح رسول اللہ ﷺ کا رشتہ مدینے کے ایک خاندان سے قائم تھا۔تاریخ بتاتی ہے کہ عبدالمطلب کے بعد سے ہر زمانے میں رسول اللہ ﷺ کا خاندان ان رشتہ داروں کے ساتھ اپنے تعلقات کو برقرار رکھتا تھا۔چنانچہ لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ جب کبھی شمالی سفر مثلاً مکہ سے شام کو جاتے، تو جاتے وقت بھی اور آتے وقت بھی، مدینہ میں اپنے خاندان کے پاس ٹھہرتے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں خاندانوں کے تعلقات دوستانہ اور قریبی تھے۔ان حالات میں صحیح بخاری کے اس بیان پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنو نجار کی بستی میں ابو ایوب انصاریؓ کے مکان میں اس لیے قیام فرمایا کہ وہ آپؐ کے ننھیال کا خاندان تھا۔(میں اس اونٹنی کے قصے کا ذکر فی الوقت ترک کرتا ہوں)۔بہرحال عرض کرنا یہ ہے کہ جب ایک قریبی رشتہ دار کے مکان میں رسول اللہ ﷺ قیام فرماتے ہیں تو وہاں بھی یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ آپؐ کے وسائلِ زندگی کیا ہیں؟ یقیناً قریبی رشتہ داروں نے آپؐ کی ضیافت کی ہوگی، بغیر اس کا مطالبہ کیے کہ ہمیں اس کے مصارف دیے جائیں۔اسے وہ اپنے لیے باعثِ فخر ہی سمجھتے ہوں گے کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے گھر میں مہمان ہیں۔یہ سلسلہ چند مہینے تک جاری رہا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس مقام پر ایک بڑی مسجد بنانے کا حکم دیا۔سارے شہر مدینہ میں مسلمانوں کی تعداد بڑھ رہی تھی اور رسول اللہ ﷺ کی موجودگی کے باعث جو لوگ پہلے محلے والی مسجد میں نماز پڑھتے تھے وہ بھی اب اس مرکزی مسجد میں رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے آنے لگے تھے۔چھوٹی مسجد کافی نہیں ہوسکتی تھی، لہٰذا ایک بڑی مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔اس مسجد میں خود رسول اللہ ﷺ کے رہنے کے لیے چند کمرے بنوائے گئے۔یہ ابتداء میں تو اتنے زیادہ نہیں تھے جو بعد میں نظر آتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ شروع میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک تو آپ ﷺ کی زوجہ حضرت سودہؓ تھیں، اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد دوسری بیوی جن کی شادی ہوچکی تھی لیکن ابھی رخصتی عمل میں نہیں آئی تھی، تشریف لائیں، یعنی حضرت عائشہؓ، ان میں سے ہر ایک کے لیے الگ الگ کمرے کی ضرورت تھی۔رسول اللہ ﷺ کی جو دو صاحب زادیاں تھیں، حضرت فاطمہؓ اور حضرت رقیہؓ، ان کے لیے بھی ایک کمرا بنایا گیا۔دونوں بہنیں ایک ہی کمرے میں رہیں۔بعد میں کبھی ان حجروں میں رہنے والوں کی تعداد گھٹے گی۔مثلاً لڑکیوں کی شادیاں ہوجائیں گی۔کبھی ان کمروں کی تعداد نئی بیویوں سے زواج عمل میں آنے کے کے باعث بڑھ جائے گی، بالآخر جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی جب وفات ہوئی تو آپؐ کے ہاں

نو بیویاں تھیں اور کنیز ماریہ قبطیہ بھی۔ لیکن اس سلسلے میں کچھ توضیحوں کی ضرورت ہے۔ جہاں تک حضرت ماریہؓ کا تعلق ہے بہ صراحت بیان کیا گیا ہے کہ مسجد نبوی کے حجروں میں نہیں رہتی تھیں بلکہ کسی قدر فاصلے پر، ان کا علیحدہ مکان تھا۔ اسی طرح جہاں تک مجھے اس وقت یاد آرہا ہے۔ حضرت صفیہؓ کا مکان علیحدہ تھا، وہ بھی ان حجروں میں نہیں رہتی تھیں۔ مسجد نبوی کے ان کمروں میں ایک کمرہ حضرت سودہؓ کے لیے تھا اور ایک کمرہ رسول اللہ ﷺ کی دو صاحب زادیوں کے لیے تھا۔ ایک اور کمرہ بنایا گیا تھا، جس میں جلد ہی اس کا مقیم آگیا یعنی حضرت عائشہؓ۔ تو ابتداءً تین حجرے رسول اللہ ﷺ کے لیے بنے اور رسول اللہ ﷺ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مکان سے اٹھ کر یہاں آگئے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ کی بسر برد کا کیا انتظام تھا۔ لکھا ہے کہ مدینہ کے جو انصار کسان تھے اور زراعت پیشہ تھے، ان میں سے اکثر نے جو کافی مالدار تھے، اپنے باغوں میں ایک ایک درخت کو نشان زدہ کردیا تھا کہ اس کا پھل رسول اللہ ﷺ کے لیے ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ کی اجازت سے انہوں نے ایسا کیا تھا، اور سال کھجور کی فصل کٹنے پر، اس درخت سے جتنی کھجوریں حاصل ہوتیں، وہ سب رسول اللہ ﷺ کے گھر پہنچا دی جاتیں۔ اگر وہ آپؐ کی ضرورت سے زائد ہوتیں تو غرباء اور مہمانوں میں تقسیم ہوتیں۔ یہ پیش کش برابر جاری رہی۔ ہمارے مؤرخ اور محدث اکثر حضرت عائشہؓ کی ایک حدیث کا ذکر کرتے ہیں کہ بعض اوقات مہینے گزرجاتے اور ہم صرف دو چیزوں پر اکتفاء کرتے تھے یعنی کھجور اور پانی پر، ہمارے گھر چولہا نہیں جلتا تھا۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ غالباً اس زمانے کا ذکر ہے جب رسول اللہ ﷺ کے وسائل آمدنی میں صرف کھجوریں ہوا کرتی تھیں۔ رفتہ رفتہ رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور ان کی ضرورتیں بڑھتی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں چنز اور تفصیلیں نظر آتی ہیں مثلاً اس کا پتا چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چند بکریاں خریدی تھیں اور ان کا دودھ خاندان میں خرچ ہوتا تھا۔ اسی طرح اس کا بھی پتا چلتا ہے کہ بعض اوقات بعض لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کوئی اونٹنی، کوئی بکری جو دوددھ دینے والی ہوتی پیش کرتے اور التجاء کرتے کہ اس کو قبول فرمایئے، اس طرح ہماری عزت افزائی ہوگی۔ تو کبھی کبھی رسول اللہ ﷺ اس کو قبول فرمالیتے تھے۔ اس طرح ان کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ شروع میں مثلاً ایک بکری تھی، بعد میں دس بکریاں ہوگئیں۔ شروع میں ایک اونٹنی تھی بعد میں چار اونٹنیاں ہوگئیں۔ اب ان کے لیے ہمیں تفصیل سے پتا چلتا ہے کہ شہر مدینہ کے مضافات میں ایک چراگاہ معین کی گئی جہاں ایک صحابی رضاکارانہ طور پر ان جانوروں کی

نگہداشت کرتے، انہیں چرانے کا فریضہ سرانجام دیتے اور روزانہ دودھ اس مقام سے مدینہ لا کر رسول اللہ ﷺ کے ہاں پہنچایا کرتے تھے۔ اہل خاندان اس دودھ کو استعمال کرتے تھے۔ اسی طرح حضرت سعد بن عبادہؓ جو بنی نجار ہی کے ایک فرد اور رسول اللہ ﷺ کے قریبی ننھیالی رشتہ دار تھے، ان کی عادت تھی کہ روزانہ اپنے گھر میں پکی ہوئی چیزوں میں سے کوئی نہ کوئی چیز رسول اللہ ﷺ کے مکان پر بھیجتے۔ وہ بہت مالدار شخص تھے۔ بعض وقت جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے کہ یہی ایک صحابی اسی اصحابِ صفہ کو بیک وقت اپنے گھر لے جاکر ان کو کھانا کھلایا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کھانے کے اوقات میں تنہا کھانا کھانا کبھی پسند نہ فرماتے۔ ہر وقت دس پانچ لوگوں کو جو اس وقت موجود ہوتے، بلا لیتے۔ کبھی کچھ گھر کی چیزیں کھجور وغیرہ، کچھ وہ تحفے جو روز بروز آتے تھے، وہ بھی کھانے کے طور پر استعمال ہوتے۔ اس طرح یہ سلسلہ جاری رہا۔ جلد ہی ایک چھوٹے سے ذریعہ آمدنی کا اضافہ ہوتا ہے۔ ۲ ہجری رمضان کے مہینے میں دشمنوں کے ساتھ جنگوں کا آغاز ہوتا ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ جنگ کے مال غنیمت کا (۱/۵) حصہ حکومت کے لیے وقف تھا اور (۴/۵) حصہ مجاہدوں میں برابر تقسیم کیا جاتا ہے۔ بیش تر جنگوں میں رسول اللہ ﷺ شخصاً شریک ہوئے۔ مثلاً بدر میں اور اس کے بعد مختلف غزوات میں۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ کے لیے دو طریقے سے آمدنی ہونے لگی، ایک تو مجاہد کی حیثیت سے کہ آپ جنگ میں شریک تھے اور جنگ میں شریک ہونے والوں کی طرح برابر حصہ ملتا جس کی مقدار گھٹتی بڑھتی رہتی۔ اس وقت ایسا نہیں تھا کہ مستقل ہر مہینے جنگ ہو اور ہمیشہ مال غنیمت سے کافی آمدنی ہوتی رہتی ہو۔ دوسرا وسیلہ اس مال غنیمت میں سرکاری مال تھا جسے رسول اکرم ﷺ کی صوابدید پر چھوڑا گیا تھا کہ جس طرح چاہیں آپ تقسیم فرمائیں۔ لیکن وہ آپؐ کے خاندان کے لیے استعمال نہیں ہوتا تھا، بلکہ عوام الناس کی ضروریات کے لیے اور ملکی عام بہبود، دفاعی انتظام، ہتھیاروں کی خریداری کے لیے خرچ ہوتا تھا۔ بہرحال اگر رسول اللہ ﷺ چاہتے اور کسی وقت آپ کے مکان میں کوئی چیز نہ ہوتی تو اس سرکاری مال یعنی خزانے کی چیزوں میں سے مہیا کردی جاتی۔ لیکن یہ صرف مال غنیمت کے متعلق ہے۔ جہاں تک زکوٰۃ کا تعلق ہے، اس کے بارے میں شریعت کا یہ حکم تھا کہ زکوٰۃ کا مال رسول اللہ ﷺ کی ذات اور رسول اللہ ﷺ کے اہل و عیال اور قبیلہ بنی ہاشم اور قبیلہ بنی المطلب کے لیے حرام ہے۔ اگر سرکاری آمدنی حکمران کی آمدنی سمجھ لی جائے تو حکمران کے قریبی لوگ، ماتحت لوگ، ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور اگر معلوم ہو کہ حکمران کے لیے یہ حرام ہے تو ماتحت افسروں کو ذرا احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے کہ حکمران ان کا محاسبہ کرے گا۔ اس لحاظ سے یہ نہایت اہم بات ہے کہ اسلام کے سوا دنیا کی اور کسی قوم نے سرکاری آمدنی حکمران کی ذات

کے لیے ممنوع قرار نہیں دی۔ یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے۔ اس عام حکم میں کہ جو مال دشمن کافروں سے، غیر مسلموں سے، مال غنیمت کے طور پر حاصل ہو، اس کا ایک حصہ رسول اللہ ﷺ کے لیے خرچ کیا جا سکتا ہے۔ " قُلِ ٱلۡأَنفَالُ لِلَّهِ وَٱلرَّسُولِ " (۸:۱) کے جو الفاظ آئے ہیں وہ صرف مالِ غنیمت کے متعلق ہے " وَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّمَا غَنِمۡتُم مِّن شَيۡءٖ" اور مال غنیمت کا کچھ حصہ اگر رسول اللہ ﷺ چاہتے تو آپؐ اپنی ذات پر خرچ کرسکتے تھے۔ لیکن زکوٰۃ کا کوئی حصہ بھی رسول اکرم ﷺ اور آپ کے خاندان کے لیے صرف نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بہرحال میں عرض کررہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ بالکل ابتداء میں، مدینہ میں، یہی صورت حال تھی۔ مکہ کا سوال نہیں کیونکہ یہاں پر آپؐ کی وراثتی جائیداد تھی، اپنی بیوی سے حاصل کردہ جائیداد تھی، آپؐ خود بھی تاجر تھے۔ مدینہ میں ہمیں یہ صورت نظر نہیں آتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ شروع میں آپؐ مدینہ میں مہمان رہے اس کے بعد آپ کو ایسی چیزیں تحفتاً پیش کی گئیں جو مستقل تھیں، مثلاً کھجوروں کی فصل کے وقت اس کا کچھ حصہ آپؐ کے پاس آتا۔ اس کے بعد مالِ غنیمت ایک ذریعہ پیدا ہوا، جو رسول اللہ ﷺ، جو رسول اللہ ﷺ کے گزر بسر کے انتظام میں کام آنے لگا۔ جنگِ بدر کے بعد جلد ہی جنگ احد پیش آئی (کم و بیش ایک سال بعد)۔ اس موقع پر ہمارے مؤرخ ذکر کرتے ہیں کہ وہاں "مخریق" نامی ایک یہودی تھا۔ کہتے ہیں کہ مسلمان ہوچکا تھا۔ اپنی انتہائی عقیدت کے پیشِ نظر اس نے وصیت کی تھی کہ اگر جنگ میں مر جاؤں تو میرے سارے باغ جو مدینہ میں ہیں وہ رسول اللہ ﷺ کے ہوں گے۔ چنانچہ مخریق کے سات باغ تھے جن کی پوری آمدنی اب رسول اللہ ﷺ کے لیے مخصوص ہوگئی۔ اس طرح ابتدائی زمانے کی دشواریاں ختم ہوگئیں۔ ہمیں اور چند چیزوں کا ذکر بھی ملتا ہے مگر میں ان تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔

میں نے ابھی آپ سے بیان کیا کہ حکومت کی طرف سے ایک قانون بنا کہ سارے مالدار مسلمان، اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کریں۔ اس سلسلے میں ابتداءً خیرات کا حکم دیا گیا اور یہی خیرات بعد میں ٹیکس بن گئی۔ اس سلسلے میں مجھے مکرر ذکر کرنا پڑتا ہے کہ مالِ غنیمت کی آمدنی کا ایک حصہ حکومت کے لیے ہوتا تھا اور مالِ غنیمت کا ۱/۵ حصہ اور "مال فئے" پورے کا پورا حکومت کے تصرف میں آجاتا۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ اگر دشمن سے لڑائی ہو اور جیسا کہ قرآن (۵۹: ۶) کے الفاظ ہیں گھوڑوں کے دوڑانے کے ذریعے دشمن کے علاقے پر دشمن کے مال پر قبضہ کیا گیا ہو، تو اسے مالِ غنیمت قرار دیا جاتا۔ اگر جنگ کے بغیر دشمن قبول کرتا کہ ہم آزاد تو رہیں گے لیکن تمھیں اس قدر سالانہ

خراج دیا کریں گے۔وغیرہ، یہ ساری آمدنیاں "فئے" کہلاتی تھیں۔ان کو تقسیم کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔وہ سارے کا سارا سرکاری خزانے میں آجاتا۔حکومت کی ان دو آمدنیوں کے ساتھ ساتھ اب ہم زکوٰۃ کو لیں گے جس کے اصول یہ ہیں کہ اگر کسی شخص کے پاس اس کی ضرورتوں سے فالتو کچھ رقم ہواور وہ رقم سال بھر اس کے قبضہ میں ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔یہ نہیں کہ مثلاً آج تو ہمارے پاس اپنی ضرورتوں سے فاضل ایک لاکھ روپے ہیں۔لیکن چند دنوں، چند مہینوں یا چندہفتوں کے بعد وہ رقم ہماری ضرورتوں کے لیے خرچ ہوگئی۔اسے فالتو رقم نہیں کہا جاسکتا۔اسلامی قانون یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس معینہ نصاب کی رقم یعنی Minimum سے اونچی رقم کم از کم ایک سال تک موجود رہے تو اسے اس کا ڈھائی فیصد زکوٰۃ کے نام سے حکومت کو دینا ہوگا۔اس میں کچھ تفصیلات کی بھی ضرورت پیش آئے گی۔ساری زکوٰۃ ڈھائی فیصد نہیں ہے۔مختلف چیزوں کی زکوٰۃ مختلف ہے۔مثلاً ایک شخص کے پاس روپیہ ہے، یا سونا اور چاندی ہے۔ ان پر ڈھائی فیصد ہے، سالانہ دینا پڑتا ہے۔لیکن اگر کوئی شخص زراعت کرتا ہے تو فصل کٹنے کے بعد جو مقدار حکومت کے سپرد کی جاتی ہے اسے زکوٰۃ الارض کہتے ہیں۔زکات ہی کے نام سے ہم اس چیز کو موسوم کرتے ہیں جو آج کل مال گزاری کہلاتی ہے۔یہ کٹی ہوئی فصل کا دسواں حصہ ہوتا ہے۔اسی طرح کسی شخص کے پاس سونے کی کان ہو، یا چاندی کی کان تو اس سے بھی اس کوایک حصہ حکومت کی خدمت میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ان تمام کی شرحیں مختلف ہیں۔اسی طرح کسی کے پاس جانور ہوں مثلاً بکریاں، گائے، بیل، بھینس یا اونٹ وغیرہ تو ان کی بھی ایک تعداد معین تھی کہ اس سے زیادہ کسی کے پاس ہوں تو ہر سال اس کا اتنا حصہ حکومت کو دیا کرے گا۔بکریوں کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک فیصد لیا جاتا تھا۔مثلاً کسی کے پاس پانچ سو بکریاں ہوں تو وہ پانچ بکریاں دیتا، کسی کے پاس چار سو بکریاں ہوں تو وہ چار بکریاں دیتا تھا۔عام طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اونٹوں کی شرح اور گائے کی شرح اس سے کسی قدر زیادہ پیچیدہ ہے۔ مثلاً پانچ اونٹوں پر ایک بکری دیں یا دس اونٹوں پر فلاں دیں یا بیس اونٹوں پر ایک اونٹ دیں وغیرہ۔بعض وقت ہمیں ایک اور ذریعہ آمدنی بھی نظر آتا ہے۔وہ زکوٰۃ التجارت ہے، یعنی تجارت کی زکوٰۃ، اسی طرح زکوٰۃ المعدن یعنی معدنیات کی زکوٰۃ غرض مختلف چیزوں پر جو ٹیکس مسلمان اپنی حکومت کو دیتے وہ سب زکوٰۃ کے نام سے موسوم ہوتے اور ان کی شرح مختلف ہوتی۔اس کے متعلق زیادہ تفاصیل میں گئے بغیر مجھے ایک چیز کی طرف اشارہ کرنا ہے، وہ بھی اسلام کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔اسلام سے پہلے کے مذہبوں میں سرکاری آمدنی کے ذرائع یعنی کن کن چیزوں پر ٹیکس لیا جائے، اس کی تفصیل تو ہمیں ملتی ہے مثلاً توریت وغیرہ میں۔لیکن کنکن مدات میں انہیں خرچ کیا جائے اس کا کوئی ذکر نہیں

ملتا۔وہ بالکل حکمران کی صوابدید پر ہوتا ہے کہ اس ٹیکس کو وہ جیسا چاہے خرچ کرے اور عام طور پر حکمران اپنی ذات پر اور اپنی فضول خرچی اور عیاشی پر خرچ کیا کرتے تھے۔میرے علم میں قرآن کریم وہ پہلی دینی کتاب ہے جس میں آمدنی کے وسائل کے متعلق بہت کم تفصیلیں ملتی ہیں، لیکن خرچ کے متعلق انتہائی تفصیل سے بتایا جاتا ہے کس کو کتنی رقم دی جائے۔ مثلاً "وَءَاتُوا۟ حَقَّهُۥ يَوْمَ حَصَادِهِۦ" (۶:۱۴۱)اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زراعت پر زکوٰۃ دینی چاہیئے۔لیکن صرف لفظ 'حق' ہے، یہ نہیں بتایا کہ کس مقدار میں عشر ۱۰/۱ یا ڈھائی فیصد یا پچاس فیصد۔ایسی تفصیلات قرآن میں نہیں ملتیں۔یہ تفصیلیں ہمیں حدیث میں ملیں گی۔لیکن قرآن کا یہ اصول نظر آتا ہے کہ آمدنی کے ذرائع کے متعلق زیادہ تفصیل نہ دے بلکہ اگر میری توجیہ (Interpretation) صحیح ہے تو قرآن اسے حکومت کی صوابدید پر چھوڑ دیتا ہے کہ حسبِ ضرورت اس میں اضافہ و تخفیف کرسکے۔جن چیزوں کا قرآن میں ذکر ہے (مثلاً زراعت پر ٹیکس، تجارت پر ٹیکس وغیرہ) ان کے علاوہ بھی کسی اور چیز پر ہم ٹیکس لے سکتے ہیں، مثلاً اگر کسی مقام پر مچھلیاں بہت ہوں یا کسی مقام پر شہد کی مکھیوں سے تجارتی پیمانے پر آمدنی ہونے لگے تو اس کا ایک حصہ حکومت کو دیں۔یہ ساری چیزیں زکوٰۃ بن جاتی ہیں۔

زکوٰۃ کی تقسیم کے سلسلے میں صاف اور واضح قرآنی احکام ہیں۔وہ مشہور و معروف آیت جو کہ سورہ توبہ میں ہے" إِنَّمَا ٱلصَّدَقَـٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَٱلْمَسَـٰكِينِ وَٱلْعَـٰمِلِينَ عَلَيْهَا وَٱلْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِى ٱلرِّقَابِ وَٱلْغَـٰرِمِينَ وَفِى سَبِيلِ ٱللَّهِ وَٱبْنِ ٱلسَّبِيلِ ۖ فَرِيضَةً مِّنَ ٱللَّهِ ۗ وَٱللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ " (۹:۶۰)صدقات (یعنی حکومت کی آمدنیاں یا زکوٰۃ) کو تقسیم کیا جائے فقراء پر، مساکین پر، اس کے بعد ذکر ہے "والعاملین علیھا" یعنی حکومت کے ان کارندوں پر جو زکوٰۃ کے کام میں مشغول ہیں۔عاملین کے بعد ذکر آیا ہے "والمؤلفة قلوبھم" یعنی ان لوگوں پر جن کا دل موہ لینے کی تمہیں ضرورت ہے (تبلیغِ اسلام کے لیے) مثلاً جیسے آج کل ہم کہتے ہیں Secret Service حکومت مخفی طور پر ملت اور مملکت کے مفاد میں لوگوں پر کچھ رقم خرچ کرتی ہے۔اس کے بعد ایک لفظ ہے "وفی الرقاب" گردنوں کو چھڑانے کے لیے۔اس کے معنی متفقہ طور پر دو لیے جاتے ہیں۔ملک کے غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے اور اسلامی مملکت کی مسلم اور غیر مسلم رعایا اگر دشمن کے ہاتھ میں قید ہوگئی ہو تو فدیہ دے کر انہیں رہائی دلانے کے لیے۔زکوٰۃ کی تقسیم کے سلسلے میں اس کے بعد ایک لفظ ہے۔"غارمین" اس کے معنی ہیں وہ کھاتے پیتے مالدار لوگ جن پر یکا یک کسی حادثے

یا خسارے سے سخت مالی بوجھ پڑجاتا ہے۔ مثلاً فرض کیجئے میں نے سہواً کسی آدمی کو قتل کردیا۔ مجھے خون بہا دینے کی ضرورت ہے۔ لیکن میں محتاج اور تہی دست ہوں۔ تو حکومت کا فریضہ ہے کہ میری مدد کرے تاکہ میں متضرر کے متعلق اس فریضہ کی انجام دہی سے سبکدوش ہوسکوں۔ یہ ہے غارمین۔ اس کی ابھی میں مزید تشریح کروں گا۔ اس کے بعد ایک لفظ ہے "فی سبیل اللہ" یعنی اللہ کی راہ میں۔ حیرت ہوتی ہے کہ فی سبیل اللہ کے اولین معنی لیے گئے ہیں۔ دفاعی خدمات، ملک کی حفاظت کا انتظام اور فوج کے اخراجات، مسجدیں وغیرہ بنانے کو ثانوی حیثیت دی گئی۔ اس کے بعد ایک اور لفظ ہے جس کی توقع عام حالات میں نہیں تھی مگر اس کا ذکر یہاں ملتا ہے۔ "ابن السبیل" اس کے لفظی معنی ہیں راستے کا بچہ اور مراد اس سے ہے مسافر۔ مسافر کسی مقام کا بھی ہو اگر ہمارے علاقے سے گزرتا ہے تو آج کل حکومتیں تو مسافر سے ٹیکس لیتی ہیں کہ ہمارے ملک میں کیوں آتے ہو۔ اسلامی قانون کا حکم یہ ہے کہ مسافروں کی مہمان نوازی کرو، انہیں کھلاؤ پلاؤ اور اقامت کی سہولتیں مہیا کرو۔ ان آٹھ مدات کے ذکر کے بعد قرآن کے الفاظ یہ ہیں کہ یہ اللہ کا مقرر کردہ حکم ہے "فریضۃ من اللہ"۔ دوسرے الفاظ میں حکومت کے موازانہ (میزانیہ، Budget) پالیسی متعین کردی گئی کہ ان آٹھ مدات میں زکوٰۃ کی آمدنی سے رقم صرف کی جائے: فقراء، مساکین، عاملین علیھا، مؤلفۃ القلوب، الرقاب، غارمین، فی سبیل اللہ، ابن السبیل۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی دلچسپ چیز کا میں ذکر کرتا ہوں۔ امام شافعیؒ کا بیان ہے کہ چونکہ آٹھ مدات میں رقم خرچ کرکے کا حکم ہے لہٰذا آمدنی کا ۱/۸ حصہ ہر ایک مد کو دلایا جائے۔ (دوسرے آئمہ کی رائے یہ نہیں ہے) ابتدائی دو نام فقراء و مساکین سے کیا مراد ہے؟ بظاہر دونوں مترادف لفظ ہیں مگر اس میں اختلاف رائے رہا ہے۔ اور اس اختلاف رائے کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوا تھا تو امام شافعیؒ نے کہا، چونکہ اللہ نے آٹھ مدوں میں خرچ کرنے کا حکم دیا ہے اور اللہ نے اپنے وفورِ رحمت سے غریبوں کو دگنا حصہ دلانا چاہا، اس لیے دو نام استعمال کیے گئے ہیں۔ (۱/۸) فقراء کے لیے اور (۱/۸) مسکینوں کے لیے یعنی دونوں غریبوں کے لیے کہ بجائے (۱/۸) کے (۱/۸) یا ایک چوتھائی آمدن ان لوگوں کے لیے خرچ کی جائے۔ یہ محض علمی بحث کے سلسلے میں، میں نے آپ سے بیان کیا ہے۔ ایک چیز بہت زیادہ اہم ہے۔ آج کل اگر ہم اپنی فقہ کی کتابوں کو کھولیں تو ان میں نظر آئے گا کہ زکوٰۃ صرف مسلمانوں کو دی جاسکتی ہے غیر مسلموں کو نہیں دی جاسکتی۔ ہمیں نظر آتا ہے انتہائی ابتدائی زمانۂ اسلام میں، انتہائی مقدس اور قابلِ احترام ہستیوں کی یہ رائے نہیں تھی۔ چنانچہ امام ابو یوسف کی

تالیف "کتاب الخراج" میں اگر ہم دیکھیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ حضرت عمرؓ اپنی خلافت کے زمانے میں زکوٰۃ کی آمدنی سے یہودیوں کی بھی مدد فرماتے تھے۔قصہ یہ ہے کہ ایک روز وہ مدینہ کی گلیوں سے گزر رہے تھے، دیکھا کہ ایک شخص بھیک مانگ رہا ہے۔انہیں حیرت ہوئی کہ میرے زمانے میں لوگ بھیک مانگیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ حکومت کا فریضہ ہے کہ غریبوں کی مدد کرے۔انہیں کھلائے پلائے۔اس سے پوچھتے ہیں تو کون ہے؟ وہ کہتا ہے میں ایک یہودی ہوں۔اب تک کاروبار کیا کرتا تھا اور جزیہ دیا کرتا تھا۔اب بوڑھا ہوگیا ہوں کام نہیں کرسکتا۔لہٰذا مجبور ہوں کہ بھیک مانگوں، تو حضرت عمرؓ بے حد متاثر ہوئے اور فوراً اپنے افسر خزانہ کو حکم دیا کہ اس یہودی سے آئندہ جزیہ نہ لیا جائے گا۔بلکہ مزید برآں اس کے لیے روزینہ مقرر کردیا جائے۔ان کے الفاظ ہیں کہ هذا مساكين اهل الكتاب یہ مساکین کی مد میں آتا ہے اس لیے زکوٰۃ سے اس کو رقم دی جائے۔دوسرے معنی میں حضرت عمرؓ کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے اور دیگر بعض صحابہ مثلاً! زید بن ثابت، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہا وغیرہ کی رائے مماثل ہونے کا ذکر طبری نے کیا ہے کہ زکوٰۃ غیر مسلموں کو دی جاسکتی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ "فقراء"سے مراد مسلمانوں کے فقیر اور مساکین سے غیر مسلم رعیت کے فقیر ہوں گے۔جو بھی ہو یہ پہلی مد ہے۔والعاملين عليها تیسری مد ہے۔اگر میں یہ توجیہ کروں کہ اس سے مراد پوری سول ایڈمنسٹریشن ہے تو حیرت کی بات نہ ہو گی۔کیونکہ زکوٰۃ کو جمع کرنے والے، زکوٰۃ کا حساب رکھنے والے، زکوٰۃ کے حساب کی جانچ پڑتال یا آڈٹنگ (Auditing) کرنے والے، زکوٰۃ کو تقسیم کرنے والے، تقسیم کی نگرانی کرنے والے، یہ سب لوگ عاملین میں آ جاتے ہیں۔چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ پوری سول ایڈمنسٹریشن یعنی سرکاری ملازمین کی تنخواہ زکوٰۃ کی آمدنی سے دی جائے گی۔

اس کے بعد کا لفظ ہے۔"مولفة قلوبهم" اس سلسلے میں ایک بہت ہی مشہور کتاب ہے۔ابویعلی الفراالحنبلی، جیسے کٹر قسم کے عالم کی۔کٹر کا لفظ میں اچھے معنوں میں استعمال کر رہا ہوں کہ وہ کسی ذاتی غرض یا کسی سیاسی ضرورت کے تحت دبنے والے انسان نہیں تھے۔کھری کھری بات سناتے تھے۔ان کی ایک کتاب ہے۔"الاحكام السلطانيه" یہ ماوردی کے معاصر ہیں اور موردی کی کتاب ہی کے نام سے یہ کتاب انہوں نے لکھی ہے اور میں زکوٰۃ کی مدات پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں "مؤلفة قلوبهم" یعنی جن لوگوں کا دل موہ لینا ہے ان کی چار قسمیں ہیں۔پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جن کو رقم اس لیے دی جاتی ہے کہ وہ مسلمانوں کی مدد کریں۔دوسری قسم ان لوگوں کی

ہے جن کو رقم اس لیے دی جائے کہ وہ مسلمانوں کو مضرت پہنچانے سے باز رہیں۔عام حالات میں وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں لیکن اگر ان کو رقم دے دیں تو مثلاً جنگ کے زمانے میں وہ غیر جانبدار رہیں گے، مسلمانوں کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔تیسری قسم، ابویعلیٰ الفراء لکھتے ہیں کہ ان لوگوں کی ہے جن کو رقم اس لیے دی جائے کہ وہ اسلام قبول کرلیں۔چوتھی قسم، وہ کہتے ہیں، ان لوگوں کی ہے جن کو رقم اس لیے دی جاتی ہے کہ اس کی وجہ سے ان کے قریبی رشتہ دار، ان کے قبیلے کے لوگ، ان کے خاندان کے لوگ اسلام قبول کرلیں۔اس فہرست کے بعد وہ ایک جملے کا اضافہ کرتے ہیں کہ یہ رقم مسلمان اور غیر مسلم کسی کو بھی دی جاسکتی ہے۔ظاہر ہے کہ کسی کی تالیفِ قلب کرنی ہو یا کسی کو، مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچانے کے لیے رقم دی جانی ہو۔تو وہ غیر مسلم ہی ہوگا۔لیکن امام ابو یعلی صراحت سے کہتے ہیں کہ "وہ چاہے غیر مسلم ہویا مسلم، اس کو مؤلفۃ قلوبھم کے تحت زکوٰۃ کی آمدنی سے رقم دی جاسکتی ہے۔"

اس سے آگے چلئے "فی الرقاب" یعنی ملک کے غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے بھی حکومت امداد کرے اور ملک کی رعایا کو، دشمن کی قید سے چھڑانے کے لیے بھی حکومت زکوٰۃ صرف کرے۔اس سلسلے میں مجھے یاد آرہا ہے "طبقات ابن سعد" میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے متعلق کچھ تفصیلی حالات دے کر ان کا خط نقل کیا گیا ہے۔وہ خط انہوں نے گورنر یمن کے نام لکھا ہے۔اس خط میں لکھتے ہیں کہ جتنی رعایا دشمن کے ہاتھ قید میں ہو، اس کو چھڑانے کے لیے سرکاری خزانے سے رقم خرچ کی جائے، اس صراحت کے ساتھ کہ چاہے وہ مسلمان ہو یا ذمی۔تو گویا رقاب کے سلسلے میں اسلامی رعیت کو دشمن کی قید سے رہائی دلانے کے لیے جو فدیہ دیا جاتا ہے، اس میں بھی مسلم اور غیر مسلم کا امتیاز نہیں ہے۔جس طرح فقراء اور مساکین کے سلسلے میں حضرت عمرؓ کی رائے میں زکوٰۃ کی رقم سے غیر مسلم کی مدد کی جاسکتی ہے۔مولفۃ قلوبھم کے سلسلے میں بھی ہم دیکھ چکے ہیں، اسی طرح رقاب کے سلسلے میں بھی ہمیں نظر آتا ہے کہ زکوٰۃ غیر مسلموں پر خرچ کی جاسکتی ہے۔

"غارمین" کا لفظ جس کا ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے ذکر کیا تھا، کسی شخص پر رقم کی ادائیگی کے سلسلے میں غیر معمولی بوجھ پڑ جائے اور وہ اس سے عہدہ بر آ نہ ہو سکے۔ہمارے مولف مثالیں دیتے ہیں کہ مثلاً اس کا مال راستے میں چوری ہو گیا یا اس کا مال طغیانی میں، کسی زلزلے میں یکایک ضائع ہو گیا وغیرہ وغیرہ، ایسی حالتوں میں اس بظاہر مال دار شخص کی بھی ہم مدد کر سکتے ہیں کیونکہ وہ اچانک، عارضی طور پر محتاج ہو گیا ہے۔حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے

زمانے میں ، بظاہر اس لفظ غارمین سے استنباط کر کے ایک نئی چیز کا ہمیں اضافہ نظر آتا ہے اور وہ سرکاری خزانے سے لوگوں کو امداد نہیں بلکہ قرض دینا ہے۔کوئی شخص کھاتا پیتا ہے، اس کو امداد کی ضرورت نہیں لیکن اس کو مال کی ضرورت ہے ، مثلاً تجارت کے لیے یا کسی اور کام کے لیے تو حکومت اس کو قرض دیتی ہے اور قرض ظاہر ہے کہ بلاسود ہی ہو گا کیونکہ حکومت ہی وہ ادارہ ہے جو سود کی آمدنی کا خیال کیے بغیر، رعایا ہی کی آمدنی، رعایا ہی کو قرض دے سکتی ہے۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا طرز عمل یہی نظر آتا ہے کہ وقتاً فوقتاً وہ لوگوں کو سرکاری خزانے سے بلاسود قرضے دیتے۔اس سے خود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔ان کی آمدنی کم تھی، ان کی تنخواہ کم تھی، کبھی کبھی انہیں ضرورت پیش آتی تھی تو وہ سرکاری خزانے سے قرض لیتے تھے۔بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ماہ تنخواہیں نہیں بنتی تھیں، بلکہ چھ ماہ میں ایک بار۔تو اپنی تنخواہ کے ملنے پر وہ ادائیگی کر دیتے۔حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرح اور لوگوں کو بھی اس سے استفادہ کرنے کا موقع ملتا تھا۔لفظ "غارمین" سے یہ بھی استنباط کیا گیا تھا۔

"فی سبیل اللہ" کے متعلق ابھی میں نے ایک حد تک اشارہ کر دیا ہے کہ اس سے مراد فوجی انتظام اور دفاع کا اہتمام ہے۔سول ایڈمنسٹریشن کا ذکر ہم "عاملین علیھا" کے تحت دیکھ چکے یں۔"فی سبیل اللہ" کے تحت پوری ملٹری ایڈمنسٹریشن آ جاتی ہے۔سپاہیوں کی تنخواہ کی ادائیگی، اسلحہ کی فراہمی اور دیگر فوجی ضروریات سب اس مد کے تحت آ جاتی ہیں۔نیز اور چیزین بھی مثلاً مسجدوں کا بنانا، کارواں سرائے تعمیر کرنا، مدرسوں کی تعمیر وغیرہ یہ ساری چیزیں جی سبیل اللہ کے تحت، اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے تحت آ جاتی ہیں۔

آخری چیز "ابن السبیل" راستے کا بچہ یعنی مسافر جو گزر رہے ہیں، اس کی طرف بھی میں نےاشارہ کیا اور میں گمان کرتا ہوں کہ اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں ہوتی تھی۔کوئی غیر مسلم کسی مقام سے گزرے، مثلاً وہاں سب مسلمان ہوں تو اس کی مہمان نوازی اور اس کی ضرورتوں کا انتظام کرنا یہ حکومت کے فرائض میں داخل تھا اور میں اس کو اور بھی زیادہ توسیع دے کر کہہ سکتا ہوں کہ ابن السبیل کے معنی پورے Tourist Traffic کا انتظام

ہے۔اس میں سڑکوں کا بنانا، پلوں کی تعمیر، اس میں پولیس کا انتظام کرنا کہ گزرنے والوں کی جان و مال محفوظ رہے۔اسی طرح بازاروں کی نگرانی کہ وہاں پر دغا اور فریب نہ ہو، غذا صحت کے لیے مضر نہ ہو، وغیرہ وغیرہ، یہ سب ابن السبیل کے لفظ کے تحت آ جائیں گے۔یہ ایک تاثر ہے جو اس آیت کو پڑھنے سے اور اس آیت کے متعلق ہمارے پرانے مفسرین کی آراء کو معلوم کرنے سے پیدا ہوا ہے۔میں جانتا ہوں اور اس کا اعتراف بھی کرتا ہوں کہ آج کل ہمارے فقہاء یہ رائے نہیں رکھیں گے اور وہ کہیں گے کہ زکوٰۃ غیر مسلموں کو نہیں دی جا سکی۔انہیں اختیار ہے لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے خلیفہ، یہودیوں اور عیسائیوں کی زکوٰۃ کی مد سے امداد کیا کرتے تھے۔ایک یہودی کا بھی میں نے ذکر ہے کہ کہ امام ابو یوسف کی "کتاب الخراج" کے مطابق مدینہ میں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔بلاذری نے لکھا ہے کہ شام کے سفر کے دوران حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زکوٰۃ کی مد سے غریب اور محتاج عیسائیوں کی مدد کرنے کا حکم دیا۔ابو عبید کی "کتاب الاموال" فقرہ 1996۔1997 کے مطابق رمضان کی عید کا صدقہ فطر بھی عیسائی راہبوں کو بھی دیا جاتا رہا ہے۔

سوال اس وقت یہ پیدا ہوتا ہے کہ زکواۃ کا جو تصور آج کل ہمارے ذہنوں میں ہے کہ ہر شخص اپنی بچت سے سال کے اختتام پر ڈھائی فی صد رقم غریبوں کو بطور زکوٰۃ دیا کرے، یہ تصور کب پیدا ہوا ہے، جب کہ عہدی نبوی میں زکوٰہ حکومت وصول کرتی تھی۔ابوبکرحضرتؓ کے زمانے میں مرتدین سے جو جنگ ہوئی وہ اسی زکوٰۃ کی وصولی کے سلسلے میں تھی۔لوگ زکوٰۃ حکومت کو دینا نہیں چاہتے تھے۔حضرت ابوبکر نے تلوار کے زور سے لوگوں کو مجبور کیا کہ انہیں زکوٰۃ حکومت ہی کو ادا کرنی ہو گی۔اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ فرق کیسے پیدا ہوا؟ تاریخ کی کتابوں میں اس کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ اس کا تعلق حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد سے ہے۔آپ کو معلوم ہو گا کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں۔(ستائیس ہجری کا میں معین طور پر ذکر کرتا ہوں کہ ) اسلامی فوجیں ایک طرف یورپ، اندلس اور افرنجہ میں پہنچ گئی تھیں(افرنجہ سے مراد غالباً فرانس ہو گا۔"اندلس اور افرنجہ" کے الفاظ طبری نے بیان کیے ہیں) دوسری طرف ستائیس ہجری میں مسلمانون کی فوجیں جیحوں کو عبور کر کے ماوراء النہر تک پہنچ جاتی ہیں یعنی چین کی سرحد تک۔گویا اسلامی حکومت رسول اللہ ﷺ کی وفات کے صرف پندرہ سال بعد تین براعظموں، یورپ، افریقہ اور ایشیا میں پھیل جاتی ہے۔اس وقت مسلمانوں کی تعداد کم تھی، آبادی کی اکثریت غیر مسلم تھی۔

فتوحات نئی نئی ہوئی تھیں۔توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ سب لوگ راتوں رات مسلمان ہو جائیں گے۔میرا اپنا گمان ہے کہ اس وقت ایک سو مربع میل میں ایک سے زاید مسلمان نہیں ہوتا ہو گا۔ان حالات میں یہ میرا اندازہ (میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں) کہ اگر اس زمانے میں زکوٰۃ کی وصولی کے لیے، ہر ایک مسلمان کے مکان پر کارندے جاتے، اس سے حساب مانگتے کہ تمہیں کتنی آمدنی ہوئی، کتنا خرچ ہوا، کتنی رقم سال بھر باقی رہی، تو تین براعظموں میں اس کام کے لیے کثیر عملے کی ضرورت ہوتی۔میرا اندازہ ہے کہ مصارف زیادہ ہوتے اور آمدنی اس سے کم ہوتی۔ان حالات میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وزیر مالیہ (فنانس) نے مشورہ دیا ہو گا کہ اس رقم کو مسلمانوں پر ہی چھوڑ دیا جائے۔انہیں معلوم ہے کہ زکوٰۃ فرض ہے۔اللہ کا فرض کیا ہوا امر ہے اس لیے ان لوگوں کے ضمیر پر چھوڑ دیجیے۔ان سے کہہ دیا جائے کہ وہ ہر سال زکوٰۃ کی رقم خود ہی قرآنی احکام کے مطابق تقسیم کر لیا کریں اگر حکومت اس کے انتظام کو بدستور اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی تو سرکاری عملے کے اخراجات اتنے بڑھ جاتے کہ اس بار گراں کو کوئی عقل مند وزیر مالیہ قبول نہ کر کتا بہرحال ان حالات میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں طے کیا گیا کہ زراعت کی زکوٰۃ، معدنیات کی زکوٰۃ اور فلاں فلاں چیزوں کی زکوٰۃ تو بدستور حکومت ہی لے گی لیکن نقد رقم کی زکوٰۃ سونا چاندی، درہم اور دینار، اس کو مسلمان اپنی ہی ذاتی صوابدید پر اپنے ضمیر کے فیصلے کے مطابق ہر سال تقسیم کر دیا کریں۔نتیجہ یہ ہوا کہ اب ہم بھول گئے کہ زکوٰۃ کے معنی عہد نبوی میں اور خلافت راشدہ کے ابتدائی دو خلفاء کے دور میں کیا تھے۔اب ہم اس کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ یہ ایک طرح کی خیرات ہے جو ہر سال اپنی آمدنی کی بچت سے غریبوں کے لیے کرتے ہیں۔حالاکہ صرف غریبوں کا ہی اس میں حق نہیں ہے بلکہ اور مدات بھی اس کے اندر شامل ہیں، جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔

اب میں اس سوال کا جواب یتا ہوں کہ مسلمانوں سے تو یہ سلوک ہو رہا ہے، پھر غیر مسلم رعایا سے کیا کیا جاتا ہے؟ اس سلسلے میں دو چیزیں نظر آتی ہیں۔اولاً مثلاً زراعت ہے، زراعت کے سلسلے میں ابتدائی دور میں حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں کسی علاقے کو فتح کیا جاتا تو ایک معاہدے کے ذریعے یہ صراحت کی جاتی کہ اس علاقے کے لوگ کتنی رقم حکومت کو سالانہ پیش کریں گے۔اور پھر اس کے لیے ایک خصوصی انتظام کیا جاتا اور اس علاقے میں حکومت کا ایک نمائندہ یا نائب ہوتا جو مقامی

رعایا سے رقم وصول کرکے، حکومت کو سالانہ مجموعی رقم ادا کردیا کرتا۔اس کو خراج کا نام دیا جاتا تھا۔یہ خراج زراعتی اراضی کے لیے بھی ہوتا، دیگر چیزوں کے لیے بھی ہوتا۔اس طرح غیر مسلم رعایا سے جزیہ بھی لیا جاتا، جس قرآن حکیم (۹: ۲۹) نے حکم دیا ہے جو اولاً قرآنی احکام کے تحت صرف اہل کتاب یعنی یہودیوں اور نصرانیوں کے متعلق خیال کیا گیا لیکن حضرت عمرؓ کے زمانے میں اولاً اس میں مجوسیوں یعنی پارسیوں کو شامل کیا گیا۔حضرت عثمانؓ کے زمانے میں بربر جو شمالی افریقہ میں رہنے والی ایک بت پرست قوم تھی ، ان کو بھی اس میں شامل کیا گیا۔پھر جلد ہی جب سندھ فتح ہوا تو ہندو اور بدھ مت لوگوں کو جو وہاں پائے جاتے تھے، اسی زمرے میں شامل کرلیا گیا اور وہ بھی جزیہ دینے لگے۔ اسی طرح غیر مسلم رعایا سے اور بھی ٹیکس لیے جاتے تھے۔بعض صورتوں میں مسلمانوں کے ٹیکس سے کسی قدر گراں تر شرح سے، مثلاً اگر مسلمان تاجر کسی مقام پر سامان لاتے تو ان سے ڈھائی فیصد شرح کے حساب سے چنگی وصول کی جاتی تھی۔اگر وہ ذمی ہوتے تو ان سے پانچ فیصد کی شرح سے، اگر غیر ملکی اور غیر مسلم ہوتے تو ان سے دس فیصد، غرض شرح مختلف ہوتی تھی۔ذکر آیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں مدینہ میں گرانی بڑھنے لگی تو انہوں نے غیر ملکی غیر مسلم تاجروں سے محصول درآمد یا امپورٹ ڈیوٹی بجائے دس فیصد کے پانچ فیصد کردی تاکہ سامان کے نرخ میں تخفیف ہو اور لوگوں کو گرانی کی جگہ ارزانی میسر ہو۔اس طرح چند اصول تھے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں میں فرق کی صورت میں ہمیں نظر آتے ہیں۔جیسا کہ دنیا کے بعض غیر مسلم علاقوں میں بھی پائے جاتے تھے۔ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو زکوٰۃ سونے اور چاندی کے متعلق ہے، اس کا کیا قاعدہ ہے؟ اس بارے میں صراحت ملتی ہے کہ یہ مسلمانوں پر واجب ہے لیکن غیر مسلموں پر نہیں۔غیر مسلموں سے ٹیکس اور خراج کے نام سے زراعت وغیرہ کی زکوٰۃ تو لی جاتی ہے لیکن سونے، چاندی، درہم اور دینار کے اندوختے پر ان سے زکوٰۃ نہیں لی جاتی۔اس کی وجہ جو میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ غیر مسلموں کو اس حکومت کے اندر داخلی خود مختاری دے دی گئی تھی۔مسلمانوں کے علاوہ جتنی رعایا تھی مثلاً یہودی، نصرانی اور پارسی وغیرہ وغیرہ، ہر کمیونٹی کو اپنے قومی و مذہبی معاملات میں آزادی حاصل تھی۔ان انتظامات کے لیے بھی کچھ رقم کی ضرورت ہونی چاہیئے۔لہٰذا غیر مسلم رعایا پر جو سونے اورچاندی کی رقم پر زکوٰۃ ہونی چاہیئے تھی، اس کو ان اقلیتوں کی مذہبی انتظامیہ کے لیے مخصوص کردیا گیا جو ان سے اپنا ٹیکس وصول کرتی اور اس کے ذریعے اپنی مذہبی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کرتی۔مسلمانوں سے نقد رقم پر زکوٰۃ لینے میں یہ امر بھی مضمر ہے

کہ وہ رقم کو اندوختہ کرکے بیکار نہ رکھیں بلکہ اس کو ہر وقت گردش میں رکھیں کہ وہ پھلے پھولے اور نفع آور بنتی رہے۔دوسرے الفاظ میں رقم کو بیکار معطل ڈالے رکھنے کی گویا ایک "جرمانے" کے ذریعے سے حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔

اولاً جیسا کہ ابھی کچھ دیر پہلے عرض کرچکا ہوں کہ اپنی تقریر کے ایک جزء کے متعلق کچھ بیان کروں گا اور وہ تقویم کا مسئلہ ہے جو دلچسپ ہے اور اس پر ہمارے مؤلفین آج کل کم غور کرتے ہیں۔عرب میں اسلام سے پہلے شمسی سال پایا جاتاتھا جیسا کہ آج کل پایا جاتا ہے۔جس طرح انگریزی سنہ کی وجہ سے سال کے موسم معین مہینوں میں آتے ہیں۔لیکن عربوں کانظام فرنگی اصول سے الگ تھا۔مہینوں کا آغاز رویت ہلال سے ہوتا تھا اور مہینوں کا اختتام نئی رویت ہلال سے ہوتا تھا۔یعنی خالص قمری مہینے پائے جاتے تھے لیکن چونکہ قمری سال کے بارہ مہینوں میں عموماً چھ مہینے انتیسے اور چھ مہینے تیسے ہوتے تھے۔اگر ہم شمار کریں تو ایک سال میں دنوں کی مجموعی تعداد تقریباً ۳۵۴ دن بنتی ہے۔موسموں کا جو فرق پیدا ہوتا ہے، کبھی گرمی، کبھی سردی وغیرہ یہ آفتاب کی گردش کے باعث ہے۔آفتاب کی گردش ۳۶۵ یا ۳۶۶ دنوں میں مکمل ہوتی ہے۔کہتے ہیں کہ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے قدیم زمانے میں بابل والوں نے جب یہ معلوم کرلیا کہ قمری سال بہ نسبت شمسی سال کے (جس میں موسموں کا لحاظ ہوتا ہے) کوئی گیارہ، بارہ دن چھوٹا ہوتا ہے تو انہوں نے شمسی تقویم اختیار کرلی۔بابل والوں نے دیکھاکہ اگر قمری سال پر عمل کریں توو فصل کاٹنے کا زمانہ، حکومت کو ٹیکس دینے کا زمانہ اور بیجوں کو بونے کا زمانہ اس سے مطابقت نہیں رکھتا اور لوگوں کو اس کی وجہ سے نقصان ہوتا ہے۔انہوں نے اس کا ایک حل معلوم کرلیا اور وہ یہ تھا کہ تقریباً ہر تین سال کے بعد ایک مرتبہ بجائے بارہ کے تیرہ مہینوں کا سال کردیا جائے۔جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ قمری سال گیارہ دن چھوٹا ہوتا ہے تو اس طرح تین سال میں تینتیس دن کم ہوں گے۔جو تقریباً ایک مہینے کے برابر تو ہیں لیکن بہت ٹھیک نہیں بلکہ محض کم و بیش۔غرض بابل میں ہر تین سال کے بعد سال میں ایک مہینے کا اضافہ کردیا جاتا تھا اور کیلنڈر میں اس سال تیرہ مہینے ہوتے اور پھر اس کے بعد دو سال بارہ، بارہ ماہ ہوتے۔پھر تیسرا سال تیرہ مہینوں کا ہوتا۔لیکن کچھ عرصہ بعد تجربے نے ثابت کردیا کہ یہ حساب ٹھیک نہیں۔کیونکہ قمری سال اگر شمسی سال سے تقریباً بارہ دن چھوٹا ہے تو تین سال میں ۳۲ دن بڑھانے کی ضرورت ہوگی، اور تیرہویں مہینے سے صرف انتیس یا تیس دن حاصل ہوسکیں گے۔حقیقی فرق بارہ دن کا نہیں بلکہ اس میں گھنٹے ، منٹ سیکنڈ اور سیکنڈ کا جزء بھی ہوتے ہیں جو ہر سال جمع ہوکر رفتہ رفتہ مزید فرق پیدا کردیتے ہیں۔بہرحال

اپنے علم کی ترقی سے انہوں نے تحقیقات کے ذریعے اس نظام کو اور زیادہ ترقی دی اور کہا کہ اتنے سال تک تو تین برس کے بعد ایک مہینے کا اضافہ ہوگا۔ جس کے بعدایک مرتبہ دو ہی سال کے بعد تیرھواں مہینہ تقویم میں بڑھایا جائے گا وغیرہ۔ اس طرح وہ اس بات میں کامیاب ہوئے کہ زراعتی اعراض کے لیے قمری مہینوں کے ذریعے سے بھی شمسی سال کی طرح کام لیا جا سکے۔ شہر مکہ میں بھی یہ نظام پایا جاتا تھا۔ اس کو زمانہ جاہلیت میں "نسی" کا نام دیا گیا۔ میں یہاں اس کی تفصیلات بیان کرنے سے گریز کروں گا۔ میں اس پر ایک مستقل اور مفصل مقالہ شائع کرچکا ہوں۔ مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ "نسی" کا جس میں سال میں کبھی کبھی تیرھواں مہینہ بڑھایا جاتا تھا مکہ میں رواج رہا، مکہ کے حج کے باعث پورے جزیرہ نمائے عرب میں اس پر عمل تھا۔ اور رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی، آخری تین مہینوں کے سوا، اسی نظام کے تحت بسر ہوئی۔ آخری تین مہینوں کے الفاظ اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ رسول اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں "نسی" کی منسوخی کا قرآنی حکم کے تحت اعلان فرمایا: " إِنَّمَا ٱلنَّسِيٓءُ زِيَادَةٌ فِي ٱلۡكُفۡرِۖ يُضَلُّ بِهِ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ يُحِلُّونَهُۥ عَامًا وَيُحَرِّمُونَهُۥ عَامًا لِّيُوَاطِـُٔواْ عِدَّةَ مَا حَرَّمَ ٱللَّهُ فَيُحِلُّواْ مَا حَرَّمَ ٱللَّهُ " (۹:۳۷) غرض اس کی منسوخی رسول اللہ ﷺ کے وصال کے صرف تین مہینے پہلے اور ذی الحجہ کے مہینے میں عمل میں آئی۔ اس "اصلاح" یا مخالفینِ اسلام کے الفاظ میں اس "نافہمی کی ترمیم" کی وجہ سے کیا نتائج نکلے، اسے دیکھنا پڑے گا۔ نافہمی کا لفظ وہ اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ دوبارہ خالص قمری نظام رائج ہوجانے کی وجہ سے حکومت کو ٹیکسیشن میں دشواریاں پیدا ہوگئیں۔ مثلاً انہوں نے طے کیاہو کہ رمضان کے مہینے میں ہر سال لوگ مال گزاری ادا کریں گے۔ پہلے ایک دو سال تو رمضان کے مہینے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی ہوگی، لیکن اس کے بعد رفتہ رفتہ فرق بڑھتا گیا ہوگا اور پھر یہ ہوا ہوگا کہ رمضان آجاتا تھا اور فصلیں کٹتی نہیں تھیں بلکہ کھیتیاں کھڑی رہتی تھیں وغیرہ۔ اس تصور کی بنا پر یہ فرض کرلیا گیا کہ یہ اصلاح نہیں تھی بلکہ ایک طرح سے تخریب تھی، لیکن عہدِ نبویؐ کا رواج ہمیں اس کا جواب دیتا ہے کہ یہ ایسا نہیں تھا۔ اگرچہ نسی کی منسوخی کا اعلان ذی الحجہ ۱۰ ھ میں کیا گیا لیکن اس کی پیش بندی میں کچھ عرصہ پہلے سے ہی ایک اور انتظام قائم کردیا گیا تھا، جس کے اشارات ہمیں پوری وضاحت کے ساتھ مختلف مکتوباتِ نبویؐ میں ملتے ہیں۔ مختلف قبیلوں کے سرداروں کو پروانے دیے جاتے ہیں، ان سے معاہدے ہوتے ہیں یا ان کو کوئی جاگیروغیرہ دی جاتی ہے تو اس میں صراحت ہے کہ یہ لوگ اپنی زراعتی زکوٰۃ معین مہینے میں یعنی رمضان شوال وغیرہ میں نہیں دیں گے۔ بلکہ فصل کٹنے پر

ادا کریں گے۔سب سے بڑی دشواری قمری سال میں یہی ہے کہ وہ زراعتی اغراض کے لیے کارآمد نہیں ہے۔اس کا حل رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ زراعتی اغراض کے لیے لوگ اپنا ٹیکس یا مال گزاری قمری مہینے کے لحاظ سے ادا نہیں کریں گے بلکہ فصل کے کٹنے پر۔لہٰذا ساری دشواریوں کا اس طرح خاتمہ ہوجاتا ہے۔باقی جو دوسرے ٹیکس ادا کرنے ہوتے ہیں، مثلاً تجارت پر معدنیات پر اس میں اسی ترمیم اور اس نظام کی تبدیلی یعنی شمسی سال کی جگہ قمری سال کو نافذ کرنے کی وجہ سے، حکومت کو ایک غیر معمولی فائدہ ہوا۔ایک مرتبہ جرمنی میں ایک لیکچر دیتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ اگر اس مصلحت کو آج روسی اور امریکی وزرائے مالیات معلوم کریں تو دونوں ہی قمری سنہ کو اختیار کرلیں گے اور شمسی سنہ کو رد کردیں گے۔اس کیوجہ میں نے یہ بتائی کہ چونکہ شمسی سال سے قمری سال گیارہ دن چھوٹا ہوتا ہے لہٰذا ہر تیس سال میں شمسی لحاظ سے توحکومت تیس مرتبہ ٹیکس وصول کرے گی لیکن قمری سال کے حساب سے اکتیس مرتبہ ٹیکس لے گی۔حکومت کو ہر سال تیس سال میں ایک زائدسال کے ٹیکس وصول ہوں گے۔کون سا وزیر مالیات ہوگا جو اس زائد آمدنی کو قبول نہ کرے گا؟ تقویم کی اس تبدیلی کی وجہ سے، اس میں شک نہیں کہ قانون میں ایک طرح کی لا مرکزیت (Decentralization) پیدا ہوجاتی ہے۔بعض چیزوں پر ایک زمانے میں ٹیکس وصول کیا جاتا ہے اور بعض چیزوں پر کسی دوسرے زمانے میں۔یہ کوئی مصیبت کی چیز نہیں تھی بلکہ ایک اور نقطہ نظر سے جانچیں تو حکومت کے لیے بھلائی کی چیز تھی۔معلوم نہیں آپ لوگوں کو واقفیت ہے کہ انہیں کہ آج کل حکومت کا خزانہ ٹیکس کے ادا ہونے کے زمانے سے عین پہلے خالی ہوجاتا ہے اور اس کو اپنی فوری ضرورتوں، ملازمین کی تنخواہوں وغیرہ کے لیے رقم نہیں ملتی، تو وہ Debenture کے ذریعے سے مختصر مدت کے لیے سود پر قرض لیتی ہے۔پھر جب ٹیکس کی وصولی کے باعث خزانہ بھر جاتا ہے تو وہ قرضے ادا کردیتی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ شمسی سال کے تحت سارے بڑے ٹیکس ایک معین مہینے میں آتے ہیں مثلاً زکوٰۃ کا زراعت کا ٹیکس ہے، فرض کیجئے وہ اگست کے مہینے میں ہمیشہ آئے گا۔دیگر ٹیکسوں میں کچھ تو مثلاً چنگی، ریل کے ٹکٹ روزانہ کے ہیں اور کچھ دیگر قسم کے ہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حکومت کا خزانہ ایک خاص زمانے میں خالی ہوجاتا ہے تو حکومت کے پاس روزمرہ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے مطلوبہ رقم نہیں ہوتی۔اسلامی حکومت میں اس نظام کے تحت یعنی اس اصلاح کے تحت حکومت کے ٹیکس مختلف موقعوں پر وصول ہوتے ہیں۔جو زراعتی ٹیکس ہے اس کا مہینہ الگ ہوتا ہے، دیگر ٹیکسوں کا زمانہ علیحدہ ہوتا ہے۔اس طرح حکومت کا خزانہ ہر زمانے میں بھرا رہتا ہے اور رہ سکتا ہے۔یہ بات شمسی سال میں نہیں پائی جاتی۔یہ ایک خاص پہلو تھاجس کی طرف

مجھے اشارہ کرنا تھااور شاید آخری جملے کے طور پر عرض کروں کہ سارے اسلامی ممالک میں موجودہ شمسی تقویم یعنی فرنگی نظام چل رہا ہے۔اس نظام میں باوجود علم کی ترقی اور انتہائی دقیق آلات کی ایجاد کے اب بھی رفتہ رفتہ فرق پیدا ہورہا ہے۔کہا جاتا ہے کہ ایک ہزار سال کے بعد پورے ایک دن کا فرق پیدا ہوجائے گا۔عمر خیام نے بھی اپنے زمانے میں ایک نظام پیش کیا تھا۔میں نے اس کا جو مقالہ پڑھا تھا، اگرچہ میں اس کی تفاصیل سمجھنے سے قاصر رہا، البتہ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ عمر خیام کے نظام سے ایک دن کا فرق ایک لاکھ سال بعد پیدا ہوگا۔اس کا نظام زیادہ پیچیدہ ہے لیکن اتنا صحیح ہے کہ پورے ایک لاکھ سال میں بھی مشکل سے ایک دن کا فرق پیدا ہوتا ہے۔یہ تھیں چند گزارشات جو مجھے آپ کے سامنے پیش کرنا تھیں۔السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاۃ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

## سوال وجواب

برادران کرام! خواہران محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

متعدد سوالات آپ کی طرف سے آئے ہیں، میں جوابات دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

**سوال ۱: "الخمس مردود علیکم" کی رو سے ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کی گزر اوقات مالِ غنیمت پر تھی؟**

**جواب:** "خمس مردود علیکم" یہ مالِ غنیمت کے اس جزء (۵/۴) کا ذکر ہے جو حکومت کو آتا ہے۔ مالِ غنیمت کا (۵/۴) حصہ سپاہیوں میں تقسیم ہوتا ہے اور رسول اللہ ﷺ اگر فوج کی لڑائی میں شریک رہے ہوں تو آپؐ کا حصہ بھی فوج کے دیگر سپاہیوں کی طرح اس (۵/۴) سے ملے گا اور وہ آپؐ کی ذاتی ملکیت ہو گی، اور اس پر گزر اوقات میں کوئی امر مانع نہیں۔ اور خمس جو حکومت کو ملتا ہے اس کے متعلق بھی رسول اللہ ﷺ کو بحیثیت صدر مملکت کچھ اختیارات دیے گئے ہیں اور عام زکوٰۃ کے برخلاف مالِ غنیمت سے حاصل ہونے والی آمدنی کو رسول اللہ ﷺ اپنے اور اپنے خاندان کے لیے استعمال فرما سکتے ہیں۔ اس طرح ان دونوں میں کوئی تضاد پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن مالِ غنیمت کوئی ایسی چیز نہیں جو ہر وقت آئے یا بہت کافی مقدار میں ہو اس لیے روزمرہ کی غذا وغیرہ کے لیے اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

**سوال ۲: علماء کو ہدیہ دینا جائز ہے اگر امداد کے طور پر دینا چاہیں؟ براہ کرم وضاحت فرمائیں۔**

**جواب:** میرے خیال میں اس سوال کے جواب کی کوئی ضرورت نہیں۔ لوگوں کی طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں، مجھے اگر ہدیہ دیا جائے تو میں رد کر دیتا ہوں، چاہے کتنی ہی محبت سے کوئی پیش کرے۔ کوئی عالم اسے قبول کرنا چاہے تو میں اسے روکتا نہیں۔ عام اصول، بطور سفارش

کے کہیئے یا بطور تاکید کے، ایک حدیث شریف میں مذکور ہے کہ استاد کو اپنے شاگردوں سے کوئی چیز نہیں لینی چاہیے۔۔اور اس سلسلے میں ایک سخت لفظ استعمال ہوتا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک مرتبہ عبادہ بن الصامتؓ، رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے یا رسول اللہ ﷺ! مجھے ایک شاگرد نے، جسے میں نے قرآن کی تعلیم دی تھی، ایک کمان ہدیہ کی ہے کہ میں اس سے جہاد فی سبیل اللہ کروں۔ رسول اللہ ﷺ نے جواباً فرمایا یہ کمان جہنم کی آگ ہے۔ تو وہ دوڑے ہوئے گئے اور کمان اپنے شاگرد کو واپس کر دی۔ علماء کو ہدیہ دینا نیت پر مبنی ہے۔ اگر آپ کا منشاء زکوٰۃ کی رقم میں سے بطورِ خیرات اپنے استاد کو دینا ہو اور اگر وہ استاد خاندان بنی ہاشم سے تعلق رکھتا ہو تو ہماری فقہ کے مطابق یہ اس کے لیے حرام ہے۔ لیکن اگر وہ غریب ہے تو وہ لے سکتا ہے۔ اس کے متعلق کوئی خاص چیز بیان کرنے کی میں ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

**سوال۳: آپ کے بیان کردہ اصول کے مطابق آج کل مسافروں کو مفت ہوٹل اور کھانا مہیا کرنا شروع کر دیا جائے تو پھر اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ لوگ مستقل مسافر نہ بن جائیں؟**

**جواب:** ایسا نہ سمجھئے۔ پیرس میں ہر محلے میں بیروزگار غریبوں کو روزانہ مفت کھانا کھلایا جاتا ہے لیکن کوئی شریف آدمی کبھی وہاں نہیں جاتا۔ یوں بھی ایک شہر میں تین دن رہیں گے۔ اس کے بعد انہیں جبراً وہاں سے رخصت کر دیا جائے گا۔

**سوال۴: اگر کسی کو کثیر رقم قرض دی گئی ہو تو کیا اس پر زکوٰۃ ہوگی، جب کہ وہ قرض تین سال کے لیے دیا گیا ہو؟**

**جواب:** زکوٰۃ کی ضرورتوں کے لیے، قرض دی گئی رقم کو جائیداد میں سے حذف کر دیا جاتا ہے۔ فرض کیجئے میرے پاس ایک لاکھ روپے تھے اور میں نے مثلاً نوے ہزار روپے قرض دے دیے ہیں تو خیال کیا جائے گا کہ زکوٰۃ کی ضرورتوں کے لیے میرے پاس صرف دس ہزار روپے ہیں۔ اس لیے اس میں کوئی دشواری نہیں۔

**سوال۵: یتیم کے مال کا ولی "زکوٰۃ" دے سکتا ہے یا نہیں؟**

**جواب:** اس بارے میں ہمارے فقہاء کی رائے میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ دینی ادائیگیاں کرنی چاہئیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ ہر شخص صرف اپنے اپنے امام کے فتاویٰ کے مطابق عمل کرے گا۔

**سوال۶: ”فی سبیل اللہ“ کے مال اور رقم سے کیا ملک کے دفاع کی خاطر ایٹم بم یا ہائیڈروجن بم خریدے جاسکتے ہیں، حالانکہ ان سے بہت سے بے گناہ افراد مارے جاتے ہیں اور ان کے اثرات آنے والی نسلوں کو بھی متاثر کرتے رہتے ہیں۔ بحوالہ ہیروشیما، ناگاساکی وغیرہ؟**

**جواب:** جہاں تک دفاع کا تعلق ہے اس میں کوئی امتیاز نہیں کہ کس غرض کے لیے ہم رقم صرف کرتے ہیں۔ یہ امر تجربے سے معلوم ہوچکا ہے کہ ایٹم بم کا استعمال اب تک صرف ایک دفعہ ہوا ہے اور اس کے بعد جن سلطنتوں کے ہاتھ میں ایٹم بم ہے، اگر وہ جنگ میں شریک بھی ہوئیں تو انہوں نے آج تک اس کا استعمال نہیں کیا۔ وہ ایک Dissuasive چیز بن جاتی ہے اور اگر کسی سلطنت کے پاس ایٹم بم یا ہائیڈروجن بم ہو تو اوروں کو اس پر آسانی کے ساتھ حملہ کرنے کی جسارت نہیں ہوتی۔ جیسا ہم اپنے ہمسائے ملک افغانستان میں دیکھ رہے ہیں۔ اگر پاکستان کے پاس مذکورہ بم آجائیں اور انشاء اللہ تعالیٰ آجائیں گے تو ہمارے بہت سے ہمسائیوں کی ہوس ملک گیری بڑی حد تک کم ہوجائے گی۔

**سوال۷: حکومت زکوٰۃ اور عشر وصول کرنے کے بعد پراپرٹی ٹیکس وصول کرسکتی ہے یا نہیں؟**

**جواب:** آج سے نہیں بلکہ ہزار سال سے زیادہ عرصے سے اسلامی حکومتیں یہ تجربہ کرچکی ہیں کہ ان کی آمدنیاں جو کہ زکوٰۃ و عشر سے حاصل ہوتی ہیں ان کی ضرورتوں کے لیے ناکافی ہیں۔ تو اپنے زمانے کے فقہاء کے فتوے اور اجازت سے اور اتفاقِ رائے سے رعایا اور حکومت دونوں کی ضرورت کے پیشِ نظر نئے ٹیکس لگائے گئے اور انکو ”نوائب“ کا نام دیا گیا۔ جس کے معنی فوری ضرورتوں کے لیے عارضی ٹیکس کے ہیں۔ یہ عارضی ٹیکس عملاً مستقل بن جاتے ہیں لیکن منشاء یہ ہوتا ہے کہ یہ مستقل ٹیکس مثلاً زکوٰۃ کی طرح کے نہیں ہوں گے بلکہ ان کی حیثیت عارضی ہوگی۔ جب تک وہ ضرورت باقی ہے اس پر عمل کیا جاتا رہے گا۔ یعنی جن حالات میں ہماری ضرورتوں کے لیے زکوٰۃ اور عشر ناکافی ثابت ہوں (اور میں سمجھتا ہوں کہ ناکافی ثابت ہوں گے) تو ان حالات میں ”نوائب“ کے نام سے مزید ٹیکس لگائے جاسکتے ہیں۔ اس کے بغیر ملک کی معمولی اور بنیادی ضرورتوں کو ہم پورا نہیں کرسکتے، چاہے وہ دفاع کی ضرورت ہو یا ضروریات، مگر اس کا فیصلہ میں نہیں کروں گا۔ حکومت کی وزارتِ مالیہ اور پارلیمنٹ کرسکے گی کیونکہ نوائب واجبی نہیں مباح چیز ہیں۔

**سوال۸: کیا ہم مسلمان ٹیلیویژن دیکھ سکتے ہیں یا نہیں؟ شرعاً اس کی کیا حیثیت ہے؟**

**جواب:** یہ مسئلہ شاید اختلافی بن جائے گا، اس بنا پر کہ فوٹو گراف کو ہمارے بعض علماء جیسے مصر کے محمد عبدہ کہتے ہیں کہ جائز ہے، بعض مجھ جیسے جاہل کہتے ہیں کہ ناجائز ہے، ٹیلی وژن میں بھی فوٹو آتا ہے تو میری رائے میں وہ ناجائز ہوگا۔ اگر محمد عبدہ کی آپ تقلید کرنا چاہیں تو وہ جائز ہو جائے گا۔ لیکن میں بھی اور وہ بھی اس بات پر متفق ہوں گے کہ ٹی وی کا استعمال فحش اغراض کے لیے اور ایسی چیزوں کے لیے جن کا مقصد تعمیری نہیں تخریبی ہے، نہیں ہونا چاہیے۔

## سوال۹: خلیفہ پر مقدمہ چلانے (Impeachment) کا طریقہ کار اسلام میں کیا ہے؟

**جواب:** جہاں تک مجھے معلوم ہے Impeachment کے معنی ہیں مقدمہ چلا کر سزا دینا۔ اس کی کوئی مثال تاریخِ اسلام میں نہیں ہے۔ خلفاء کو معزول کیا گیا، خلفاء کو قتل کیا گیا۔ لیکن یہ فوجی افسروں کی اپنی صوابدید پر ہوا، عدالت کے حکم سے نہیں کیا۔ اس کا کوئی طریقہ ہے یا نہیں، میرے لیے یہ کہنا دشوار ہے، لیکن ہمارے فقہاء قدیم سے یہ کہتے آئے ہیں کہ جو لوگ کسی کو خلیفہ یا حکمران بنا سکتے ہیں وہی اس کو معزول بھی کر سکتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حاکم کی حیثیت وکیل یعنی نائب کی ہے، یعنی میں ایک شخص کو اپنے ذاتی انتظامات کے لیے اپنا نائب مقرر کرتا ہوں تو مؤکل کو حق ہوتا ہے کہ وکیل کو جب چاہے اس کی خدمات سے الگ کر دے، اس لیے اس اساس پر ہمارے فقہاء کہتے چلے آئے ہیں کہ اگر حکمران نااہل ثابت ہوں تو انہیں معزول بھی کیا جا سکتا ہے۔ غالباً یہی ایک صورت ہے جس کا فقہاء نے ذکر کیا ہے۔ حکمران پر مقدمہ چلانے Impeachment کا جو مغربی تصور ہے، وہ میری دانست اور میرے علم میں کبھی پیش نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے یا نہیں، اس کے متعلق میں صرف اپنی ذات کی حد تک کہہ سکتا ہوں کہ وہ ممنوع نہیں ہے، اس کا فیصلہ ہماری پارلیمنٹ کر سکتی ہے۔

## سوال۱۰: سنگ تراشی، مصوری، فلم وغیرہ تفریح کے دائرے میں آتے ہیں یا نہیں؟ یا انہیں معصیت گردانا گیا ہے؟

**جواب:** میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ تصویر کے متعلق میرا اپنا تصور حرمت کا ہے اور بعض دوسرے بڑے علماء جیسے محمد عبدہ اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔ جہاں تک فلم اور فوٹو گرافی کا تعلق ہے اس میں کچھ حد تک اختلاف رائے ہے۔ باقی سنگ تراشی (بت تراشی) اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے، سبھی اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔

**سوال ۱۱: اگر ایک آدمی کو اس کے حق سے محروم کیا جارہا ہو اور بجز اس کے کہ وہ رشوت دے، اس کو اپنا جائز حق ملنے کی امید نہیں، تو کیا اس صورت میں رشوت جائز ہو گی؟**

**جواب:** یہ بڑا مشکل سوال ہے کیونکہ حدیثِ مبارکہ کے الفاظ میں الراشی والمرتشی کلاھما فی النار یعنی رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں جہنم میں جائیں گے۔ لہٰذا اسے چاہیئے کہ رشوت نہ دے تھوڑی مصیبت بھگت لے۔ اگر ہم رشوت دینے سے اجتناب کریں تو ملک سے اگر رشوت ستانی کا خاتمہ نہیں ہو سکتا، تو کم از کم اس میں کمی تو واقع ہو گی۔ لیکن ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ آدمی مجبور ہو جائے تو اپنی جان بچانے کے لیے اپنا مال خرچ کر سکتا ہے۔ چنانچہ ایک مثال میرے ذہن میں ہے۔ لکھا ہے کہ جب ہجرت سے پہلے بہت سے مکہ کے مسلمان حبشہ گئے تو عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے کہ انہیں کسی وجہ سے حبشہ کی پولیس سے کچھ دشواری پیش آئی اور انہوں نے اس کو نصف دینار یا پانچ درہم بطور بخشش کے دے دیے اور اس طرح ان کی گلو خلاصی ہوئی۔

**سوال ۱۲: رسول اللہ ﷺ کے اہل بیت کی ذرا وضاحت کیجیے۔ کیا آل رسول یعنی سید زادوں کو اہل بیت قرار دے سکتے ہیں؟**

**جواب:** میری رائے میں قرار دینا پڑے گا۔ اس میں یہ ذکر نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں آپ کی جو اولاد ہے بلکہ پورے بنو ہاشم اور بنو المطلب بھی۔ اس کے معنی ہیں وہ لوگ جو اس وقت بڑے تھے اور وہ لوگ جو بچے تھے، سب اس میں داخل تھے۔ ان کے بعد آنے والے بچے بھی اس میں داخل ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں ہمارے علماء کا اتفاق ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ اگر کسی زمانے میں اہل بیت (سید زادوں) میں سے کسی کے لیے کوئی ذریعہ معاش بالکل موجود نہ ہو اور حکومت بھی ان کی ضرویات کو پورا کرنے سے عمداً یا سہواً یا عدم امکان کی وجہ سے، غافل ہو تو ان کو خیرات دے سکتے ہیں۔

**سوال ۱۳: اسلامی نقطہ نظر سے انسان اپنے جسم کا مالک نہیں ہے بلکہ اس کی مالک اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ کیا اسلامی نقطہ نظر سے آنکھوں، خون اور دیگر اعضائے جسمانی کا عطیہ دینا جائز ہے یا نہیں؟ اس طرح کسی دوسرے شخص کی آنکھ یا دل وغیرہ لگانا جائز ہے یا نہیں؟**

**جواب:** اس بارے میں نہ آپ کو قرآن میں کوئی ذکر ملے گا، نہ حدیث میں اور نہ ہی ہمارے پرانے آئمہ اور فقہا کی کتابوں میں۔ یہ چیز علم طب کی جدید ترین ترقی ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہوئی ہے۔ اس بارے میں ابھی تک کوئی اجماع نہیں ہو سکا۔ ہمیں معلوم

نہیں کہ اور فقہاء کی کیا رائے ہے۔ میں اپنی ذاتی رائے عرض کر سکتا ہوں، ممکن ہے اس سے اوروں کو اتفاق ہو، ممکن ہے وہ اسے رد کر دیں۔ ایک زندہ کی جان بچانے کے لیے ایک مردہ کی ذات سے استفادہ کیا جائے تو اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ اس طرح ایک انسان کی فالتو چیز سے دوسرے انسانوں کا فائدہ ہوتا ہو، تو اس کی اجازت سے ہم استعمال کر سکتے ہیں۔ ان حالات میں فرض کیجئے ایک آدمی مر جاتا ہے اور فوراً ہی اس کی آنکھوں کو لے کر آج کل طبی طریقے سے محفوظ کر لیتے ہیں اور ان کو کسی اندھے کے لیے استعمال کر کے اسے بینائی بخشتے ہیں۔ میرے خیال میں ایک زندہ کی جان بچانے کے لیے ایک مردہ کے جسم سے استفادہ کر لیا جائے تو اس میں کوئی امر مانع نہ ہو گا۔ اس طرح اگر میں اپنا خون کسی کو دوں تو ایک طرح کی خیرات ہے اور میں خوشی سے دیتا ہوں تو کوئی امر مانع نہیں۔ اگر مجھ سے جبراً لیا جائے تو ممکن ہے حقوقِ انسانی کی خلاف ورزی کے تحت آجائے۔ حدیث شریف میں مثلہ کرنے (Mutilation) کی بے شک ممانعت آئی ہے لیکن اس کا مقصد مرے ہوئے شخص کی توہین ہوتی تھی۔ اعضاء کی علاج کے لیے منتقلی میں یہ بات بالکل نہیں پائی جاتی۔

**سوال ۱۴: مسلمانوں سے چنگی کی شرح اور غیر مسلموں سے چنگی کی شرح میں تفاوت بظاہر ظلم لگتا ہے۔ براہ کرم اس نکتے کی وضاحت فرمائیں۔**

**جواب:** یہ سوال خود مجھے بھی کھٹکا تھا۔ عرصہ تک میں اس پر غور کرتا رہا اور اس کا جواب جو میرے ذہن میں آیا، وہی میں آپ سے عرض کرتا ہوں۔ یہی جواب میں نے ایک اطالوی پروفیسر "لیوی دیل لاویدا" کو دیا تھا جو یہودی النسل تھے۔ وہ اعتراض پر تلے ہوئے تھے اور جب میں نے تشریح کی تو وہ ایک دم چپ ہو گئے اور کہا کہ اس منطق کے سامنے کسی رابی Rabbi کی زبان بھی نہ کھل سکے گی۔ میرا جواب یہ تھا کہ مسلمانوں پر بعض بندشیں ہیں جو غیر مسلموں پر نہیں۔ انہیں سب سے اہم سہولت سود کی ہے جب کہ ایک مسلمان نہ سود لے سکتا ہے، نہ دے سکتا ہے۔ اس کے برخلاف اسلامی قانون غیر مسلموں کو داخلی خود مختاری عطا کرتا ہے جس میں ان کا حق ہے کہ وہ سود لیں یا دیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک سود لینے والا غیر مسلم تاجر بہت جلد متمول ہو جاتا ہے بہ نسبت ایک مسلمان تاجر کے۔ اس طرح اس کی سالانہ آمدنی بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ چونکہ اس کی آمدنی زیادہ ہوتی ہے لہٰذا ٹیکس بھی زائد شرح سے عائد ہوتا ہے۔ اسے ظلم نہیں کہا جا سکتا۔ تجربہ بتاتا ہے کہ اس ٹیکس کی شرح کی زیادتی کے باوجود غیر مسلم زیادہ فائدے میں رہتا ہے، اس لحاظ سے بھی کہ اسلامی حکومت مسلمان پر زیادہ مالی ذمہ داریاں اور پابندیاں عاید کرتی ہے بہ نسبت غیر مسلوں کے۔ ملکیوں اور غیر

ملکیوں میں فرق بہت سے ملکوں میں رہا ہے اور اب بھی ہے آپ نے اخباروں میں بارہا "نہایت منظور نظر قوم کا سا برتاؤ" Most Favoured Nation Clause کا بھی ذکر پڑھا ہو گا اور امریکہ وغیرہ کی Protectionism (یعنی اپنے اقتصادی مفاد کے تحفظ کے لیے اجنبی مالک تجارت کی درآمد پر بندشوں) کا بھی ملکیوں میں مسلم اور غیر مسلم کے فرق کی وجہ میں ابھی بیان کر چکا ہوں کہ وہ فرق حقیقی نہیں بلکہ ٹیکنیکل ہے۔

**سوال ۱۵: آپ نے اپنی گزشتہ تقاریر میں جس فرقہ بندی کی حمایت کی ہے وہ مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہو رہی ہے۔ یہی فرقہ پرستی مسلمانوں کو ایک دوسرے سے دور کر رہی ہے۔ واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا (۳:۱۰۳)) (اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ بازی نہ کرو) ایک اور جگہ پر آیا ہے کہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم (۴۸:۲۹) (کافروں کے لیے سخت اور آپس میں نرم) یہ حکم ایمان لانے کے بعد ہر مسلمان پر نافذ ہوتا ہے تو ان آیات کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنا نقطہ نظر واضح کریں؟**

**جواب:** میں سمجھتا ہوں ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ میں نے یہ کہا ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی کام مختلف اوقات میں مختلف طریقوں سے انجام دیا ہے اور ایک گروہ کے نزدیک مثلاً حنفی یا شافع، ایک عمل کی روایت کے مطابق ایک بات پر عمل ہوتا ہے اور دوسرے گروہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سنت پر (ایک دوسری روایت کے مطابق) عمل ہوتا ہے، تو ہمیں رواداری سے کام لینا چاہیے اور اس کو فرقہ واریت قرار نہ دیں۔ کیونکہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر مبنی ہیں۔۔ خیال فرمائیے کہ اگر آج ایک حنفی کسی شافعی کے پیچھے نماز سے یا شافعی حنفی کے پیچھے نماز پڑھنے سے اس بناء پر انکار کرے کہ اس کے امام کے بیان کردہ طریقے کے خلاف ورزی ہو گی، تو اس کے کیا معنی ہیں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے فرقے کے امام کے طریقے کے مطابق نہیں بلکہ کسی دوسرے فرقے کے امام کے طریقے کے مطابق کسی دن عمل فرما رہے ہوں، تو میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کرتا ہوں، کون مسلمان اس بات کا تصور بھی کر سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کرے۔ اس نقطہ نظر سے غور فرمائیں تو آپ بھی اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ باہم رواداری زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ ہم میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عمل کرے۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت اگر ایک سے زیادہ طریقوں پر مشتمل رہی ہے تو بھی آپؐ کا طرزِ عمل ہے۔ ہمیں اس کا ادب واحترام کرنا چاہیئے۔

## سوال نمبر ۱۶: کیا زکوٰۃ ایک ٹیکس ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیا سربراہ مملکت اس کی شرح میں تبدیلی کا مجاز ہے؟

**جواب:** میں ٹیکس کا لفظ اپنی تقریر میں خود استعمال کر چکا ہوں اور کہہ چکا ہوں کہ اگر ٹیکس کا مطلب یہ ہے کہ ایک معینہ زمانے میں، ایک معینہ شرح سے ایک معینہ چیز، پر ہم رقم وصول کریں اور دینے سے انکار کرنے والے سے بالجبر وصول کریں، تو اس لفظ کا پورا پورا اطلاق زکوٰۃ پر بھی ہوتا ہے اور یہ بھی میں نے بیان کیا کہ زکوٰۃ کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ شروع میں زکوٰۃ ایک اختیاری چیز تھی یعنی خیرات کی طرح تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ قرآن مجید نے اس کو ایک فریضہ قرار دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کا زمانہ مقرر کیا، اس کی شرح مقرر کی اور اس کی ادائیگی پر مجبور کر دیا اور حضرت ابو بکرؓ کی طرزِ بود و باش بتاتی ہے کہ زکوٰۃ دینے سے انکار کیا جائے تو تلوار کے ذریعے اس سے وصول کیا جائے گا۔ یہی ٹیکس کے عناصر ہیں۔ ان حالات میں اگر زکوٰۃ کو ٹیکس کا نام دیا جائے تو وہ غلط نہ ہو گا۔ اگرچہ ٹیکس ایک برا لفظ ہے۔ اس کے معنی تکلیف دینے کے ہیں۔ اس لیے ہم نے ایک بہتر لفظ "زکوٰۃ" اختیار کیا ہے جس کے معنی ہیں "پاک کرنا"۔ میرے مال میں خدا کے حکم کے مطابق لوگوں کا جو حصہ ہے اس کا ادا کرنا مجھ پر فرض ہے۔ صرف لفظ کا فرق ہے، جب کہ معنی کی حد تک دونوں میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اس کی شرح میں تبدیلی کی جا سکتی یا نہیں؟ اس سلسلے میں ہمارے فقہاء کی رائے یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے کی شرح کو نہ بدلا جائے اور عصری ضرورتوں کے لیے "نوائب" کے نام سے نئے ٹیکس لگائے جائیں، تو اس طرح مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ ہمارا قانون جو خدا اور رسول اللہ ﷺ کے احکام کا نام ہے، اس میں کسی قسم کی تبدیلی کا کسی کو اختیار نہیں اور نہ ہی آج تک ایسی صورت پیش آئی ہے اور غالباً آئے گی بھی نہیں کہ ہماری حکومت یہ قرار دے کہ زکوٰۃ ایک گراں ٹیکس ہے اس کی ضرورت اب باقی نہیں رہی، اسے اب کم کیا جائے۔ اس کے برخلاف زکوٰۃ کی آمدنی سے زیادہ ہماری حاجات ہوتی ہیں، لہٰذا "نوائب" کے نام سے مزید ٹیکس لگائے جاتے ہیں۔ ہاں ایک چیز کہی جاتی ہے کہ قیامت کے قریب مسلمانوں میں دولت کی اس قدر فراوانی ہو جائے گی کہ لوگ مستحقینِ زکوٰۃ کی تلاش کریں لیکن انہیں کوئی بھی ملے گا نہیں۔ یہ ایک پیشن گوئی ہے جو ممکن ہے پوری ہو جائے۔ اس صورت میں زکوٰۃ دینے کی ضرورت نہیں رہے گی کیونکہ کوئی لینے والا نہیں ہو گا۔

## سوال ۱۷: کیا زکوٰۃ کی رقم سے مسجد بن سکتی ہے؟

**جواب:** میری رائے میں "فی سبیل اللہ" کی رقم سے مسجد بن سکتی ہے اور زکوٰۃ میں فی سبیل اللہ کی مد بھی ہے۔ ایک چیز کے متعلق ہمارے بعض فقہاء کہتے ہیں کہ زکوٰۃ کو اس پر خرچ نہیں کیا جا سکتا، وہ متوفی کی تجہیز و تکفین کا مسئلہ ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ زکوٰۃ میں

کسی شخص کو مالک بنایا جاتا ہے اور چونکہ متوفی مالک نہیں بنتا، لہٰذا متوفی کو زکوٰۃ کے ذریعے، کفن دینا ممکن نہیں۔ اس کا حل میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ زکوٰۃ کے ذریعے سے کفن خود مرنے والے کو نہ دیجئے بلکہ متوفی کے کسی قریبی رشتہ دار کو مدد کے طور پر زکوٰۃ دیجئے کہ وہ اس رقم سے اپنے متوفی عزیز کے کفن دفن کا انتظام کر سکے۔ یا کفن کا کپڑا ہی خرید کر غسال کو دے دیجئے۔ اس طرح وہ دشواری باقی نہیں رہتی جو عارضی طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی شخص کی وفات ہو جائے اور اس کے قریبی رشتہ دار بالکل نہ ہوں تو ناگزیر ہو گا کہ دیگر مسلمان اس کی تکفین و تدفین کریں چاہے وہ زکوٰۃ کی رقم سے ہی کیوں نہ ہو۔

### سوال ۱۸: کیا یہ امر درست ہو گا کہ کوئی شخص کسی فقہی مسلک کی اتباع "ایسر الامور" کے تحت کرے اور مسائل میں اپنی ضرورت اور سہولت کو بھی مدِ نظر رکھے؟

**جواب:** میں شخصاً اس کا قائل نہیں ہوں۔ زندگی کا اصول یہ ہے کہ ہر انسان کو کسی قانون پر عمل کرنا چاہئیے۔ آسان ترین راستہ تو یہ ہو گا کہ کسی قانون پر عمل ہی نہ کیا جائے، مگر سب لوگ تسلیم کریں گے کہ یہ غلط خیال ہے۔ قرآن اور رسول اللہ ﷺ کے احکام کے تحت ہر کام کرنا چاہئیے۔ چاہے بار گزر رہا ہو کیونکہ یہ خدا کا حکم ہے۔ اس کی خلاف ورزی محض آسانی کی خاطر نہیں کرنی چاہئیے۔ یہ اسلامی تعلیمات کی روح کے منافی ہو گا۔ معقول چیز پر عمل کرنا چاہئیے، صرف آسان چیز ہمیشہ معقول نہیں ہو سکتی۔

### سوال ۱۹: کیا استعمال میں آنے والے سونے چاندی کے زیوروں پر زکوٰۃ ہو گی؟

**جواب:** ہمارے فقہاء نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ عورت کے استعمال کے زیورات پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ نہیں، اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہو گی۔ سوائے اس کے میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ ہر شخص اپنے امام کے احکام پر عمل کرے۔

### سوال ۲۰: کتنی نقد رقم پر زکوٰۃ واجب ہو گی یعنی کم سے کم مقدار پر؟

**جواب:** یہ مسئلہ اس طرح پیچیدہ ہو گیا ہے کہ ہمارے فقہاء کے نزدیک عہدِ نبوی میں دو سو درہم پر زکوٰۃ کی ادائیگی کا اطلاق شروع ہوتا تھا۔ دو سو درہم سے کم پر نہیں اور وہ اس معیار کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ سوچنا یہ ہے کہ پرانے درہم آج کے کتنے روپے کے برابر ہوں

گے۔ بد قسمتی سے اس کا تعین اس بناء پر ناممکن ہے کہ آئے دن گرانی Inflation اور Devaluation وغیرہ کی وجہ سے روپے کی قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اس کا جواب میں صرف یہ دے سکتا ہوں کہ اپنے مقامی علماء سے آپ یہ سوال دریافت فرماتے رہیں۔ ان شاءاللہ وہ آپ کو دھوکہ نہیں دیں گے۔ آپ کی صحیح رہنمائی کریں گے۔ بہر حال میں آپ سے اپنا خیال ظاہر کرتا ہوں کہ رقم کی کم از کم مقدار جس پر زکوۃ واجب ہے اس کے متعلق اولاً یہ سوچنا چاہیئے کہ عہدِ نبوی میں درہم کی قوتِ خرید کیا تھی؟ یعنی ایک درہم سے کتنا کام پورا ہو سکتا تھا اور اسی کی اساس پر ہم آج یہ دیکھیں کہ آج وہ غرض کتنے روپوں میں پوری ہوتی ہے۔ سیرت کی کتابوں میں ذکر آتا ہے کہ ۸ ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے مکہ معظمہ کی فتح کے بعد وہاں حضرت عتاب بن اسید ﷺ کو گورنر مقرر فرمایا اور ان کی تیس درہم ماہانہ تنخواہ مقرر کی۔ اسی تنخواہ میں گورنر، اس کی بیوی، اس کے بچے، اس کے گھر کے ملازم اور غلام وغیرہ سب گزارہ کرتے تھے۔ میری رائے میں اس پہلو پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ دوسو درہم کی جگہ آسانی کے ساتھ ایسی شرح مقرر کی جاسکے جو سامان کی گرانی کے باعث ہمیں مناسب نظر آئے۔ فرض کیجئے کہ میں ایک درہم کو ایک روپے کے برابر تصور کرلوں تو آج کل کی گرانی میں دوسو روپے اتنی حقیر رقم ہے کہ وہ ہمارے ہاں کے چپڑاسی کو بھی ماہانہ دی جائے تو وہ قبول نہیں کرتا۔

**سوال ۲۱: آج کے جدید دور میں منصوبہ بندی کئی سال پہلے کرلی جاتی ہے، جب کہ اسلامی یا قمری نظام میں تاریخوں اور مہینوں کا تعین چاند کے نکلنے پر ہوتا ہے۔ اس طرح قمری نظام میں قطعیت (Exactness) پیدا نہیں ہوتی، دوسرے یہ ایک ہی دن میں، مختلف ملکوں میں، مختلف اسلامی تاریخیں پائی جاتی ہیں۔ کئی ملکوں میں مختلف دنوں میں عید منائی جاتی ہے۔ اس بحران پر کیسے قابو پایا جائے اور آیا قمری نظام میں قطعیت پیدا کی جاسکتی ہے تاکہ وہ آج کے زمانے کا ساتھ دے سکے؟**

**جواب:** اس میں کئی سوالوں کو ایک ہی جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ الگ الگ جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر آپ منصوبہ بندی کئی سال پہلے کرتے ہیں تو قمری تقویم ہو یا شمسی کوئی خاص فرق پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ قمری سال کے اگر ۳۵۴ دن ہوتے ہیں؟ تو اس سال محرم کا مہینہ خواہ انتیس دن کا ہوا ہے یا تیس کا صرف ایک دن کا فرق ہو گا اور پانچ سال میں جو فرق ہو گا وہ مشکل سے ایک یا دو دن کا ہو سکتا ہے۔ اس سے ہماری منصوبہ بندی پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ ہم یہی کہیں گے کہ پانچ سال کی آمدنی سے ہم پانچ سال تک آئندہ فلاں فلاں طریقے سے کام کریں گے۔ مجھے اس میں کوئی دشواری نظر نہیں آتی۔ دوسرے میں یہ بھی بیان کر چکا ہوں کہ خود عہدِ نبوی کے رواج کے مطابق ہم شمسی سال کو بھی استعمال کرسکتے ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے بعض قبائل کو حکم دیا کہ تم سے زراعت کی

زکوۃ معین مہینے میں نہیں لی جائے گی بلکہ فصل کے کٹنے پر وصول کی جائے گی۔ دوسرے الفاظ میں شمسی سال پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ آپ کی بیان کردہ منصوبہ بندی کے لیے بھی اگر ہم شمسی سال پر عمل کریں مثلاً عمر خیام کے سال پر تو کوئی امر مانع نہیں، آپ کر سکتے ہیں، اسلام اس سے نہیں روکتا۔ جہاں تک عیدین کا تعلق ہے، میں اپنی حد تک اسے قطعاً کوئی اہمیت نہیں دیتا کہ پاکستان میں جمعرات کو عید منائی جائے اور بنگال میں جمعہ کے دن چہار شنبہ کے دن۔ کیونکہ اصل سوال یہ ہے کہ آیا میں اپنے خدا اور اپنے رسول اللہ ﷺ کے احکام کو کو پورے اخلاص، پورے خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرتا ہوں کہ نہیں۔ اہمیت اس کو نہیں ہے کہ میں کس دن اس فریضہ کو انجام دیتا ہوں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ بنگال میں اور پاکستان کے اوقات میں شاید ایک گھنٹے کا فرق ہے۔ مغرب کی نماز آپ یہاں جس وقت پڑھتے ہیں، وہاں تقریباً عشاء کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ اپنے فرائض کی انجام دہی میں اب بھی ہم اس شمسی یا قمری سال کے بغیر اختلاف رکھتے ہیں اور یہ مسئلہ نیا نہیں ہے۔ عہدِ صحابہؓ میں بھی یہ چیز پیش آچکی ہے کہ اسلامی مملکت کے ایک علاقے میں، چاند ایک دن دیکھا گیا اور دوسرے علاقے میں دوسرے دن۔ چنانچہ جہاں تک مجھے یاد ہے، سنن ابو داؤد میں ذکر آتا ہے کہ مدینہ منورہ سے ایک شخص امیر معاویہؓ سے ملاقات کے لیے یا کسی اور غرض سے، دمشق بھیجا گیا۔ وہ وہاں رمضان کا پورا مہینہ مقیم رہا، پھر اس نے بیان کیا کہ ہم دمشق میں ایک دن پہلے چاند دیکھ چکے ہیں اور آج انتیسویں نہیں تیسویں ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے گفتگو کے دوران یہ بات کہی گئی۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے ہی حکم دیا ہے کہ مقامی رویت کے مطابق عمل کریں۔ چاہے دوسرے مقام کی رویت خود خلیفہ وقت کے حکم ہی سے کیوں نہ عمل میں آئی ہو۔ ان حالات میں اگر ہم آج قانونِ فطرت کے مطابق رویت ہلال دو مختلف اوقات میں کرتے ہیں، تو میرے نزدیک اس میں قطعاً کوئی حرج نہیں ہے۔ آپ ایک دن عید منائیں۔ لیکن عید منائیں اور نماز بھی پڑھیں۔ دوسرا شخص دوسرے دن عید منائے لیکن وہ بھی نماز کو اہمیت دے "دن" کو نہیں۔ یہ میرا اپنا ذاتی خیال ہے اس لیے میرے نزدیک یکسانیت پیدا کرنے پر اصرار کرنا محض بے کار ہے۔

# خطبہ ۱۲: عہدِ نبویؐ میں تبلیغ اور غیر مسلموں سے برتاؤ

محترم صدر! وائس چانسلر صاحب! محترم اساتذہ و مہمانانِ گرامی!

السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ!

الحمد للہ رب العالیمین ولاصلوۃ والسلام علی سید المرسلین و آلہ واصحاب اجمعین!

رسولِ کریم ﷺ کی زندگی کے دو پہلو ہیں جو حقیقت میں ایک ہی پہلو کے دو جز ہیں یعنی اسلام کی تبلیغ اور اس تبلیغ کو قبول نہ کرنے والوں کے ساتھ آپؐ کابرتاؤ۔ آج ہم ان کے بارے میں بات کریں گے۔یہ برتاؤ کچھ تو خود رسول اللہ ﷺ کی سنت یا آپؐ کے ذاتی طرزِ عمل پر مبنی ہوگا اور کچھ ان احکام پر مبنی ہوگاجو قرآن مجید اور حدیث شریف میں پائے جاتے ہیں۔میرے علم مین ایسی کوئی جامع کتاب نہیں ہے جو صرف اس موجوع پر لکھی گئی ہو۔اس لیے میں کوشش کروں گا کہ تاریخی حیثیت سے دیکھوں کہ رسولِ کریم ﷺ پر جب پہلی وحی نازل ہوئی تو آپؐ کا طرزِ عمل کیا رہا اور کس طرح آپؐ اللہ کے پیغام کو دوسروں تک پہنچاتے رہے؟ پھر اس کا جو ردِ عمل ہوا، اس سلسلے میں آپؐ کا برتاؤ کیا رہا؟ کس طرح آپ اس کا مقابلہ کرتے رہے اور تاریخی نقطہ نظر سے اس کے کیا نتائج نکلے؟ ہمیں ایک خاص بات یہ نظر آئی کہ پہلے دن کی وحی میں تبلیغ کا کوئی حکم نہیں ہے۔پہلی وحی سے آپ سب لوگ واقف ہیں کہ وہ سورۂ اقراء(96:۱-۵) کی پہلی پانچ آیتیں ہیں، جن میں رسول اللہ ﷺ کو پڑھنے کا حکم دیا گیااور رسول اللہ ﷺ کے واسطے سے آپؐ کی امت کو یہ حکم دیا گیا۔اس کے بعد ہمارے مؤرخ بیان کرتے ہیں کہ تین سال تک ایک تک وقفہ رہا جس

کے لیے فترۃ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔اس دوران کوئی نئی وحی نہیں آئی لیکن دوسری وحی نہ آنے کے باوجود یہ ایک عجیب و غریب بات ہے کہ تبلیغ کا کام شروع ہوگیا۔ان پہلی آیتوں مین صاف طور پر تبلیغ کا حکم نہ ہونے کے باوجود عملاً اس کا آغاز ہوجاتا ہے۔جب پہلی وحی نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ غارِ حرا میں تھے۔میرے علم میں یہ دسمبر کا مہینہ تھا ۔مکے میں سخت سردی پڑ رہی تھی۔وحی کے فوراً بعد آپ شہر واپس آجاتے ہیں اور اپنے مکان میں پہنچ کر اپنی بیوی حضرت خدیجہؓ سے فرماتے ہیں:زملونی زملونی (مجھے کمبلوں سے ڈھانپو، مجھے کمبلوں سے ڈھانپو)۔ظاہر ہے بیوی نے ایسا ہی کیا ہوگا۔کچھ تو اس سردی کی شدت کا اثر سے اور کچھ اس وحشت کی وجہ سے جو جبرئیل علیہ السلام کی آمد اور متعلقہ واقعات کے مشاہدے کے باعث پیدا ہوئی، آپؐ کی حالت غیر تھی۔جب ذرا سکون ہوا تو رسول کریم ﷺ نے اپنی بیوی کو سارا واقعہ سنانے کے بعد آخری بات یہ کہی کہ کیا یہ شیطان کی کارستانی تو نہیں ہے؟ میں کوئی کاہن تو نہیں ہوگیا ہوں حالانکہ میں ساری زندگی ،ان لوگوں کو ،جو غیب دانی کا دعویٰ کرتے ہیں ، برا کہتا رہا ہوں۔آپؐ کو بیوی تسلی دینے کے لیے کہتی ہے کہ یقیناً ایسا نہیں ہوگا کیونکہ آپ زندگی بھر لوگوں کی مدد کرتے رہے ہیں۔غریبوں ، محتاجوں، بیواؤں اور یتیموں کی پرورش کرتے رہے ہیں، اس لیے خدا ایسے شخص کا ساتھ نہیں چھوڑے گا، یقیناً خدا آپؐ کو شیطان کے حوالے نہیں کرے گا۔اس کے بعد آپؐ کی بیوی نے ایک جملہ اور کہا کہ میرا چچا زاد بھائی جس کا نام ورقہ بن نوفل ہے، وہ ان چیزوں سے بہت واقفیت رکھتا ہے، کل ہم اس کے پاس جائیں گے۔آپؐ اس سے اپنا قصہ بیان کیجئے گا۔وہ آپ کو اچھی طرح سے بتا سکے گا کہ یہ کیا چیز ہے۔

اس کے بعد دو روایتیں ہیں۔ایک روایت کے مطابق حضرت خدیجہؓ رسول اللہ ﷺ کو ساتھ لے کر اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس جاتی ہیں ، جو عیسائی تھا۔دوسری روایت کے مطابق ، اگلی صبح (غالباً حسبِ عادت) حضرت ابو بکرؓ آپؐ کے پاس تشریف لائے تو حضرت خدیجہؓ نے ان کو یہ واقعہ سنایا، یا یہ کہ رسول اللہ ﷺ سے فرمائش کی کہ وہ ابو بکرؓ کو یہ واقعہ سنائیں۔پھر رسول اللہ ﷺ کو حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ ورقہ بن نوفل کے پاس بھیجا۔ورقہ بن نوفل کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ضعیف العمری کے باعث نابینا ہوچکے تھے۔یہ واقعہ سن کر اس کی زبان سے یہ جملہ نکلا کہ "جو کچھ تم نے بیان کیا ہے اگر یہ سچ ہے تو ناموس موسیٰ علیہ السلام کے مماثل ہیں۔اگر میں اس وقت تک زندہ رہا جب تمہاری قوم تمہارے ساتھ بدسلوکی کرے گی اور تمہیں اپنے شہر سے نکال دے گی تو اس وقت میں تمہارا ساتھ

دوں گااور تمہاری مصیبتوں کو دور کرنے کی کوشش کروں گا۔"رسول اللہ ﷺ نے کہا کہ کیا اس بات پر' کہ میں خدا کا پیغام لوگون تک پہچاؤں، لوگ مجھ پر ظلم وستم کریں گے، اذیتیں دیں گے، اور مجھے اس ملک سے نکال دیں گے؟ اس پر ورقہ بن نوفل نے کہا "ہاں! کوئی نبی ایسا نہیں آیا جس کو اس کی امت نے تکلیف نہ دی ہو۔

اب میں لفظ ناموس پر کچھ بحث کروں گا۔عام طور پر اردو میں یہ لفظ عزت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ظاہر ہے کہ زیرِ بحث سیاق وسباق میں معنی نہیں لیے جاسکتے۔ہمارے بعض مفسر یہ کہتے ہیں کہ ناموس کے معنی قابلِ اعتماد چیز کے ہوتے ہین۔یہ معنی بھی یہاں مناسب نظر نہیں آتے۔میں شاید یہ کہنے کی جسارت کرسکتا ہوں کہ جس سیاق وسباق میں یہ لفظ استعمال ہوا ہےوہاں ایک اور معنی مراد لینے کی ضرورت ہے۔ورقہ بن نوفل نے عیسائیت اختیار کرلی تھی اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے ، جیسا کہ بخاری کی حدیثوں میں بھی ہے، کہ انہیں سریانی زبان آتی تھیاور سریانی سے عربی میں انہوں نے انجیل کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ان حالات میں کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ سریانی زبان میں موجود ایک یونانی لفظ ہو۔اگر اس مفروضے کی بنیاد پر غور کریں تو فوراً اس کے معنی واضح ہوجاتے ہیں۔یونانی زبان میں توریت کو "نوموس" (Nomos) ہی کہتے ہیں۔مطلب یہ کہ جو پیغام آپ پر نازل ہوا ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توریت سے مشابہ ہے۔ظاہر ہےیہ لفظ اس مفہوم میں زیادہ پھبتا ہے اور زیادہ مناسب و معقول لگتا ہے۔

ان ابتدائی واقعات کے بعد، بجز مفروضات کےیہ کہنا مشکل ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا کیا تھا۔غالباً و ہ بار بار مختلف لوگوں اور پوچھنے والوں کو اپنا واقعہ سناتے رہے ہوں گےکہ جبرئیل نے مجھے یوں کہا اور مجھے یہ بتایا۔میں ایک چھوٹی سی بات کا تکملہ کرتا چلوں۔پہلی وحی کے سلسلے میں بلاذری کی "انساب الاشراف" میں کچھ تفصیلیں اور بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ سورۂ اقراء کی پہلی پانچ آیتوں کے ابلاغ کے بعد حضرت جبرئیل نے رسول اللہ ﷺ کو اولاً استنجے کا طریقہ بتایا کہ اپنے جسم کو نجاست سے کس طرح پاک کریں۔اس کے بعد وضو کا طریقہ بتایاکہ نماز کے لیے کس طرح اپنے آپ کو جسمانی اور روحانی طور سے تیار کرنا چاہیئے۔پھر جبرائیل علیہ السلام نے امام بن کر نماز پڑھائی اور رسول اللہ ﷺ نے مقتدی بن کر اسی طرح نماز پڑھی۔اس کے بعد جبرئیل علیہ السلام چلے گئے۔ان حالات میں سیرت کی کتابوں میں یہ روایت پڑھ کر ہمیں حیرت نہیں ہونی چاہئیے کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت خدیجہؓ دونوں وقتاً فوقتاً کعبے کے سامنے علانیہ نماز پڑھا کرتے تھے۔یہ نماز مکہ والوں کی عبادت سے، ظاہر ہے ،مختلف تھی جس کے باعث لوگ انہیں حیرت سے

دیکھتے تھے۔ ابھی تک قرآن کی وہ آیتیں نازل نہیں ہوپہ تھیں جن میں بت پرستی کو برا بھلا کہا گیا تھا اور بتوں کی پرستش کرنے والوں کو جہنم میں جانے کا مستحق قرار دیا گیا تھا۔ لوگوں کو اس نئے دین کے متعلق استعجاب ضرور ہوتا ہوگا لیکن ابھی ان میں کوئی عناد یا غصہ پیدا نہیں ہوا ہوگا۔ بہرحال ان دنوں دو تین مسلمان نظر آتے ہیں۔ حضرت خدیجہؓ ، ان کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ ان کے بعد آپ کے چچا زاد بھائی جو آپ کے متبنی بیٹے بھی تھے یعنی حضرت علیؓ ، ان کے بعد آپؐ کے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ۔ گویا اولین مسلمانوں کی کماعت ان پانچ سات آدمیوں پر مشتمل تھی۔ حضرت علیؓ کے اسلام لانے کے بارے میں دو مختلف روایات ملتی ہیں۔ پہلی روایت کے مطابق چونکہ ووہ بہت کم سن تھے، اس لیے رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھتا دیکھ کر خود بھی آپؐ کی تقلید کرنے لگے۔ دوسری روایت جو غالبًا کچھ عرصے بعد کی ہوگی، یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت خدیجہؓ کعبے کے سامنے نہیں بلکہ شہر کے باہر صحرا میں یا کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چھپ کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ حضرت علیؓ نے کئی مرتبہ دیکھا کہ دونوں چھپ کر گھر سے چلے جاتے ہیں تو وہ ان کی ٹوہ میں پیچھا کرتے ہین۔ جب دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہے ہیں تو وہ بھی وہان کھڑے رہتے ہیں۔ نماز کے اختتام پر پوچھتے ہیں کہ یہ کیا چیز تھی؟ جب رسول اللہ ﷺ بتاتے ہیں کہ یہ اللہ کا حکم ہے اور میں اللہ کا نبی ہوں تو وہ اسلام قبول کرتے ہیں۔ ان دو کے علاوہ حضرت علیؓ کے اسلام لانے کے بارے میں ایک تیسری روایت بھی ہے۔ ان اکتلافی روایات کی وجہ یہ کہنا دشوار ہے کہ حضرت علیؓ نے کس زمانے میں اسلام قبول کیا۔ تیسری رواہت پہلی وحی نازل ہونے کے کم از کم تین سال بعد کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ حکم ملا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو اسلام کی تبلیغ کریں: و انذر عشیرتک الاقربین (۲۶ : ۲۱۴) (اپنے قریبی رشتہ داروں کو اللہ سے ڈراؤ) چنانچہ رسول اکرمؐ نے اس خدائی حکم کی تعمیل میں تبلیغ کا ایک اور طریقہ اختیار کیا۔ آپؐ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ بازار سے فلاں فلاں چیز خرید لاؤ اور بیوی سے کہا کہ ان سے ایک جیافت کا اہتمام کرو۔ پھر حضرت علیؓ کو بھیجا کہ کاندان کے سارے گھروں میں (چچاؤں اور چچاؤں کے بیٹوں کے پاس) جاؤ اور انہیں دعوت دو کہ فلان دن اور فلاں وقت کھانے کے لیے میرے پاس آئیں۔ عام کتب، سیرت مین ہے کہ پہلی مرتبہ لوگ آئے تو تھوڑی مقدار میں کھانا بہت سے (تیس چالیس) آدمیوں کو کافی ہوگیا۔ اس معجزے کو دیکھ کر ابو لہب نے استہزاء کیا کہ یہ جادوگر ہے۔ رسول اللہ ﷺ سخت متاثر اور ملول ہوئے اور کچھ بول نہ سکے۔ چند دن کے بعد رسول اکرم ﷺ نے مکرر دعوت دی ، اور اس دن ان کی تبلیغ کی۔ یہ عام روایت ہے، لیکن میرا گمان ہے کہ پہلی مرتبہ چونکہ ان لوگوں کو یہ علم نہیں تھا کہ کس غرض سے بلایا گیا ہے وہ آئے لیکن

سب ایک وقت میں میں نہیں آئے اور کھانا کھا کر جاتے رہے ہوں گے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آخری شخص کے کھانا کھا چکنے کے وقت سوائے اس آخری شخص کے کوئی اور آدمی موجود نہ تھا۔ اس لیے اصل مقصد کہ خاندان کے لوگوں میں تبلیغ کریں پورا نہ ہوا۔ کچھ دنوں بعد رسول اللہ ﷺ نے دوبارہ وہی تدبیر اختیار کی۔ حضرت علیؓ خاندان والوں کو اطلاع دیتے ہیں۔ اس مرتبہ رسول اللہ ﷺ احتیاطاً کہتے بھی جاتے ہیں کہ کھانے کے بعد میں تم لوگوں سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، ٹھہرنا انتظار کرنا۔ چنانچہ اب کی بار سب لوگ اس تجسس میں بیٹھے رہ کہ دیکھیں وہ کیا بات ہے جس کے لیے ہمیں بلایا گیا ہے۔ کھانے کے بعد رسول اللہ ﷺ ان سے مخاطب ہو کر بتاتے ہیں کہ بت پرستی کیوں بری ہے۔ اللہ کو ایک ماننا کیوں ضروری ہے۔ پھر اس کے نتائج یعنی آخرت کی زندگی اور خدا کے سامنے حساب کتاب کا ذکر کیا۔ اس طرح کی چند بنیادی باتیں لوگوں کو بتائیں۔ اس سلسلے میں طبری کی روایت بہت دلچسپ ہے۔ طبری کا بیان ہے کہ اس تبلیغ کا غالباً آخری جملہ یہ تھا کہ تم میں سے جو شخص میری دعوت قبول کرے گا وہ میرا جانشین اور خلیفہ ہو گا۔ کہتے ہیں اس وقت حضرت علیؓ، جو ابھی بچے تھے، اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ میں اسلام قبورل کرتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کا چچا ابو لہب قہقہہ مار کر ہنسا اور تالی بجا کر کہنے لگا۔ ابو طالب مبارک ہو۔ آج سے تم اپنے بیٹے کے ماتحت بن چکے ہو۔ اس سے ابو طالب کو خفت سی ہوئی اس لیے وہ ساری عمر اس کے لیے آمادہ نہیں ہوسکے کہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت قبول کر لیں۔ میں یہاں اس بحث میں نہیں پڑوں گا کہ "خلیفہ" سے کیا مراد ہے، خاص کر اس لیے کہ امکان تھا کہ کئی لوگ اس دن مسلمان ہوجاتے اورر ہر ایک خلافت کا مستحق بنتا۔ شاید حدیث "علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ اس بیان کا منشا تبلیغ کا طریقہ بتانا تھا۔ میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ حضرت علیؓ کیسے ایمان لائے یا وہ کب ایمان لائے؟ یہ ایک علیحدہ بحث ہے۔ اس وقت ہم صرف یہ دیکھ رہے ہیں کہ پہلی وحی کے بعد رسول االلہ ﷺ نے تبلیغ کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کیے۔ اس کے کچھ عرصے بعد دوسری وحی نازل ہوتی ہے، جس میں یہ حکم آتا ہے کہ فاصدع بما تومر واعرض عن المشرکین (۱۵ : ۹۴) (جس چیز کا تجھے حکم دیا جاتا ہے وہ کھول کر بیان کر اور مشرکوں کی پروا نہ کر)۔ اس حکم کے آنے پر رسول اکرم ﷺ ایک طرح کی دہشت محسوس کرتے ہیں کہ سارا شہر بت پرست ہے، اگر میں یہاں کے لوگوں کو برملا یہ کہوں کہ تمہارا دین غلط ہے، اور تمہارے بت تمہارے لیے حفاظت اور نجات کا باعث نہیں بن سکتے، تو لوگ خفا ہوں گے اور استہزاء بھی کریں گے۔ حضرت جبرئیلؑ نے پھر آکر تشفی دی کہ اللہ آپ کو نہیں چھوڑے گا، اللہ آپ کی حفاظت کرے گا۔ اس پر ایک دن رسول اللہ ﷺ شہر سے باہر ایک پہاڑی کے

کسی بلند حصے پر کھڑے ہوکر لوگوں کو اپنی طرف بلاتے ہیں۔ جیسے کوئی حادثہ پیش آگیا ہو۔لوگ دوڑے ہوئے آئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں فلاں قبیلے کے لوگوں کو مخاطب کرنا چاہتا ہوں۔جو لوگ اس قبیلے کے نہیں تھے وہ چلے گئے۔ پھر اس کی ایک شاخ کا ذکر کیا کہ میں صرف ان سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔غرض بجائے سارے شہر کے لوگوں کو خطاب کرنے کے اس کے ایک محدود حصے کو اس دن آپؐ نے مخاطب کیا۔خطاب کا انداز کچھ اس طرح تھا کہ اے بھائیو! اگر میں تم سے بیان کروں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ، دوسری طرف ایک دشمن کی فوج آئی ہوئی ہے اور وہ تم پر حملہ کرنے والی ہے تو کیا تم میری بات پر اعتماد کرو گے؟ ان کا جواب تھا کہ ہم نے تمہیں آج تک جھوٹ بولتے ہوئے نہیں پایا۔ اگر تم سنجیدگی سے کہتے ہو کہ واقعی کوئی دشمن اس طرف آیا ہوا ہے اور پڑاؤ ڈالے پڑا ہے تو ہم تمہاری بات پر یقین کریں گے۔اس وقت رسول اللہ ﷺ کہتے ہیں کہ مین تم اس انسانی لشکر سے بھی بڑے ایک دوسرے لشکر سے ڈراتا ہوں، یہ اللہ کا قہر اور عذاب ہے۔اگر تم اللہ کو ایک نہ مانو گےاور بتوں کی پرستش نہیں چھوڑو گے تو مرنے کے بعد اللہ تمہیں دوذخ میں ڈال دے گا۔اس دن اور لوگون کے علاوہ آپ کا چچا ابو لہب بھی وہاں موجود تھا۔اس نے جل کر کہا" کیا اس فضول بات کے لیے تم نے ہمارا وقت ضائع کیا؟" اور وہ چلا گیا۔دوسرے لوگ بھی آہستہ آہستہ وہاں سے چلے گئے۔

اس وقت بے محل نہ ہوگا اگر میں یہ بیان کروں کہ ابو لہب کو اپنے بھتیجے رسول اللہ ﷺ سے نفرت کیوں پیدا ہوگئی تھی؟ بلاذری نے انساب الاشراف میں اس کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک دن گھر میں دو بھائی یعنی ابو لہب اور ابو طالب کسی بات پر لڑ پڑے۔اولاً ابو لہب نے اپنے بھائی کو زمین پر پٹخ دیا اور سینے پر چڑھ کر طمانچے لگائے۔اس کو دیکھ کر رسول اللہ ﷺ جو ان دنوں دادا کی وفات کے بعد ابو طالب کی کفالت میں تھے دوڑتے ہوئے آتے ہیں اور ابو لہب کو ابو طالب کے سینے سے دھکیل کر ہٹاتے ہیں۔اس طرح ابو طالب کو اٹھنے کا موقع مل جاتا ہے۔اب وہ ابو لہب کو زمین پٹخ دیتے ہیں اور اس کے سینے پر چڑھ کر اپنا بدلہ لیتے ہیں۔اس وقت رسول اللہ ﷺ چپ چاپ دیکھتے رہتے ہیں۔ ابو لہب جل کر کہنے لگا : ”اے محمد(ﷺ)! ابو طالب بھی تیرا چچا ہے اور میں بھی تیرا چچا ہوں۔پہلے تو نے ابو طالب کی مدد کی لیکن اب میری مدد کے لیے کیوں نہیں آیا؟ خدا کی قسم! میرا دل تجھ سے کبھی محبت نہیں کرے گا۔“ بلاذری کی انساب الاشراف میں یہ ایک چھوٹا سا واقعہ بیان ہوا ہے۔یہ نفسیاتی اصول ہے کہ جو لوگ جتنے زیادہ حساس

ہوتے ہیں۔ اتنا ہی وہ چھوٹی سی چیز کا زیادہ اثر لیتے ہیں اور ان کے دلوں پر اس کا دیرپا اثر رہتا بلکہ روز افزوں ہوتا جاتا ہے۔ ممکن ہے یہی وجہ ہو جس کی بنا پر ابو لہب کو رسول اللہ ﷺ سے عداوت پیدا ہوگئی اور کبھی اپنے بھتیجے کے دین پر ایمان لانے پر آمادہ نہ ہوا۔ چنانچہ اسے اسلام کے انتہائی شدید دشمنوں میں سے ایک قرار دیا گیا۔ ان ابتدائی کوششوں کے بعد یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی کہ محمد ﷺ نبوت کا دعویٰ کر رہے ہیں، اور یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ ہمارے آباؤ اجداد کا دین غلط اور لغو ہے۔ جن چیزوں کی ہم پرستش کرتے ہیں وہ ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ چنانچہ رسول اکرم ﷺ کے خلاف نفرت شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی اور جلد ہی وہ نوبت آگئی کہ شہر کی حکومت اور سربر آوردہ نے بھی انہیں اس بات سے منع کر دیا کہ خانہ کعبہ کے سامنے آکر اپنے طرز کی عبادت کریں۔ اس کے بعد سے رسول اللہ ﷺ یا تو اپنے مکان میں نماز پڑھتے یا گھر سے باہر کسی جنگل یا صحرا میں عبادت کرتے۔ لیکن کافروں کی چھیڑ خانی میں کمی نہیں آئی۔ لوگ آپؐ کے پاس آتے ، آپ سے بحث کرتے، آپؐ کو طرح طرح کی تکلیفیں دیتے۔ ان میں آپؐ کا چچا ابو لہب پیش پیش رہتا۔ اسے پتا چلا کہ جب سب لوگ سو جاتے ہیں تو اس وقت رسول اللہ ﷺ چھپتے چھپاتے خانہ کعبہ کے سامنے آتے ہین اور وہاں اپنے طرز کی عبادت یعنی نماز پڑھتے ہیں۔ وہ آپؐ کی گزرگاہ میں خاردار درختوں کی شاخیں لا کر ڈال دیتا اور مکان کی دہلیز پر گندگی اور غلاظت لا کر ڈالا کرتا تھا۔ یہ وہ رکاوٹیں تھیں جن کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو پیغام پہنچانے میں دشواری ہوتی رہی لیکن آپ نے ہمت نہ ہاری اور تبلیغ کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ پھر ایک نئی مشکل سے آپؐ کو سامنا کرنا پڑا، وہ یہ کہ مکے کے باشندے وقتاً فوقتاً گلی کے لونڈوں کو ترغیب دلاتے تھے ک ہوہ رسول اللہ ﷺ کے پیچھے پیچھے جائیں، ان پر پتھر پھینکیں اور انہیں یہاں سے نکالیں۔ جب کبھی ایسا ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ کا بدتمیز لڑکے پیچھا کرتے تو مقریزی نے بیان کیا ہے کہ ایسے وقت اگر رسول اللہ ﷺ کبھی اتفاق سے ابو سفیان کے مکان کے قریب ہوتے تو ابو سفیان کے گھر میں چلے جاتے اور ابو سفیان مسلمان نہ ہونے کے باوجود اس قدر شرافت اور انسانیت کا مظاہرہ کرتا کہ فوراً رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کرتا اور گلی کے بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیتا۔ ان کے جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ اطمینان سے اپنے گھر جاتے۔ اس واقعے کا ذکر کرنے کے بعد مقریزی نے ایک بہت بعد کے واقعے کی طرف چھوٹا سا اشارہ کیا ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ مکہ کو فتح کرتے ہیں تو ہمارے مؤلف لکھتے ہیں کہ فوج کے ہراول دستے یا مقدمتہ الجیش میں ایک منادی کرنے والا تھا جو گلیوں سے گزرتے وقت باآواز بلند ، چلا چلا کر کہتا جاتا تھا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے وہ امن میں رہے گا۔ جو شخص اپنے گھر کے اندر بند رہے ، باہر نہ

نکلے، امن میں رہے گا۔جو حرم کعبہ میں چلا جائے گا وہ امن میں رہے گااور آخری چیز جس کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے ، وہ یہ کہ جو شخص ابو سفیان کے مکان میں جائے گا وہ بھی امن میں رہے گا۔مقریزی کہتے ہین کہ یہ امتیاز اور خصوصیت اس واقعے کی بناءپر تھی کہ زمانہ قبل ہجرت جب کبھی مکے کے شریر بچے رسول اللہ ﷺ کو تکلیف دیتے اور آپؐ ابو سفیان کے گھر جاتے تو ابو سفیان آپ کو پناہ دیتا تھا۔لہٰذا اس کے بدلے میں ابو سفیان کے مکان کو بھی پناہ گاہ قرار دے دیا گیا۔

اس تبلیغ کا سلسلہ کوئی چار پانچ سال جاری رہا۔اس عرصے میں کفار کے ظلم و ستم اور اذیتوں کی وجہ سے مسلمانوں کی حالت اس قدر خراب ہوگئی کہ انہیں اپنے ملک مین رہنا دشوار ہوگیا۔اس لیے رسول اللہ ﷺ نے انہیں بتایاکہ وہاں ایک عیسائی بادشاہ نجاشی حکومت کرتا ہے، جس کے ملک میں کوئی ظلم نہیں ہوتا۔وہ لوگ حبشہ پہنچ گئے۔ اب چونکہ تبلیغ کی آزادی تھی ، اس لیے یہ مسلمان (مکے کے نو مسلم مہاجر) حبشہ میں تبلیغ کرنے لگے۔نتیجہ یہ نکلا کہ چند سالوں میں وہاں کافی تعداد میں یعنی کم از کم چالیس پچاس حبشی مسلمان ہوگئے۔لیکن اس سلسلے میں انہیں دشواریاں بھی پیش آئیں۔جب مکے کے نو مسلم ہجرت کرکے حبشہ چلے گئے تو مکے کے مشرکوں نے نجاشی کے پاس ایک وفد بھیجا ۔اس وفد نے جا کر یہ مطالبہ کیا کہ ان مسلمانوں کو ہمارے سپرد کیا جائے۔ان کا خیال تھا کہ انہیں واپس لے جا کر پھر تکلیفیں دیں اور ستائیں۔نجاشی نے صرف مطالبے کی بنا پر فیصلہ کرنا مناسب نہ سمجھا بلکہ مسلمانوں کو بلا بھیجا کہ تم لوگوں کے متعلق الزام ہے کہ تم اپنے شہر میں فتنہ و فساد کرتے رہے ہو اور وہاں کی سزا سے بچنے کے لیے یہاں آکر پناہ گزین ہوگئے ہو۔تم لوگوں کا کیا جواب ہے؟ اس وقت رسول اللہ ﷺ کے چچا زاد بھائی جعفر بن طیارؓ جواب دیتے ہیں۔ قبل اس کے کہ میں یہاں جواب ذکر کروں ، ایک ذاتی استنباط آپ سے بیان کرتا ہوں جس کا ذکر ہمیں تاریخ میں نہیں ملتا۔رسول اللہ ﷺ کے مکتوبات میں نجاشی کے نام ایک مکتوب ہمیں ایسا بھی ملتا ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ میں اپنے چچا زاد بھائی جعفرؓ کو تیرے پاس بھیج رہا ہوں۔جب وہ پہنچے تو اس کی اور اس کے ساتھیوں کی مہمانداری کر، ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کر اور اس بارے کوئی ہٹ دھرمی اختیار نہ کر۔" طبری میں یہ خط موجود ہے جسے وہ ۷ ہجری کے حالات میں درج کرتے ہیں لیکن جیساکہ میں نے عرض کیا ، یہ ممکن نظر آتا ہے کہ یہ خط جعفر طیارؓ کو بطور تعارف دیا گیا ہو، خط لے کر گئے ہون اور نجاشی کو ۵ نبوی میں دیا ہو کیونکہ ۷ ہجری میں مسلمان مہاجرین حبشہ میں پندرہ سال

گزار کر مدینہ واپس جا رہے تھے۔واپسی کے وقت پناہ طلبی کے لیے تعارفی خط بھیجنا فضول سی بات نظر آئے گی۔اس لیے مورخوں کے سکوت کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ مہاجرین مکہ کی اولین جماعت جس وقت حبشہ گئی ہوگی اس وقت رسول اللہ ﷺ نے ان کو یہ تعارفی خط دیا ہوگا۔قطع کلام کرکے یہ عرض کرتا چلو کہ سہیلی کے مطابق یہ نجاشی ایک زمانے میں اپنے ظالم چچا کی وجہ سے عرب میں سکونت پذیر ہونے پر مجبور ہوا، اور مقامِ بدر میں رہتا تھا۔بدر وہ مقام ہے جہان قریشی کاروان شام کو جانے اور وہاں سے واپس آنے کے وقت منزل کرتے تھے۔ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی کاروانی سفر کے وقت، بعثت سے قبل، اس سے شخصی تعارف حاصل ہوا ہو۔بہرحال مکہ میں رسول کریم ﷺ اسلام کی تبلیغ کرتے تھے اور مسلمان ہوجانے والے لوگ بھی جہاں جہاں جاتے، اپنی قابلیتوں اور صلاحیتوں کے مطابق اپنے نئے دین کی تبلیغ شروع کر دیتے، جس سے متاثر ہوکر لوگ ایمان لے آتے۔چنانچہ جعفر طیارؓ کو جب نجاشی کے سامنے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا موقع ملا تو انہوں نے تفصیل سے بتایا کہ اسلام کیا چیز ہے؟ یہ لوگ ہم پر الزام کیوں لگاتے ہیں کہ فتنہ و فساد کرتے ہیں۔آخر میں انہوں نے قرآن مجید کی کچھ آیتیں پڑھ کر سنائیں بالخصوص سورۂ مریم کی، جس میں یہ ذکر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ خدا کے حکم سے بغیر باپ کے حضرت مریمؑ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ہمارے مورخوں کا بیان ہے کہ یہ تفصیل سن کر نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ ان آیتوں میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے ، حضرت عیسیٰؑ اس سے اتنے(اس تنکے کے برابر) بھی زیادہ نہیں تھے۔ہمیں مزید تفصلیں نہیں ملتیں کے آیا نجاشی نے اسلام قبول کر لیا تھالیکن کچھ اشارے ایسے ہیں جن سے گمان ہوتا ہے کہ اگر اس وقت نہیں تو بعد میں نجاشی ضرور مسلمان ہوگیا تھاکیونکہ بخاری کی ایک روایت کے مطابق ، جس دن نجاشی کی وفات کی خبر مدینے میں آئی رسول اللہ ﷺ نے اسی دن اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی۔ظاہر ہے رسول اللہ ﷺ کسی غیر مسلم کے لیے نمازِ جنازہ نہیں پڑھ سکتے تھے۔اس لیے یہ گمان کرنا چاہیئے کہ نجاشی نے اسلام قبول کر لیا تھا، اور اس کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو بھجوائی تھی۔

تبلیغ کے سلسلے میں یہ چند ابتدائی باتیں ہمیں ملتی ہیں۔اس کے بعد رسول اکرم ﷺ کو اس سے بھی مشکل تر حالات سے سابقہ پڑتا ہے۔جب حبشہ بھیجی ہوئی مشرکینِ مکہ کی جماعت اپنے مقصد یعنی مسلمان مہاجرینِ حبشہ کو واپس مکہ لانے میں ناکام ہوئی تو وہ لوگ مقیم مکہ بقیہ مسلمانوں کو زیادہ سختی سے اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنانے لگے ، اور باتوں

کے علاوہ انہوں نے ایک قرارداد منظور کی کہ رسول ﷺ اور آپؐ کے خاندان کے دوسرے لوگوں سے نہ کوئی شخص شادی بیاہ کے تعلقات رکھے ، نہ ان کو بیٹی دے اور نہ ان سے رشتہ لے، نیز یہ بھی کہ نہ کوئی تجارتی چیز انہیں فروخت کرے ، اور نہ ان کی دکان سے کوئی چیز کریدے، حتیٰ کہ ان سے بات چیت بھی نہ کرے۔یہ قرارداد انہوں نے لکھ کر خانہ کعبہ کے اندر لٹکا دی اور یہ عہد کیا کہ ہم اس کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔یہ بائیکاٹ کئی سال تک جاری رہا۔ اس کے نتیجے میں متعدد مسلمان فاقہ کشی سے شہید بھی ہوئے۔بہت سے مسلمانوں نے ایسی ایسی تکلیفیں اٹھائیں کہ انہیں یاد کرنے سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہین۔بالآخر وہ بائیکاٹ ختم ہوجاتا ہے۔اس کی تفصیل میں میں نہیں جانا چاہتا۔رسول اللہ ﷺ شہر واپس آتے ہیں اور یہ دیکھ کر کہ اب شہر کے باشندوں سے بات چیت بھی ناممکن سی ہوگئی ہے اور لوگ اسلام کا نام سننے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں تو سوچنے لگتے ہیں کہ کیا کریں ؟ اسی زمانے میں چچا ابو طالب کی وفات ہوگئی ، اور نہ معلوم کس طرح دوسرا چچا ابو لہب قبیلے کا سردار بنا۔اس نے پہلا کام یہ کیا کہ حضورِ اکرم ﷺ کو "خلع"(یعنی جات باہر) کردیا کہ جو چاہے آپ کو جان سے بھی مار ڈالے، قبیلہ انتقام کی کوشش نہ کرے گا۔اس پر حضورِ اکرم ﷺ مجبور ہوتے ہیں کہ شہر چھوڑ دیں اور کسی اور جگہ جا کر تبلیغ کریں۔آپؐ شہر طائف کا انتخاب کرتے ہیں۔ ہمارے مؤرخوں نے لکھا ہے کہ وہاں رسول اللہ ﷺ کے ننھیالی رشتہ دار تھے ، گویا ماموؤں کا علاقہ تھا۔آپؐ بہت پر امید ہوکر گئے لیکن وہاں مکے سے زیادہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ماموؤ ں نے آپؐ کی حوصلہ شکنی کی اور دھمکی دی کہ آپؐ ان کا شہر چھوڑ کر چلے جائیں ورنہ آپ کی جان کی خیر نہیں۔مجبوراً آپؐ شہر سے نکلے تو ان لوگوں نے گلی کے شریر لڑکون کو آپؐ کے پیچھے لگا دیا: ان پر پتھر پھینکواور انہیں ستاؤ۔آپؐ زخمی ہوجاتے ہیں۔شہر سے باہر آکر ایک باغ دیکھتے ہیں جس کے دروازے پر ایک دربان کھڑا تھا۔آپؐ اس کی اجازت سے باغ کے اندر داخل ہوتے ہیں۔دربان ایک نیک دل عیسائی تھا۔اس نے شریر لڑکوں کو ڈانٹ کر بھگا دیا اور اپنے مالک کی اجزت سے ،جو مکے کا رہنے والا تھا اور اس وقت باغ میں موجود تھا، اس بے بس مہمان کی میزبانی کرنے لگا۔انگور کا ایک خوشہ توڑ کر اس نے رسول اللہ ﷺ کو پیش کیا۔اس وقت ایک واقعہ پیش آیا جسے شاید تبلیغ کا بالواسطہ طریقہ کہا جائے۔رسول اللہ ﷺ نے "بسم اللہ" کہہ کر انگور کے ان دانوں کو کھانا شروع کیا۔باغ کا مالی یا دربان حیرت سے پوچھنے لگا کہ تمہارے ملک میں تو ایسا نہیں ہوتا۔یہ کیا طریقہ ہے؟ اس پر رسول اللہ ﷺ نے اسے بتایا کہ میں نبی ہوں۔اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں جو کام کروں ، اللہ کا نام لے کر شروع کروں۔پھر آپؐ نے دربان سے پوچھا تم کون ہو؟ اس نے کہا میں عیسائی ہوں۔میرا وطن نینویٰ کا شہر

ہے(اسے آج کل موصل کہتے ہیں)۔ ایسی مصیبت آئی کہ اب غلام کی صورت میں یہاں کام کر رہا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم اس شہر کے باشندے ہو جہاں میرا بھائی یونسؑ رہا کرتا تھا۔اس پر وہ عیسائی بے اختیار آپؐ کے قدموں کو بوسہ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہاں یونسؑ نبی رہا کرتے تھے۔کچھ اس طرح کی گفتگو ہوئی۔اس کے بعد آپؐ وہاں سے رخصت ہوکر مکے کی طرف لوٹے۔ تھوڑی دور جاکر آپ تھک کر ٹھہر جاتے ہیں۔رات کا وقت ہے۔آپ نماز میں مشغول ہوجاتے ہیں۔نماز کے بعد دکھے ہوئے دل سے آپؐ دعا کرتے ہیں جو آج بھی ہم پڑھیں تو دل پر گہرا اثر پڑتا ہے۔اس کے الفاظ کم و بیش اس طرح ہیں: "اے اللہ! میں اپنی کمزوری اور بے بسی کی تجھ سے فریاد کرتا ہوں۔لوگ مجھے حقیر پاتے ہیں۔مصیبت زدوں کا رب تو ہی ہے۔اے میرے رب، کیا کروں؟ دور کے رشتہ دار درشتی سے پیش آرہے ہیں۔قریبی رشتہ دار دشمن بن گئے ہیں۔اس سب کے باوجود ، اگر تو مجھ سے خفا نہیں ہے تو مجھے ان تکلیفوں کی پروا نہیں لیکن تیری طرف سے عافیت مل سکے تو وہ زیادہ خوشگوار ہو۔میں پناہ صرف اس بات سے چاہتا ہوں کہ تو مجھ سے ناراض ہوجائے۔ میں تیری اور صرف تیری خوشنودی کا طالب ہوں۔کسی بھی کام کی کوئی قوت، کوئی طاقت مل سکتی ہے تو وہ بس تجھی سے ہے۔" مختصر یہ کہ فرماتے ہیں: میں ان ساری مشکلوں ، تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں اور عازم ہوں کہ اپنے فریضے کی انجام دہی کو جاری رکھوں۔

یہ امتحانِ الٰہی تھا۔ہم نے دیکھا کہ اس میں حضور ﷺ کس شان سے کامیاب ہوتے ہیں۔خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا۔ابھی نماز اور دعا سے فارغ ہی ہوتے ہیں کہ قبولیت کے آثار نمودار ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ ایک اہم واقعہ پیش آیا جس کی رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دینے کے لیے خدا نے ایک سورت نازل کی جس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں قُلْ أُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ ٱسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ ٱلْجِنِّ فَقَالُوٓا۟ إِنَّا سَمِعْنَا قُرْءَانًا عَجَبًا (۷۲ : ۱) ( آپ کہہ دیجئے کہ مجھ پر وحی کی گئی ہے کہ جنوں کا ایک گروہ مجھے سن رہا ہے) اس سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو دیکھا اور نہ ان کےوجود محسوس کیا کو محسوس کیا۔جب تک خدا نے اطلاع نہین دی آپ کو اس کی خبر بھی نہیں ہوئی۔اب رسول اللہ ﷺ صرف انسانون کے لیے نبی نہ رہے، جنات کے لیے بھی نبی بن گئے۔اگر انسان آپؐ کی نبوت کا انکار کرتے ہیں تو کم از کم جنات کا ایک گروہ تو اسلام قبول کر رہا ہے۔یہ روشنی کی پہلی کرن تھی جو اس تاریکی اور مایوسی کے عالم میں آپ کو دکھائی دیتی ہے۔

آپؐ آہستہ آہستہ پیدل مکہ واپس آ جاتے ہیں۔یہاں ایک نئی مشکل آپؐ کا انتظار کر رہی تھی۔وہ یہ کہ چچا کے طرد اور شہر مکہ کو چھوڑنے کے بعد آپؐ کی مکی قومیت ختم ہوگئی تھی۔آپ اس وقت تک شہر مکہ میں داخل نہیں ہوسکتے تھے جب کہ شہر مکہ کا کوئی باشندہ آپؐ کو پناہ نہ دے چنانچہ آپؐ ایک بدوی شخص کو کچھ رقم دے کر بھیجتے ہیں کہ میری ماں کے فلاں رشتہ دار سے جا کر کہو کہ وہ مجھے اپنی پناہ میں لے لے۔وہ جاتا ہے مگر واپس آکر کہتا ہے کہ اس شخص نے یہ کہہ کر انکار کر دیا ہے کہ میں مکہ والا نہیں، طائف والا ہوں، اس لیے مکہ والوں کو اپنی پناہ دہی کا پابند نہیں کر سکتا۔پھر اسی بدوی کو کچھ اور انعام دے کر ایک شخص کے پاس بھیجتے ہیں جو آپ کی بیوی حضرت سودہؓ کا رشتہ دار ہے۔وہ بھی انکار کرتا ہے کہ میں چھوٹے خاندان کا آدمی ہوں۔پھر اسی کو ایک تیسرے شخص کے پاس بھیجتے ہیں جو آپ کی بیوی حضرت خدیجہؓ کا رشتہ دار ہے۔وہ قبول کرلیتا ہے اور اپنے بچوں اور اپنے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ ہتھیار بند ہوکر آتا ہے رسول اللہ ﷺ کو اپنی حفاظت میں لے کر مکے میں داخل ہوتا ہے۔حسبِ رسم اولاً رسول اللہ ﷺ کے لیے ضروری تھا کہ کعبے کا طواف کریں اور پھر گھر جائیں چنانچہ رسول اللہ ﷺ علی الاعلان کعبے کا طواف کرتے ہیں اور پھر اپنے گھر جاتے ہیں۔یہاں میں یہ بیان کرتا چلوں کہ طائف کے اس سفر سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے بڑے حامی اللہ کو پیارے ہوچکے تھے: آپؐ کے چچا ابو طالب اور آپؐ کی بیوی حضرت خدیجہؓ۔اسی افسردگی کے عالم میں آپؐ شہر چھوڑ کر طائف گئے تھے۔اس شہر مکہ میں چچا ابو لہب کی دشمنی کے باعث آپؐ کی حیثیت اجنبیوں کی سی تھی جو مقامی باشندوں میں سے ایک کی پناہ میں رہتے تھے۔جس سے میں یہ معنی اخذ کرتا ہوں کہ اب رسول اللہ ﷺ کو شہر میں آزادی نہیں تھی کہ سیاست میں حصہ لیں، یعنی تبلیغ دین کریں۔اللہ نے اس کا حل بھی آپؐ کو بتا دیا۔وہ یہ کہ شہر مکہ کے رواج کے تحت لوگوں کو ہر سال حج کے زمانے میں ایک طرح کا امنِ عام مل جاتا تھا۔چنانچہ جو لوگ مجرم اور قاتل ہوتے تھے اور سارا سال چھپتے رہتے تھے وہ بھی حرام مہینے میں، یعنی حج کے زمانے میں ، کھلم کھلا باہر نکل سکتے تھے اور آجا سکتے تھے۔حضور ﷺ نے سوچا کہ شہر مکہ کے لوگ تو اسلام کے دشمن ہیں، ممکن ہے بیرونی قبائل یعنی غیر علاقوں سے آنے والے حاجی اسلام قبول کرلیں۔چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے کوشش کی کہ حج کے زمانے میں باہر سے آنے والے قبائل میں اسلام کی تبلیغ کریں۔کافی جدوجہد کے بعد اس میں کچھ کامیابی ہوئی۔ابن ہشام کے مطابق رسول اللہ ﷺ کم سے کم پندرہ قبائل میں گئے۔ہر ایک کو مخاطب کرکے یہ کہتے رہے کہ تم اسلام قبول کرو ( جس کی یہ خصوصیات ہیں) تو جلد ہی قیصر و قصریٰ کے خزانے تمہارے قدموں پر نثار ہو جائیں گے۔مگر کسی نے قبول نہیں کیا،

سوائے آخری سولھویں گروہ کے، جس میں صرف انصار کے چھ آدمی تھے۔وہ یہ سن کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔گویا آنکھوں آنکھوں میں مشورہ کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ ہم سب اسلام قبول کرتے ہیں۔یہ پہلی بیعتِ عقبہ ہے۔

بات یہ تھی کہ شہر مدینہ میں بہت سے یہودی بستے تھے اور ہمارے مؤرخ بیان کرتے ہیں کہ جب کبھی عربوں اور یہودیوں کا مدینے میں جھگڑا ہوتا تھا تو یہودی ان سے کہتے تھے 'ذرا ٹھہر جاؤ، آج تو تم ہمیں مار رہے ہو لیکن جلد ہی آخری نبی آنے والا ہے، جب وہ آئے گا تو ہم اس کی اتباع کرکے تم کو دنیا سے نیست و نابود کردیں گے۔تمہارے بچے، بوڑھے، عورتیں ، مرد، سب کو قتل کردیں گے۔ان مدینے والوں نے سوچا کہ اگر یہ واقعی آخری نبی ہیں تو کیوں نہ یہودیوں سے بھی پہلے اسلام قبول کرلیں۔چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر آنکھوں کے اشارے سے گفتگو کرتے ہیں۔پھر سب لوگ اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ان کا اسلام مخلصانہ تھا چنانچہ مدینے پہنچ کر وہ سب لوگ اسلام کی تبلیغ کرتے ہیں اور اس میں انہیں کامیابی بھی ہوتی ہے۔ایک سال بعد امن کے زمانے میں ، یعنی حج کے مہینے میں، مدینے سے بارہ نئے آدمی مکے آتے ہیں اور بمقام عقبہ رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔اس بیعت کے بعد ہمیں چند ایسے واقعات نظر آتے ہیں جو بہت دلچسپ ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے ان بارہ آدمیوں کو، جو بارہ مختلف قبیلوں کے نمائندے تھے، اپنی طرف ان قبیلوں میں نقیب یا سردار مامور کیا۔اور انہی میں سے ایک کو نقیب النقباء۔اس میں ایک طرف تو ہمیں نظر آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طبیعت میں تنظیم پسندی تھی اور مسلمانوں میں ایک مرکزی نظام پیدا کرنا چاہتے تھے۔دوسری طرف ان کو رسول اللہ ﷺ نامزد کرتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ آپ کے ماتحت تھے۔جو کسی کو نامزد کرتا ہے وہ اس کو معزول بھی کر سکتا ہے۔اس نامزدگی کے بعد وہی لوگ رسول اللہ ﷺ سے فرمائش کرتے ہیں کہ ہمیں ایسا معلم دیجئے جو اسلا م سے ہمارے مقابلے میں زیادہ واقف ہو اور دینے میں ہمیں دین بھی سکھائے اور تبلیغ بھی کرے۔رسول اللہ ﷺ نے مصعب بن عمیرؓ کوکو روانہ کیا جو بہت ہی مخلص مسلمان تھے اور نفسیات کے بڑے ماہر تھے۔ان میں لوگوں کو اسلام پر آمادہ کرنے کی غیر معمولی صلاحیتیں تھیں۔چنانچہ لکھا ہے کہ انہیں بہت ہی شاندار کامیابیاں حاصل ہوئیں۔بیسیوں لوگ مسلمان ہوتے گئے۔حتیٰ کہ انتہائی اجڈ لوگ بھی اسلام قبول کرتے تھے۔

اس بارے میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتا ہوں۔ایک دن حضرت مصعب بن عمیرؓ نے ایک باغ میں جا کر وہاں کے لونڈی ، غلاموں اور بچوں کے سامنے تبلیغ شروع کردی۔مالک کو یہ تماشہ برا لگا۔اس نے ایک آدمی کو بھیجا کہ اس کو ڈانٹ کر نکال دو کہ ہمارے باغ میں اس طرح بلا اجازت آکر کیوں فساد کر رہا ہے؟ وہ شخص پہلے سے مسلمان ہوچکا تھا۔اس نے بہانہ کیا اور واپس جا کر مالک کو بتایا کہ میں نے اسے بہت ڈانٹا مگر وہ نہیں مانتا ، تم خود کاجر اسے نکالو۔اصل میں اس کا منشاء یہ تھا کہ یہ مالک بھی اسلام کی باتیں سنے اور اس شخص کی زبانی سنے، جو اپنی جادو بیانی اور طاقتِ لسانی سے ہر شخص کو اسلام کا گرویدہ بنا لیتا ہے۔چنانچہ وہ سردار بڑے طنطنے سے نیزہ ہلاتا ہوا آیا اور دھمکی دی کہ نکل جاؤ یہاں سے ورنہ میں تمہیں قتل کر دوں گا۔مصعب بن عمیرؓ گھبرانے کی بجائے مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ”ایک بات پوچھنے کی اجازت چاہتا ہوں وہ یہ کہ یہ معلوم کیے بغیر کہ میں کیا کہہ رہا تھا، تم مجھے یہاں سے کیوں نکالنا چاہتے ہو؟ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ تم پہلے سن لو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔اس کے بعد تمہیں اختیار ہے، تم لہو گے تو میں چلا جاؤں گا۔“ وہ اجڈ شخص اپنے نیزے کو زمین میں گاڑھ کر بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو۔انہوں نے حسبِ عادت قرآن مجید کی ایک سورۃ کی تلاوت کی۔تلاوت شروع ہوتے ہی اس کو سکون آگیا۔چہرے پر خشونت کی جگہ سکون اور ایک نئے شعور کی روشنی پھیل گئی۔پھر قبل اس کے کہ سورہ کی تلاوت ختم ہوتی، وہ شخص اٹھا اور پوچھنے لگا کہ مجھے مسلمان ہونے کا طریقہ بتاؤ۔چنانچہ وہ فوراً کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوجاتا ہے۔پھر اپنی عادت کے مطابق سابقہ اجڈ پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے زور سے نیزہ ہلاتے ہوئے اپنے گھر کے اندر جاتا ہے اور کہتا ہے کہ آؤ، سب میرے پاس آؤ۔چنانچہ عورتیں، بچے اور غلام سب بھاگ کر اس کے پاس آتے ہیں۔اس نے سب سے پوچھا کہ بتاؤ میں کون ہوں؟ سب نے کہا 'آپ ہمارے سردار ہیں۔ہم سب سے زیادہ عقل مند ہیں۔تب اس نے کہا ”میرا حکم ہے کہ تم سب مسلمان ہوجاؤ ورنہ تم مجھ سے زیادہ کسی کو اپنا دشمن نہ پاؤ گے۔“ اس طرح پورا خاندان مسلمان ہوجاتا ہے۔جب سردار مسلمان ہو تو ظاہر ہے کہ سردار کے ماتحت لوگوں کا مسلمان ہوجانا بہت آسان ہوجاتا ہے۔ہمیں اسلام پھیلنے کے یہ مختلف طریقے نظر آتے ہیں، یہ ان میں سے ایک تھا۔

یہ چیزیں ہمیں رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے آخری زمانے تک ملتی ہیں۔دو ایک مثالیں اور دے کر میں اس بیان کو ختم کروں گا۔ایک دن رسول اللہ ﷺ کے مکان میں ایک اجنبی مہمان آتا ہے۔رسول اللہ ﷺ اس کو کھانے

کو بھی دیتے ہیں اور رات گزارنے کے لیے کمرہ بھی دیتے ہیں۔وہ بدنیتی اور دشمنی کے ساتھ آیا تھا۔علی الصبح کمرے میں بستر پر غلاظت کرکے ، قبل اس کے کہ لوگ بیدار ہوں ، اٹھ کر چلا جاتا ہے۔صبح کو جب رسول اللہ ﷺ وہاں آئے اور غلاظت دیکھی تو اس کو اپنے دستِ مبارک سے دھویا ، بستر کو پاک صاف کیا۔پھر دیکھا کہ وہ شخص جاتے ہوئے اپنی تلوار وہیں بھول گیا ہے۔کچھ دور جا کر اس اجنبی کو بھی تلوار یاد آئی اور آہستہ آہستہ واپس آیا کہ ابھی لوگ سو رہے ہوں گے۔میں تلوار لے کر پھر واپس چلا جاؤں گا۔مگر اس نے دیکھا کہ رسول اکرم ﷺ بیدار ہوچکے ہیں۔اپنے ہاتھ سے بستر کو صاف کر رہے ہیں۔بجائے اس کے کہ رسول اللہ ﷺ اسے ڈانٹیں یا دھمکائیں ، آپؐ فرماتے ہیں کہ تم اپنی تلوار بھول گئے تھے، یہ تلوار رکھی ہے، لے لو۔اس سلوک کے نتیجے میں وہ بے ساختہ پکار اٹھا: ”اشھد ان لا الہ اللہ و اشھد ان محمدا رسول اللہ“۔

ایک اور واقعہ ملتا ہے کہ ایک جنگ کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ تشریف لے جاتے ہیں۔فوج کی آمد کی خبر سن کر دشمن بھاگ جاتا ہے۔دور تو نہیں بھاگتا۔ کیونکہ پہاڑی علاقہ تھا۔پہاڑ پر چڑھ کر کسی درے یا وادی میں چلا جاتا ہے۔اس دشمن قبیلے کا سردار پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کے دور تاکتا رہتا ہے کہ یہ فوج کیا کرتی ہے۔اس دن بارش ہوئی۔ چنانچہ بارش کی وجہ سے رسول اکرم ﷺ اور آپ کے ساتھی تتر بتر ہوگئے۔خود رسول اللہ ﷺ تنہا ایک درخت کے نیچے لیٹ گئے۔اور اپنا کرتا درخت کی شاخ سے لٹکا دیا تاکہ وہ خشک ہوجائے۔دشمن جو اوپر سے تاک رہا تھا، دیکھتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ تنہا سوئے ہوئے ہیں۔آتا ہےاور تلوار کھینچ کر چلا کر کہتا ہے: ”اے محمدؐ! تجھے اب میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟“ رسول اکرم ﷺ بہت ہی سکون کے ساتھ کہتے ہیں: ”اللہ“۔اس جواب سے اس پر اتنا رعب ہوا کہ ہاتھ میں تھرتھری پیدا ہوگئی اور تلوار ہاتھ سے گر گئی۔ تلوار کو اب رسول اللہ ﷺ خود اٹھاکر کہتے ہیں: ”اب تجھے میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟“ وہ کہتا ہے: ”کوئی نہیں۔“ آپؐ اس کو اس کی تلوار واپس کرتے ہیں کہ جاؤ میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔وہ اس مرحمت پر اس قدر متاثر ہوا کہ فوراً کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوجاتا ہے اور کہتا ہے کہ اب میں اپنے قبیلے میں اسلام کی تبلیغ کروں گا۔اسی طرح فتح مکہ کے بعد حضور اکرم ﷺ جب عام معافی کا اعلان کرتے ہیں تو اس کے رد عمل کے طور پر لوگ جوق در جوق مسلمان ہوتے ہیں اور راتوں رات سارا مکہ مسلمان ہوجاتا ہے۔یہ تھے وہ طریقے جو تبلیغِ اسلام کے لیے رسول اکرم ﷺ نے اختیار فرمائے اور نتیجہ ہمیں واضح نظر آتا ہے۔

اس سے پہلے کے انبیاءؑ کی زندگی میں ان کے ہاتھوں پر ایمان قبول کرنے والوں کی تعداد کا ہم رسول اکرم ﷺ کی کامیابی سے مقابلہ کریں تو یہاں بھی آپ کو غیر معمولی فوقیت نظر آتی ہے۔۔حضرت عیسیٰؑ کے متعلق انجیل میں جو تفصیلات ملتی ہیں، ان سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ تیس چالیس آدمی ایمان لائے ہوں گے۔حضرت موسیٰؑ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی قوم بنی اسرائیل کے لوگ جن کی تعداد بائبل کے مطابق پانچ لاکھ تھی، ان کا ساتھ دے رہی تھی، لیکن ایک خود غرضی کے تحت تاکہ فرعون کے ظلم سے نجات پائیں۔سچے دل سے ایمان لانے والوں کی تعداد تقریباً صفر تھی۔کیونکہ جب حضرت موسیٰؑ نے مصر سے نکلنے کے بعد ایک دن اس سے مخاطب ہوکر کہا: ”خدا نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ تمہیں ملک فلسطین کا ملک دے گا، آگے بڑھو اور اس ملک پر قبضہ کر لو۔“ تو انہوں نے کہا کہ ”ان جباروں سے ہم مقابلہ نہیں کرسکتے۔تمہارے خدا نے وعدہ کیا ہے تو تم اور تمہارا خدا دونوں (فلسطین پر قبضہ کرنے) جاؤ ہم تو یہیں بیٹھے رہتے ہیں۔“ (قرآن ۵ : ۲۴) دوسرے الفاظ میں ساری قوم کافر اور نا فرمان ہوجاتی ہے۔آپ کی بات قبول کرنےاور ایمان لانے سے سے انکار کرتی ہے۔کہتے ہیں کہ صرف دو آدمی تھے ، جنھوں نے ایسا نہیں کیا ، اور حضرت موسیٰؑ کا ساتھ دینے پر آمادگی ظاہر کی: ایک آپ کے بھائی حضرت ہارونؑ اور دوسرے آپ کے خادم حضرت یوشع جو بعد میں نبی بنے۔ان دونوں کے سوا سارے بنی اسرائیل میں سے کسی نے آپ کی بات نہیں مانی تھی۔حضرت عیسیٰؑ کے بارہ(۱۲) بہت ہی مخلص حواری تھے۔ان میں سے سینٹ پیٹر کا نام آپ نے سنا ہوگا جن کی قبر (ویٹ کن) اٹلی میں ہے۔ان کے متعلق انجیل ہی میں حضرت عیسیٰؑ کا قول ہے: ”جا او شیطان۔“یہ ان کی کسی حرکت یا طرزِ عمل کی بنیاد پر کہا ہوگا۔تفصیلات مجھے معلون نہیں۔ایک اور حواری یہودا تھا جس کے متعلق تو صراحت ملتی ہے کہ اس نے ارتداد اختیار کیا۔پولیس کو حضرت عیسیٰؑ کی ضرورت تھی اور وہ انہیں تلاش کر رہی تھی۔حضرت عیسیٰؑ غائب ہوگئے تھے۔تو اس ساتھی نے جو مرتد ہوگیا تھا، پولیس کو مخبری کی اور حضرت عیسیٰؑ کو گرفتار کرا دیا۔اس کے برخلاف حضور اکرم ﷺ کے ہاتھ پر جو لوگ مسلمان ہوئے ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ صحیح اعداد و شمار توہمارے پاس نہیں لیکن ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے ان کی تعداد کا ایک حد تک تخمینہ لگایا جا سکتا ہے۔حجتہ الوداع کے متعلق جو وفات سے تین مہینے پہلے کا واقعہ ہے، ہمارے مؤرخ لکھتے ہیں کہ اس وقت میدانِ عرفات میں ایک لاکھ چالیس ہزار آدمی جمع ہوگئے تھے۔اسلام میں حج کوئی ایسا فریضہ نہیں کہ ہر شخص کو ہر سال ادا کرنا پڑے۔ظاہر ہے کہ جتنے لوگ مسلمان ہوئے تھے، سب کے سب وہاں اس سال حج کے لیے نہیں آئے ہوں گے۔کچھ لوگ گھروں میں رہے، کچھ لوگ آئے۔اگر

بالفرض ہر پانچ میں سے ایک شخص آیا ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ سب مسلمانوں کی تعداد کم و بیش پانچ چھ لاکھ ہو گی۔ کہاں تیس چالیس آدمی، کہاں لاکھوں کی تعداد۔ہمیں اسلام کی تاریخ میں یہ بھی نظر آتا ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد شاذونادر ہی کسی نے ارتداد کیا ہو، عہدِ نبویؐ میں ارتداد کی ایک آدھ مثال ہمیں نظر آتی ہے۔لیکن حقیقت میں وہ مسلمان ہونے کے بعد مرتد نہیں ہوئے بلکہ وہ منافق تھے۔منافقانہ طور پر اسلام کا اظہار کرتے تھے اور اسلام کو اندر سے نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔لیکن جب ان کی چلی نہیں تو بھاگ نکلے اور پھر اپنے کفر کا کھلم کھلا اعلان کیا۔غرض یہ چند خاص باتیں جو تبلیغ کے سلسلے میں ہمیں نظر آتی ہیں۔

اب ایک سوال یہ ہے کہ غیر مسلموں کے متعلق اسلام کا برتاؤ کیا ہے۔مختصراً بیان کرتا ہو۔اس آیت سے آپ میں سے ہر شخص واقف ہوگا: "لا اکراہ فی الدین" (۲ :۲۵۶) ـــ " ان علیک الا البلاغ" (۴۲: ۴۸) یعنی اسلام قبول کرنے کے لیے جبر کرنے کی کوئی اجازت نہیں۔پیغمبر کا فریضہ صرف ابلاغ و تبلیغ ہے، اس کے بعد نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔عہدِ نبویؐ اور خلافتِ راشدہ کے بارے میں حتمی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی کو جبر کے ساتھ کبھی مسلمان نہیں بنایا گیا۔غیر مسلموں کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیئے؟ قرآن میں یہ عجیب و غریب اصول ملتا ہے کہ ہر مذہبی کمیونٹی کو کامل داخلی خودمختاری دی جائے گی حتیٰ کہ نہ صرف عقائد کی آزادی ہو اور اپنی عبادات وہ اپنی طرز پر کر سکیں بلکہ اپنے ہی قانون، اپنے ہی ججوں کے ذریعے سے اپنے مقدمات کا فیصلہ بھی کرائیں۔کامل داخلی خود مختاری کا قرآن کی کئی آیتوں میں ذکر ہے۔جن میں سے ایک آیت بہت ہی واضح ہے: ولیحکم اهل الانجیل بما انزل الله فیه" (۵: ۴۷) یعنی انجیل والوں کو چاہئیے کہ اس چیز کے مطابق احکام دیا کریں جو اللہ نے انجیل میں نازل کی ہے۔ان احکام کے تحت عہدِ نبویؐ ہی میں قومی خود مختاری ساری آبادی کے ہر ہر گروہ کو مل گئی تھی۔جس طرح مسلمان اپنے دین، عبادات ، قانونی معاملات اور دیگر امور میں مکمل طور پر آزاد تھے، اسی طرح دوسری ملت کے لوگوں کو بھی کامل آزادی تھی۔

اس کے کچھ عرصے بعد ایک نیا واقعہ پیش آتا ہے۔مسلمانوں پر جنگ فرض کی جاتی ہے اور غیر مسلم رعایا کو اس سے مستثنیٰ کیا جاتا ہے۔کیونکہ اگر مسلمان دین کی خاطر جنگ کریں تو غیر مسلموں کو اسلام کی خاطر جنگ کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔چونکہ مسلمان جنگ کرکے اسلامی مملکت، ریاست اور اس کی حدود کی حفاظت کرتا ہے ، جس کے باعث وہاں رہنے والی غیر مسلم رعایا امن و ایمان سے متمتع ہوتی ہے جب کہ مسلمان اپنے ملک کی حفاظت کے لیے سر

کٹاتے ہیں۔ لہٰذا فوجی ضروریات کے تحت غیر مسلم رعایا پر ایک ٹیکس عاید کیا جاتا ہے ، جو جزیہ کہلاتا ہے۔ یہ جزیہ اسلام کی ایجاد نہیں ہے۔ اسلام سے پہلے ایران و غیرہ میں بھی جو لوگ فوجی خدمت سر انجام نہیں دیتے تھے، ان کو ایک ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ یہ چیزاسلام میں بھی آئی۔ غیر مسلم رعایا بہت ہی خفیف ٹیکس دے کر، جو سال میں دس دن کی غذا کے مترادف تھا، اسلامی سلطنت کی پوری حفاظتی قوتوں اور پولیس وغیرہ کی خدمات سے مستفید ہوتے رہتے اور جس وقت مسلمان اپنا سر کٹاتے ، یہ اپنی تجارت اور کاروبار میں لگے ہوتے ، دولت کماتے۔ اس کے علاوہ ایک اور چیز غیر مسلموں کے متعلق ہمیں نظر آتی ہے کہ محض دین کی بنا پر ان کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ۲ ہجری میں جب غزوہ بدر میں مسلمانوں کو فتح ہوئی تو مکے والوں نے ایک وفد دوبارہ حبشہ بھیجا اور چاہا کہ وہاں جو مسلمان مہاجرین مقیم ہیں ان کو نئے نجاشی سے کسی طرح واپس حاصل کرلیں اور ان کو تکالیف دیں۔ جب اس کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو ہوئی تو مؤرخوں نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عمرو بن امیہ الضمری کو اپنا سفیر بنا کر نجاشی کے پاس بھیجا کہ وہ مسلمانوں کی سفارش کرے اور ا ن کی حفاظت کے لیے حکمران کو آمادہ کرے ۔ حالانکہ عمرو بن امیہ الضمری اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اسی طرح ہمیں اس کا بھی پتا چلتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے ہمسائے میں یہودی رہتے تھے، اگر ان کے یہاں کوئی بچہ بھی بیمار ہوتا تو رسول اکرم ﷺ اس بچے کی عیادت کے لیے اس کے گھر جایا کرتے۔ بنی عریض نامی ایک یہودی قبیلہ مدینے میں رہتا تھا۔ اس کی کسی بات سے خوش ہوکر رسول اکرم ﷺ نے اس کے لیےکچھ سالانہ معاش مقرر فرمائی۔ یہ مختلف چیزیں ہیں جو غیر مسلموں سے برتاؤ کے سلسلے میں ہمیں نظر آتی ہیں۔ ایک اور چیز کہ مسلمان کا ہی نہیں یہودیوں کا جنازہ بھی شہر کی گلیوں میں سے گزرتا اوراتفاق سے رسول اکرم ﷺ وہاں کسی جگہ بیٹھے ہوتے تو جنازے کو دیکھ کر آپ کھڑے ہوجاتے تاکہ ان کے ساتھ ایک طرح سے اپنی ہمدردی کا مظاہرہ کریں۔ غرض مسلمانوں کا طرزِ عمل غیر مسلم رعایا کے ساتھ اس قدر رواداری کا تھا کہ اس کی نظیر ہمیں تاریخِ عالم میں کم ملتی ہے۔ اس کا جو نتیجہ نکلا ، اس کی طرف اشارہ کرکے میں اسے ختم کرتا ہوں : رسول اکرم ﷺ کی وفات کے بعد پہلی مرتبہ مسلمانوں میں حضرت عثمانؓ کے زمانے میں خانہ جنگی ہوئی۔ پھر اس کے بعد بارہا خانہ جنگیاں ہوتی رہیں۔ کسی بھی مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی کے زمانے میں غیر مسلم رعایا نے کبھی بغاوت نہیں کی۔ وہ نہ اس فریق کا ساتھ دیتے، نہ اس فریق کا ساتھ دیتے، موقع سے فائدہ اٹھا کر مسلمان حکومت سے غداری یا بغاوت کا خیال انہیں کبھی پیدا نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے زمانے میں جب قیصر روم نے پیام

بھیجے اور اسلامی ممالک کی عیسائی رعایا سے کہا کہ موقع ہے کہ تم بغاوت کرو۔میں بھی اس وقت مسلمانوں پر حملہ کروں گا، اور ان مشترکہ دشمنوں سے ہم نجات پائیں گے، اس ابتدائی زمانے سے لے کر کروسیڈز( صلیبی جنگوں) تک جب کبھی ایسے مطالبے کسی پوپ نے یا کسی عیسائی حکمران نے کیے ، تو مسلمانوں کی عیسائی رعایا کا جواب یہ ہوتا تھا کہ ہم ان کافر حکمرانوں (مسلمانوں) کو تم جیسے ہم مذہب حکمرانوں پر ترجیح دیتے ہیں۔اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان کبھی غیر مسلموں پر اسلام لانے کے لیے جبر نہیں کرتے تھے اور ان کو مذہبی و قومی معاملات میں پوری آزادی و خود مختاری دیتے تھے، حتیٰ کہ ان کے مذہبی اداروں کی مدد بھی کیا کرتے تھے۔چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانے کی ایک معتبر شہادت موجود ہے جس کی اصل دستاویز بھی آج تک محفوظ ہے۔ایک عیسائی اپنے بعض ہم مذہبوں کو جو دوسرے شہر کے تھے یہ خوشخبری پہنچاتا ہے کہ آج کل ایک نئی قوم ہماری حاکم بن گئی ہے۔لیکن وہ ہم پر ظلم نہیں کرتی، اس کے بر خلاف وہ ہمارے گرجاؤں اور ہمارے راہب خانوں Convents کی مالی امداد کرتی ہے۔السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ!

## سوال وجواب

برادران کرام! خواہران محترم! السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ!

سوالات جو آج کے اجتماع کے دوران کیے گئے ہیں، ان کے متعلق میں کچھ مختصراً عرض کروں گا۔امید ہے آپ میری تقصیروں اورکوتاہیوں کو جو جوابات کے متعلق اور اپنی ساری گزشتہ تقریروں کے متعلق مجھ سے ہوئی ہیں، معاف فرمائیں گے۔کیونکہ انسان اپنی معصومیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔اگر مجھ میں کوئی قابلیت، کوئی خصوصیت ہے تو وہ یہی ہے یہی ہے کہ میں اپنی تقصیر کو ماننے کے لیے ہمیشہ آمادہ رہتا ہوں۔

**سوال ا:** آپ کے بیان کے مطابق ﷺ کے پیروکاروں کا تناسب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں سے کافی زیادہ تھا۔کیا وجہ ہے کہ موجودہ دور میں وہ تناسب نہیں ہے؟

**جواب:** اس کے دو جواب ہوسکتے ہیں۔ایک جواب قدرت کے متعلق ہے اور دوسرا جواب کود آپ کےہمارے متعلق ہے۔قدرت کے متعلق میں اس لیے کہتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اور ہمارے پیغمبر ﷺ کی اس دنیا میں تشریف آوری تک چھ سو سال کا وقفہ ہےلہٰذاعیسائیوں کو ہم پر چھ سو سال کی سبقت حاصل ہے۔ انشاءاللہ آئندہ چھ سو سال کے بعد ہماری حالت وہ نہیں رہے گی جو آج ہے۔یہ قدرتی صورت حال ہے۔جو اس کی توجیہ کے لیے پیش کی جاتی ہے۔یوں بھی رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے وقت دنیا میں عیسائیوں کا جو تناسب تھاوہ بہرحال اب باقی نہیں ہے۔ان عیسائیوں میں سے کروڑوں مسلمان ہوچکے ہیں۔لیکن گستاخی معاف ہو، اگر میں یہ کہوں کہ ان سے زیادہ یہ ہمارا اپنا قصور ہے۔کیا ہم اپنے اطراف میں نہیں دیکھتے کہ عیسائی مشنری کس تن دہی، کس جوش و خروش اور اور کس خلوص کے ساتھ اپنا دین پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔وہ دنیا کے ہر خطے میں

جاتے ہیں۔قطب شمالی اور قطب جنوبی کی سردیوں میں بھی اکڑتے، اور خطِ استوا کی گرمیوں میں بھی جھلتے ہیں اور اپنا فریضہ انجام دیتے رہتے ہیں۔یہ ہمارے لیے سبق آموزچیز ہے۔تبلیغ، اسلام کے سلسلے مین ہم اس کا عشر عشیر بھی نہین کرتے۔پھر ہم اس بات کی کیسے توقع کرسکتے ہیں کہ ہماری تعدادعیسائیوں کی تعداد سے زیادہ ہو۔اس کے باوجود میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ بیان درست نہیں ہے کہ موجودہ دور میں عیسائیوں کی تعداد مسلمانوں سے بہت زیادہ ہے۔خود یورپ اور امریکہ میں اب اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے۔

**سوال ۲:** اگر خلیفہ وقت یا اقتدارِ اعلیٰ قتل یا طبعی موت سے فارغ عہدہ نہ ہو تو کیا کوئی ایسا اسلامی طریقہ ہے جس سے انہیں علیحدہ کیا جانا ممکن ہو۔براہ کرم کسی مثال یا نظیر سے مطلع فرمائیں۔

**جواب:** میرا پہلا جواب یہ ہے کہ آپ کو ایسی خواہش نہیں کرنی چاہئیے۔اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں میں اتحاد، یکجہتی اور تعاون ہو۔یہ نہیں کہ ایک دوسرے کے ساتھ خانہ جنگی میں مبتلا ہوکر اپنے دشمنوں کو موقع دیں کہ ہم پر حاوی ہوجائیں۔دوسرا پہلو اس کا یہ ہے کہ مسلمان فقہاء کے بیان کے مطابق حکمران یا خلیفہ کی حیثیت ایک وکیل کی ہے اور مؤکل جو کسی شخص کو اپنا وکیل بناتا ہےاس بات کا ہمیشہ حق رکھتا ہے کہ اپنے وکیل کو معزول کرے۔جو لوگ کسی کو حکمران بنائیں گے انہی کو یہ حق بھی ہوگا کہ اس کو اس خدمت سے الگ کریں۔

**سوال ۳:** آپ نے کل ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا تھاکہ استاد کے لیے شاگرد کا دیا ہوا ہدیہ لینا مناسب نہیں۔ ہمارے علماء تقریریں کرنے کا معاوضہ لیتے ہیں۔اس کے متعلق قرآن وحدیث کی روشنی میں آپ کا کیا خیال ہے؟

**جواب:** مجھے معلوم نہیں کہ ایسا ہوتا ہے۔لیکن میں عرض کروں گا کہ ہر شخص کی ضرورتیں ہوتی ہیں، اس لیے کوئی عام حکم نہیں دیا جا سکتا۔ایک مثال دیتا ہوں۔حضرت عمرؓ کو رسول اکرمﷺ نے ایک خدمت پر مامور کیا تھااور جہاں تک مجھے یاد ہےوہ زکوٰۃ وغیرہ کی تحصیل کا کام تھا۔یہ کام انجام دینے کے بعد جب وہ واپس آئے تو رسول اکرمﷺ نے ان کی تنخواہ کے طور پر کچھ رقم عطا کی۔حضرت عمرؓ نے ادب کے ساتھ اس کو لینے سے انکار کر دیااور کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھے اس مال کی ضرورت نہیں ہے۔میں یہ کام اللہ کے لیے کرنا چاہتا ہوں۔آپ یہ رقم دوسری ضروریات کے لیے صرف فرما سکتے ہیں۔رسول اکرمﷺ نے فرمایا کہ نہیں تمہیں لے لینا چاہئیے۔لینے کے بعد کسی کارِ خیر میں لگا دو،

لیکن لینا چاہئیے۔یہ بخاری کی بیان کردہ حدیث ہے۔منشاء اس سے یہ ہے کہ کچھ تو حکومت کے فرائض ہیں جن کے لیے کسی شخص کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔دوسری طرف جس شخص سے کام لیا گیا ہے۔اس کے اپنے مسائل اور اپنی جرورتیں ہوں گی۔ان تمام چیزوں کا ہمیں لحاظ رکھنا ہوگا۔میں سمجھتا ہوں اس قدر جواب آپ کے لیے کافی ہوگا۔پھر آپ اس کے لیےخود فیصلہ فرماسکتے ہیں۔

**سوال۴:** یہ بتایا گیا ہے کہ مسند احمد بن حنبل میں ایک حدیث ہے۔جس میں کم و بیش یہ الفاظ ہیں کہ خدا نے مجھ کو معارف اور مزامیر کے نابود کرنے کے لیے بھیجا ہے۔

**جواب:** اگر یہ حدیث صحیح ہے تو ظاہر ہے میرے لیے یا کسی مسلمان کے لیے سوائے سرِ تسلیم خم کرنے کے اورکوئی چارہ نہیں۔اس کے باوجود دو چیزیں قابلِ ذکر ہیں۔ایک چیز علمی ہے جس کے بیان کرنے کے لیے وقت چاہئیےاور دوسری چیز وہ فوری ردِ عمل ہے جو اس حدیث کو پڑھنے سے ذہنوں میں آتا ہے۔لیکن میں سب سے پہلے ایک اصولی بات کی طرف اشارہ کروں گا۔ایک سے زیادہ مرتبہ رسول کریمﷺ کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ ستار کے تار وں کوتوڑنے کے لیے اللہ نے مجھے بھیجا ہےلیکن اب تک صحیح حوالے کے ساتھ کوئی حدیث بیان نہیں کی گئی۔حدیث کی کتابوں روایت کے ساتھ ساتھ اس کے مصادر بیان کئے جاتے ہیں کہ فلاں نے فلاں سے، فلاں نے فلاں سے، اس کی روایت کی ہے۔جس طرح ہم حدیث پر عمل کے پابند ہیں، چونکہ وہ اللہ اور اللہ کے رسولﷺکا حکم ہے، اسی طرح اس بارے میں اولاً یہ بھی معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ آیا یہ روایت صحیح بھی ہے یا نہیں۔چنانچہ ان راویوں کی سوانح دیکھنی ہوں گی اور یہ معلوم کرنا ہوگا کہ ان راویوں کے متعلق ہمارے علمائے سلف نے کیا رائے قائم کی ہے۔اس تحقیق کے ختم ہونے تک ، جس کا مجھے یہاں وقت نہیں مل سکتا۔کوئی رائے اس مسئلے کے متعلق قائم نہیں کی جا سکتی۔ بہرحال حدیث کے تمام الفاظ پر دوبارہ غور کیجئے۔حدیث کے الفاظ یہ ہیں کی بتوں کی پوجا اور پرستش کے لیے جو گانابجانا ہوتا ہے، میں اس کو محو کرنے آیا ہوں۔یہاں گانے بجانے کا ذکر بتوں کی پرستش کے سلسلے میں آیا ہے۔یہ بات ذہن میں رہنی چاہئیے۔بتوں کے حوالے کو نظر انداز کرکے کوئی نتیجہ اخذ کرنامناسب نہ ہوگا۔

**سوال۵:** حضرت امِ ورقہؓ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان کو آپ ﷺ نے گھر کی عورتوں کا امام بنایا تھا۔کیا عورت صرف عورتوں کی امامت کر سکتی ہے،مردوں کی نہیں؟

**جواب:** میں اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ نہیں کہ صرف عورتوں کے لیے امام بنایا گیا تھا۔حدیث میں یہ الفاظ ہیں " اہل خاندان" کے لیے۔"اہل" کے معنی صرف عورتوں کے نہیں ہوتے پھر اس حدیث میں بیان فرمایا گیا ہے کہ ان کا ایک موذن تھا، جو مرد تھا۔اور مزید تفصیلات بھی ملتی ہیں کہ ان کے غلام بھی تھے۔ظاہر ہے کہ غلام بھی ان کی امامت میں ہی نماز پڑھتے ہوں گے۔غرض یہ کہ امامت صرف عورتوں کے لیے نہیں تھی بلکہ مردوں کے لیے بھی تھی۔

**سوال۶:** رسول اللہ ﷺ طائف میں تقریباً ڈیڑھ ماہ رہے۔آپؐ نے وہاں کس کے ہاں قیام کیا؟

جواب: مجھے اس کا علم نہیں۔میں سمجھتا ہوں کہ مشکل سے ایک دن وہاں رہے۔ڈیڑھ مہینے کی روایت میں نے نہیں پڑھی۔ممکن ہے صحیح ہو مگر قرین قیاس نہیں۔

**سوال۷:** غائبانہ نمازِ جنازہ جائز ہے یا نہیں؟ روایت میں آیا ہے کہ نجاشی کی وفات کے وقت تمام پردے ہٹا دیے گئے اور رسول اکرم ﷺ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ذرا وضاحت فرمائیں۔

**جواب:** جہاں تک بخاری کی روایت کا تعلق ہے جو حدیث کی مستند کتاب ہے اس میں اس جزو کا کہیں ذکر نہیں ہے کہ " تمام پردے ہٹا دیے گئے۔" اگر کسی روایت میں ہو تو میں نے کبھی نہیں پڑھی۔بہرحال ایک واقعہ بہ صراحت ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے اس شخص کی وفات کے بعد جو کسی اور ملک میں ہوئی تھی، مدینہ منورہ میں نمازِ جنازہ پڑھائی اور اب مسلمان چودہ سو سال سے ایسا ہی کرتے چلے آ رہے ہیں۔اس میں کوئی امر مانع نہیں کہ ہم اپنے کسی مسلمان بھائی یا بہن کی مغفرت کے لیے ایک سے زیادہ وقت میں یا ایک سے زیادہ مقام پر نمازِ جنازہ ادا کریں۔

**سوال ۸:** حضوراکرم ﷺ کسی غیر مسلم کو مسلمان کرتے وقت کیا پڑھاتے تھے؟

**جواب:** میں سمجھتا ہوں کہ ایک ہی کلمہ ہوتا تھا "لا الہٰ الا اللہ محمد رسول اللہ"۔ممکن ہے کچھ اور تفصیلات ہوتی ہوں مثلاً پوچھا جاتا ہو کہ تم نماز پڑھوگے؟ کیا تم روزہ رکھوگے؟ کیا تم اسلام کے احکام پر عمل کروگے؟ تاکہ آدمی سوچ سمجھ کر

اسلام لائے، یہ نہیں کہ بعد میں واقفیت پر رائے بدل دے۔اس طرح کی جو چیزیں ہوسکتی ہیں، وہ مختلف افراد کے لحاظ سے مختلف بھی ہوسکتی ہیں، لیکن کئی بار اس کا ذکر آیا ہے کہ صرف "لا الہ لااللہ محمد رسول اللہ" کہا گیا اور قصہ ختم ہوگیا۔

سوال۹: کیا مسلمانانِ عالم کو ایک مرکز پر مجتمع کرنے کے لیے اسلامی مملکت کا دوبارہ قیام کرنا ضروری نہیں ہے؟ اگر ہے تو اس کے کیا امکانات ہیں اور ایسا کرنے کے لیے کیا اقدامات ضروری ہیں؟

**جواب:** اس کا جواب دینے سے قاصر ہوں۔سوائے اس کے کہ یہ میری بھی تمنا ہے کہ ایسا ہی ہو۔اگر میں کسی ملک کا حکمران ہوتا تو اسکے لیے آمادہ رہتا کہ کسی اور بہتر شخص کے لیے اپنی جگہ خالی کردوں کہ تم ان دونوں ملکوں کے بادشاہ ہو جاؤ۔لیکن ایسا نہیں ہے ، اس لیے کہہ نہیں سکتا کہ کیا کرنا چاہیئے۔یہ کام حکمرانوں کے کرنے کا ہے۔

**سوال۱۰:** آج کل کے حالات میں تبلیغ کی ضرورت غیر مسلموں سے زیادہ مسلمانوں میں کرنے کی ہے۔اپنے تجربات کی روشنی میں وضاحت کریں۔

**جواب:** مجھے اس سے اتفاق ہے بھی اور نہیں بھی۔اتفاق اس معنی میں ہے کہ اگر مسلمانوں کا کردار اچھا ہو تو اس کردار کا اثر دیکھنے والے غیر مسلموں پر پڑتا ہے۔لیکن اختلاف بھی ہے اور وہ اس معنی میں کہ اگر ہم انتظار کریں کہ سارے مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان بن جائیں، اس کے بعد ہم تبلیغ کریں تو یہ قیامت تک نہیں ہوسکتا۔ضرورت ہے کہ دونوں کام بیک وقت جاری رہیں۔ہم مسلمانوں کو مسلمان بنانے کے لیے بھی کام کریں اور غیر مسلموں تک اسلام پہنچانے کی بھی کوشش کریں۔

**سوال۱۱:** غیر مسلموں کے ساتھ مثالی رواداری کے باوجود مرتد کو واجب القتل کیوں قرار دیا گیا ہے؟ "لا اکراہ فی الدین" (۲:۲۵۶) کے باوجود ایسا حکم دینے کا کیا جواز ہے؟

**جواب:** اس بارے میں میرا شخصی ردعمل یہ ہے کہ مرتد کو سزائے موت دینے کے سلسلے میں نہیں دی جاتی بلکہ اسے ایک سیاسی غداری کی سزا دی جاتی ہے۔دنیا کی کوئی حکومت غداری کرنے والے کو معاف نہیں کرتی۔اسلام میں چونکہ

سیاست اور دین میں کوئی دوئی نہیں۔اس لیے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ محض دین سے انحراف کی سزا ہے۔ہم کسی کو اسلام میں داخل ہونے اور اسلامی امت کا رکن بننے کے لیے جبر نہیں کرتےلیکن جب وہ مسلمان ہونے کے بعد اس اجتماعی نظام سے بغاوت کرتا ہے تو اس دنیا کے عام سیاسی قواعد اور سیاسی ضرورتوں کے تحت غداری کی سزا بھی دی جائے گی۔

**سوال ۱۲:** غیر ممالک خاص طور پر یورپ اور امریکہ میں تبلیغی جماعت کی تبلیغ کے کیا نتائج مرتب ہوئے ہیں؟ کیا اس جماعت کی کارکردگی کافی مؤثر ثابت ہو رہی ہے؟اگر نہیں ہے تو کیوں؟ وضاحت فرمائیں۔

**جواب:** مجھے اور ممالک کا علم نہیں لیکن پیرس شہر کی حد تک میں کہہ سکتا ہوں کہ گزشتہ بیس سال سے یہ جماعتیں وہاں آنے لگی ہیں اورمیں نے اس کے اچھے نتائج دیکھے ہیں۔اب سے بیس سال پہلے پیرس شہر کے مسلمانوں میں اگرنماز پڑھنے والوں کی تعداد ہزار میں سے ایک تھی تو اب میں کہہ سکتا ہوں کہ کچھ نہیں تو سو میں سے پچاس ہوگئی ہے۔یعنی پچاس فیصد لوگ نماز پڑھنے لگے ہیں۔یہ تبلیغی جماعت کی کوششوں کا اثر ہے۔اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ۱۹۲۴ سے پیرس میں ایک بہت عظیم لشان مسجد ہے لیکن اب گزشتہ بارہ سالوں سے یہ مسجد ناکافی ثابت ہورہی ہے، چنانچہ شہر میں روز بروز نئی مسجدیں بننے لگی ہیں یا کوئی عمارت کرائے پر لے کر اس سے مسجد کا کام لیا جاتا ہے یا خود عیسائیوں کی طرف سے فروخت کیے جانے والے گرجاؤں کو خرید کر مسجدوں میں بدلا جا رہا ہے۔نتیجہ ی ہے کہ اس وقت میرے علم میں شہر پیرس اور اس کے مضافات میں اسی(۸۰) سے زائد مسجدیں ہیں۔

**سوال ۱۳:** سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں رسول اکرمﷺ کی بڑی صاحبزادی حضرت زینبؓ کا نام کیوں نہیں لیا جاتا؟ جبکہ ان کے ہم عمر یا ان سے بھی کم عمر حضرت علیؓ کا نام لیا جاتا ہے۔

**جواب:** میرا منشاء یہ نہیں تھا کہ سارے ابتدائی مسلمانوں کا نام بیان کروں۔اس لیے میں نے بھی اس طرف توجہ نہیں کی۔صرف چند نام گنوائے جن سے لوگ واقف ہیں۔یہ معلوم نہیں کہ بعثت کے وقت بی بی ابھی والدین کے گھر ہی میں تھیں کہ فوراً مسلمان بنیں یا شادی ہوکر شوہر کے پاس جا چکی تھیں۔صرف یہ ذکر آتا ہے کہ وہ شوہر کو چھوڑ کر رسول اللہﷺ کے ساتھ مدینہ ہجرت کر گئیں اور بعد میں شوہر مسلمان ہوئے تو نکاح سابق ہی پر وہ شوہر کے گھر چلی گئیں۔نکاح کب ہوا تھا معلوم نہیں۔

**سوال۱۴:** جب کہ قرآن پاک نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی برات بیان فرمائی اور مسلمانوں کو ان کے حواریوں کی اتباع کا حکم دیا ہے تو پھر بھی حواریین یعنی صحابۂ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کیوں مطعون کیا جاتا ہے؟

**جواب:** آیت یہ ہے کہ "يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ كُونُوٓاْ أَنصَارَ ٱللَّهِ كَمَا قَالَ عِيسَى ٱبۡنُ مَرۡيَمَ لِلۡحَوَارِيِّـۧنَ مَنۡ أَنصَارِيٓ إِلَى ٱللَّهِۖ قَالَ ٱلۡحَوَارِيُّونَ نَحۡنُ أَنصَارُ ٱللَّهِ"۔ میں نے اپنی طرف سے مطعون نہیں کیا بلکہ میں نے انجیل کے حوالے سے بیان کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے ایک حواری سینٹ پیٹر کو ان الفاظ میں جھڑکا تھا: "جا او شیطان۔" اس سے زیادہ میرا کوئی مقصد نہیں تھا۔یہ روایت صحیح ہے یا نہیں ، میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔یہی حال یہوداا سخریوطا حواری کا ہے جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پولیس کے ہاتھوں گرفتار کروایا تھا۔

**سوال۱۵:** آپ نے تقریر کی ابتداء میں ورقہ بن نوفل کا واقعہ بیان فرمایا ہے۔اس واقعے سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اپنے رسول ہونے کا علم نہیں تھا۔جب کہ ورقہ بن نوفل یہ جانتا تھا۔کیا اس بیان سے رسول اللہ ﷺ کی سبکی نہیں ہوتی؟ کیا نبی وقت کا سب سے بڑا عالم ، وقت کی سب سے بڑی کامل و جامع شخصیت تسلیم نہیں ہوتا۔کیا وہ کسی فرد سے کم تر ہوکر نبی ہوسکتا ہے؟

**جواب:** جو مفہوم میں آپ کا سمجھ سکا ہوں اس کا جواب عرض کرتا ہوں۔رسول اللہ ﷺ کو جب پہلی مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک شخصیت آپؐ کے سامنے آکہتی ہے کہ میں جبرئیل ہوں اور خدا نے مجھے بھیجا ہے اور آپ کو اللہ نے اس امت کا نبی بنایا ہے۔اس واقعے کی تفصیل آپ ابن ہشام میں پڑھیں۔اس میں لکھا ہے کہ یہ واقعہ خواب میں پیش آیا تھا۔رسول اکرم ﷺ نیند سے بیدار ہوئے تو آپؐ کو کچھ تذبذب تھا اور وہ تذبذب کچھ عرصے بعد ختم ہوجاتا ہے۔ جب یہ بات مکرر ہوتی ہے اور جبرئیل دوبارہ آپ کی بیداری میں آتے ہیں تو اس طرح توثیق(Confirmation) ہو جاتی ہے لیکن پہلی وحی اور دوسری وحی میں تین سال کا طویل وقفہ ہے۔اس عرصے میں فطرتِ انسانی کے تقاضے سے شروع شروع میں کچھ خوف کا احساس ہوا۔ پھر جب خوف دور ہوجاتا ہے تو یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کاش! اس تجربے کادوبارہ اعادہ ہو۔پھر اس کے بعد شوقِ انتظار ایک خلش کا روپ اختیار کرتا ہے اور بالآخر یہ کیفیت پیش آتی ہے کہ آدمی مایوس ہوکر سمجھے کہ شاید گزشتہ واقعہ محض ایک وہم تھا۔چنانچہ ہماری کتابوں میں یہی روداد ملتی ہے۔ صحیح بخاری کی ایک

روایت ہے کہ شدید مایوسی کے عالم میں ایک مرتبہ رسول اکرم ﷺ نے خودکشی کی کوشش فرمائی۔قصہ یہ ہے کہ ایک دن آپ کی چچی ، ابو لہب کی بیوی نے طعنہ دیا کہ معلوم ہوتا ہے تیرا وہ شیطان تجھ سے خفا ہوکر تجھے چھوڑ چکا ہے۔ آپؐ کے صبر و انتظار کے پیمانے میں یہ آخری قطرہ گرا تو وہ چھلک پڑا۔اس وقت آپانتہائی جوش کی حالت میں شہر سے نکلتے ہیں، ایک پہاڑی کی چوٹی پرچڑھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ چھلانگ لگا کر خودکشی کر لیں۔اس وقت جبرئیلؑ آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ(قرآن ۹۳: ۳) نہیں، اللہ نے آپؐ کو چھوڑا نہیں ہے۔آپؐ برحق نبی ہیں۔پھر اس کے بعد آپ کو سکون ہوجاتا ہے اور وحی کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوجاتا ہے۔ان حالات مں رسول اکرم ﷺ کو آپ فرشتہ نہ سمجھئے۔وہ ایک بشر تھے۔قرآن مجید باربار کہتا ہے: "انما انا بشر مثلکم" (۱۸: ۱۰)۔رسول اکرم ﷺ کا ردِ عمل بشری تقاضوں کے مطابق ہے۔اگر ابتداء میں شبہ پیدا ہوا، تو وہ انکار کے باعث نہیں تھا بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ تقاضائے بشری کے باعث تھا، پھر جو کاہن اور جادوگر تھے۔ان کے حالات سے بھی آپؐ واقف تھے۔یہ لوگ کہا کرتے تھےکہ ہمیں کسی غیبی شخصیت نے آ کر فلاں فلاں چیزیں بتائیں تو اس بنا پر شبہ پیدا ہونا ایک لازمی اور طبعی بات تھی اور اس کا منشاء صرف اس قدر تھا کہ مجھے شیطان نہ بہکائے۔اس سے زیادہ اور کوئی بات نہیں تھی۔

**سوال۱۶:** حضور ﷺ اور ان کے اہلِ خانہ نے شعب ابی طالب میں پناہ لی۔کیا شعب ابی طالب میں پناہ لینے والے سارے مسلمان تھے یا ان میں غیر مسلم بھی شامل تھے؟ اگر ابو طالب نے کچھ عرصہ شعب مین پناہ لیے رکھی ، بھوک وغیرہ برداشت کی تو اس کی کیا وجہ ہے؟

**جواب:** میں سمجھتا ہوں کہ اس کی تفصیلات آپ کو آسانی کے ساتھ سیرت کی ہر کتاب میں مل سکتی ہے۔مکہ والوں نے یہ معاہدہ کیا تھا کہ خاندانِ بنی ہاشم کا بائیکاٹ کیا جائے لہٰذا مسلم و غیر مسلم جتنے افراد تھے سب پر اس کا اطلاق ہوتا تھا۔ ہماری کتابوں میں مثلاً بلاذری کی کتاب میں صراحت کے ہے کہ اور غیر مسلموں نے خاندان کا ساتھ دینے (Solidarity)کی خاطر ساتھ دیا لیکن ابو لہب نے خاندان کو اور شعب ابی طالب کو چھوڑ کر شہر میں آکر مشرکوں سے کہا کہ میں خود کو مستثنیٰ کرتا ہوں اور تمہارے ساتھ رہتا ہوں۔میں بتوں کی حمایت کروں گا۔ان حالات میں دونوں مسلم اور غیر مسلم وہاں تھے۔ غیر مسلموں نے خاندانی حمیت کی خاطر ساتھ دیا اور مسلمانوں نے مجبوری کے تحت ایسا کیا تھا۔ رہا بھوک پیاس کا برداشت کرنا، اگر ہم قبول کرتے ہیں کہ خاندان کے ساتھ ہم اپنا تعلق برقرار رکھیں گے تو اس کے

نتائج کو برداشت کرنا ہوگا، چنانچہ انہوں نے برداشت کیا۔کچھ لوگ اس بھوک اور پیاس کی تلیف اٹھا کر بیمار بھی ہوتے رہے۔کچھ لوگ جاں بحق بھی ہوئے۔لیکن بہرحال انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا ساتھ نہ چھوڑا۔

**سوال۱۷:** مستشرقین کا دعویٰ ہے کہ رسول اللہ ﷺ مکہ میں تو پیغمبر تھے اور مدینے میں بادشاہ بن گئے۔آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

**جواب:** میری اس بارے میں رائے یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ مکے میں نبی تھے۔اس سے دشمن کو بھی انکار نہیں۔ مدینے میں صرف بادشاہ تھے، اس سے مجھے اتفاق نہیں۔مدینے میں آپؐ نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی تھے۔یعنی آپؐ کے ابتدائی پرانے فرائض میں اب اضافہ ہوگیا تھا۔دوسرے الفاظ میں اگر نبی کے فرائض یہ ہیں کہ دین کی تبلیغ کرے، عبادت کے طریقے بتائے ، عقائد کی اصلاح کرے تو رسول اللہ ﷺ بعثت سے لے کر وفات تک مکے اور مدینے دونوں جگہ یہی فرائض انجام دیتے رہے۔شکریہ، السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ٹائپنگ: محمد امین اکبر، حسیب انصاری، محمد شعیب

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی مزید کتب و مضامین ڈاؤن لوڈ کرنے کے لیے:

www.drmhamidullah.com